

رودِ کوثر

شیخ محمد کرام

ادارۂ ثقافت اسلامیہ
۲۔ کلب ر لاہور

یہ کتاب برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مذہبی ثقافتی اور علمی تاریخ اور ان کے کارناموں پر مشتمل ایک اہم دستاویز ہے اور اس کو سلسلہ کوثر کی دوسری کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں عہدِ مغلیہ سے لے کر سرزمینِ برصغیر پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ عہدِ سلطیہ میں علما، مشائخ اور صوفیہ نے جو خدمات انجام دیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ شیر شاہ سوری اور خاندانِ سوریہ کے دیگر حکمرانوں کے حالات اور اس عہد کے اسلامی علمی واقعات بھی نیتِ کتاب ہیں۔ کتاب میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ یہ کتاب اس قسم کی بے شمار معلومات کا مستند ذخیرہ ہے۔

کتاب کی افادیت و مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ چھ مرتبہ یورپ سے آراستہ ہو چکی ہے اور اب یہ اس کا ساتواں ایڈیشن ہے۔

روزگار

روزِ کوثر

اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ
عہدِ مغلیہ

شیخ محمد اکرام

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

ادارہ ثقافت اسلامیہ سلیم زیب اکرام کا انتہائی شکر گزار ہے کہ انھوں نے اپنے مرحوم شوہر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی تصانیف: آب کوثر، رود کوثر، موج کوثر اور غالب نامہ کے جملہ حقوق ادارے کے نام منتقل کر دیے ہیں۔

چھٹی بار ۱۹۷۵
ساتویں بار ۱۹۷۹
آٹھویں بار ۱۹۸۲
نویں بار ۱۹۸۴
تعداد ۱۱۰۰
مطبع : مکتبہ جدید پریس، شارع فاطمہ جناح، لاہور
ناشر : ملک فیض بخش معتمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۰	پیر روشن میاں بانو زید انصاریؒ	۴۳	۱	تمہید (۱۹۵۷)	۷
۱۱	پیر روشن کے متعلق اختلافات	۴۸	۱۲	استدراک (۱۹۶۷)	۱۲
۱۲	مخزن الاسلام کا اندراج	۵۲	۱	اکبر سے پہلے	
۱۳	دبستان مذہب کا اندراج	۵۷	۱	عہد مغلیہ	۱۷
۱۴	پیر روشن کی تاریخی اہمیت	۵۹	۲	مغلیہ حکومت کی ابتدا	۲۰
	قادر سیر سلسلہ		۳	شیر شاہ اور خاندان سور	۲۴
۱۵	مخدوم محمد گیلانی حبیبیؒ	۶۳	۴	مہدوی تحریک	۲۴
۱۶	مخدوم عبدالقادر ثانیؒ	۶۴	۵	شاہان سور اور مہدویت	۳۰
۱۷	شیخ داؤد کربانی شیر گڑھیؒ	۶۶	۶	ایرانی اور شیعہ اثرات	۳۲
	چشتیہ سلسلہ		۷	شطاری سلسلہ	۳۵
۱۸	شیخ عبدالعزیز چشتی دہلویؒ	۷۰	۸	شیخ محمد غوث گویاری	۳۷
۱۹	شیخ سلیم چشتیؒ	۷۱	۹	سلسلہ مداریہ	۴۱
	صابریہ سلسلہ			روشنیہ فرقہ	
۲۰	شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ	۷۳			

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۱	ردولی، ناگور اور اجیر	۷۴	۱۷	اکبر کے آخری ایام	۱۳۳
۲۲	مخلوں کی مخالفت	۷۶	۱۸	فیضی کی تفسیر منقوطہ ۱۵۹۳ء	۱۳۳
۲	عہد اکبری		۱۸	ابوالفضل اور اکبر کا بگاڑ	۱۳۵
۱	اسلامی حکومت کا استحکام	۷۸	۱۹	پرتگیز مشنری اور مسلمان امرا	۱۳۷
۲	فتوحات اکبری	۸۰	۲۰	ابوالفضل کا انجام	۱۴۰
۳	مغلیہ نظام حکومت	۸۱	۲۱	خان اعظم مرزا عزیز کوکھ	۱۴۲
۴	علوم و فنون کی سرپرستی	۸۳	۲۲	اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی	۱۵۹
۵	طریق صلح کل	۸۵	۲۳	عہد اکبری میں علم و فن	۱۶۱
۶	اکبر کی ابتدائی مذہبی حالت	۸۷	۲۴	عہد اکبری کی محدود ترقیاں	۱۶۵
۷	عبادت خانہ	۸۹	۲۵	نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید	۱۷۸
۸	مخدوم الملک اور صدر الصدور	۹۲	۲۶	حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ	۱۹۰
۹	علماء کا زوال	۱۰۰	۲۷	خواجہ گلان	۲۱۱
۱۰	مخالفت	۱۰۴	۲۸	خواجہ خرد	۲۱۳
۱۱	اسباب مخالفت	۱۰۸	۲۹	خواجہ حسام الدین	۲۱۵
۱۲	عہد اکبری کے مذہبی مؤرخ	۱۱۱	۳۰	شیخ تاج الدین سنہالی	۲۱۹
۱۳	مریدان شاہی	۱۱۸	حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد مرندی قدس سرہ		
۱۴	اکبر کے احکام عمومی	۱۲۱	۱	مخدوم عبدالاحد	۲۲۳
۱۵	کیا اکبر نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟	۱۲۷	۲	شیخ یعقوب صرفی کشمیری	۲۲۴
۱۶	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا محاکمہ	۱۳۱	۳	قیام اکبر آباد	۲۲۷
			۴	ابتدائی حالات کے متعلق دشواریاں	۲۳۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵	شادی خانہ آبادی	۲۳۶	۲۳	۲۲ - وحدت الشہود	۳۰۸
۶	حاجی سلطان بھانیسری	۲۳۷	۲۴	حضرت مجدد و اولہ شیخ	۳۱۵
۷	رسالہ رد ووافض	۲۳۳	۲۵	ابن العربی	۳۱۵
۸	رسالہ تہلیلہ	۲۳۴	۲۶	جار خانہ ہندو اچاریت اور	۳۱۸
۹	حضرت خواجہ باقی اللہ سے بیعت	۲۳۷	۲۷	حضرت مجدد کا رد عمل	۳۱۸
۱۰	لاہور بچو قطب الارشاد است	۲۵۲	۲۸	اختلافات کا حل	۳۲۴
۱۱	خانقاہ باقویہ اندہ حضرت مجدد	۲۵۳	۲۹	مکتوبات امام ربانی	۳۲۵
۱۲	رسالہ معارف لدنیہ رسالہ	۲۵۷	۳۰	مخدوم زادگان کی والدہ محترمہ	۳۳۱
	مبداء و معاد وغیرہ	۲۵۷	۳۱	خواجہ محمد سعید	۳۳۳
۱۳	ارشاد و ہدایت	۲۵۹	۳۲	شیخ محمد معصوم	۳۳۶
۱۴	خانگی صدقات اور حضرت مجدد کی عالی سوسلگی	۲۶۰	۳۳	شیخ آدم بندری	۳۳۹
۱۵	شیخ بدیع الدین	۲۶۴	۴	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	
۱۶	مکتوب یازدہم کی مخالفت	۲۶۵	۱	علوم دینی کا نیا دور	۳۴۳
۱۷	حضرت مجدد دربار جہانگیری میں	۲۶۷	۲	شیخ سیف الدین	۳۴۵
۱۸	شدت یوسفی	۲۷۱	۳	ابتدائی تعلیم	۳۴۷
۱۹	کیا حضرت مجدد (اور "تنہا") کا قلع قمع کیا؟	۲۷۷	۴	دربار اکبری	۳۴۸
۲۰	حضرت مجدد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا؟	۲۷۷	۵	شیخ موسیٰ پاک شہید ملتان	۳۵۰
۲۱	حضرت مجدد کی مذہبی خدمات	۲۸۴	۶	سفر حرمین	۳۵۱
۲۲	صوفیانہ احوال اور نظریہ قیمت	۲۹۲	۷	شیخ عبدالوہاب متقی	۳۵۲
۲۳	روضۃ القیومیہ	۳۰۴	۸	شیخ علی متقی	۳۵۳
			۹	شیخ محدث اور بدایونی	۳۵۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵۴۲	۵۔ سفرِ حرمین		۸۔ بنگال میں اسلام		
۵۴۸	۶۔ خلافت باطنی		۱۔ چین کی ویشنو تحریک	۴۹۳	
۵۵۱	۷۔ قرآن		۲۔ بنگال میں ویشنو تحریک	۴۹۴	
۵۵۴	۸۔ حدیث		کے اثرات		
۵۵۸	۹۔ اصول فقہ		۳۔ بنگالی مسلمانوں کا ردِ عمل	۴۹۸	
۵۶۰	۱۰۔ اجتہاد و تقلید		۴۔ سید سلطان	۴۹۹	
۵۶۳	۱۱۔ تصوف		۵۔ بہرام سقا بردوانی	۵۰۲	
۵۶۷	۱۲۔ حجۃ اللہ البائتہ		۶۔ مولانا حمید دہشت مند مکمل کوٹی	۵۰۷	
۵۷۰	۱۳۔ دیگر تصانیف		۷۔ بزرگانِ ڈھاکہ	۵۱۰	
۵۷۱	۱۴۔ اصلاحِ معاشرہ		۸۔ مدرسہ باگھا۔ ضلع راجشاہی	۵۱۲	
۵۷۳	۱۵۔ اشعار اور مکاتیب		۹۔ شاہ نعمت اللہ قادری	۵۱۳	
	حکیم الامت کون ہے؟		۱۰۔ عہدِ آخر کے مشائخِ قادریہ	۵۱۴	
۵۷۵	۱۶۔ شیعہ سنی خیالات کی تطبیق		۱۱۔ غیر شرعی طریقے	۵۱۶	
۵۷۹	۱۷۔ شریعت اور طریقت		۱۲۔ مرتضیٰ شاہی فقیر	۵۱۸	
۵۸۱	۱۸۔ اختلاف بین المذہب		۱۳۔ بنگال میں اسلام	۵۲۰	
۵۸۳	۱۹۔ جدید علم الکلام کی ابتدا				
۵۸۴	۲۰۔ حکیم الامت کے علمی کارنامے		۹۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ		
۵۸۵	۲۱۔ قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ		۱۔ ۱۷۰۳ء	۵۲۸	
	کامرتبہ		۲۔ خاندانی حالات	۵۳۲	
	حکیم الامت کے فرزندانِ ارجمند		۳۔ شاہ عبدالرحیم	۵۳۵	
۵۸۷	۲۲۔ شاہ عبدالعزیز		۴۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت	۵۴۱	
۵۹۱	۲۳۔ تحفہ انا عشریہ				

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۵۸	۱۰۔ فیضی اللہ شیخ محدث		۴۔ عہدِ شاہجہانی		
	۱۱۔ شیخ محدث اور حضرت		۱۔ شاہجہان	۴۲۲	
	مجددِ اہل ثنائی	۳۶۱	۲۔ حضرت شیخ میاں میر قادری	۴۲۵	
	۱۲۔ شاہ ابوالمعالی قادری لاہوری	۳۷۹	۳۔ ملا شاہ قادری	۴۲۹	
	۱۳۔ شیخ محدث کی علمی خدمات	۳۸۳	۴۔ سرمد	۴۳۳	
	۱۴۔ خاندانِ حق	۳۸۸	۵۔ دبستانِ مذاہب	۴۳۸	
	۵۔ علما و مشائخِ عصر		۶۔ شیخ محب اللہ آبادی	۴۴۰	
	۱۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی	۳۹۰	۷۔ شہزادہ داراشکوہ قادری	۴۴۲	
	۲۔ ملا محمود جوہری	۳۹۱			
	۳۔ شیخ محمد بن طاہر شہینی	۳۹۲	۷۔ عہدِ عالمگیری		
	۴۔ شیخ وجہ الدین احمد آبادی	۳۹۳	۱۔ عالمگیر	۴۵۲	
	۵۔ مولانا صبغت اللہ روحی شطاری	۳۹۴	۲۔ اصلاحاتِ عالمگیری	۴۵۷	
	۶۔ شیخ محمد بن فضل اللہ بریلوی	۳۹۵	۳۔ اربابِ ظاہر	۴۵۹	
	۷۔ اندونیشیا میں شطاری سلسلہ	۳۹۷	۴۔ اسلامی مدارس اور ان	۴۶۳	
	۸۔ قاضی نور اللہ شہرستانی	۳۹۹	کا نصابِ تعلیم		
	افغان مشائخ و علما		۵۔ عالمگیر اور غیر مسلم	۴۶۶	
	۹۔ شیخ عبداللہ نیازی سرسیدی	۴۰۵	۶۔ خوشحال خاں خطک	۴۶۸	
	۱۰۔ شیخ احمد سون قدس سرہ	۴۰۵	۷۔ علوم و فنون	۴۷۳	
	۱۱۔ قصور کے افغان مشائخ	۴۱۰	۸۔ فتاویٰ عالمگیری	۴۷۷	
	۱۲۔ حضرت پیر بابا قدس سرہ	۴۱۲	۹۔ عالمگیر اور بنگال سرسید	۴۷۸	
	۱۳۔ اخوند بابا درویش پشاور	۴۱۴			

تہذیب

(۱۹۵۷ء)

دورِ کوثر اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی تاریخ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں عہدِ مغل کی شخصیتوں اور تحریکوں کا بیان ہے۔

ہر ایک دور کی تاریخ نویسی خاص مسائل اور مخصوص مشکلات سے دوچار رہتی ہے۔ ابتدائی ایام کے متعلق بڑی دشواری کی معلومات کی تھی۔ عہدِ مغل کے متعلق معلومات اور روایات کی افراط ہے۔ یہاں اصل مشکل بے خبری نہیں بلکہ افواہوں غیر مصدقہ قصوں اور غلط تاثرات کا وہ رنگ و روغن ہے جس نے حقیقت کے خدخال چھپا دیے ہیں۔

اس صورت حال میں غالباً سب سے زیادہ دخل مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ کو ہے۔ مولانا کی قابلیت اور علم و فضل مسلمہ ہے۔ بلاشبہ تذکرہ ایک عمدہ آفریں کتاب ہے۔ انشاء پر دانی کا شاہکار بھی اور علم و فضل کی ضیافتِ خوش ذائقہ بھی۔ لیکن مولانا کو مؤرخ ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ہماری قومی تاریخ کے جن واقعات کو انھوں نے بیان کیا ان کے ذکر سے ان کا مقصد مورخانہ نہ تھا۔ پھر ان کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا تھا اس سے وہ بہت آگے نکل گئے لیکن مولانا کی کمال انشاء پر دانی نے ان نیم صحیح بیانات کو اردو ادب میں دوامی جگہ دے دی ہے۔ اور انشاء پر داز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے۔ (ہمدی گورکھپوری)۔ اب حاکم یہ ہے کہ ان مضامین پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بیشتر تذکرہ ہی کی صدا سے بازگشت ہے! مولانا کی سحر نگاری سے کئی مشتبہ امور نے مسلمات کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

لے مثلاً بدلیونی کے متعلق تذکرہ اور کچھ برس بعد کی تصنیف غبارِ غلام میں جو تادمِ بیکہ ہے۔ وہ غور کی مستحق ہے۔

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۴	شاہ رفیع الدین	۵۹۶	۲	مرشد آباد	۶۲۴
۲۵	شاہ عبدالقادر	۵۹۶	۵	عظیم آباد	۶۲۸
۲۶	شاہ عبدالغنی	۵۹۷		لکھنؤ کے اکابر شیعہ علماء	
	۱۰۔ علمائے متاخرین		۶	مجتہد العصر مولانا دلدار علی	۶۳۲
	۱۔ زوالِ حکومت	۵۹۸	۷	سلطان العلماء سید محمد	۶۳۴
	۲۔ زوالِ حکومت کے اسباب	۶۰۱		مجتہد العصر	
	علوم اسلامی کا فروغ		۸	لکھنؤی شیعیت کی خصوصیات	۶۳۶
	۳۔ فرنگی محل	۶۰۳		دوسرے علمائے شیعہ	
	۴۔ درسِ نظامی	۶۰۵	۹	علامہ تفضل حسین کاشمیری	۶۳۹
	۵۔ علامہ بجز العلوم	۶۱۰	۱۰	اسماعیل فرقہ	۶۴۰
	۶۔ آزاد بلگرامی	۶۱۱		۱۲۔ اٹھارہویں صدی کے مشائخ	
	۷۔ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی	۶۱۲		۱۔ چشتیہ سلسلہ کا احیا	۶۴۱
	۸۔ شیخ محمد حیات سندھی	۶۱۵		۲۔ نقشبندیہ سلسلہ	۶۴۲
	۹۔ مولوی سلام اللہ محدث	۶۱۵		۳۔ شاہ گلشن دہلوی	۶۴۳
	۱۰۔ خیر آبادی خاندان	۶۱۶		۴۔ مرزا مظہر جانجاناں	۶۴۵
	۱۱۔ شیعہ فرقہ کا فروغ			۵۔ خاتم الاولیا شاہ غلام علی قدس	۶۴۹
	۱۔ اٹھارہویں صدی میں			۶۔ سلسلہ مجددیہ کا دوبارہ جدید	۶۵۸
	شیعیت کا فروغ	۶۱۶		۷۔ شاہ احمد سعید دہلوی ثم مدنی	۶۶۰
	۲۔ حاجی محمد حسن	۶۲۰		۸۔ مغربی پاکستان میں مجددی سلسلہ	۶۶۲
	۳۔ دکن کے شیعہ علماء	۶۲۳		۹۔ اردو زبان کی ارتقا	۶۶۵
				۱۰۔ اہم تاریخی شخص	۶۶۷
				منتخب فہرست کتب	۶۶۸

مثلاً یہ کہ اکبری الحاد کا قلع قمع تنہا حضرت مجدد الف ثانی نے کیا۔ یا یہ کہ اکبری شیخ الاسلام (مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری) اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہیؒ میں برائیاں ہی برائیاں تھیں اور اکبری مذہبی پالیسی معین کرنے کا باعث فقط ان علما کی خرابیاں تھیں۔ اکبری کی اپنی سیاسی اغراض نہ تھیں یا یہ کہ جب شیخ عبدالحق محدث نے حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کے متعلق ایک رسالہ لکھا تو ان سے ایک "سخت لغزش" سرزد ہوئی جس کی "آخر عمر کے اعتراف و رجوع نے تلافی کر دی"۔ مولانا کے نقطہ نظر کا کرشمہ تھا کہ حکام الامت شاہ ولی اللہؒ کی خوبیوں سے کما حقہ "باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ اس مرد عصر آفریں کو جس کے فیض سے شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے کئی علما اور مجاہد بر سرکار ہوئے" اپنے نواسے سے نچلا درجہ دیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد تو خیر اصلاً سیاسی رہنما اور اخبار نویس تھے کسی علمی ادارے سے وابستہ نہ تھے۔ چند سال ہوئے ایک نوجوان فاضل نے شیخ مجددؒ کے نظریہ توحید پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی تھی۔ جہاں تک فلسفیانہ حصے کا تعلق ہے مقالہ دلچسپ۔ واضح اور متوازن ہے۔ لیکن سوانحی حصہ اس طرح رطب و یابس ہے بھرا ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس حصہ کی اصلاح کیے بغیر اس مقالہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق کیسے قرار دیا گیا اور فاضل محقق اور ان کے فاضل نگران نے زبدۃ المقالات جیسی معاصرانہ تصانیف چھوڑ کر ڈیڑھ سو سال بعد کی داستانوں (روضۃ القیومیہ) پر کیوں اعتماد کیا اور حضرت مجددؒ کی تائید میں ہماہوت خاں کی بغاوت اور اس طرح کے دوسرے حصوں کو درج کتاب کرتے وقت معاصرانہ کتب تاریخ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟

جب ان کتابوں کی جو یونیورسٹیوں کی مہر تصدیق کے ساتھ شائع ہوں یہ حالت ہے تو عامۃ الناس کی معلومات کا کیا حال ہوگا؟ آئندہ سطور میں ہم نے ان لئے مولانا نے بغیر کسی استدلال کے حضرت مجددؒ کے "علمائے سوء" والے فقرے کا اطلاق ان بزرگوں پر کر دیا جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔

مباحث سے تفصیلی بحث کی ہے اور عام غلط فہمیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ بزرگانِ روحانی کا ذکر کرتے ہوئے سب سے نازک مرحلہ ان کے کاموں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ آرائی ہے۔ بلاشبہ اس میں ادب و احتیاط لازم ہے۔ اور غیر ضروری بحثیں اور نکتہ چینی مناسب نہیں، لیکن جب ان ہستیوں کا ذکر ہو، جنہوں نے ہماری قومی زندگی کا دھارا بدل دیا ہے۔ تو ان کے کاموں کا تجزیہ کیے بغیر ایک مورخ اپنے فرائض سے کس طرح عمدہ برآ ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ وہ واقعہ نگاری ہی کیا ہوئی جس میں آپ اصحابِ تذکرہ کے خط و خیال نہ پہچان سکیں اور ان کا امتیازی رنگِ طبیعت نہ سمجھ سکیں۔

ہم نے اپنی تصانیف میں مختلف بزرگانِ دین کے کاموں کا تجزیہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کہیں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تمام وہ آداب ملحوظ رہیں جو ان بزرگوں کے ذکر و بیان سے وابستہ ہیں، بلکہ ان کے کام کو عقیدت مندانہ حسنِ ظن سے دیکھا جائے، لیکن قومی ہی خواہی بھی نظر سے اوجھل نہ ہو اور تبصرہ و تجزیہ کو نظر انداز کر کے مورخانہ فرائض سے پہلو تہی نہ کی جائے۔

ہمارا اصول کار وہی ہے جسے غالب بار بار اپنے خطوط میں درج کرتا تھا۔ یعنی "راستی بالائے طاعت است" ہماری مسلسل کوشش ہے کہ حقیقت سے پردہ اٹھائیں۔ واقعات اور شخصیتوں کو ان کی صحیح شکل و صورت میں دیکھیں، خواہ اس سے قومی خود پسندی کی تسکین ہو یا نہ۔ ہمارے ہاں شبلی کے "مضامین عالمگیر" کے وقت سے جو اسلوبِ تاریخ نویسی رائج ہے وہ اس اصول کے خلاف ہے۔ اور فی الحقیقت اسلامی ہندوستان کی تاریخ اور مذہب اسلام کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط پراپیگنڈا کا جو طوفان مغربی علمی اداروں سے چلا آرہا ہے اسے دیکھ کر ایک خاص قسم کا مدافیانہ یا خود پسندانہ نقطہ نظر پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے، لیکن کیا یہ قومی فلاح کا راستا ہے؟ کیا اسے اختیار کر کے اور واقعات کو

ایک رنگین کمر میں دیکھنے سے ہم تاریخ سے وہ فوائد حاصل کر سکتے ہیں جن کے لیے یہ علم کار آمد ہوتا ہے؛ راقم الحروف کو یقین ہے کہ یہ طریق کار نہ مؤرخانہ ہے۔ نہ قومی ہی خواہی کا۔ اگر قومی خود داری کی تسکین ہی منتہا ہے آزدو ہے تو اس کے لیے ایم اسلام اور نسیم مجازی کے تاریخی رومان ہی کیوں نہ پڑھ لیے جائیں۔ تاریخ نگاری اور تاریخ خوانی سے قائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر اس کے اصول و آئین پیش نظر میں اور ان میں راستی بالاسے طاعت است کاہ اصول سبک مقدم ہے۔

رود کوثر کا یہ سیراڈیشن ہے۔ لیکن کتاب کو زیادہ مفید اور مکمل بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ حجم میں کوئی ڈھائی سو صفحے کا اضافہ ہے۔ بعض ابواب (مثلاً عہد اکبری کی مذہبی تاریخ اور شیخ عبدالحق محدث کے سوانح اور مذہبی کارناموں کا بیان) دوبارہ لکھے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں تمام نئی معلومات کو سمیٹ لیا جائے۔ بعض اہم مباحث (مثلاً اسلامی جنگال کی مذہبی تاریخ۔ روشنیہ فرقہ اور حضرت اخوند درویش پشاور کے حالات۔ اٹھارہویں صدی میں شیعہ فرقے کے فروغ کی تاریخ اور مشاہیر شیعہ کا تفصیلی تذکرہ) بالکل نئے ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ شروع سے ہم نے ان ہستیوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے پر خاص توجہ کی ہے جن کے کام اہم تھے لیکن جن کے متعلق صحیح واقفیت نہ تھی۔ مثلاً نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید کی اسلامی خدمات کو پہلے مرتبہ رود کوثر میں بیان کیا گیا اور حضرت خواجہ باقی باللہ کی اہمیت بھی تفصیلی طور پر پہلے پہل اسی کتاب میں نمایاں کی گئی۔ موجودہ ایڈیشن میں بھی ایسے کئی بزرگوں کے حالات اضافہ ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری اور شیخ صبغت اللہ کا بیان جن کے علمی اور روحانی کارناموں کی یاد ابھی تک جاوا اور سماڑ میں باقی ہے۔ یا افغان بزرگ شیخ محمد سون کا ذکر جنہوں نے عہد جاگیر میں سب سے پہلے سجدہ دوبارہ ادا کرنے سے انکار کیا اور اپنی حکمت اسلامی

کی بنا پر قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ امید ہے ان اصناف کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

قوم کی مذہبی، علمی، فکری تاریخ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے جو مواقع پیش آئے ہیں ان کے لیے عنایت ایزدی کا جتنا بھی شکرا ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن جس قدر طلب کا میدان وسیع ہے، اسی قدر ٹھوکریں کھانے اور بے ہوشی کا سامان بھی زیادہ ہے۔

رود کوثر کی کتابت، تصحیح اور طباعت مصنف سے بہت دور لاہور میں ہو رہی ہے۔ اس میں سینکڑوں بزرگوں کا ذکر ہے۔ ہزاروں کتابوں کے نام آتے ہیں۔ ہتھمیں مطبع کی پوری احتیاط کے باوجود کئی غلطیاں رہ جائیں گی۔ بعض میں میری کوتاہیوں کو دخل ہوگا۔ کاش وہ اہل دل، اہل علم جن کی رسائی علی گڑھ، ندوہ، دیوبند، دارالمصنفین وغیرہ کے کتب خانوں تک ہے۔ کتاب پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ اور مصنف کو اس کی غلطیوں سے آگاہ اور اپنے مشوروں سے مستفید کریں۔

اکرام

استدراک

(۱۹۶۷ء)

رود کوثر کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت کتاب غیر معمولی تعداد میں طبع کسلی گئی۔ چوتھے ایڈیشن کی نوبت قریباً نو سال کے بعد آرہی ہے۔ اس تعویق کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ چونکہ دھاکہ میں قیام کے باعث راقم السطور کتابت شدہ کاپیوں اور پردوں کی تصحیح نہ کر سکا۔ اور کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، ان کی اصلاح میں بڑی تاخیر ہوئی۔

اس وقفہ میں مزید مواد کی فراہمی جاری رہی، جس کے لیے خوش قسمتی ہے غیر معمولی مواقع میسر آئے۔ موجودہ اشاعت میں صفحات کا سائز بدلنے کے بلوجود کتب کے حجم میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ مزید مواد سمیٹنے کے لیے ایک دو اندیشہ کو جن کا تعلق مذہبی سرگزشت سے زیادہ ادبی تاریخ سے تھا، حذف کرنا پڑا۔ اور خالص مذہبی تاریخ کے متعلق قریباً بیس پچیس فیصدی مواد نیا یا نو ترمیم شدہ ہے۔

اس دوران میں کئی ایسی کتابیں شائع ہوئیں، جن سے عہد مغلیہ کی مذہبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً دو شہنہ سلسلہ پر غیر مطبوعہ مواد کی مدد سے پروفیسر ظہور الدین احمد اور مولانا اعجاز الحق قدوسی نے، بالترتیب اپنی کتب پاکستان میں فارسی ادب اور تذکرہ صوفیائے سرحد میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقیقت حال زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے مجددی بزرگوں کی قلمی اور نایاب تصانیف وغیرہ کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، ان سے بھی تاریخ کے طالب علم کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم نے ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ بعض کتب کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے کی سعادت راقم السطور کو نصیب ہوئی۔ مثلاً رسائل مجددیہ۔ مکتوبات سعیدیہ۔

مکتوبات امام ربانی کا امرتسری ایڈیشن (اشاعت ثانی) وغیرہ۔ مکتوبات محصویر کی (دوبارہ) اشاعت ابھی زیر تکمیل ہے، لیکن اس کی تین جلدیں کسی زمانے میں مختلف مطالب سے ایک ایک کد کے چھپی تھیں۔ پہلی ندوہ کے کتب خانہ سے ۱۹۴۷ء میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اب دوسری حکیم ذوالقرنین اور تیسری مولوی جمیل الدین احمد (جامعہ بہاولپور) کی بدولت حاصل ہو گئی۔ یہ سب کتابیں میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ اہمیت افزا وہ مواقع تھے، جو سلسلہ مجددیہ کے بعض مشہور کتب خانوں سے مستفید ہونے کے حاصل ہوئے۔ مدنیہ منورہ میں دو مرتبہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور دونوں مرتبہ

کافی وقت رباط منظری کے کتب خانہ میں گزرا۔ جہاں سلسلہ مجددیہ ہی نہیں، بلکہ عام تصوف اور علوم اسلامی کا (بالخصوص ان شعبوں کا) جن کا ہند۔ پاکستان سے تعلق ہے) ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح خانقاہ شریف دہلی اور خانقاہ کندیا شریف بھی پہنچنے اور بعض نوادر سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ سریندر شریف کی زیارت بھی نصیب ہوئی، لیکن اگرچہ روضہ مبارک کے باہمت منتظین نے، عینی اغیار کے زرخے میں، درگاہ کا بڑا ستھرا انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں علمی ذخیرہ کوئی نہیں۔ ان کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں ذخیرہ دہلی (Delhi Collection) کے نام سے ایک وسیع مجموعہ کتب ہے۔ جس کی فہرست کبھی شائع نہیں ہوئی۔ لیکن جس میں کتب خانہ شاہی کے بچے کچھ سرمائے کے علاوہ دہلی کے مشہور مدارس اور خانقاہوں کی کتابیں بھی شامل ہیں، جو سن ستاون کی لوٹ میں انگریزوں کے ہاتھ آئیں اس میں قلمی نوادر کی افراط ہے۔ اولیاء کے متعدد غیر مطبوعہ، نادر تذکروں کے علاوہ خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ نوردی کی قریباً تمام تصانیف ہیں۔ خواجہ کلل کا ایک اہم غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔ شیخ آدم بنوری اور ان کے سلسلہ کے متعلق مناقب آدمیہ اور شیخ کے بعض رسائل میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی تصانیف کے نہایت قدیم العہد مخطوطے ہیں۔ کلیات باقی باللہ کے ایک بیش قیمت نسخے میں ان کی وفات کے متعلق بارہ تیس وریق کا رسالہ در بیان رحلت ہے جس میں میاں (شیخ؟) عبدالحق کی لکھی ہوئی تاریخ وفات ہے۔ اور آخر میں میاں نور محمد شیخ نور الحق؟ اولد میاں (شیخ؟) عبدالحق کا ایک محرر کا مرقع ہے راقم السطور کو اس ذخیرہ دہلی سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ان کے علاوہ مطبوعہ سد بہار مآخذ زبدة المقامات۔ حضرات القدس (اردو ترجمہ) منتخب تاریخ وغیرہ کو پھر سے کھنڈا لا اور مکتوبات امام ربانی کا کئی بار پھر سے بغور مطالعہ کیا۔

لہ صرف شہر میں ایک کد کے پاس فارسی کی ایک قلمی تاریخ سریندر کا سرغ ملا۔ لیکن بوجہ میں اس کی تلاش ہو کر سکا۔ لہ افسوس کہ حافظہ نے دھوکا دیا۔ یہ سمجھ کر کہ یہ مرقع وہی ہے جو اردو ترجمہ مکتوبات خواجہ باقی باللہ میں شامل ہے، اسے نقل نہ کیا۔

ان سب کی روشنی میں رو کوثر کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے متحدہ ابواب بالکل نئے ہیں۔ اور کئی نظر ثانی اور اضافوں کے بعد نئے سرے سے لکھے گئے جو مباحث بالکل نئے ہیں۔ ان میں خانِ اعظم خواجہ باقی بائند کے صاحبزادگان۔ حضرت مجدد کے خسر حاجی سلطان تھانیسی اور والد ماجد محمد عبد الاحد صاحبزادگان (مجددہ) کی والدہ محترمہ۔ عالمگیر بزرگان سرسند۔ خانگی صدقات کے مقابلے میں حضرت مجدد کی عالی حوصلگی۔ شیخ عبد الحق محدث اور بدایونی۔ شاہ احمد سعید دہلوی۔ مدنی اور مغربی پاکستان میں مجددی سلسلے کی توسیع قابل ذکر ہیں۔ جن ابواب میں تفصیلی اضافے ہوئے ہیں ان میں روشنی فرقت۔ ذکر حضرت خواجہ محمد باقی بائند۔ ابوالفضل اور اکبر بکارت صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت اور شیخ محدث اور حضرت مجدد و الف ثانی نہ شامل ہیں۔

تاریخی تحقیق اور عقیدہ مندانہ ارادت کے تقاضے ایک طرح کے نتیجے کم از کم ابتداء میں ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا خاص طور پر دشوار ہوتا ہے۔ لیکن اگر فریقین انصاف اور سمجھ سے کام لیں اور ان کے درمیان نقطہ نظر کا کوئی بنیادی اختلاف نہ ہو تو یہ منزل طے ہو جاتی ہے۔ سلسلہ کوثر شروع کرتے وقت ہمیں راہ کی ان دشواریوں کا احساس تھا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ صد ہا بزرگوں کے اس تذکرے میں دو باتیں کے علاوہ کہیں کوئی خاص مشکل پیدا نہیں ہوئی۔ ان دو تین بزرگوں میں سب کا ہم سہی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ہے جن کے متعلق ہمارے بعض بیانات سے اور بالجملة تذکرہ اور روضۃ القیومیہ سے جو اختلافی نقطہ نظر کا ہم نے مندرجہ بالا تمہید میں اظہار کیا ہے، اس سے بعض بزرگان سلسلہ نے تفصیل، بلکہ شدت سے اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو تحریر سب سے پہلے ہماری نظر سے گزری۔ پروفیسر محمد فرمان کی حیات مجددہ ہے۔ جس میں انھوں نے رو کوثر کو ایک متوازن تصنیف کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے۔ اور ہمارے بعض بیانات کی تفصیلی تردید کی ہے۔ پروفیسر صاحب کو بعض امور میں غلط فہمی ہوئی ہے (مثلاً شیخ بیچ الدین کی نسبت ہمارے اندراج کے متعلق) اور جیسا کہ انھیں اعتراف ہے ان کا لہجہ کہیں تلخ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے انصاف اور تحقیق کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور مورث سلسلہ کی محبت میں مضار کو رد کر کے غرض خط سے خالی نہیں ہونے ویلا اس لیے ان کی تصحیح و تنبیہ سے استفادہ کرنا دشوار نہ تھا چنانچہ سوائے ایک اہم بحث کے (جسے اب زیادہ وضاحت بیان کر دیا گیا ہے) ہم نے اپنی

کتاب پر ان کے اعتراضات کی روشنی میں نظر ثانی کی ہے۔ اور حسب ضرورت اپنے بیان میں ترمیم کر دی ہے۔ اس سلسلے میں دوسری تحریر ایک محترم بزرگ کی ہے جن کے احسانات مجتہد سلسلہ پر بڑے قدیم ہیں۔ اور جن کا مرتبہ بلوک میں ہی نہیں علم فضل میں بھی بڑا بلند ہے۔ ہم نفلان کے رشادات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ (بلکہ مدینہ منورہ کے پہلے سفر کا فوری محرک یہ خیال تھا کہ اس پاک سرزمین میں پہنچ کر ایک کٹھن مسئلے میں رہنمائی کی درخواست کی جائے) لیکن افسوس کہ فاضل موصوف اور ہمارے نقطہ نظر میں بنیادی اختلافات ایسے ہیں بحالات موجودہ اس خلیج کو پرکھنا ناممکنات سے نہیں۔ دوسرے امور سے قطع نظر اس کی اہم وجوہ بالا اختصار میں (۱) حضرت مجدد کی نسبت محترم کا بنیادی نقطہ نظر وہی ہے جو روضۃ القیومیہ کے مصنف کا تھا اور جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے (تذکرہ میں) رنگ و رخس بھر ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں حضرت مجدد متعلق بہترین کتاب ابوالفضل مولانا احسان اللہ عباسی گورکھپوری نے لکھی۔ (جس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیہ کا خلاصہ ہے)۔ فرماتے ہیں: حضرت مجدد کے متعلق یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دود میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجدد کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔ ہماری رائے اس سے بالکل مختلف ہے۔

(۲) معاملہ صرف تاریخی محاملات کے متعلق اختلاف رائے کا نہیں بلکہ جیسا کہ موصوف کو احساس ہے۔ جلالی اور جمالیت نقطہ نظر کا ہے۔ یعنی فلسفہ زندگی اور مسلک کا اختلاف ہے۔ ان کو ہم سے اصولی شکایت یہ ہے کہ ان کے خیال میں ہم نے... "جلالی رنگ" والے حضرات کی تنقید یا تنقیص میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ "تنقیص" کے متعلق تو ہمیں ان اتفاق نہیں۔ لیکن اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے "جلالی رنگ" والے حضرات کے متعلق متبادل نقطہ نظر کو نسبتاً گڑے طریقے سے پرکھا ہے۔ اور "جلالی رنگ" والے حضرات کے حالات کی تلاش اور ان کی خوبیاں سمجھنے اور نمایاں کرنے کی خاص کوشش کی ہے تو ان کی شکایت بے بنیاد نہیں۔ شاید اس میں ہمارے رجحان طبع کو دخل ہو۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ جب تک یہ طریق کار اختیار نہ کیا جائے بیان واقعات میں صحت توازن کا حصول ناممکن ہے۔ یعنی جلالی شان والے بزرگوں کی عظمت کا احساس تو سطحی نظر میں بھی ہو جاتا ہے، لیکن جو اصحاب ستر احوال اور اخفا پر شدتِ عامل ہیں اور جن پر انکسار کا رنگ غالب ہے ان کے حالات کا اندازہ بغیر خاص کوشش کے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے سے واقعہ نگار جس طرح فاش

غلطیوں کا متحجب ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال احسان مسکا کی کتاب میں ملتی ہے جو ہادی زمانہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے انگسار نہ بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ”حضرت خواجہ باقی باللہ بظاہر آپ (حضرت مجددؑ) کے پیر اور درپردہ مرید تھے“ !!

اس کے علاوہ ہیں یہ بھی خیال ہے کہ اگر عبد الکریم کی کمزوریوں اور جارحانہ ہندو احمائیت کے خلاف جلالی طریق کار اختیار کرنا مستحسن بلکہ عین جواب ”تھا۔ تو خود کی اور خود پسندی کے موجودہ دور میں جہاں خودیوں کو نمایاں کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔

آج یہ خیال کہ ان ہستیوں پر جنہوں نے قومی زندگی کا دھارا بدل دیا، جدید تحقیق و تجربہ کی روشنی نہ پڑے گی۔ یا زور بیان اور جوش و جذبہ سے روضۃ القیومیہ کی روایات کو بقراردہ کھا جاسکے گا، ممکن محمول نہیں۔ اور ذمہ دار بزرگانِ سلسلہ اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں۔ (مثلاً خانقاہ شریف دہلی کے سربراہ حضرت زید ابوالحسن فاروقی مظہر نے فاضل موصوف کے سالہ کے ساتھ روضۃ القیومیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس احساس کا بقیہ اظہار ہے)۔ اب تحقیق و تلاش کے عمل کو روکا نہیں جاسکتا، لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ حجابِ سلسلہ اور غیر جانبدارانہ اہل تحقیق حضرت مجدد قدس سرہ کے ارشادات اور مستند متعلقہ تحریروں کا مؤرخانہ دیانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، لیکن پورے ادب و احترام بلکہ حسن ظن و ملی محبت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اور ان کی شخصیت مرتبہ اور حقیقی احسانات کے بے نقاب کریں حضرت قدس سرہ کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی اور ان کی شخصی زندگی میں ہمت، جرأت، بلند کردار، شجاعت و محبت کا ایسا امتزاج تھا۔ ان کی دینی خدمات اتنی عظیم الشان تھیں اور جارحانہ ہندو احمائیت کا (جب اس کا دار السلطنت میں احساس ہی نہ تھا!) مقابلہ کر کے انھوں نے قومی شخصیت کو اس طرح خود بینی، خود اعتمادی اور توانائی بخشی اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اس پلے کی تھی (ان کی دوسری خوبیوں۔ مثلاً عظیم صلاحیت روحانی، علمیت، غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، ممتاز طرزِ تحریر کے علاوہ)۔ کہ اگر ان پہلوؤں کا صحیح طور پر مطالعہ ہو تو خواہ تحقیق کی روشنی میں روضۃ القیومیہ کے نقطہ نظر کو ترک کرنا پڑے، بلکہ حضرت کے بعض ارشادات، مثلاً ہندو سر اور دوسرے علوم عقلی کے متعلق ان کے اظہار خیال، کو لائقِ تاویل سمجھا جائے۔ تب بھی ان کے عقو مرتبہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

راقم السطور نے اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق اس طریق کار پر عمل کیا ہے اللہ تعالیٰ اپنا رحم کے در غلطیوں سے بچائے

رود کوثر

اکبر سے پہلے

عہدِ مغلّیہ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ پڑھیں تو مغلوں سے زیادہ ہیبت ناک اور قابلِ نفرت کوئی ہستی نظر نہیں آتی۔ سلاطینِ دہلی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ”فتنہ مغول“ کا سد باب تھا۔ باقی سب باتیں جزوی اور ضمنی تھیں۔ منہاج سراج۔ ضیاء الدین برنی اور امیر خسرو منگولور کا ذکر کرتے ہیں تو ”کفار“ ”کفار مغول“ ”ملا عین“ اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے جو مسلمان ہو گئے تھے ان پر بھی اعتماد نہ کیا جاتا اور علاء الدین خلجی نے مغل نو مسلموں کا قتل عام کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ان مظالم کا خیال کریں جو چنگیز خاں اور ہلاکو نے نہیں بلکہ تیمور نے اہل دہلی اور شمالی ہندوستان پر توڑے تو یہ خوف اور جذبہ نفرت بجا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن قدرت کے طریقے عجیب ہیں۔ جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی کمزوری سے وہ فہمیل جو غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی نے مغلوں کے خلاف قائم کی تھی ٹوٹ گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا تسلط ہو گیا تو اسلامی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار اور پُر امن دور کا آغاز ہوا۔ اور نہ صرف ملکی نظم و نسق اور

خلقت کی مرفہ الحالی کا اعلیٰ درجے پر انتظام ہوا۔ بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی علم و ادب کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ ہوا۔ اس کی کمی وہیں نہیں پہلی یہ کہ جو حکمران تاریخ میں شاہانِ مغلیہ کے نام سے مشہور ہیں، ان کا منگول یا منگولوں سے فقط دور کا تعلق تھا۔ وہ حقیقت میں چغتائی ترک تھے، امیر تیمور کی نسل سے۔ ان میں منگولوں نہیں ترکوں کی خصوصیات تھیں۔ اور وہ بھی ان ترکوں کی جنہوں نے امیر تیمور کی عالمگیر فتوحات کے بعد مشرق و مغرب کے تہذیبی عناصر اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ امیر تیمور کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اپنے دار الحکومت سمرقند کو مشرق کا تہذیبی مرکز بنادے۔ اس مقصد کے لیے جہاں کہیں وہ جاتا اہل ہنر، اہل صنعت اور مہماروں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آتا۔ ان کی مدد سے سمرقند میں عالیشان، خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں اور شہر عروس البلاد بن گیا۔ تیمور کے وارث فتوحاتِ ملکی میں تو اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچے لیکن علم کی محبت اور تہذیب و ثقافت کی سرپرستی میں اس سے بہت بڑھ گئے۔ اس کی وفات کے جلد ہی بعد اس کی وسیع سلطنت محدود حکمرانیوں میں منقسم ہو گئی۔ لیکن اس کے جانشینوں نے انھی مختصر ریاستوں میں علم و ثقافت کو فروغ دیا۔ تیمور کا بیٹا شاہ رخ خود شاعر اور عالم تھا۔ اس نے چین اور دوسرے دور دراز ملکوں میں سفارتیں بھیجیں، جو وہاں سے تفصیلی حالات لے کر آئیں اور جن کے سفر نامے مورخین کے لیے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ اس کا ایک بیٹا الخ بیگ تھا جس نے اپنے دار الحکومت استرآباد میں ایک رصد گاہ تعمیر کرائی۔ دوسرے بیٹے بایسنقر نے کتابیں جمع کرنے میں ناموری حاصل کی۔ لیکن میزبان تیموری میں سے جس حکمران نے علم و فن کی سرپرستی کو کمال تک پہنچایا وہ تیمور کے ایک بیٹے عرش کا پوتا سلطان حسین مرزا تھا، جو ۱۴۶۸ء سے ۱۴۹۵ء تک خراسان کا حکمران رہا۔ اس کے دار الحکومت ہرات میں بہزاد جیسا مصور، جامی جیسا شاعر، میرخواند اور خواند میر جیسے مورخ اور شیر علی نوائی جیسے ہر فن

درباری تھے۔

مغلیہ حکومت کا بانی بابر حسین مرزا کا دوست اور مددگار تھا لیکن وہ صرف ان عظیم النظیر سستیوں ہی کا قدردان نہ تھا، جو حسین مرزا کے دربار میں جمع ہو گئی تھیں۔ بلکہ اسے وہ روح عزیز تھی، جو ان مشاہیر کی سرگرمیوں میں کارفرما تھی۔ یعنی جو کام ہاتھ میں لیا جائے، اسے کمال تک پہنچانے کی خواہش۔ بابر اپنی خود نوشت سوانحی میں کس حسرت اور کس فرط احترام سے لکھتا ہے:-

”زمان سلطان حسین مرزا عجیب زمانے بود۔ از اہل فضل مردم بے نظیر خراسان، ہر خصوص شہر ہری مملو بود۔

ہر کس بہر کار کہ مشغول بود۔ ہمت و غرض او آں بود کہ ہر کار را بکمال رساند۔

ان تہذیبی روایات کو بابر اور اس کے جانشینوں نے اپنی نئی سلطنت میں منتقل کیا لیکن مغلیہ تہذیب و تمدن کے سدا بہار باغ کی سیرابی دوسرے سرزمینوں سے بھی ہوئی۔ جن میں ایران۔ جسے ایک مورخ نے ”دبستانِ ہند“ لکھا ہے، سب سے بڑھ گیا۔ بابر کے تعلقات صفوی خاندان کے بانی شاہ اسماعیل سے خوشگوار تھے جب ہمایوں کو شیر شاہ افغان نے ہندوستان سے نکال دیا اور اسے دوبارہ تاج و تخت طہماسپ صفوی کی مدد سے ملا تو مملکت میں ایرانیوں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ اس نے جلا وطنی کے اٹھارہ مہینے زیادہ تر ایران میں گزارے تھے۔ اس دوران میں ایرانی تہذیب و تمدن سے اسے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا اور جب وہ ہندوستان کو واپس لوٹا تو متعدد ایرانی شعرا، مصور۔ اہل قلم اس کے ساتھ تھے، جنہوں نے ایک نئے تہذیبی عمل کا آغاز کیا، جو آگے چل کر اور مستحکم ہو گیا۔ ان تہذیبی اثرات کے علاوہ ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کا بھی برصغیر میں فروغ پہلی مرتبہ عہدِ مغلیہ میں ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو حکومت کا استحکام (اور علوم کی سرپرستی) تھا لیکن اس سے بھی بڑا سبب عرب اور بالخصوص حرمین سے شمالی ہندوستان کا تعلق تھا، جو اکبر کی فتح گجرات کے بعد

بحری راستے سے پیدا ہو گیا۔ اب علوم اسلامی کے طالبین کو خطرناک صحرا و جنگل کے راستے غیر ممالک میں نہ کاٹنے پڑتے بلکہ سورت اور کھنباست کی بندگاہوں سے جہازوں میں بیٹھ کر سیدھے حجاز جا پہنچتے اور علوم اسلامی کے اہل سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس دور میں شیخ عبدالحق محدث - شاہ ولی اللہ - علامہ وجیہ الدین گجراتی - مولنا یعقوب صیرفی کشمیری - سیالکوٹی ا جیسی کئی ہستیاں برسرکار آئیں جو حجاز میں تعلیم کی تکمیل کر کے اپنے اپنے علاقوں میں درس و تدریس کے مرکز بن گئے اور ان کے وجود ہائے گرامی سے علوم اسلامی بالخصوص علم حدیث کو ایک بالکل نیا فروغ حاصل ہوا۔ اور عام اسلامی مسائل کے متعلق بھی معلومات زیادہ صحیح اور نقطہ نظر زیادہ راسخ العقبانہ ہو گیا۔

ان کے علاوہ اور بھی اثرات تھے۔ فرنگی تاجراور پادری تو بچی اور طبیب بھی اب ملک میں پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان کی قدیم قوموں سے ربط و ضبط بڑھ رہا تھا اور ان کا ادب و فن بھی دربار میں عزت پاتا تھا۔ مختلف بلکہ مخالف اثرات کی موجودگی سے بعض اوقات تلخ کشمکش کے لمحے آئے اور ایک زمانے میں تو خطرناک صورت حالات پیدا ہو گئی لیکن خدا کا فضل شامل حال رہا۔ اراکین سلطنت اور اہل اللہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے حالات پر قابو پایا۔ اسلامی اثرات بہر صورت غالب رہے اور ساتھ ساتھ مغلوں نے جنہیں اُس زمانے میں اہل مغرب *Muslims* کہتے تھے، فنون لطیفہ۔ انتظامی معاملات۔ سیاست مدن۔ عام تہذیب و تمدن میں ایک ایسا معیار قائم کیا جو نہ صرف برصغیر بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغلیہ حکومت کی ابتدا | مغلیہ خاندان کی بنا سلطان ظہیر الدین بابر نے ڈالی جو تیمور کی نسل سے تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ ترکستان کے شہر فرغانہ میں تخت نشین ہوا لیکن مخالفوں سے ایک

طویل کشمکش کے بعد اسے موٹرونی وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر ہندوستان کے بعض امیروں کی دعوت پر جو حاکم وقت ابراہیم لودھی کے سلوک سے نالاں تھے، ہندوستان آیا اور ۱۵۱۹ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا۔

بابر نے دہلی فتح کر لی لیکن دہلی کی فتح سے ہندوستان فتح نہ ہوا تھا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے ہر طرف صوبیدار خود مختار ہو گئے تھے شمالی ہندوستان میں رانا سانگا نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا اور بابر کا سب سے بڑا معرکہ ۱۵۱۹ء میں اسی کے ساتھ ہوا۔ حکومت دہلی کے کمزور ہو جانے پر بہت سے ہندو راجاؤں نے سزا ٹھایا تھا۔ وہ بھی رانا سانگا کے ساتھ تھے۔ اس کا اپنا لشکر ایک لاکھ کا تھا۔ مارواڑ۔ چندیری اور دو نگر پور کے راجاؤں اور دوسرے راجپوت رؤسا نے پچاس لاکھ ہزار سوار اس میں اور اضافہ کیے اور لودھیوں کو ملا کر قریب قریب پورے دو لاکھ فوج بابر کے مقابلے میں آئی۔ شروع شروع میں بابر نے مخالفوں کی پروانہ کی لیکن جب شاہی فوج کے ہراولوں کو راجپوتوں نے شکست دی اور بیانہ کی فوج جو ان کی مدد کو گئی تھی اُسے بھی شکست کھا کر محصور ہونا پڑا تو پھر شاہی لشکر پر فکر و ہراس طاری ہوا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بڑے قلعے محمد سرداروں کے سپرد کر کے پنجاب لوٹ جانا چاہیے اور کسی لطیفہ غیبی کا انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن بابر نے ایک پُر جوش اور دولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ اطراف و اکناف کے مسلمان بادشاہ ہم پر اظہار نفرت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ جو انہری کا تقاضا ہے کہ ہم شہادت کے لیے تیار ہو جائیں اور جان توڑ کر لڑیں۔

بچوں جاں آخر از تن ضرورت دہو ہماں بہ کہ بارے بعزت رود
سرا انجام گیتی ہمیں است و پس کھ نامے پس از مرگ ماند ز کس
بابر کی اس تقریر سے بڑا جوش پیدا ہوا۔ سب الجہاد الجہاد کا نعرہ لگایا۔

اور قسمیں کھائیں کہ ہم میدانِ غزاسے مُنہ نہیں موڑیں گے۔ مر گئے تو شہید اور کلمیاب ہوئے تو غازی۔ بابر نے بھی جو شراب کا بڑا دلدادہ تھا۔ شراب نوشی اور دوسرے غیر مشروع احکام حتیٰ کہ ریش تراشی سے توبہ کی اور خدا سے عزوجل کی بارگاہ میں دعا کر کے میدانِ جنگ میں آگے بڑھا۔ معرکہ سارادن جاری رہا۔ راجپوت جانتے تھے کہ اس لڑائی سے شمالی ہند کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ جان توڑ کر لڑے لیکن فتح آخر کار بابر کی ہوئی۔ فتح بادشاہ اسلام لڑائی کی تاریخ ہوئی اور اس کے بعد بابر نے غازی کا لقب اختیار کیا۔

سیکری کی لڑائی میں جو راجپوت راجے رانا ساٹنگا کی مدد کو آئے تھے ان میں چندیری کاراجا میدتی رائے بھی تھا۔ رانا ساٹنگا کو شکست دینے کے کچھ عرصہ بعد بابر نے چندیری کا رخ کیا اور اسے فتح کر کے قدیمی قلعہ دار احمد شاہ بن ناصر الدین مندوی کے سپرد کیا۔ بابر نے جب یہ علاقہ فتح کر کے چندیری۔ سارنگپور اور رنچنبور کی مسجدیں اور خانقاہیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ رائے سین نے جو مالوہ کا بااختیار وزیر تھا، انھیں رانا ساٹنگا اور میدتی رائے کے حکم سے حیوانات کا مسکن بنا کر فضلہ گاؤں سے روپ رکھا ہے شیخ زہین الدین صدر کی کوشش سے یہ کثافت اور غلاطت دُور ہوئی اور مؤذن اور جازوب کش مقرر ہو کر پھر ان مسجدوں میں آوازِ اذان بلند ہونی شروع ہوئی۔

مغلیہ خاندان کے بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا کیے ہیں لیکن بابر کی شخصیت میں ایک خاص دلکشی ہے۔ اس کی ذات اسلامی تمدن کی اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے کہ ہندوؤں کے برعکس جن میں کشتری فنونِ جنگ میں اور بہمن علم و ادب میں کمال حاصل کرتے ہیں، اسلامی طرزِ معیشت میں ایک ہی شخص بیک وقت صاحبِ سیف و قلم ہو سکتا ہے۔ بابر فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی نگہی ہوئی تزکِ بابر اپنی قسم کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے۔ اس میں لغاطی نہیں۔ خلوص ہے۔ اور سنی سنانی باتیں نہیں۔ آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ

کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے۔ مناظرِ فطرت۔ درختوں اور پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی، اس کا تفصیلی اظہار ہے اور ترکستان۔ افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑے پتے کی اور پُر مغز باتیں درج ہیں۔ تو زکِ بابر کی تصنیف کے علاوہ بابر خطِ بابوی کا مُوجد تھا اور اس طرزِ تحریر میں اُس نے کلامِ مجید کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھجوائے۔ اسے ہندوستان میں بہت عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا لیکن اپنی فطری ذہانت سے اس نے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں اور اُس نے ہمایوں کے لیے جو وصیت لکھی اُس سے اس کی سمجھ۔ انصاف پسندی اور مدبرانہ قابلیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”فرزندِ من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بلا شہ کا میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:-

- (۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رور حایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا (۲) گادکشی سے بالخصوص پرہیز کرنا کہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکر کے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔
- (۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب پر پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے
- (۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی (۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا (۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔

سے ترجمہ از اندرین اسلام [ثانی ٹس] اس وصیت کی ایک نقل اسٹیٹ لائبریری بمبئی میں ہے۔

جس کا مقصد نہایت نیک تھا۔ یعنی تجدیدِ دین اور احیائے ملت اور اس نے بعض مخلص اور قابل افراد کو متاثر کیا۔ لیکن اس قسم کی بہت سی دوسری کوششوں کی طرح یہ تحریک بھی بہت جلد بانی تحریک کے شخصی دعویوں، جمہوریت کی مخالفت اور صلاح کے چند نہایت خاص طریقوں تک محدود ہو گئی۔

اس تحریک کے بانی سید محمد جوہر پوریؒ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ دوست دشمن گواہ ہیں کہ وہ ظاہری اور باطنی علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے مرشد شیخ دانیال چشتی جوہر پوری اور دوسرے علماء جوہر پور نے آپ کو نوجوانی میں ہی اسد العلماء کا خطاب دے رکھا تھا۔ جوہر کا آخری بادشاہ سلطان حسین شرتی جوہر ۱۲۵۸ھ میں تخت نشین ہوا اور ۱۲۸۶ھ میں بہلول لودھی کے ہاتھوں تاج و تخت کھو بیٹھا اور بنگال میں پناہ گزیں ہو کر ۱۲۹۹ھ میں فوت ہوا، اس وقت جوہر کے تخت پر قابض تھا۔ مہدویوں کی روایت ہے کہ وہ راؤ دلپت رائے والی گوڑ کا خراج گزار تھا اور سید محمد نے اُسے وعظ و نصیحت سے ایک غیر مسلم کو خراج دینے سے باز رکھا اور اس سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے سلطان کی مدد سے پندرہ سو جوان بھائی ملازم رکھے۔ جب ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن سید محمد جوہر پوری اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈٹے رہے بلکہ انھوں نے آگے بڑھ کر خود دلپت رائے کو تہ تیغ کیا اور شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔

مہدوی روایت ہے کہ جب آپ نے راجا پرزور کا دار کیا اور تلواریں سر کاٹتی ہوئی سینہ تک جا پہنچی تو دلپت رائے کا دل باہر نکل پڑا۔ آپ نے دیکھا

۱۲۸۶ھ یہ گوڑ اسلامی بنگال کا قدیمی دار الخلافہ تھا۔ وہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں تھا مولوی ابو ظفر مہدوی کا خیال ہے کہ ترمہٹ کے زمیندار (یاراجا) سے حسین شاہ کی جنگ ہوئی تھی کیونکہ اس نے جوہر کا خراج نہیں ادا کیا تھا اور اس جنگ میں اسد العلماء نے نظر ثواب جہاد میں شریک ہوئے۔

بابر نے ۱۵۲۰ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی تیس سال کا نوجوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل۔ شیر شاہ نے اسے شکست دے کر ۱۵۴۰ء میں ایران کی طرف بھاگا دیا اور خاندانِ سوری کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پندرہ سال برقرار رہا۔

شیر شاہ اور خاندانِ سوری | شیر شاہ جس نے پانچ سال تک تختِ دہلی پر حکومت کی ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ اس نے جوہر کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی۔ سکندر نامہ۔ گلستان۔ بورتان وغیرہ اسے زبانِ یاد تھیں۔ فلسفے سے بھی واقف تھا اور عربی میں کافیہ۔ شرح کافیہ مصنفہ تاضی شہاب الدین پڑھ چکا تھا۔ وہ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق تھا اور علماء و فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ علم و فضل سے دلچسپی کے علاوہ بڑا منتظم اور قابل حاکم تھا اور اسی قابلیت کے زور سے ایک معمولی جاگیر دار کے عہدے سے ترقی کرتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

بدقسمتی سے اسے تختِ دہلی پر فقط پانچ سال بیٹھنا نصیب ہوا۔ اس عرصے میں بھی اسے لڑائیوں سے فرصت نہ ملی لیکن اس تھوڑی سی مدت ہی میں اس نے انتظامِ سلطنت میں نمایاں صلاحیں کیں جنھیں شمالی ہندوستان میں اکبر اور دکن میں اورنگ زیب وسعت دے کر ملک کی خوشحالی کا انتظام کیا۔ عہدِ مغلیہ کے مورخین نے عام طور پر شیر شاہ سے انصاف نہیں کیا لیکن پھر بھی جو حالات ہم تک پہنچتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ بڑا بیدار، مغرور بادشاہ تھا اور اگر موت اُسے کچھ مہلت دیتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

شیر شاہ ۱۵۴۵ء میں کالجیہ کا محاصرہ کرتا ہوا مارا گیا اور اس کی جگہ اسلام شاہ سوری تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ مختلف جھگڑوں میں گزرا۔ اور جب ۱۵۵۳ء میں وہ مر گیا تو مغلوں نے اس کے جانشین سے تختِ دہلی چھین لیا اور ۱۵۵۵ء میں ہمایوں پھو دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔

مہدوی تحریک | اس زمانے میں اضلاع پورب میں ایک تحریک شروع ہوئی۔

لے آج کل کی مادی دُنیا اس روایت کو شاید ہی تسلیم کرے لیکن ان قدیم ہندوی روایات اور
پندرہ سویراگیوں کی شیخ محمد زین الدین کی فوج میں شمولیت سے شیخ کے ہندو ماحول کا کچھ اندازہ
ہو جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ شیخ چلتا پھرتا کی طرح سے باغیچوں اور انھیں خیال آیا ہو کہ اگر مسیحا باطل
کے لیے یہ کچھ کیا جاسکتا ہے تو مسیحا حقیقی کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے !

مولوی ابو ظفر ندوی کا خیال ہے کہ آپ نے ہمدی موعود ہونے کا اعلان پہلی مرتبہ برآکی میں (منہر الہیٹن کے قریب) کیا اور اس سے پہلے دعووں کی روایات خلاف قیاس ہیں۔

مہدویہ جماعت کی ایک خصوصیت تو سید محمد جوہنوری کے دعادی پر ایمان ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں انہیں نمایاں کرتی ہیں۔ ”مہدیوں کا عقیدہ ہے کہ فرائض و واجبات قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں، جن کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ لسان شریعت مفصل بیان فرمادیا۔ دوسری قسم میں وہ احکام ہیں، جن کا تعلق خاص ولایت محمدیہ سے ہے۔ اب مشیت الہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی بھی تبلیغ ہو جائے۔ لہذا حضرت سید محمد ہمدی موعود مبعوث ہوئے جو دافع ہلاکت امت محمدیہ اور ناصر شریعت محمدی و مبلغ احکام ولایت محمدی ہیں۔ مقام ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکان دین کا درجہ رکھتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں:-

(۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزت از خلق (۴) توکل (۵)
طلب دیدار خدا (۶) عشر (۷) ذکر کثیر (۸) هجرت

ان اصولوں کی پیروی نے مہدویوں کی عملی زندگی کو ایک خاص رنگ دے دیا تھا اور انہی کی وجہ سے (جیسا کہ باقی طریقہ کی زندگی میں ہوا اور شیخ علانی نے اسلام شاہ سوری کے عہد میں دیکھا) مہدویوں کی حکومت وقت سے بسا اوقات کشمکش ہوئی۔ شروع شروع میں یہ تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے۔ لیکن شیخ علی متقی کی علمی مخالفت اور محمد الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھیلنے پھولنے نہ دیا۔ گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہو گئی۔ احمد نگر میں جہاں جمال خاں مہدوی نظام شاہی افواج کا ایک بااثر سپہ سالار تھا، اس فرقے کو ایک زمانے میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ جمال خاں نے اپنے ہم مشرب مہدویوں کو ذکر و فکر کے اشغال سے ہٹا کر سیاسیات اور عسکری زندگی کی طرف مائل کیا۔ اسی کے زیر اثر نظام شاہی خاندان کے بیٹے بادشاہ اسماعیل بن برہان نظام شاہ ثانی نے مہدوی عقائد اختیار کر لیے لیکن تخت نشینی کے دو ہی سال بعد وہ ۱۵۹۷ء میں مارا گیا اور احمد نگر میں پھر اثنا عشری شیعہ اثرات غالب آ گئے۔ اس کے بعد بھی مہدویوں نے دکن کی عسکری اور سیاسی زندگی میں حصہ لیا۔ مہدوی سپاہی اور افسر بہادر اور وفادار، لیکن دوسرے تجدیدی گروہوں کی طرح جوشیلے اور سرسبز غضب ہوتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی لکھتے ہیں: "شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ ایک مہدوی سردار مع اپنی جماعت کے متعین تھا۔ کسی منہبی بحث کی بنا پر آپس میں فساد ہو گیا اور آخر شہزادہ کی فوج کے ہاتھ سے مع اپنے متبعین کی فوج کے مارا گیا۔ سلطان ٹیمپو کے پاس بہت سے مہدوی افغان ملازم تھے۔ ایک بلوچ حکمی کی بنا پر کئی سو مارے گئے اور باقی کا اخراج کر دیا گیا۔ سردار نمڑے زئی مہدوی ملازم باجی راؤ والی پونا نے اپنے آقا کی ممانعت کے باوجود انگریزی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ جس سے باجی راؤ کا علاقہ ضبط ہو گیا اور باجی راؤ کو گرفتار کر کے بھٹور پہنچا دیا گیا۔"

راجا چند لال کے دور میں حیدر آباد مہدوی گروہ کا مرکز بن گیا۔ وہ دس

بارہ ہزار کی تعداد میں بمشابرہ پیش قرار ملازم رکھ لیے گئے۔ اور اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ بے باکانہ مذہبی جینشن شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ ۱۷۳۳ء میں مولوی عبد الکریم کو مذہبی بحث کی بنا پر میر عالم بہادر کی مسجد میں قتل کر دیا۔ جس پر شہر میں فساد ہو گیا اور بہت سے سنی اور مہدوی مارے گئے۔ نواب سکندر جاہ نے انگریزی فوج کی امداد سے ان کو ملک سے نکالا۔

دورِ حاضر کے سب سے مشہور مہدوی نواب بہادر یار جنگ تھے، جنہیں مہدویوں ہی میں نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں بھی بڑا اثر حاصل تھا۔ وہ جذباتی خطابت کے بادشاہ تھے۔ مہدوی مشاہیر میں سے شیخ علانی کا ذکر ہم خاندان سور کی تاریخ کے ضمن میں کریں گے۔ لیکن دسویں صدی ہجری میں مہدویت کی اہمیت فقط مہدوی اکابر کے ناموں سے جا بچی نہیں جاسکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہدوی جو پوری کا نام تمام برصغیر میں گونج رہا تھا اور تمام اہل الرائے یا اس کے شدت سے مخالف تھے یا معتقد کئی لوگ تھے جو مہدوی عقیدہ اختیار کیے بغیر حیاے دین کی اس فضا سے متاثر ہوئے جو اس تحریک نے پیدا کی۔ بہت سے ایک مدت تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔ مثلاً فیضی والو الفضل کے والد شیخ مبارک۔ بلکہ شیخ علی متقی جنہوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر راسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرجوشی دکھائی۔ بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انہوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس مدلل کتابیں لکھیں۔

مہدویت کی تنظیم و اشاعت کا بڑا ذریعہ ان کے "دارے" تھے جو مختلف مقامات پر

۱۷۹۲ء کے بعد کا ایک واقعہ ۱۷۹۲ء میں ہوا۔ جب حیدر آباد کے ایک مشہور فاضل اور نظام سابق میر محبوب علی خاں کے استاد مولوی زمان خان شاہجہان پوری کو ہدیہ مہدویت کی تالیف کی بنا پر ایک مہدوی نے مسجد میں شہید کیا (تذکرہ علماء ہند ص ۱۸۹)

قائم ہوئے۔ ان میں یہ لوگ مل کے رہتے۔ جو کچھ ایک کے پاس ہوتا، سب میں برابر برابر بانٹ دیا جاتا۔ شرع کی سختی سے پابندی ہوتی۔ سب مل کر ذکر میں شریک ہوتے جس پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ جماعت کا نظام بڑا سخت تھا۔ مولوی ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں کہ جب گجرات میں یہ جماعت طاقتور ہو گئی تو اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ منکرین ہمدی کو کافر کہہ دیا۔ آخر میں جرأت اس قدر بڑھ گئی کہ جو اہل فہم اس کا انکار کرتا، اس کو قتل کر ڈالتے اور ہر ایک ان میں سے اپنی جان قربان کرنے کو مذہب کی خدمت اور کارِ ثواب سمجھتا تھا۔ سلطان محمود بن لطیف خاں (۶۴۴ھ) کے عہد میں ان کا حال بالکل اسماعیلیوں (فرقہ حسن بن صباح) کی طرح ہو گیا تھا۔ جس کے باعث گجرات میں فساد بڑھ گیا اور امن جاتا رہا۔ چنانچہ سنی حاکموں نے سختی اور حکمت عملی سے فرقے کو دبا دیا۔ اگرچہ اب بھی گجرات، بے پور، اور حیدرآباد میں یہ لوگ موجود ہیں اور کراچی میں بھی ایک "ذکری ہمدوی انجمن" ہے۔

شاہانِ سورا اور ہمدویت | سید محمد جونپوری کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی۔ لیکن ان کا اثر برقرار رہا اور کئی مشہور اور با اثر

علماء نے ہمدوی طریقہ اختیار کیا۔ ہمدویوں کی خصوصیات سید محمد کے معتقد ہونے کے علاوہ یہ تھیں کہ وہ قیامت کا ہر وقت انتظار کرتے اور دنیا کی ناپائیداری پر زور دیتے۔ ان میں سے اکثر نے اپنا مال و اسباب غریبا میں بانٹ کر بڑی توکل کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شرع کی پابندی پر بڑا زور دیتے۔ جہاں کوئی بات خلافت شرع دیکھتے اسے روک دیتے اور حکام کی ذرا پروا کرتے۔

ہمدوی طریقے کو شیخ علانی کے قبولِ ہمدویت سے بڑا فروغ ہوا۔ وہ بنگالہ کے مشہور عالم تھے۔ حج سے واپسی کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں میاں عبداللہ افغان نیازی کے زیر اثر ہمدوی طریقہ اختیار کیا۔ شیخ علانی کی زبان میں خدا نے بڑی تاثیر دی تھی۔ ان کے دوست اور مرید ہمدویت کی طرف رجوع ہو گئے اور بالآخر ہزاروں لوگوں نے یہ عقائد اختیار کر لیے۔

اس زمانے میں شیر شاہ کابلیا اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ بادشاہ تھا۔ اور اس کے دربار میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری کو اسی قسم کا رسوخ حاصل تھا۔ جو خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام کا تھا۔ یہ زمانہ سیاسی بد نظمی اور عام مذہبی انتشار کا دور تھا۔ ہر طرف نئی نئی تحریکیں شروع تھیں۔ مخدوم الملک کی مسلسل پالیسی تھی کہ اقتدار حکومت کے زور سے اور حد شرعی جاری کر کے نئے فرقوں اور غیر راسخ طریقوں کو کچل دیا جائے۔ اس نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ بہت سے لوگ شیخ علانی کے پیرو ہو گئے ہیں۔ اگر وہ بغاوت کر بیٹھا تو تدارک مشکل ہوگا۔ چنانچہ سلیم شاہ نے شیخ علانی کو بلا بھیجا۔ شیخ نے بادشاہ سے روکھا پھیکا سلوک کیا۔ دربار میں آئے تو رسوم دربار کا خیال نہ رکھا اور جب بادشاہ نے اپنے خاصے کا کھانا بھیجا تو بادشاہ کے خلاف اظہارِ ملامت کیا۔ بادشاہ کو اس رویے پر افسوس ہوا لیکن وہ خود شیخ علانی کے خلوص اور دینی جوش سے متاثر ہو چکا تھا۔ ان باتوں کو پی گیا اور ہمدوی عقائد کے متعلق شرعی فیصلہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس منعقد کی۔ اس مجلس میں دربار اور شہر کے برگزیدہ عالم جمع ہوئے۔ سید رفیع الدین محدث اور ابو فتح تھانیسری کے علاوہ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک بھی بلائے گئے۔ شیخ مبارک نے شیخ علانی کی طرفداری کی۔ اس مجلس کے مباحثے کئی روز تک جاری رہے لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے شیخ سے عقیدہ ہمدویہ ترک کرنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر تم یہ عقیدہ ترک کر دو تو تمہیں اپنی کل مملکت کا محتسب بنانا ہوں۔ اب تک تم میرے اذن کے بغیر امر معروف کرتے رہے ہو پھر میری طرف سے اختیار لے کر کرنا۔ شیخ کے لیے اپنی اصلاحیں جاری کرنے کا یہ بڑا شاندار موقع تھا۔ لیکن پرجوش تجدیدی اور احيائی طبیعتوں کو اصلاح کے عام عملی طریقے پسند نہیں آتے۔ اس نے بادشاہ کی تجویز قبول نہ کی اور بادشاہ نے اسے سرحد کن کی طرف ملک بدر کیا۔ وہاں کا حاکم شیخ کا مرید ہو گیا۔ مخدوم الملک نے پھر نئے خطرات بادشاہ کے دل میں پیدا کیے۔ مخدوم تو شیخ کے قتل کا فتویٰ دے چکا تھا۔ لیکن

بادشاہ بیت و لعل کدیا تھا۔ بالآخر بادشاہ نے شیخ غلامی کو صوبہ بہار کے ایک جلیل القدر فاضل میاں بڈھے کے پاس بھیجا تاکہ وہ شیخ کے عقائد کے متعلق تحقیق کریں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ہمدویت کے متعلق میاں بڈھے نے سلیم شاہ کو ایک خط لکھا کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ ایمان اسی پر منحصر ہو اور علامات ہمدی کے بارے میں بہت اختلاف ہے اور ان سے شیخ غلامی کے کفر یا ایمان کے متعلق فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میاں بڈھے کا یہ خط سلیم شاہ تک نہ پہنچا۔ ان کے لڑکوں نے یہ سمجھ کر کہ مخدوم الملک سے اختلاف مضرت ثابت ہوگا۔ باپ کی طرف سے بادشاہ کے نام ایک گولی مول خط لکھا کہ آج مخدوم الملک محققین میں سے ہیں جو فیصلہ وہ کریں وہی صحیح ہے۔ بادشاہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے شیخ کو مخدوم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ تو دانی و ایں۔ چنانچہ مخدوم نے شیخ کو کوڑے مروا کر شہید کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۱۵۷ھ کا ہے۔ مخدوم نے اس سے پہلے میاں عبداللہ نیازی کے خلاف بادشاہ کو اگسا کر انھیں پڑایا تھا اور یہ تشدد اس نے فقط انھیں دو بزرگوں کے خلاف روا نہیں رکھا بلکہ ہر اس شخص کے ساتھ جس کے عقائد کے متعلق اسے ذرا بھی شبہ ہوتا، یہی سلوک کیا جاتا۔ مخدوم الملک کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اس زمانے میں یہ طریق احتساب عام تھا۔ لیکن یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اکبر کو علما بلکہ اسلام سے بدظن کرنے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا جو مخدوم کے زخم خوردہ تھے۔ چاہے اسے شدت احتساب کا نتیجہ سمجھ لیں چاہے یہ خیال کریں کہ مخدوم نے ان لوگوں کے عقائد کی نسبت جو اندازہ لگایا تھا، وہ صحیح ثابت ہوا۔

ایرانی اور شیعہ اثرات ہمایوں نے ۱۵۵۷ء میں شیر شاہ سے شکست کھائی اور راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستان میں پریشان پھرتا رہا۔ یہاں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر پیدا ہوا۔ جب ہمایوں ہندوستان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی تو اس نے ایران کا رخ کیا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ صفوی اس کے ساتھ بڑے حسن سلوک سے پیش آیا اور

جب ایک عرصہ قیام کے بعد ہمایوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے فوج دی۔ جس کی مدد سے اس نے ۱۵۵۷ء میں قندھار اور ۱۵۵۸ء میں کابل فتح کر لیا۔ ۱۵۵۹ء میں ہندوستان آیا اور دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔ لیکن ابھی اپنی حکومت مستحکم کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے کتب خانے کی سرٹھیوں سے پھسلا اور گر کر مر گیا حکومت کے استحکام کا کام اکبر اور اس کے لائق اتالیق بیرم خاں کو کرنا پڑا۔ جنھوں نے عادل شاہ سور کے ہندو وزیر ہیمو بھال کو شکست دے کر خاندان سور کا خاتمہ کر دیا۔

جب ہمایوں سفر ایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بشپا ایرانی سپاہی، امراء اور علما تھے اور اس وقت سے ایران اور ہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہوا۔ جن کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات تورانی اور عرب اثرات سے بھی زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی غزنویہ خاندان کے وقت سے ہندوستانی مسلمانوں کی ادبی اور درباری زبان فارسی تھی اور ایران سے قابل اور بہادر قسمت آریا ہندوستان آتے رہتے تھے لیکن ہمایوں کے بعد یہ سلسلہ بہت وسیع ہو گیا۔ ایران کے بڑے بڑے شاعر مثلاً عرفی۔ نظیر جی۔ مشہور مصور مثلاً خواجہ عبدالصمد۔ میر علی فرخ اور قابل مدبر مثلاً علی مردان۔ آصف خان وغیرہ ہمایوں کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور علوم و فنون کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ بنابرین مآثر رحیمی کا مصنف ایران کو دبستان ہند کہتا ہے۔ مغلہ حکومت کے استحکام اور قرار میں بھی ایرانی فہانت اور تدبیر کو بڑا دخل تھا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ ہمایوں ایران جا کر شیعہ ہو گیا تھا اور اسے شاہ ایران سے مدد اس وعدہ پر ملی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں شیعہ عقائد کی ترویج کرے گا۔ یہ تو غالباً غلط ہے لیکن اتنا قرین قیاس ہے کہ ہمایوں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا اور ذیل کی رباعی اس سے منسوب کی جاتی ہے۔

ہستیم ز جاں بندہ اولاد علی ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں سر ولایت ز علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ در دِ خود ناد علی
اس کے علاوہ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمال کا زیادہ عمل دخل ہو گیا
اور انھیں اپنے مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی۔ ہمالیوں کا وزیر بابتدیر بیرم خاں
خود شیعہ تھا اور شیخ گدائی جنھیں عہد اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ ملا۔
شیعہ عقائد کے تھے۔ حضرت علیؑ کی تعریف میں بیرم خاں کا ایک پُر جوش قصیدہ
ناثر رحیمی میں نقل ہوا ہے، جس کا مطلع ہے۔

شعہ کہ بگزرد از نہ سپہ افرو اگر غلام علی نیست خاک بر سر او!
لیکن عام طور پر ملکی، معاشرتی اور مذہبی معاملات میں بیرم خاں اس قدر
مخاطب اور منجانب مرغ تھا کہ اگرچہ شیخ گدائی کی تعیناتی کو کوئی تورانی امراء نے
ناپسند کیا لیکن مذہبی حلقوں میں اس کے خلاف شکایت کا ایک حرف نہیں ملتا۔
ملا عبد القادر بدایونی جیسا بزرگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور شیخ
عبدالحق محدث اس کی نسبت لکھتے ہیں:-

خانخانان محمد بیرم خاں کہ باوجود علو منصب و جاہ و جلال زیادہ از ہرچ تصور توان
نمود۔ بسوگ طریقہ درویشان و اعتقاد محبت ایشان جو در تواضع و رعایت طریقہ تعظیم
الامر اللہ و الشفقت علی خلق اللہ اتصافے کامل و توفیقے شامل داشت و مصدق عاش
سجد اوقات شہید بود۔

ہمالیوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانے میں آئی،
جب وہاں شاہ اسماعیل ثانی نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا
اور اُسکی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران میں برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابر پر سختی شروع
ہوئی۔ شیعہ حضرات کی آمد کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا اور شمالی ہند میں بھی شیعوں کی محقول
تعداد ہو گئی۔ حتیٰ کہ ایک انگریز اہل قلم کے اندازے کے مطابق اورنگ زیب کے امراء
میں اکثریت شیعوں کی تھی۔ ایرانی النسل افراد کے علاوہ سادات بارہہ شیعہ تھے۔

ۛ Holak

اٹھارھویں صدی میں او دھ۔ مرشد آباد وغیرہ میں شیعہ ریاستوں کا قیام بعض اوقات
سیاسی اور مذہبی پیچیدگیوں کا باعث ہوا ہے، لیکن عام طور پر شیعوں نے قی مفاد کو
مذہب نظر رکھا اور اپنی ذہانت، بلند نظری اور قابلیت سے ہماری تمدنی اور ادبی تاریخ
میں کئی رنگین باب اضافہ کیے۔ اہل سنت حضرات نے بھی بالعموم ان سے دوستی اور
رواداری کا سلوک کیا ہے اور غالب کو اردو کا بہترین شاعر۔ آزاد کو اردو کا بہترین
نثر نگار اور رائٹ آرمیل سید امیر علی کو اسلام کا بلا و مغرب میں بہترین ترجمان سمجھتے
وقت کسی کو ایک لمحہ کے لیے خیال نہیں آتا کہ وہ شیعہ تھے یا سنی!

اسلامی ہند کی تاریخ میں شیعہ اور سنی شخصیتوں کو علیحدہ کرنا بڑا مشکل ہے۔
کیونکہ ایک تو بعض شیعہ حضرات افشاے مذہب کے معاملے میں تقیہ اور احتیاط کے
قائل ہیں۔ دوسرے پاکستانی ہندوستانی اہل سنت والجماعت میں بھی تفصیلیوں کی
کوئی کمی نہیں۔ چنانچہ متعدد ممتاز ہستیوں مثلاً میر سید علی ہمدانی، خواجہ محمود گادوان
اور حضرت گیسو دراز کی نسبت اختلاف ہے کہ وہ شیعہ تھے یا سنی۔ عام طور پر اب
مذہبی عقائد کی یہ حالت ہے کہ کسی بحث کے وقت یا ضد اور سینہ زوری کی وجہ سے
کوئی اختلاف ظاہر ہو تو ہر دو نے عموماً شیعہ و سنی شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں اور انھیں
ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہے۔

شہطاری سلسلہ | عہد وسطیٰ میں شہطاریہ طریق تصوف نے فروغ حاصل کیا۔
اسے شیخ بایزید بسطامیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ
اپنے آپ کو شہطاری اس لیے کہتے ہیں کہ سلوک اور طریقت میں وہ دوسرے سلسلوں
کے بزرگوں سے زیادہ تیز اور سرگرم (شہطار) ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگلوں میں رہ کر
سخت ریاضتیں کرتے تھے اور ان سے غیر معمولی افعال و تصرفات منسوب کیے
جاتے تھے۔ شمالی بہار میں جہاں شہطاری سلسلے نے پہلے قدم جمائے، اس میں
اور مدار یہ طریقہ میں کئی مقامی چیزیں داخل ہو گئیں۔ سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں
جس بزرگ نے یہ طریقہ جاری کیا، شیخ عبد اللہ شہطاری تھے، جو مرشد کے ایما پر

ایران سے ہندوستان وارد ہوئے۔ شطاری روایات کے مطابق وہ پانچ واسطوں سے حضرت شہاب الدین سہروردی کی اولاد اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامی کے مرید تھے۔ ہندوستان آکر انھوں نے کچھ وقت دیارِ پُرب میں گزارا۔ نیکپور میں شیخ حسام الدین مانکیپوری سے ملاقاتیں کیں۔ پھر جنپور گئے لیکن سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے متشرع اراکین سے ان کی نہ بنی۔ پھر وہ مالوہ گئے۔ جہاں انھوں نے بڑا فروغ پایا اور ظاہری اور باطنی شان و شوکت حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص ان کے پاس مرید ہونے کے لیے آتا تو وہ اسے کھانا اور سالن کھانے کو دیتے اور دیکھتے رہتے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا ہے یا کوئی چیز بچ جاتی ہے۔ اگر دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا تو اسے سمجھ دار اور قابلِ اعتماد انسان سمجھ کر شغلِ باطنی تعلیم کرتے اور اگر دونوں کو برابر برابر ختم نہ کرتا تو سمجھتے کہ اسے اپنے اوپر مضبوط نہیں اور چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں لگاتا۔ پھر اس سے فقط ظاہری باتیں کرتے۔ آپ کے طریقِ کار میں لوگوں کو مرغوب و متاثر کرنے والی کئی باتیں تھیں۔ مشہور ہے کہ آپ نقارہ بجواتے اور اعلان کرتے کہ ہے کوئی خدا کا طالب، جسے ہم راہِ خدا دکھائیں۔ "سطوت شوکت ظاہر" بھی حاصل تھی۔ بڑی شان سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے۔ نقارہ بجواتے۔ علم اٹھواتے۔ خود سلطانی لباس اور ہمراہی صوفی فوجی وردی پہنتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو ہر طرف نگاہ دوڑاتے اور کہتے کہ کیا یہاں کوئی تختہ سیاہ یعنی بے اعتقاد اور شکی مزاج طالب علم ہے۔ بعض لوگ تو ان طریقوں کو ناپسند کرتے لیکن بعض پر ان کا بڑا اثر ہوتا۔ مشہور ہے کہ جب بہار میں پنجے تو حسب معمول شیخ محمد علا کو جواب شیخ قاضی شطاری کے نام سے مشہور ہیں، پیغام بھیجا کہ اس درویش نے اس خیال سے سیاحی اختیار کی ہے کہ اگر کچھ توحید کے معنی کوئی اس سے بہتر جانتا ہو تو وہ مسافر کو تعلیم دے اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو بے مشقت وہ گنج توحید مسافر سے حاصل کرے۔ شیخ محمد علا نے جواب دیا کہ ایسے فضول گو اشخاص خراسان اور ایران سے بہت آتے ہیں۔ شاہ صاحب نے

من کر فرمایا کہ شیخ محمد علا کے کمالات کا ظہور مجھ ہی فضول گو کی تلقین پر منحصر ہے۔ گلزارِ ابرار میں غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ اس کے بعد شاہ عبداللہ تو مانڈو کی طرف روانہ ہو گئے لیکن شیخ محمد علا کو خواب میں اشارہ ہوا کہ تمھاری گرہ کشائی شاہ عبداللہ سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ وطن چھوڑ کر مانڈو روانہ ہوئے۔ شاہ صاحب کے دروازے پر تین روز کھڑے رہے۔ چوتھے روز وہ باہر تشریف لائے۔ سرزنش کی۔ امتحان لیا اور بالآخر خلعتِ خلافت سے سرفراز کر کے واپس روانہ کیا۔

شاہ عبداللہ شطاری کی وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی۔ مزار مالوہ کے سابق دار الخلافہ مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے۔ ان کے خلیفہ اعظم شیخ محمد علا المعروف شیخ محمد قاضی شطاری تھے۔ مرشد سے خرقہ و خلافت پانے کے بعد انھوں نے عمر کے باقی میں سال ارشاد و ہدایت میں صرف کیے۔ آپ کی مساعی کا بڑا مرکز صلیح مظفر پور (بہار) کا جنوبی حصہ تھا اور وہ ایک قدیمی ہندو مرکز کے قریب بسرِ مہاراجہ میں مدفون ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے مخدوم منصور حلاج شہید کا مزار بھی یہیں ہے۔ وہ ایک مسجد کی تعمیر کے وقت مقامی قبائل کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ دوسرے بیٹے عبدالرحمن شطاری تھے۔ تیسرے بیٹے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست شطاری کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے۔ ان کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید حضور گواسلری (وفات ۸۵۳ھ) بہار کے مقامِ رتن سرا میں دفن ہیں۔ شیخ ظہور نے دو چھوٹے بچوں کو پالا۔ ان کے نام تو شیخ فرید الدین جہانگیری اور شیخ خلیل الدین تھے۔ لیکن تاریخ میں وہ بالترتیب شیخ بہلول یا شیخ پھول اور شیخ محمد غوث گوالیاری کے نام سے مشہور ہیں۔

اس سلسلے کے دو اور بزرگوں شیخ بہاء الدین شطاری اور شیخ بدھن شطاری جنپوری کا ذکر اخبارِ الاخیار میں ملتا ہے۔ مؤخر الذکر نے شاہ عبداللہ شطاری کے ایک خلیفہ سے ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی اور سکندر لودھی کے زمانے میں شطاریہ سلسلے کی اشاعت کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چچا شیخ رزق اللہ مشائی (مصنفِ جامعہ شائقی

نے انھیں سے شطاری اعمال و وظائف سیکھے۔ لیکن شطاری سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد غوث گوالیاری کو ہوئی۔ وہ شیخ فرید الدین عطار کی نسل سے تھے۔ شیخ ظہور حاجی حمید نے آپ اور آپ کے بھائی کو فرزندوں میں لیا اور سلوک و باطن کی پوری تعلیم دی۔ نامور خانوادوں کے مشائخ جو کمالات اور حالات رکھتے ہیں ان کے اطوار اور اسرار۔ بالخصوص شطاریہ مشرب کی رفتار۔ دعوت کافن۔ افکار کی طرز اور اشغال و تصورات کی سندیں۔ غرض کہ کل چیزیں دو سال کے اندر تعلیم و تلقین فرمادیں۔ مزید فیضان کے لیے انھیں کوہ چنار کے جنگلات میں روانہ کیا۔ جہاں شیخ محمد غوث گوالیاری نے تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کیں اور درختوں کے پتے کھا کر یاد الہی کی۔ گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ہمایوں شیخ ابوالفتح سرمست شطاری کا معتقد تھا۔ شیخ بہلول سے اس کے اعتقاد و ارتباط کی کتب تاریخ سے بھی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ شیخ سے سیاسی معاملات میں مدد لیتا تھا اور اس لیے مرزا ہندال نے انھیں شہید کرادیا۔ (۳۸)۔

بدایونی ہمایوں کے ان دو بھائیوں سے تعلقات کی نسبت کہتا ہے :-
 ”وہمایوں پادشاہ را بہ ہر دو ایں بزرگوار نسبت عقیدہ و اخلاص بکمال بود۔
 چنانچہ بہ کم کسے دیگر آں جہت داشتہ باشند و طری دعوت اسمائیں اعزہ یاد
 مے گرفتہ۔“

شیخ محمد غوث گوالیاری نے شروع سے ہی مغل بادشاہوں سے روابط قائم کر لیے تھے۔ جب بابر بادشاہ نے قلعہ گوالیار فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی تو شیخ ان دلوں قلعہ کے اندر تھے۔ انھوں نے مغل حملہ آوروں کو ایک ترکیب بتائی جس سے قلعہ آسانی سے فتح ہو گیا۔ مغل سرداروں نے شیخ کے مشورے پر تانار خاں والی قلعہ سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ چند خدمت گاروں کے ساتھ قلعہ کے اندر رات گزاریں۔ تانار خاں اس سے پہلے اطراف کے بعض سرداروں کے خلاف بابر سے مدد مانگ چکا تھا۔ اس نے نتائج کا صحیح اندازہ کیے بغیر اس کی

اجازت دے دی اور خود مزے سے لمبی تان کر سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بہت مغل سپاہی خدمت گار بن کر قلعہ کے اندر آ چکے ہیں۔ قلعہ کے دربان شیخ کے مرید تھے۔ انھیں بھی شیخ کا حکم پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ تانار خاں نے دیکھا کہ اب قلعہ مغلوں سے نہیں بچایا جاسکتا۔ ناچار اس نے قلعہ کو ان کے حوالے کیا اور خود بابر کی اطاعت اختیار کر لی۔

بابر کے ساتھ شیخ محمد غوث کے تعلقات تو استوار ہو ہی گئے تھے اور ہمایوں بھی ان کا معتقد تھا لیکن اب شیر شاہ کا دور دورہ تھا۔ وہ شیخ کے در پے ہوا۔ چنانچہ شیخ اہل و عیال۔ مریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے۔ قریباً اٹھارہ سال اس علاقے میں گزارے۔ کچھ وقت چانپانیر اور بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد صرف کیا۔ وہاں بھی انھوں نے بڑا اقتدار حاصل کیا۔ لیکن شیخ علی متقی نے جو بڑے پایہ کے عالم تھے، ان کی بعض تصانیف کی بنا پر ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ بادشاہ وقت سلطان محمود گجراتی نے ایک دوسرے عالم شیخ وجہیہ الدین سے استصواب کیا لیکن وہ شیخ کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود ان کی بیعت کر لی اور شیخ علی متقی کے فتوے کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس سے عوام کی نظروں میں شیخ کا اثر اور بھی بڑھ گیا اور کسی لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ لیکن اب ایرانی فوج کی مدد سے پھر ہندوستان میں مغل حکومت قائم ہو گئی تھی۔ شیخ نے مغل دربار کا رُخ کیا۔ ہمایوں اس زمانے میں وفات پا چکا تھا اور اکبر اس کا جانشین تھا۔ امور ملکی بیرم خاں کے سپرد تھے اور عہد اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی شیخ کے خلاف تھا۔ جب وہ اگرہ پہنچے تو اس نے بیرم خاں کے کان بھرے کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو بڑے پیغمبروں سے فضیلت دی ہے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ یہ کہاں تک جائز ہے۔ چنانچہ علماء و مشائخ کے جلسے ہوئے۔ جن میں اس رسالے پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراض کئے گئے۔ آخر شیخ آزرہ دل ہو کر گوالیار چلے گئے۔

دربار بکری میں شیخ کی حسب توقع قدردانی نہ ہوئی پھر بھی خاندانی تعلقات کو
تو نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے گراں بہا جاگیر مقرر ہو گئی۔ تاثر الامرا میں لکھا ہے :-
”گویند از جناب مرثی آشیانی یک کور در دم و طیفہ مقرر بود“۔ پھر خود ہی کہتا ہے :-
”مد ذیقرۃ الخواتین آوردہ کہ شیخ نہ لک رہا نہ دیا نہ لکشت و چہ فی ذلک دفعہ او سے رفت“
شیخ نے اس روپے سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ جہاں
سماع و سرود اور وجد کا شغل رہتا۔ شیخ خود بھی معرفت کے گیت بجاتے اور گزواتے
تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ رسالہ معراجیہ کے علاوہ جواہر خمسہ -
کلید مخازن - کنز الوجدہ - ضمائر و بصائر آپ سے یادگار ہیں۔ بحر الحیوۃ میں ہندو
یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے بحر الحیوۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار
و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف جواہر خمسہ میں بھی ان کی
ایک آدھ جھلک دکھائی۔ اس سے شطاریہ طریقے کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی
ہے جو اس کا ہندو لوگ سے تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں مشرقی ہندوستان کے ہندوؤں
میں دو تحریکوں نے جنم لیا (۱) ویشنو مت میں چیتنیا کی احیاء مذہب کی تحریک
نے جس کا اگر ابتدائی ردِ کمال جو پور سے اٹھنے والی ہندو تحریک تھی تو آخری جواب
حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات تھیں (۲) شیو مت والوں میں تترک طریقوں نے
زور پکڑا۔ جس کی بنیادی سطح پر خلافِ اخلاق مظاہرے اور آئین و رواج سے آزادی
تھی اور اس سے بالا روحانی سطح پر ریاضتوں اور یوگ سے غماضِ فطرت کو تسخیر کرنے
کے ارمان تھے۔ عجب نہیں کہ اس تحریک کی بے آئینی نے مدلی فرقے کو متاثر کیا ہو
اور روحانی سطح پر تسخیرِ فطرت کے نیم روحانی طریقے انہی اثرات سے شطاری سلسلے
میں آگئے ہوں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور
۱۰ مرتبہ کنڈکار ترمیم ہے۔

گوالیار میں اپنے عالی شان روضے میں دفن ہوئے۔ شیخ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔
”تہ سماع و سرود و وجد... اشتغال داشت و خود راں ولادی تصنیف سے کردہ“۔ اور یہ
ایک اتفاقی امر نہیں کہ ہندوستان کا سب سے بڑا گوتان سین کنج روضے کے احاطہ میں دفن ہے۔
شیخ محمد غوث گوالیاری سے شطاری طریقے کو بڑی وسعت ہوئی۔ ان کے ایک
عالم مرید شاہ وجیہ الدین احمد آبادی تھے جن کے ایک شاگرد شیخ نصیحت اللہ بھڑوچی
نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر اس طریقے کو عالم اسلام میں پھیلا دیا۔ ہم ان کا ذکر آئندہ
صفحات میں کریں گے۔

مغلیہ حکومت کے استحکام کے ساتھ اسلامی علوم کی جو اشاعت ہوئی اور نقشبندیہ
طریقے اور شیخ عبدالحق محدث جیسے بزرگوں نے پابندیِ شرع پر جو زور دیا۔ اس نے
شطاری سلسلے کی مقبولیت پر اثر ڈالا۔ لیکن سولھویں صدی میں ہندوستان بالخصوص
بنگال - بہار - مالوہ اور گجرات میں اس طریقے کی اہمیت باقی مشہور قدیمی سلسلوں
سے کم نہ تھی۔ اس نے غوثی مندوی جیسے باخیر اور متوازن الطبع تذکرہ نگار اور شیخ
عبدالنبی شطاری اکبر آبادی (وفات ۱۰۱۱ھ) جیسے فاضل پیدا کیے۔ جن کی پیاس سے
زاید کتابوں کی فہرست تذکرہ علماء ہند میں درج ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے
کہ امام الہند شاہ ولی اللہ اور ان کے محبوب استاد شیخ ابوطاہر مدنی نے شطاریہ اعمال
و اشغال سیکھے تھے۔

اس زمانے میں ایک اور سلسلے نے اہمیت حاصل کی جو اپنی
سلسلہ مداریس | بے قاعدگیوں کی وجہ سے فقہ حضرات کو ناگوار تھا۔ نین ان پڑھ
عوام میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اس کا انتساب شاہ بدیع الدین مدار سے کیا جاتا ہے
جو فوارح قنوج میں موضع مکن پور میں مدفون ہیں۔ اخبار الاخبار کے مطابق وہ ہرمز سے
سے کالپی آئے۔ ان کا طریقہ جذبِ خلافت کا تھا اور عوام میں ان کی بڑی شہرت
تھی۔ مشہور تھا کہ انھوں نے بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا اور جو لباس ایک
دفعہ پہنا۔ اس کے دھوئے کی ضرورت نہ پڑی۔ ان کی عمر کی نسبت عجیب عجیب
۱۰ مصنف گلزار ابرار

تھے مشہور تھے۔ کوئی دوسو کوئی تین سو بتاتا اور کہا جاتا تھا کہ صرف پانچ چھ واسطوں سے آپ کا سلسلہ رسالت تک پہنچتا ہے۔ کاپی کے حاکم قادر شاہ نے آپ کی شہرت سنی تو سوار ہو کر ملنے گیا۔ خادموں نے کہہ دیا کہ ایک جوگی آیا ہے۔ شاہ ملا اس سے باتیں کر رہے ہیں اس وقت نہیں مل سکتے اور نہ ہی ہمیں اجازت ہے کہ ان تک کسی کے آنے کی اس وقت خبر پہنچائیں۔ قادر شاہ نے حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ ہمارے شہر میں نہ رہیں اور چلے جائیں۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ چلتے وقت شاہ مدار نے بد عادی لیکن اس کا اثر مخدوم جہانیاں کے ایک مرید شیخ سراج سوختہ نے زائل کر دیا۔

// گلزار ابرار میں جو عہد جاگیر کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ مداری روایات کے مطابق آپ کا سلسلہ رسول اکرم تک صرف چار واسطوں سے پہنچتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف غوثی کا بیان ہے: ”برہنگی اور بے حجابی اس گروہ کے مشرب میں دسویں صدی کے آخری نصف میں جوش کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے ورنہ بدیع الدین شاہ مدار کے پرمعروف زمانے میں راز وحدت کے ظاہر کرنے سے نہایت روک ٹوک تھی اور ظاہر شریعت کی مخالفت سے غایت درجہ کا خوف دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ ایک ”تازہ بدعت“ یہ تھی کہ اس سلسلے میں ظاہر تجرید ضروری قرار دی گئی تھی۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے لیے صرف ستر عورت اور اسی قدر طعام کا انتظام کرتے جو اسی ایک روز کے اندر کھالیا جائے۔ باقی پوشاک اور خوراک سے دست کش رہتے۔ انتہا پسندوں نے ”مشرور ازار کو چار انگشت کی لنگوٹی سے بدل دیا“ جس سے مشکل فقط اندام نہانی چھپ سکتا ہے اور رات کے وقت پہاڑ کی طرح آگ مشتعل کی جس سے سرما کے لحاف کا کام لیا۔ صبح کو لباس کی جگہ بدن پر زاکھ مل لی۔ یہ شعار جو سراپا عار ہے، اختیار کر کے ادب کے دائرے سے نکل گئے۔ غوثی نے آپ کے آٹھ خلفاء کے نام لکھے ہیں جن میں سید حسن ہماری سب سے پہلی نسل تھے۔ باقی زیادہ تر نواح کھنڈ، قنوج، بھراچ سے تھے۔ //

روشنیہ فرقہ

ایک اور فرقہ جس کے آغاز میں شطریہ اور مداریہ سلسلوں کی طرح اس دور کے روحانی انتشار کی جھلک نظر آتی ہے۔ روشنیہ فرقہ تھا۔ جس نے افغان علاقے میں فروغ پایا اور جس کی مقبولیت میں شاید اس بے مدینی اور بلبل کو بھی دخل تھا، جو افغانوں میں اپنی حکومت کھونے پر پیدا ہوئی۔

روشنیہ سلسلہ کے بانی میاں بایزید نصاریٰ (المعروف پیر روشن یا پیر و خاں) ۱۵۲۵ء میں مشرقی پنجاب کے قدیمی شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اور اس کے ایک سال بعد بابر نے پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان میں افغان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

میاں بایزید ایک ممتاز اور اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ کوہستان (وزیرستان) میں معتبر عالم اور قاضی تھے۔ خاندان کے کچھ لوگ تو افغان علاقے میں رہتے تھے اور ایک شاخ ہندوستان میں آباد تھی۔ بایزید کے باپ اور دادا بھی اس سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے تھے اور جالندھر میں بایزید کے دادا کا ایک بھائی مقیم تھا۔ یہیں عبداللہ کی شادی ہوئی اور ۱۵۲۵ء میں بایزید پیدا ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ کوہستان چلے گئے۔ وہ بیوی کو جالندھر بھپوڑ گئے اور وہیں نان و نفقہ بھیجتے رہے۔ اگلے سال بابر کے حملے سے افغانوں کے خاندان منتشر ہو گئے اور بڑی مشکلوں اور مصیبتوں کے بعد بایزید اور اس کی والدہ بایزید کے ایک چچا کے ساتھ کانی گرام عبداللہ کے

۱۵ یہ اندراج ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب سے ماخوذ ہے۔ اور انھوں نے اس کی بنیاد حال نامہ پر رکھی ہے۔

پاس پہنچے۔

کافی گرام پہنچنے کے وقت بایزید کی عمر سات سال تھی۔ ان کے والد کی ایک افغان بیوی تھی جس سے ان کے دو بچے تھے۔ بایزید کی والدہ کے لیے کوہستان کا ماحول نیا تھا۔ سوکن کی بدسلوکی اور خاوند کی بے رخی نے اس کا دل اُچاٹ کر دیا آخر طلاق ہوئی۔ وہ اپنے خاندان کے پاس چلی گئیں اور بایزید شفقت مادی سے محروم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے ان مناقشات کا بایزید کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ عمر بھر سوتلی ماں کا ان سے سلوک بُرا تھا بلکہ والد کا رویہ بھی ہمدردانہ نہ تھا۔ اور آگے چل کر ان میں اور بایزید میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے۔

بایزید کے والد چاہتے تھے کہ وہ علم حاصل کرے اور خاندانی روایات کو برقرار رکھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد کے ایک خلیفہ کے پاس قرآن ختم کیا۔ اور فقہ و مسائل کی کتابیں مثلاً عمدۃ الاسلام اور منیر پڑھیں۔ وہ اپنے باپ سے قدرتی اور لباب الاخبار کا سبق پڑھا کرتے تھے لیکن جب معلوم ہوا کہ باپ نے جھوٹ کہا ہے تو پڑھنا چھوڑ دیا۔

سوتلی ماں کے سلوک اور والد سے اختلافات کی وجہ سے بایزید اپنے والد سے الگ ہو گئے۔ اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کیا اور زراعت و تجارت کے کاموں میں لگ گئے۔ لیکن وہ جوانی میں ہی تفکر و تدبیر کے عادی ہو گئے تھے۔ انھیں ظاہری عبادات میں ایمان کی چاشنی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ملا۔ قاضی اور صوفی کی ریاکاری اور عام مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں ان کو منموم رکھتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی ایسا شخص ملے جو انھیں سیدھی اور سچی راہ دکھائے اور ان کے اطمینان قلب کا سبب بنے۔ اس لیے وہ مرشدِ کامل کی جستجو میں رہنے لگے۔ ان کے گائوں میں ان کے چچا زاد بھائی خواجہ اسماعیل انصاری کی درویشی کا پھل چھایا تھا اور وہاں بایزید نے چاہا کہ ان کے مرید ہو جائیں لیکن والد نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ میں اپنے والد کا سب سے

قابل بننا ہوں۔ میرے لیے یہ باعثِ تنگ ہے کہ تم میرے بھائی کے بیٹے کے مرید ہو جاؤ۔ اگر مرید ہونا ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کے سلسلہ خاندان سے بیعت کر لو۔ ”مستان جاؤ۔ میں توشہ راہ اور شکرانہ پیر دے دوں گا۔ لیکن بیٹے نے یہ قبول نہ کیا۔ اور بالآخر خود ہی اپنا راستہ نکالا۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلام الہی احادیث نبوی (یا ان اقوال پر جو اس زمانے میں احادیث کے طور پر مشہور تھے) اور احکام شریعت پر غور و خوض کیا۔ اور ان خیالات و عقائد کو پیش کیا جن کی اس علاقے کے علما اور سرداروں نے مخالفت کی۔ جب کافی گرام والوں نے تنگ کیا تو بعض مریدوں کے مشورے سے منگ توی گئے۔ وہاں بھی مخالفت ہوئی۔ پھر کافی گرام آکر اپنے والد کا مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ مخالفت کے باوجود کئی لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تیراہ کی طرف گئے۔ وہاں بھی کئی قبیلوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اب ان کے مخالفوں نے کابل کے بادشاہ مرزا محمد حکیم کے پاس شکایت کی۔ اس نے حاکم پشاور کو حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر کے کابل بھیج دو۔ جب یہ وہاں پہنچے تو انھیں قاضی خاں قاضی کابل کے پاس مذکرہ کے لیے بھیجا گیا۔ قاضی خاں نے بایزید سے پوچھا: ”لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو مہدی کہتے ہو“ بایزید نے کہا: ”میں مہدی نہیں بلکہ ہادی ہوں اور گمراہوں کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہوں“ دوسرا اعتراض تھا: ”تم کہتے ہو۔ مجھ پر وحی آتی ہے“ بایزید نے جواب دیا: ”مجھ پر وحی نہیں آتی بلکہ الہام ہوتا ہے“ اور رسول خدا کی حدیث پیش کی۔ ”الہام نازل فی القلب یعرف بما حقیقۃ الاشیا کہی“۔ قاضی نے پوچھا: ”مذہبِ رحمانی و شیطانی میں کیسے تمیز کرتے ہو“ بایزید نے جواب دیا: ”جو الہام قرآنی آیت و حدیث کے مطابق ہو۔ صرف وہ قابل قبول ہے“ پھر قاضی نے پوچھا: ”کس خاندان کے توسط سے تم نے یہ علم حاصل کیا ہے؟“ بایزید نے جواب دیا کہ ”ہمارا طریقہ ایسی ہے اور حضرت رسالت پناہ کے طفیل بے واسطہ خدا سے تعالے نے مجھے علم لدنی سے بہرہ مند کیا ہے“۔ قاضی اور حاضرین ان جوابات سے مطمئن ہو گئے۔

اور حکیم مرزا کے پاس جا کر تفصیلات بیان کیں۔ اس نے ایک دو اور سوال کیے اور میاں بایزید کو اس پر خلعت دے کر رخصت کیا۔

پیر روشن کابل سے پشاور پہنچے۔ وہاں اب نیا حاکم تھا جو ان کا بہت مخالف ہو گیا۔ چنانچہ وہ پشاور چھوڑ کر علاقہ مہمند زئی میں چلے گئے اور وہیں پیمانے پر کام شروع کیا۔ یہاں سے انھوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ اپنی کتاب صراط التوحید اکبر کے پاس بھیجی جس نے خوشی کا اظہار کیا اور نذر و تحائف بھیجے۔ اسی طرح مرزا سلیمان کے پاس بدخشاں میں ایک خلیفہ کو بھیجا۔ اُس نے گھوڑا اور پوستین دی۔ اور خدمت میں حاضر ہونے کی توقع ظاہر کی۔

اس کے جلد بعد مخلوں اور پیر روشن میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ابتدائی کی اس طرح ہوئی کہ پیر روشن کے فریدیوں نے ایک قافلہ کو لوٹ لیا، جو مال لے کر ہندوستان سے کابل جا رہا تھا۔ اب حکیم مرزا نے پشاور میں اپنے نائب کو لکھا کہ بایزید کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔ اس نے بایزید کو گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن بایزید اور ان کے ہمراہیوں نے مقابلہ کی ٹھانی۔ چنانچہ زور کا معرکہ ہوا۔ جس میں مغل سپاہیوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ مخلوں اور ان قبائل کی جنھوں نے روشنیہ عقائد اختیار کر لیے تھے کشمکش جاری تھی کہ ۹۸ھ (۱۵۷۷ء) میں بایزید کی وفات ہو گئی۔

میاں بایزید کے پلنگ بیٹے تھے۔ شیخ عمر۔ نور الدین۔ خیر الدین۔ کمال الدین۔ جلال الدین۔ ان میں سے شیخ عمر مسند خلافت پر بیٹھے۔ انھوں نے باپ کا سلسلہ جاری رکھا اور یوسف زئی افغانوں کے مال و اسباب میں دست زنی کرنی چاہی لیکن سب یوسف زئی جمع ہو گئے اور شیخ عمر کو مح ان کے کئی ساتھیوں کے ہلاک کر دیا۔ خیر الدین بھی اسی لڑائی میں مارے گئے۔ نور الدین نے راہ فرار اختیار کی۔ لیکن اشغریہ کے گوجروں نے انھیں بھی ہلاک کر ڈالا۔ کمال الدین کو اکبر نے قید کر لیا اور بحالت قید ہی انھیں بیجاں اہل آپہنچا۔ اب میاں جلال الدین اپنے باپ کے

جانشین تھے (جنھیں مغل مورخین جلالہ کہتے ہیں)۔ ان کے شروع میں مغلیہ دربار سے اچھے مراسم تھے۔ جب ۹۸ھ میں حکیم مرزا کی بغاوت فرو کر کے اکبر کابل سے واپس آیا تو راستے میں میاں جلال الدین اس سے ملے اور مسلک ملازمت میں داخل ہوئے۔ لیکن یہ پالیسی ان کے ساتھیوں کو ناگوار تھی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ مغلیہ لشکر سے روپوش ہو گئے اور اپنا پُرانا سلسلہ شروع کیا۔ ۹۹ھ میں جعفر بیگ قزوینی کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ یہ ہم ایک حد تک کامیاب رہی اور میاں جلال الدین کے اہل و عیال قید ہو کر دار السلطنت بھیجے گئے۔ لیکن میاں جلال الدین ہاتھ نہ آئے بلکہ وہ ترکستان چلے گئے تاکہ عبداللہ خاں ازبک مدد حاصل کریں لیکن اکبر کی حکمت عملی سے یہ حکیم کامیاب نہ ہوئی (اگرچہ اکبر کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے عبداللہ خاں ازبک کی وفات تک لاہور میں مقیم رہنا پڑا)۔ ۹۹ھ میں میاں جلال الدین نے غزنی پر یلغار کی اور اس مقام کو خوب لوٹا۔ لیکن وہاں پاؤں نہ جما سکے۔ اس زمانے میں افغانوں کی قبائلی لڑائیاں بھی جاری تھیں۔ میاں جلال الدین ایک مخالفت تانہا ہزاروی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور اسی سال وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں کی بھی مخلوں کے ساتھ کشمکش کا ہی گاہے ہوتی رہی۔

میاں جلال الدین کے بعد مسند خلافت پر شیخ عمر کا بیٹا احمد داخاں بیٹھا۔ لیکن ۱۰۳ھ میں وہ جہانگیری لشکر کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا عبداللہ تھا جنھیں شاہجہان کے زمانے میں اعلیٰ منصب مل گیا اور وہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ میاں جلال الدین کے بیٹے اللہ داد خاں کو رشید خاں کا خطاب اور چار ہزاری

۱۰۳ھ معلوم ہوتا ہے مخلوں سے کشمکش میں اعلیٰ سلطنت کو بھی دخل تھا بقول ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں، احمد داخاں نے جہانگیر کو... لکھا کہ ذرا اپنا شاہنامہ کھول کر تو دیکھ۔ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سلطان ابو سعید تیموریہ کی دختر کس صاحب مال سے بیاہی گئی تھی۔ ہم اسی بزرگ کی اولاد ہیں اور اسی لیے

عہدہ ملا۔ اور فرور و شنیہ اور منسل حکام کی کشمکش ختم ہوئی۔

فرور و شنیہ اور منسلوں کی کشمکش کا آثار چڑھاؤ ہوتا رہا لیکن اس فرقے کے زوال کا اصل سبب وہ مسلسل مخالفت تھی جو ان کے عقائد و خیالات کی ان کے اپنے علاقے میں ہوئی۔ سرحدیں اس وقت کئی فاضل علماء ایسے تھے جو جانتے تھے کہ میاں بایزید کی قرآن و حدیث کی ترجمانی صحیح نہیں۔ انھوں نے میاں بایزید کی سخت مخالفت کی۔ ان میں اخوند درویش کو بڑی شہرت ہے جن کا تفصیلی تذکرہ ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

پیر روشن کے متعلق اختلافات | پیر روشن کے واقعات زندگی بیان کرتے وقت ہم نے زیادہ تر انحصار ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب

کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب پر کیا ہے۔ جس میں پیر روشن کے نقطہ نظر کو اس کی تصانیف کی بنا پر (جس حالت میں وہ اب طبعی ہیں) نمایاں کیا گیا ہے۔ زمانہ حال کے بعض دوسرے اہل علم نے بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اور ان کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ مزید تحقیق و تفکر کا محتاج ہے۔ روشنیہ سلسلے کے متعلق قریب قریب معاصر العہد بیانات ملتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حقیقت الحال کو جاننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے بلانی نے حال نامہ کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی۔ جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ دیا۔ اور اس نام کا ایک مخطوطہ علیگرہ لائبریری میں ہے۔ جس کی نقلیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور دوسرے اداروں میں بھی ہیں۔ لیکن خود اس مخطوطہ سے ظاہر ہے کہ یہ اصل نسخے کی نقل نہیں بلکہ حال نامہ کا ایک بالکل نیا ایڈیشن ہے جسے مصنف کی وفات کے ستر اسی سال بعد ان کے ایک معتقد نے عہدہ المکیری میں از سر نو ترتیب دیا۔ مولانا عجاز الحق قدوسی نے مرتب کے متعلقہ الفاظ تذکرہ صوفیائے سرحد میں مع ترجمہ دیے ہیں اور حسب ذیل ہیں:-

بعد ازیں فقیر حقیر علی محمد بن ابابکر اس کے بعد یہ فقیر حقیر علی محمد بن

قدحاری مرید و غلام خاندان بایزید انصاری
بگوید کہ بعضہ از حجاب مخلصان کہ رعایت خاطر
ایشان از حجاب لوازمات و واجبات ہنستہ ہیں
ازیں فقیر التماس داشتند کہ حال نامہ پر دستگیر کہ
از تائید و راسخ و تسامح ناسخاں تغیر و تبدل
بجائز رشرفے راہ یافتہ و صحتش بسقامت
بدل گشتہ و نیز سوانح و حقائق فرزندوں و
احوال نبرگان پیر دستگیر قدس سرہ و دیگر از
احوال کتہ منصفہ ظہور جلوہ گر آمدہ چنانچہ
شمشیر گشتن و رفتن ایشاں بجانب پشاور و
تراہ و کابل و غیر از سوانحات کہ در انضباط
نیامدہ ازیں نسخہ شریفہ زائل گشتہ و از طبع
زکی ثنما کہ مفتوح ابواب معانی متعلقہ و کاشف
اسرار و فارمہ سدودہ است بعید نیست
کہ عمیق و تطابق دادہ تصحیح نمایند و ارادت و
تقاضاے ایشاں بسبب قبول و اصغیانمود
بموقف اجابت مقرون گشت با امید توفیق
حق و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم و
هو حسبی و نعم الوکیل۔

و آنچه از کتاب و ناقلان معتبر استماع
گشتہ بسبب تحریر و در نظم تقریر آورده شد
محرار از بمنبت سخن پیرانی متباز تکلیف
کلام آرائی و در حیز ارقام مرسم گشت

ابابکر قدحاری جو بایزید کے خاندان کا
مرید اور خاص خادم ہے عرض کرتا ہے کہ
بعض مخلص دوستوں نے جن کے پس منظر
کو میں واجبات میں سے جانتا ہوں، پیر
سے کہا کہ پیر دستگیر (پیر و شاں) کے
حالیہ کی عبارت میں زمانے کی طوالت
اور نقل کرنے والوں کے تسامح سے بہت
کچھ تبدیل و تغیر ہو گیا ہے اور اس کی صحت
سقم سے بدل گئی، اس کے علاوہ اس
میں ان کے فرزندوں اور ذریت کے
حالات اور دوسرے واقعات جو ظہور پذیر
ہوئے جیسا کہ مسلح ہو کر پیر دستگیر کا پشاور
تراہ اور کابل وغیرہ جانے کے واقعات تحریر
میں نہیں آئے اور جو اس نسخہ شریف سے زائل
(غائب) ہو گئے ہیں آپ کی جو دست طبع سے
جو متعلقہ ابواب کے معانی کو کھولنے والی
اور سرسبتہ و فارمہ اسرار کی کاشف ہے، بعید
نہیں ہے کہ فکر عمیق سے اس کا تطابق کر کے
اس کی تصحیح کریں، توفیق حق کی امید پیران کی
ارادت مندی اور ان کے تقاضے کو سامع
نے قبولیت کا درجہ دیا۔ و ما توفیقی الا باللہ
العلی العظیم و هو حسبی و نعم الوکیل۔
اور میں نے جو کچھ کہ کتاب میں دیکھا تھا

آبغرم مبتدیان و در ذہن متعلمان صورت
معانی روشن و میرمن نماید و ثواب آن
اين نازل بہرہ مندرگہ و الثواب عند اللہ
واللہ عندہ من الثواب والسلام
علی من اتبع الہدٰی ۔

اور معتبر ناقلوں سے سنا تھا اسے سادگی کے
ساتھ تحریر میں لایا، جو بناوٹ اور عبارت
آرائی سے بالکل پاک ہے۔ تاکہ مبتدیل اور
طالب علموں کے ذہنوں میں اس کے معانی و
مطالب واضح طور پر آسکیں اور اس کے
ثواب سے یہ نقل کرنے والا بہرہ مند ہو۔
الثواب من عند اللہ واللہ عندہ من
الثواب والسلام علی من اتبع الہدٰی۔

مندرجہ بالا اندراج سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن
کی خود نوشت سوانح عمری سے کافی مختلف ہے۔ اس کی تشکیل و ترتیب عہد عالمگیری
میں ہوئی۔ جب افغان علاقے میں راسخ العقیدگی غالب آپجی تھی اور خود پیر روشن
کے پوتے اور دوسرے مستند مغللوں کے منصبداروں میں شامل ہو گئے تھے۔
حالنامہ کے متعلق یہ حقیقت اس لیے اہم ہے کہ حالنامہ کے حوالے سے پیر روشن
کے عقائد کا جو خلاصہ دبستان مذاہب میں دیا گیا ہے۔ وہ قلمی حالنامہ پر منطبق نہیں
آتا۔ اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو دبستان مذاہب کے مصنف نے غلط بیانی
سے کام لیا ہے یا حالات کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے حالنامہ کے مرتب نے
کتاب میں تغیر و تبدل کیا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اصلی حالنامہ کا کوئی نسخہ مل
جائے اور یہ عقدہ حل ہو جائے۔ لیکن مرتب کے اپنے بیان کے پیش نظر یہ امر
زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن کی تالیف سے کافی
مختلف ہے۔ اور اس سے دبستان مذاہب کے بیانات کی تردید نہیں ہوتی۔
جناب قدوسی صاحب نے جنہوں نے اس مسئلے کا سب سے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا ہے،

۱۔ حالنامہ قلمی ملوک پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ ص ۱-۲ [منقولہ مذکورہ صوفی سرحد ص ۱۹۳-۱۹۴]

پیر روشن کے مشہور مخالف اخوند درویش پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور پیر روشن کی اہم
تصنیف خیر البیان کی نسبت لکھا ہے۔ "ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ حضرت اخوند درویش
نے اس کتاب کو کن اسباب کی بنا پر اس قدر مطعون کیا ہے۔" لیکن خیر البیان کے دیباچہ
ہی سے انھوں نے جو حوالے دیے ہیں (باقی کتاب کا جو حصہ ملا ہے وہ پشتو میں
ہے، اس لیے موصوف نے اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا) ان سے خیال ہوتا ہے کہ
مترجمین کے اعتراضات اس قدر بے بنیاد نہ تھے بلکہ اہل شریعت اس کتاب پر
اعتراض نہ کرتے تو حیرت ہوتی۔ یہ کتاب کلام مجید کی طرز پر اس طرح لکھی گئی ہے
کہ گویا پیر روشن پر وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ ارشادات ربانی کو حرف بہ حرف
سپرد قرطاس کر رہے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

یا بایزید! بنویس آں حرفہا کہ بسا نند ہرزباں برائے منفعت آدمیاں
[توئی دانامن نمیدانم بجز حرفہا قرآن، یا سبحان آیا بایزید نوشتن حرفہا بر تو
آسان است و نمودن و آموزانیدن نامہاد حرفہا بر من است۔ (منقولہ در
تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۸۶)]

قدوسی صاحب نے تو اس طرز تحریر کو "ملہمانہ انداز" یا "القائی" طریق کہہ کر معاملے
کو ختم کر دیا ہے لیکن اگر ایسی کتاب کو دیکھ کر اخوند درویش یہ کہیں کہ پیر روشن الہام یا
وحی کے مدعی ہیں اور ان کے دہائی کو فتنہ عظیم سمجھیں تو اس پر حیرت کیوں ہو؟ انھوں
نے قلمی حالنامہ پیر روشن کے ساتھ بعض علماء مثلاً مرزا حکیم کے دربار میں قاضی خانہ
[تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۲۴-۱۲۵] یا مولانا زکریا (ص ۱۴۱-۱۴۳) کے مباحثوں کی جو
تفصیلات دی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے علماء بھی پیر روشن پر وہی
الزام لگاتے تھے جو اخوند درویش نے لگائے۔ مثلاً الہام کا دعویٰ۔ نبوت کا
ادعا وغیرہ۔ پیر روشن خیر البیان کے متعلقہ اندراجات کی تاویل کرتے تھے، لیکن کم از کم ان
مباحثوں سے ظاہر ہے کہ اخوند درویش جو کہتے تھے وہ ان تک محدود نہ تھا۔ تاریخ مرصع
اور غوغا خاں خٹک کے بعض اشعار میں بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار ہے۔

اخوند درویش صاحب نے پیر روشن کی نسبت جو سخت الفاظ کہے ہیں (طون غفر) ان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے بجا ہے۔ انھوں نے اس کے افعال کے متعلق سبب وہ ان کا ہمان تھا، جس طرح خفیہ طریقے سے خبر رکھی، وہ بھی کسی عالی خیالی کا مظہر نہ تھا۔ وہ پیر روشن کی ذہانت، قابلیت اور اثر کے قائل تھے، لیکن اس کے اہم مثبت پہلوؤں کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ انھیں پیر روشن سے جو مذہبی عناد تھا، وہ ان کی کتابوں سے صاف عیاں ہے بلکہ ان کی مذہبی زندگی کا نمایاں جزو تھا، لیکن ابھی تک ایسے شواہد نہیں ملے جن کی بنا پر انھیں دروغ بیانی کا مجرم قرار دیا جاسکے۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ جس قسم کے اعتراضات اخوند درویش پیر روشن پر کرتے ہیں، حالنامہ کے بیانات کے مطابق دوسرے کئی محاصرین نے کیے ان کے والد ان کے مخالف تھے۔ مرزا حکیم حکمران کابل کے ایما پر قاضی کابل نے ان پر اعتراضات کیے۔ اگرچہ پیر روشن نے تاویلات سے ان اعتراضات کا جواب دے دیا۔ لیکن اگر ان اعتراضات کو ہی دیکھا جائے، جو متعدد موقعوں پر حالنامہ کے بیان کے مطابق کیے گئے تو پیر روشن کی مخالفت میں اخوند درویش تنہا نظر نہیں آتے بلکہ اور کئی علما و فضلا تھے۔ خیر البیان کے اندازہ بیان سے یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ اعتراضات کیوں ہوتے تھے۔ صراط التوحید، مسلمان حکمرانوں کو پیش کرنے کے لیے اس وقت لکھی گئی، جب کابل کا مباحثہ ہو چکا تھا اور پیر روشن کو معلوم تھا کہ ان پر کس قسم کے اعتراضات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس میں قابل اعتراض باتیں نہیں۔ (اگرچہ اس کا موجودہ نسخہ بھی بدیہی طور پر ترمیم شدہ ہے)۔ لیکن خیر البیان کو دیکھ کر پیر روشن کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ہم ان کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

محزن الاسلام کا اندراج | اخوند درویش صاحب نے اپنی تصانیف (بالخصوص اپنی پشتو کتاب محزن الاسلام کے آخر میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی کی نسبت کئی ایسی معلومات جمع کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ اخوند صاحب کی

میاں بایزید کے ساتھ سخت مخالفت تھی اور انھوں نے اس کے متعلق جا بجا غیظ و غضب اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ میاں بایزید کے بعض کلمات (مثلاً اس کی دو ٹوٹیوں) سے جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں ان سے ہم متفق نہیں، لیکن اخوند صاحب ایک برگزیدہ مذہبی عالم تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے خیالات میں سخت تھے اور بعض جگہ محصوم یا قابل تاویل امور سے بھی بڑے مخالفانہ نتیجے اخذ کر لیتے تھے، لیکن یہ خیال کہ انھوں نے دانستہ دروغ بیانی سے کام لیا، قابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔

اخوند درویش لکھتے ہیں کہ نواب قندھار کے موضع کانی کرم میں عبداللہ نام کے ایک بزرگ رہتے تھے۔ وہ علما و صلحا کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی زیور علم و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام اس صلحا کے قندھان نے بایزید رکھا۔ اسے بھی انھوں نے دولت علم سے بہرہ ور کر دیا۔ کم عمر بایزید ریاضت و عبادت میں مشغول رہتا اور منہیات شرعی سے حتی الوسع مجتنب تھا، لیکن حصول تعلیم کے بعد وہ گھوڑوں کی سوداگری کے سلسلے میں ہندوستان گیا اور موضع کالنج (جالدھر) میں ملا سلیمان ملحد کی صحبت میں رہا۔ اس صحبت اور ہم نشینی سے بایزید کے دل میں خیالات فاسد جا نشین ہوئے۔ حتی کہ وہاں سے وہ ایک "کافر مطلق" اور منکر دین برحق "ہو کر واپس ہوا۔

جب کانی کرم میں بایزید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کے والد سخت برہم ہوئے بلکہ بیٹے کو زد و کوب کیا۔ چنانچہ بایزید وہاں سے بھاگ کر ننگر پار چلا گیا۔ اور مہمند علاقے میں ملک سلطان احمد کے مکان پر ایک مدت تک مقیم رہا، لیکن یہاں اہل سنت اور علما کثرت سے تھے۔ انھوں نے اس کی بات نہ سنی۔ وہاں سے وہ بیرشو (پشاور) کے قریب غور یا خیل قبیلے کے درمیان آ مقیم ہوا۔ یہاں کوئی

یہ قصبہ جنوبی وزیرستان میں رزمک کی مشہور سابق چھاؤنی سے کوئی بیس میل اور ٹانک سے ۸۰ میل دور ہے۔

زبردست اور سحر عالم نہ تھا جو بایزید کے بیان کو کتاب و حدیث اور علم و اصول کی کسوٹی پر کستا۔ اس لیے عوام میں سے کئی لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔

اخوند درویش نے میاں بایزید کے جو حالات لکھے ہیں ان سے اور دوسرے خلائع سے خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید پر ہندو اثر بھی کافی تھا۔ مشرقی پنجاب تو خیر ہندوؤں کی روحانی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، لیکن پشاور اور دوسرے افغان علاقوں میں ابھی ہندو موجود تھے۔ خود پیر و خاں کے مریدوں میں ہندو تھے اور اخوند درویش لکھتے ہیں کہ وہ انھیں ”بزبان ہندوی“ ذکر کی تعلیم دیتے۔ ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کو تو پیر و خاں نے اپنی تعلیمات کا جزو بنالیا تھا۔ اخوند درویش یہ بھی لکھتے ہیں کہ میاں بایزید مردوں اور عورتوں کو یکجا بٹھاتے اور سرود و قص اور دستک کا آغاز کرتے۔ شر پڑھے جاتے اور ذکر ہوتا پس مرداں را با زناں یکجا مے نشاند۔ سرود و قص و دستک مے دزدیند و بریت مے گفتند و ذکر مے گفتند۔ مردوں اور عورتوں کا اس طرح کا یکجا اجتماع اس بزرگمقام میں کسی اسلامی سلسلے میں پہلے رائج نہ تھا، لیکن اس کا دلچسپ بعض ہندو فرقوں میں عام تھا۔

پیر و خاں پر دوسرے اثرات بھی کئی تھے (مثلاً) خیالات فلسفہ و سفسطائیہ بیان مے کردہ دے نوشتہ، لیکن مقامی حالات و ضروریات کے اثر کے علاوہ جو چیز ان کی تحریک میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ صوفی عقیدہ وحدت الوجود کی غالی پیروی اور طریقت کی انتہائی مطلق العنانی ہے۔ ہندوستان کے چند ایک دوسرے صوفیہ میں بھی یہ رجحان نظر آتا ہے، لیکن میاں بایزید ایک تو پیدا اس زمانے میں ہوئے، جب شیخ علی متقیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحی تحریکیں ابھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ دوسرے اپنے خیالات کی تدوین انھوں نے اس علاقے میں کی، جہاں اہل علم کی روک ٹوک محسوس نہ تھی۔ اس لیے ان کے خیالات میں وہ مطلق العنانی ہے، جس کی مثال اس بزرگمقام کے کسی دوسرے مشہور اور با اثر روحانی راہنما میں نہیں ملتی، لیکن ان کی تحریک کی بنیاد انھیں رجحانات پر تھی جو وحدت الوجودیوں

میں عام ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ مشہور شعر ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہو گا مہ اسے خدا کیا ہے

میاں بایزید نے اس خیال کو جس صورت میں پیش کیا، وہ (بقول اخوند درویش) یہ تھا۔ ”چوں جز وجود خدا چیزے دیگر در وجود نیست پس حرام و حلال و روا و ناروا چہ معنی دارد؟ اسی طرح بعض صوفیہ میں مرشد کو جو درجہ تعظیمی دیا جاتا ہے اسے سب جانتے ہیں۔ بقول حافظ۔

ہر مے سجاده رنگیں کن گرت پیر مہاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

میاں بایزید کی مطلق العنانی اور انتہا پسندی نے مرشد کو خدا اور پیغمبر کا ہم رتبہ بنا دیا اور کہنے لگے کہ پیر کامل کے بغیر خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کلام مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیتے وابتغوا الیہ الوسیلۃ اور کہتے کہ اس کے مطابق خدا تک پہنچنے کا وسیلہ پیر ہے۔ و افغاناں از بے علمی تصدیق و باور کردند و نہ استند کہ در تفسیر بیضادی وغیرہ آلودہ کہ وسیلہ بخدا سے ایساں طاعات و ترک معاصی است۔ پس بے استقامت بر شریعت نبوی صلعم بہ خدا راہ نیست۔ [اخوند درویش]

اسی طرح شریعت پر طریقت اور معرفت کو ترجیح دینے کا مسئلہ ہے۔ میاں بایزید کہتے کہ پہلی منزل شریعت ہے۔ جب تک شریعت سے نہ گزریں طریقت تک رسائی نہ ہوگی اور جو شخص طریقت سے نہ گزرے گا وہ معرفت و حقیقت تک نہ پہنچے گا۔ اس خیال کا اظہار بھی صوفیوں میں عام ہے، لیکن اخوند درویش اور ان کے ہم خیال کہتے کہ جو کوئی شریعت سے گزر جاتا ہے، وہ کافر ہو جاتا ہے اور کافر کی

سہ پیروشن کی تصنیف صراط التوحید میں جو بہت بڑی تصنیف ہے اور اکثر دوسرے سلاطین وقت کے لیے لکھی گئی زیادہ تر عام نقطہ نظر کا اظہار ہے، لیکن عالمانہ میں جو تغیر و تبدل ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے پیروشن کی تصانیف کے قریب الحمد قلمی نسخوں کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کہتے کہ یہ خیال کہ شریعت کے علاوہ بھی کوئی دوسرا راستہ ہے جو خدا تک پہنچا دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔

غرضیکہ میاں بایزید کی تعلیمات کا سراغ دوسرے وحدت الوجودیوں کے ہاں مل جاتا ہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو ایک نیارنگ دیا اور ان خیالات میں اس طرح غلو کیا کہ ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ شریعت پر طریقت کو اور طریقت پر معرفت کو اس طرح ترجیح دی کہ ایک طرح سے مریدوں کو شریعت سے بالکل آزاد کر دیا بلکہ بعض روایات کے مطابق ایک نئی شریعت کا آغاز کیا اور نماز روزہ و طہارت کے احکام میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ہم ان کا ذکر دبستان مذاہب کے اندراج کے ضمن میں کریں گے۔

میاں بایزید کی افغان علاقے میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے افغان زبان میں اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنی تعلیمات کو افغانوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ میاں بایزید نے جس زمانے میں نشوونما پائی اس وقت (مثلاً بھگتی تحریک کے دوران میں) سنسکرت اور عربی کی جگہ عام فہم زبان میں تصنیف و تالیف کا رجحان عام تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میاں بایزید بھی مریدوں کی سمجھ اور زبان کے مطابق ذریعہ تعلیم اختیار کرتے۔ انھوں نے درویشہ لکھتے ہیں۔

”القسم این محدثوں مردم را بخود معتقد میکرد۔ ایشان را خلوت سے فرمود و ذکر سے داد۔ اما ذکر اور نامہ سے باری تھائے بودہ بلکہ افغاناں را بہ زبان افغانی زبان سخن موافق موزوں ساختہ سے داد۔ و بعضے جملہ سے فارس را بہ زبان فارسی و ہندواں را بہ زبان ہندوی و ہکذا“

میاں بایزید کا دائرہ کار افغان علاقہ رہا، لیکن ان کی ذہنی ساخت میں فقط مقامی اثرات نہ تھے اور نہ ہی ان کا مطالعہ نظر محض مقامی تھا۔ وہ تو سارے ہندوستان اور خراسان کو مستحضر کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ (دلائل ہازدہ کہ تمام ہندوستان و خراسان خواہم

۱۔ یعنی زبان عربی (موت)

در تصرف خود آدرودہ، اور یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا مجموعہ خیر البیان فقط پشتو زبان میں نہیں لکھا گیا بلکہ میاں بایزید نے اسے چاند بانوں یعنی عربی، فارسی، پشتو اور ہندی میں لکھا تاکہ سب زبانوں میں اپنے خیالات کی ترویج کر سکیں۔

دبستان مذاہب کا اندراج | دبستان مذاہب سے جو غیر معروف فرقوں کے متعلق قابل اعتماد معلومات کا ایک بڑا ماخذ سمجھا جاتا ہے،

خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید کی نجی مشکلات نے ان کی پریشانیوں میں بڑا اضافہ کیا، ان کے والد شیخ عبداللہ انصاری زیادہ تر سرحد کے افغان علاقے میں (مقامی مقام) رہتے تھے۔ جب ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ایک عرصہ بعد بایزید اور ان کی والدہ بھی ان کے پاس چلی گئیں، لیکن بیوی کی میاں سے نہ بنی۔ شیخ عبداللہ نے اسے طلاق دے دی اور خورد سال بایزید کو عام بے چینی کے علاوہ سوتیلی ماں اور بے پروا باپ کے ظلم و ستم سہنے پڑے۔ انھیں شروع ہی سے روحانی اور مذہبی امور سے دلچسپی تھی۔ کھیتوں کی نگہبانی کے لیے جاتے تو دوسروں کی کھیتوں کا بھی خیال رکھتے۔ چھوٹی عمر میں حقیقت اشیا اور مبادی و محاد کی نسبت سوال کرتے اور پوچھتے کہ زمین اور آسمان تو موجود ہیں لیکن خدا کہاں ہے؟ وہ چاہتے تھے کہ اپنے ایک قریب دار خواجہ اسماعیل کے مرید ہو جائیں، لیکن والد مانع ہوئے اور کہا کہ یہ باعث شرم ہے کہ اپنے ایک معمولی قریب دار کی مریدی کرو۔ مرید ہونا۔ یہ تو شیخ بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے کسی کی بیعت کرو۔ بیٹے نے کہا۔ روحانی مرتبہ کوئی موزوں چیز تو نہیں، لیکن بالآخر بایزید کو خود ہی اپنا راستا بنانا پڑا۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلام الہی، احادیث نبوی اور احکام شریعت پر خود ہی غور و خوض کیا، لیکن ایسے ایسے معنی نکالے کہ حقیقت سے بہت دور جا پڑے اور شریعت و طریقت کی خود و ترجمانی سے ایک ایسا ملغوبہ تیار کیا جو مروجہ اسلام سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے معتقد انھیں پیروشن کہتے تھے، لیکن ان کے مخالف کثرت سے کہتے تھے۔ وہ انھیں ”پیر تاریک“ کہتے۔

میاں بایزید نے اپنے پیروؤں کے لیے نئے قواعد و ضوابط بنائے۔ نماز کے لیے قبلہ رو ہونے کی شرط ارادی غسل کے لیے پانی کو غیر ضروری قرار دیا۔ مریدوں کو تعلیم دی کہ جو ان کے پیر کا قائل نہ ہو اور وحدت وجود کے راستے پر نہ چلیں گا ذبح کیا جوا نور حرام ہے بلکہ انھوں نے تو اپنے مخالفین کا قتل کرنا اور ان کا مال متاع لوٹ لینا جائز قرار دیا۔ وجہ یہ بتانے کہ جو لوگ خود شناس نہیں وہ یا تو حیوان ہیں جنھیں دوسرے حیوانوں مثلاً بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرنا اور سانپ بھجوروں کی طرح ہلاک کرنا جائز ہے۔ یا حیات ابدی سے محروم ہونے کی وجہ سے مُردے ہیں اور مُردوں کا مال زندوں کو پہنچتا ہے۔

”وگفت ہر کہ خدا را و خود را شناسد آدمی نیست۔ اگر آدمی است حکم گرگ و پلنگ و مار و کژدم دارد۔ پیغمبر بی گفتمہ اقتل المؤمنین قبل الایمان و اگر نیکوکار و نماز گزار است حکم گاؤ و گوسفند دارد۔ کشتن آن جائز است۔ بنا بریں مخالفین خود شناسی را کشتن فرمود۔ چہ اینہا حیوانند۔۔۔۔۔ وگفت ہر کہے کہ خود را شناسد و خبر از زندگی جاوید و حیات ابدی ندارد مُردہ است و مال مُردہ کہ وارثان آن نہیں مُردہ باشند بہ زندگان رسد۔ بنا بریں نیز حکم بر قتل نادان کرد۔“

اس فلسفہ پر وہ خود عامل تھے۔ چنانچہ دبستان مذاہب میں جس کے مصنف نے میاں بایزید کے حالات ان کی خود نوشت سوانح عمری حال نامہ اور دوسرے مآخذ سے جمع کیے ہیں لکھا ہے کہ میاں بایزید اپنے بیٹوں کے ساتھ مدتوں تک راستا چلنے والوں کو ٹوٹتے رہے۔ پانچواں حصہ اپنے قائم کردہ بیت المال میں جمع کرتے

۱۔ ”او خود را نمی دانستے و مردم را بہ ریاضت فرمودے و نماز بگزاردے۔ انا تعین جنت را از میان برداشت فایماتو تو افشرد و جوہ اللہ فرمود۔ غسل آب واجب نیست چہ ہمیں کرباد رسید تن پاک میشود۔ چہ چار عنبر از مہر ایت است۔“ (دبستان مذاہب ص ۸۰-۷۹)

۲۔ دبستان مذاہب ص ۸۰

اور بوقت ضرورت اہل استحقاق میں تقسیم کرتے۔

پیر روشن کی اہمیت | پیر روشن کے خیالات کا جو خلاصہ ہم نے مخزن الاسلام اور دبستان مذاہب سے دیا ہے۔ اس کی دلچسپی نظری اور تحقیقی ہے۔ روشنی فرقہ کے اگر ہی عقائد ابتدائیں تھے جن پر اعتراض کیے گئے تب بھی وہ ترک ہو گئے۔ پیر روشن کے خاندان کے کئی افراد اپنے عقائد سے تائب ہو گئے اور بہر کیف جس علاقے سے اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کی اتنی خدمات لینی تھی وہاں راسخ العقیدگی غالب آگئی، لیکن اگر مخزن الاسلام اور دبستان مذاہب کے اندراجات کو بالکل صحیح مانیں تب بھی پیر روشن کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ انھوں نے اور ان کے جانشینوں نے کئی سال تک ایک اہم مذہبی ’تمدنی‘ اور سیاسی تحریک کی رہنمائی کی۔ پشتو ادب کے تو وہ بانیوں میں سے ہیں اور خیر البیان پشتو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے۔

ایک ایسے پنجوہاڑی علاقے میں جہاں جائز آمدنی کمانے کے ذریعے کم تھے، لیکن جہاں سے ہو کر ترکستان اور بلخ بخارا کے پُر اموال تجارت لدرے ہوئے قافلے گزرتے تھے۔ میاں بایزید کی تعلیمات کا مقبول ہونا قدرتی امر تھا (اور ایک تک یہ تعلیمات مقامی حالات اور اس علاقے کی اقتصادیات کا نتیجہ تھیں، لیکن میاں بایزید کے وسیع اثر کی ایک وجہ ان کی اور ان کے مریدوں کی ادبی سرگرمیاں تھیں۔ ادبیات سرحد میں رضا ہمدانی لکھتے ہیں:-

”پیر روشن بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ ادب، فلسفہ، تبلیغ و ارشاد اور قومیت سب میں ماہر تھا۔ اگرچہ پیر روشن زندگی کے تمام شعبوں میں دسترس کامل رکھتا تھا، لیکن اس کی ادبی زندگی بہت نمایاں تھی بلکہ پشتو ادب کی ترقی کا باعث ہی پیر روشن تھا۔ اس نے نثر کے ذریعے پشتو ادب کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ اس کی تصانیف میں خیر البیان بڑی مشہور کتاب ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب پیر روشن نے چار زبانوں میں لکھی

پشتو - فارسی - عربی اور ہندی - یہ کتاب شریعت طریقت اور دینی مسائل سے متعلق ہے۔ نیز اس میں پٹانوں کے سیاسی، اجتماعی، ادبی، قبیلوی اتحاد کا بیان ہے اور بابا قرآن و احادیث کے ساتھ اپنے خیالات کو تطبیق دی گئی ہے۔

رضا ہمدانی صاحب نے اپنے بیان کا ماخذ نہیں بتایا۔ پشتو ادب کے قدیمی عالم پیر و خاں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو رضا صاحب نے دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک پیر و خاں کی تصانیف چھپ کر سامنے نہ آئیں، پشتو ادب میں ان کا مرتبہ معین کرنا مشکل ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے پشتو زبان کی سرپرستی کی پشتو شاعری بہت پرانی ہے اور پشتو نثر میں بھی پرورش سے پہلے تصنیف و تالیف ہو رہی تھی، لیکن انھوں نے جس مکتب فکر کا آغاز کیا، اس کے متعدد ممتاز ادبی ترجمان تھے۔ شعل میں سے مخلص اور آزادی ان کے معاونین خاص تھے۔ لیکن اس مکتب خیال کا سب سے با اثر نمائندہ (میاں بایزید انصاری کا پوتا؟) مرزا خاں انصاری تھا، جس نے پشتو میں پہلا دیوان مرتب کیا۔ وہ آخر میں روشنیہ عقائد سے تائب ہو گیا تھا، لیکن اس نے پہلی مرتبہ پشتو غزل کو صوفیانہ خیالات (بالخصوص نظریہ وحدت الوجود) کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور پشتو شعر کے سرتاج رحمان بابا کے لیے راستہ ہموار کیا۔

پیر روشن کے جو احسانات پشتو ادب پر ہیں اس سے زیادہ افغان موسیقی پر ہیں، اس سلسلے میں قدوسی صاحب نے قلمی حالنامہ سے طویل حوالے دیے ہیں اور ہم ان کے شکریے کے ساتھ ان کا تمام اندراج درج ذیل کرتے ہیں:-

حالنامے کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

”پیر یازید اور ان کے مریدوں نے اس علاقے کی موسیقی کے فروغ میں بھی بڑا حصہ لیا تھا۔ حالنامے میں ان دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پیر یازید کے ذریعے سے قوم کو ملے۔ حالنامے میں ہے کہ:-

روزے۔۔۔ بیابان خود میفرمود کہ ایک روز اپنے دوستوں۔۔۔ سے

دو گنج از افغاناں حق تعالیٰ پوشیدہ داشت
بہ طفیل دو کس آن ہر دو گنج ظاہر ساخت
یکے از آن گنج علم توحید است کہ از افغاناں
پوشیدہ بود حق تعالیٰ از طفیل پیر و شاں
برایشان کشوف گردانید۔ سخن گنج دوم کہ
مذکور شدہ بود، آن گنج علم موسیقی است کہ
از طفیل حاجی محمد خلیفہ میرضی ولدلی بلغاناں
کشف نمود، زیرا کہ پیشتر در افغاناں غمچگیں
سرتارامی نواختند، و بر رباب پنج تار یعنی
سرد و تار مینواختند و دو تارے گھنڈ
واز تعلیم و طفیل حاجی محمد ساز فلکے ایشان
تارے بسیار بر ساز ہائے انداختند و
نغمہائے نو و اخراج نمودند، اباً اکثر نغمہائے
رقص و غیر ملائم می نواختند، بچوں آن
سازند ہائے در خدمت پیر و شکیر و فلکے
رسیدند، و از برکت و صحبت و طفیل پیر
دستگیر سرود و سلوک و نغمہائے ملائم نمودند
و شش مقام بستند، یکے ناصری، دوم
پنج پردہ، سوم چار پردہ، چہارم سر پردہ،
پنجم پردہ جنگ کہ در وقت جنگ می نواختند
ششم مقام شہادت است و در ہر مقام
بسیار بند ہا و نغمہا نواختہ می شود، و دیگر
پیشتر در افغاناں از دوسرے بیت شعر زیادہ

فرماتے تھے کہ دو خزانے حق تعالیٰ نے
افغانوں سے پوشیدہ رکھے تھے۔ دو شخصوں
کے طفیل سے وہ دونوں خزانے افغانوں
پر ظاہر کیے۔ ایک خزانہ ان میں سے
علم توحید ہے، جس کو خداے تعالیٰ نے
پیر و شاں کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر
کیا۔ دوسرا خزانہ جو ظاہر کیا گیا، وہ خزانہ
علم موسیقی کا ہے، جو حاجی محمد خلیفہ میرضی ولدلی
(مرید پیر و شاں) کے طفیل سے افغانوں
پر ظاہر ہوا۔ اس لیے کہ پہلے افغان غمچیں
(ساز) پر اکتارہ بجاتے تھے اور پانچ تار
کے رباب یعنی سردہ پر دو تار بجاتے تھے
اور پانچ تار کے رباب یعنی سردہ پر دو تار
بجاتے تھے اور اسے دو تار کہتے تھے۔
حاجی محمد کی تعلیم اور طفیل سے ان کے
سازندوں نے کئی کئی تار سازوں میں ڈالے
اور نئے نئے نغمے نکالے، لیکن وہ اکثر نغمے
غیر ملائم بجاتے تھے۔

جب یہ سازندے پیر و شکیر پیر و شاں
کی خدمت میں پہنچے تو پیر و شکیر کی صحبت و
برکت اور طفیل سے نغمہ ملائم بجانے لگے
اور چھ نغمے ایجاد کیے۔ ایک ناصری، دوسرے
پنج پردہ، تیسرے چار پردہ، چوتھے تین پردہ،

نبود و پیر و شگیر قدس سرہ بزبان افغانی
قصیدہ ہاوغر لہا و رباعی ہا و قطعہا و
مثنویا ہا ساختند و از طفیل پیر و شگیر
قدس سرہ فرزندان و مریدانش یوانہا گفتند

اس کے علاوہ اس سے پہلے افغان
(شاعری) میں شعردو تین قسم سے زیادہ
نہ تھے۔ پیر و شگیر نے افغانی زبان میں
قصیدے، غزلیں، رباعیاں، قطعے اور مثنویاں
کہیں اور پیر و شگیر کے طفیل سے ان کے
فرزندوں اور مریدوں کے دیوان کہے۔

حالنا ملے کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حاجی محمد مرید میر فضل اللہ
ولی متوفی ۹۲۰ھ (۱۳۹۳ء) نے رباب میں چند تاروں کا اضافہ کیا تھا اور ان کی
اس ایجاد پر افغان موسیقاروں نے چند نئے نئے اضافہ کیے تھے، لیکن موسیقاران
نعموں کو غیر متوازن بجاتے تھے۔ پیر یازید نے ان نعموں میں اصلاح کی۔ ان کی زنجائی
میں موسیقار اس قابل بنے کہ سرود و سلوک اور دوسرے حسب ذیل طریقہ نعمات کا
سرود بنا سکیں۔

ناصری (دھنا سری) پنج پردہ، چار پردہ، سہ پردہ، جنگی، آہنگ، مقام شہادت۔
سرود کا فوق پیر یازید میں شروع ہی سے تھا۔ جب سرود ہوتا تو وہ وجد میں آجاتے
تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے بھی ماہر موسیقار تھے۔“

قادر یہ سلسلہ

زمان وسطیٰ کے ہندوستان میں مرکزی حکومت کی کمزوری کا آخری زمانہ مذہبی
انتشار کا زمانہ بھی تھا، لیکن سیاسی استحکام اور علوم اسلامی کی اشاعت کے ساتھ
حالات سدھر گئے۔ اس اصلاح حالت میں ایک نئے صوفیانہ سلسلے سے بھی مدد ملی۔

جس نے شمالی ہندوستان بالخصوص پنجاب اور سندھ میں بڑا اقتدار حاصل کیا اور جس کا
اثر آج کسی دوسرے خاندان کے اثر سے کم نہیں۔ یہ سلسلہ حضرت پیران پیر غوث اعظم
شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے شروع ہوا جو ۶۵۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے
اور جن کے نام پر یہ سلسلہ قادریہ کہلاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں چشتیہ اور
سہروردیہ سلسلوں کا زور کم ہو گیا تھا۔ ان خاندانوں میں سے اب بھی کئی پاک سیرت
اور نیک نفس بزرگ پیدا ہو رہے تھے۔ جن کی زندگیاں عوام کے لیے چراغ ہدایت
تھیں، لیکن ان میں سلطان المشائخ جیسی عظیم الشان شخصیتیں نہ تھیں۔ اس کے
علاوہ مغلیہ حکومت کے استحکام اور بالخصوص حرمین کے لیے بحری راستا کھل
جانے سے ملک میں اسلامی علوم اور فقہ کی اشاعت بڑھ گئی۔ اس لیے بعض متشرع
بزرگوں کو جو تصوف اور ذاتی روحانی تجربات کو بھی اہمیت دیتے تھے ایک ایسے صوفیانہ
نظام کی تلاش تھی جس کی کوئی بات شرع کی نظروں میں مشتبہ نہ ہو۔ بالآخر نقشبندیہ
سلسلے نے اس رجحان کو پورا کیا لیکن اس کے فروغ سے پہلے اس بارے میں
قادریہ سلسلے کو دوسرے قدیمی سلسلوں پر امتیاز حاصل تھا اور اس کی وجہ سے بڑے
بڑے پرہیزگار علما مثلاً شیخ علی متقی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس
سلسلے میں بیعت کی اور اسے خواص و عوام میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مخدوم محمد گیلانی حلوی | سب سے پہلے طریقہ قادریہ کے جس بزرگ کا نام ملتا
ہے۔ دکن کے شاہ نعمت اللہ قادری متوفی ۱۳۱۰ھ
تھے۔ لیکن ان سے سلسلہ بہت پھیلا نہیں اور صحیح طور پر جس بزرگ نے ہندوستان میں

اس سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ حضرت مخدوم محمد گیلانی قدس سرہ تھے۔ آپ حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے، لیکن جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ و برباد کیا تو آپ کے بزرگ حلب چلے گئے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے۔ آپ کو ظاہری جاہ و جلال بھی حاصل تھا اور علوم معنوی و منقولی بھی آپ کے پوری طرح حاصل کیے۔ ایک عرصہ ایران، خراسان اور دوسرے ملکوں کی سیر کی۔ پھر اپنے والد کی وفات کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور مغربی پنجاب کے مشہور مقام اچہ میں توطن اختیار کیا۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور قادری تخلص کرتے تھے۔ اکثر اشعار حضرت غوث اعظم کی تعریف میں ہیں۔ لیکن ایک غزلوں کا دیوان بھی ہے جس میں کئی ترجیع بند ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث نے ایک بند اخبار الاخیار میں درج کیا ہے۔ ہم بھی تبرکاً چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

رندیم و قلندریم و چالاک	مستیم و معریدیم و بے باک
جامیم و صراحیم و بادہ	دُر و صد فیم و بحر و خاشاک
والی و لایت شش و پنج	حائی بلاد فیم و ادراک
مجموعہ راز عالم دل	منصوبہ کشائے ستر لولاک
بگذشتہ ز خویش بے کدورت	نگذشتہ ز عشق جو ہر خاک

ماہبل بوستان قدسیم

شہباز سفید دست انسیم

مخدوم عبدالقادر ثانی | مخدوم محمد گیلانی کی وفات کے بعد ان میں ہولی۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ سبھی اپنی جگہ بلند مرتبہ، لیکن جو مرتبہ مخدوم عبدالقادر ثانی کا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم محمد گیلانی وفات پا گئے تو اگرچہ سجادہ نشینی کا حق شیخ عبدالقادر ثانی کا تھا، لیکن ان کے بھائی بادشاہ کے دربار میں تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ ہم اپنے اثر و اقتدار سے سجادگی اپنے لیے حاصل کر لیں۔ آپ کو پتا چلا تو آپ نے جاگیر و املاک کے متعلق تمام اسناد

و فرامین بادشاہ کے پاس بھیج دیے کہ جوان کے طالب ہیں انھی کو یہ دے دو۔ اس کے بعد متوکلانہ گزارہ کیا۔ ایک بار بادشاہ نے (غالباً ملتان کا حاکم ہوگا) ان سے اپنے دربار میں آنے کی درخواست کی اور گزشتہ اقدام کی تلافی چاہی، لیکن انھوں نے لکھ بھیجا۔

برہنچ باب ازیں باب روعے گشتن غریت ہر آنچہ بر سرِ مائے رود، مبارک باد
کسیکے خلعت سلطان عشق پوشیدہ است بجلدے ہائے بھشتی کجا شود دل شاد

کہتے ہیں کہ غفوانِ شباب میں آپ بڑے عیش و آرام سے زندگی گزارتے تھے بلکہ جہاں آپ جاتے، باجوں اور دوسرے آلات موسیقی سے لدے ہوئے اونٹ ہمراہ ہوتے۔ لیکن جب آپ پر دوسرا رنگ غالب آیا اور اپنے والد کے سجادہ نشین ہونے تو ان سب باتوں سے منہ پھیر لیا۔ سماع سے قطعی پرہیز کرنے لگے اور اپنے مریدوں کو بھی سختی سے اس کی ممانعت کرتے۔ اس تبدیلی کا باعث تذکرہ نگار یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک دفعہ اچہ کے بیابان میں شکار کر رہے تھے کہ ایک تاج نے بڑی دردناک آواز سے نالہ و فریاد شروع کیا۔ ایک درویش اس بیابان میں تھا۔

اُس نے کہا کہ سبحان اللہ ایک دن ایسا بھی ہوگا جب یہ جوان خدا کی محبت میں اسی طرح نالہ و فریاد کرے گا۔ یہ سن کر آپ پر عجیب حالت طاری ہوئی۔ دنیاوی چیزوں سے دل سرد ہو گیا اور روز بروز محبت الہی کے آثار زیادہ نمایاں ہونے شروع ہوئے حتیٰ کہ آخر میں ہر طرف سے دل ہٹ گیا اور فقط ذاتِ مولیٰ کا دھیان رہ گیا۔ آپ کو شیخ عبدالقادر ثانی اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے کمالات حضرت غوث اعظم قدس سرہ کے تابع تھے اور آپ روحانیت میں انھیں کے وارث حقیقی تھے۔ آپ کی بڑی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ کی نگاہ میں ایسی تاثیر تھی کہ جس پر نظر ڈالتے، اس کی کایا پلٹ جاتی۔ گنہگار ہوتا تو تائب ہو جاتا اور کافر ہوتا تو ایمان کی دولت سے شرف یاب ہوتا۔ اخبار الاخیار کا بیان ہے: "بسیار سے از عصاة و کفار بمشاہدہ جمال و معانہ"

کمالش بسعادتِ توبہ نصوح سے رسیدند و بشرف ایمان مشرف مے شدند۔
 شیخ عبدالقادر ثانی کی وفات ۷۳۳ھ میں ہوئی۔ ان کے بعد قادریہ سلسلے میں
 کئی مشائخ کبار گزرے ہیں۔ آپ کے پوتے حضرت سید حامد جو حامد گنج بخش کے نام سے
 مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں شیخ زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے ایک صاحبزادے
 شیخ موسیٰ پاک شہید تھے جو ملتان میں پاک دروازہ کے اندر دفن ہیں۔ شیخ عبدالحق
 محدث دہلوی نے پہلے ابھی سے قادریہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔ شیخ موسیٰ بیشتر
 شاہی لشکر میں رہے۔ اچھے میں ارشاد و ہدایت زیادہ تر ان کے بھائی کرتے۔ بدایونی
 لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسیٰ بادشاہ (اکبر) کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت
 آن پہنچتا تو عین دیوان خانے میں خود اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے
 اور کوئی انہیں روک نہ سکتا۔ شیخ موسیٰ کا اپنے بھائی شیخ عبدالقادر سے سجادہ نشینی
 کے سلسلے میں تنازعہ ہوا تھا اور شیخ عبدالقادر اس سلسلے میں فتح پور آئے تھے لیکن
 ایک بات پر ان کی اکبر سے چپقلش ہو گئی اور انہوں نے وراثت اور مدد معاش کا
 قضیہ ترک کر کے اُچر میں واپس جا کر متوکلانہ زندگی شروع کر دی اور قبول عام
 حاصل کیا۔

شیخ داؤد کرانی شیر گڑھی | شیخ حامد کے ان فرزند ان گرامی کے علاوہ ان کے
 خلیفہ شیخ داؤد کرانی جو ضلع ننگرہ (ساہیوال) کے قصبہ شیر گڑھ میں آرام فرما ہیں۔ ایک بڑے باکمال بزرگ ہوئے ہیں۔ ملا عبدالقادر
 بدایونی آپ کا ذکر اس عقیدت اور احترام سے کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، لیکن
 دوسرے ہم عصر مورخین کے بیان سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے شیخ عبدالحق
 محدث لکھتے ہیں۔ ”صاحب حال صحیح و کشف صریح۔ در حین سلوک ریاضیات شاد
 و مجاہدات فوق الطاقہ کشیدہ“ اور شیخ قطب عالم کا جو اس زمانے کے مشہور چشتی
 بزرگ تھے (ملاحظہ ہو ذکر حضرت خواجہ باقی باللہ) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ جب
 میں شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو ان کے وعظ و نصیحت کے طریقے دیکھ کر

میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں شیخ مہدوی نہ ہوں، لیکن جو نہی میرے دل میں
 یہ خیال گزرا۔ شیخ نے بغیر میری طرف سے کسی اظہار کے یا کسی اور تقریب گفتگو کے
 فرمایا کہ مہدویہ فرقہ گمراہ ہے اور ان کے پاس اپنے طریقے کی کوئی صحیح سند نہیں۔
 شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ملتان کے
 قریب ایک قصبے میں اقامت پذیر ہوئے۔ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے
 اور والدہ پیدائش سے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئیں اور آپ در یتیم ہو کر رہ گئے۔
 آپ نے علوم ظاہری مشہور شاعر اور عالم مولانا جامی کے شاگرد مولانا اسماعیل اچھے
 شہر لاہور میں حاصل کیے، لیکن جلد ہی جذبہ الہی غالب آگیا اور آپ کی توجہ تمام تر
 ذات واحد کی طرف منعطف ہو گئی۔ روحانیت آپ نے حضرت غوث اعظم سے
 اویسی طریقے سے حاصل کی، لیکن ”بجست نگاہ اشت سلسلہ“ شیخ حامد قادری کے مرید
 ہوئے۔ آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ برہنہ سر و برہنہ پا آپ علاقہ دیپال پور کے
 صحرا میں پھرا کرتے تھے۔ اور جنگل کے جانوروں اور پرندوں کے سوا آپ کا کوئی
 رفیق نہ ہوتا۔ بالآخر آپ نے شیر گڑھ میں اقامت اختیار کی اور جلد ہی آپ کی شہرت
 سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس وقت سلیم شاہ سُوری کی بادشاہت تھی اور
 ملا مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری رقبہ بدعت کا دُورہ ہاتھ میں لیے مصروف کار
 تھے۔ چنانچہ گوالیار سے فرمان جاری ہوا کہ شیخ داؤد دربار میں حاضر ہوں۔ آپ دو ایک
 رفیقوں کے ساتھ اس دُور دراز سفر پر روانہ ہوئے۔ گوالیار کے باہر مخدوم الملک
 ملاقات ہوئی، لیکن شیخ کے تقدس نے مخدوم الملک پر بھی اثر کیا اور ان کی ملاقات
 بڑی خوشگوار رہی۔ ابتدائی گفت و شنید کے بعد آپ نے مخدوم سے پوچھا کہ فقر
 کی طلبی کس لیے ہوتی ہے؟ مخدوم نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کرتے
 وقت ”یا داؤد“ ”یا داؤد“ کہتے ہیں۔ آپ نے کہا نہیں ممکن ہے سُننے والے کو غلطی ہوئی
 ہو۔ ”یا داؤد“ ”یا داؤد“ کہتے ہوں گے۔ قطع نظر اس جواب کے مخدوم آپ کے
 ورع و تقویٰ کا قائل ہو گیا تھا۔ آپ نے اُسے چند نصیحتیں کیں اور شیر گڑھ کی راہ لی۔
 لے منتخب التواریخ (بدایونی)

آپ کا معمول تھا کہ سال میں ایک یا دو دفعہ جو کچھ آپ کے پاس نذر و فتوحات کی قسم سے آتا۔ تقسیم کر دیتے اور اپنے گھر میں ایک مٹی کے گزے کے سوا کچھ نہ رکھتے۔ جب حضرت غوث اعظم کا عرس میلاد آپ کی خانقاہ میں ہوتا تو بقول بدایونی ایک لاکھ کے قریب انسان جمع ہوتے اور ان سب کو لنگر میں کھانا ملتا۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر اس طرح حیران و پریشان بیٹھے رہتے تھے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے یا کسی آنے والے کے منتظر ہیں کہ اتنے میں یکایک کوئی حالت طاری ہوتی اور آپ حقائق و معارف کا بیان شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی کہتے کہ عراق کی طرف سے جو ہوا آتی ہے، اس کے ساتھ میرے دل پر فیض الہی کے جھونکے آتے ہیں۔

آپ بڑے پابندِ شریعت تھے اور کوئی امرِ خلافِ حدیث شریف آپ سے صادر نہ ہوتا۔ مشہور مورخ ملا عبد القادر بدایونی نے شیر گڑھ جا کس آپ کی زیارت کی۔ وہاں تین چار دن رہا اور شیخ کی روحانیت اور تقدس سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ کے جمال۔ کوئی ایسی چیز نظر آتی تھی جس سے دنیا کے سب صاحبِ جمال محروم ہیں اور تنہم اور تکلم کے وقت ان کے چہرے پر ایک ایسا نور چمک اٹھتا جس سے دلوں کی تاریکیاں دور ہو جاتیں اور وجہ اللہ کا بھید عیاں ہو جاتا تھا۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے بدایونی پر بڑی مہربانی کی۔ کئی نصائح ہمیش قیمت کیں اس کے مطلوبہ سوالات کا جواب دیا اور اپنی کلاہ بھی عنایت کی۔

بدایونی کی حضرت سے جو گفت و شنید ہوئی اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت امام مہدی کے ظہور کا عام طور پر انتظار ہو رہا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:-

”روزے در وقت و راح بوسیلہ میاں عبد الوہاب... عرض کردم کہ خبر در مشائخ ہند چنین است کہ وقت خروج سید سے نزدیک است و اکثرے از آن جماعت اتفاق بریکے از سادات آن دیار کہ قبل ازین بہ چند گاہ آبا و اجداد اور بر سر سلطنت دلی و بدایونی ممکن بودند نمودہ در تہیہ اسباب جہاد و استعداد و اسلحہ اندوختن و تہیہ مہم دلی امر از جانب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ و بعض از امرائے سرحدی را نیز بخود متفق ساختہ

بعضی در مقامات و اوقات بشدت مایافتہ می خواہند۔ آن داعیہ را از قوت بفعل آوردند۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اولیاء و مشائخ کے تذکروں میں خارقِ عادت و اوقات کچھ سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مشنروں کی طرح اشاعتِ مذہب کی منظم اور باقاعدہ کوششیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ فقط خارقِ عادت و اوقات سے جن کی صحت مشتبہ ہے یہ بزرگ اشاعتِ اسلام میں کامیاب ہوئے ہوں، لیکن نکتہ چین مشرقی مذاہب کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہندو لوگوں اور ریشیوں کے تذکروں میں بھی خارقِ عادت و اوقات کے سوا کچھ نہیں اور ایشیا میں مذہب پھیلانے کے لیے دوسرے مذاہب کی مذمت کے بجائے طریقِ کار ہی رہا ہے کہ داعیانِ مذہب اپنے روحانی کمالات اور اپنی خوبیوں کو نمایاں کریں اور عوام الناس عموماً خارقِ عادت و اوقات یا مقدس روحانی زندگیوں سے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ شیخ داؤد کے عام صوفیانہ تذکروں اور ملحوظات میں اشاعتِ اسلام کا کوئی ذکر نہیں، لیکن بدایونی جو تین چار دن ان کی خدمت میں رہا لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوگا، جب سو سو پچاس پچاس ہندو مع اپنے اہل و عیال کے حاضر خدمت ہو کر مسلمان نہ ہوتے ہوں! سو کم روزے بود کہ صد صد و پنجاہ پنجاہ ہندو کم و بیش باخیل و تبار خویش آمدہ در ملازمت آنحضرت بشرف اسلام نئے پیوستند و تلقین نئے گرفتند (منتخب التواریخ جلد سوم) ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے جب وہ پنجاب میں تھا، شہباز خاں کو بھیج کر چاہا کہ شیخ اس کے پاس آئیں، لیکن انھوں نے عذر کیا اور کہلا بھیجا کہ میں یہاں بیٹھا غائبانہ دعا دیتا ہوں۔ مجھ سے یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

آپ کی وفات ۸۵۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ ابو المعالی قادری جن کا مزار لاہور میں ہے، صاحبِ القصائیف اور بڑے اہل دل بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے قادریہ سلسلے کا فیض لاہور اور وسطی پنجاب میں عام کیا اور ۹۱۵ھ میں وفات پائی۔ شیخ عبد الحق محدثِ آپ کے عقیدہ تمندوس میں سے تھے۔ ہم ان دو بزرگوں کے تعلقات کی تفصیل آئندہ صفحات میں دیں گے۔

ان کا معتقد تھا اور دوسرے امراء کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ فیض کرتے۔ وفات ۱۵۶۶ء میں ہوئی۔ عوام میں آپ بحر المواجه اور شکر باب کے عرف مشہور تھے۔ آپ کے فرزند ارجمند شیخ قطب عالم تھے جن کی نسبت اخبار الاخبار میں لکھا ہے "عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ۔ قدم صفا و استقامت بجلالہ پدید نہادہ اوقات بطاعت و عبادت محمود دارد"۔ ان خوبیوں کے علاوہ شیخ قطب عالم دو اور اسباب کی بنا پر یاد کے مستحق ہیں۔ ایک تو ان کی پوتی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی دادی تھیں اور انھیں ایک ایسے خاندان سے تعلق تھا جس کے احسان اسلامی ہندوستان کبھی عمدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہ نے ایک زمانے میں ان کی خالقاہ میں رہ کر ان سے فیض حاصل کیا تھا۔ تفصیل اس کی ہم انشاء اللہ حضرت خواجہ کے احوال میں پیش کریں گے۔

شیخ سلیم چشتی | ایک اور چشتی بزرگ جنھوں نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ شیخ سلیم چشتی تھے جن کے نام پر اکبر کے بیٹے جہانگیر کا نام سلیم ہوا اور جن کی کشن سے اکبر نے ایک عرصہ تک فتح پور سیکری کو اپنا دار الخلافہ بنائے رکھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن آپ کی ولادت کے بعد آپ کے والدین فتح پور سکونت پذیر ہو گئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل آپ نے سرہند میں شیخ محمد الدین ملک العلماء سرہندی سے کی۔ کئی حج کیے اور بلاد اسلامی کی سیروسیاحت کی۔ اس سیروسیاحت کے دوران میں شیخ ابراہیم چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ عرب میں کسی لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ وہاں آپ کو شیخ الہند اور ہندوستان میں شیخ الاسلام کہتے تھے۔ ہندوستان واپس آ کر فتح پور سیکری کی پہاڑی پر آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ بالعموم روزہ سے رہتے اور ٹھنڈی اور مضعف چیزوں سے روزہ انظار کرتے۔ ہر روز ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے اور کڑکتے جاڑوں میں ایک پرہیز کے سوا کچھ نہ پیتے۔ آخر میں آپ نے شادی کی اور بادشاہ اور امراء کے اعتقاد کی وجہ سے آپ کی ظاہری حالت بہت بڑھ گئی۔ عمارتیں اور باغات اور چاہ تعمیر کروائے

چشتیہ سلسلہ

شیخ عبد العزیز چشتی دہلوی | حضرت چراغ دہلی کے بعد نظامی سلسلہ دہلی سے منتشر ہو گیا اور جو پور، کالپی، گلبرگہ، پٹن اور پٹوہ ان بزرگوں کے قدوم سے فیض یاب ہوئے، لیکن اکبر کی تخت نشینی سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اس خانوادہ کے ایک ایسے بزرگ نے ظہور کیا جنھوں نے پھر سے اولیائے کبار کی نیک نفسی اور پاک سیرتی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بزرگ شیخ عبد العزیز دہلوی ہیں جنھیں عوام میں شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن جن کا ذکر خواص کی لوح کو تازگی بخشتا ہے۔ ان کے والد شیخ حسن طاہر جو پور کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ سکندر لودھی کی استدعا پر دہلی تشریف لائے۔

شیخ عبد العزیز اپنے والد کے خلیفہ، میاں قاضی ظفر آبادی کے مرید تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل اور ابو قتال کے خلیفہ حاجی عبد الوہاب بخاری اور ان کے صاحبزادہ میر سید محمد سے کی اور ارشاد و ہدایت میں عمر صرف کر دی۔ شیخ عبد العزیز دہلوی اخبار الاخبار میں لکھتے ہیں کہ شیخ اپنے زمانے میں مشائخ چشت کی یادگار تھے اور اخلاق حسنہ مثلاً تواضع، حلم، صبر و رضا، خلق خدا پر شفقت اور عنایت فقرا میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ عبد العزیز محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ شیخ قاضی خاں کے پاس پہنچے تو اپنا مال و متاع، گھوڑا، گاڑی جو کچھ اپنے پاس تھا سارے کا سارا راہ خدا میں تقسیم کر دیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً شیخ امان پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے جواب میں آپ نے رسالہ عینہ تحریر کیا اور آداب السلوک بھی علم سلوک کے متعلق تصنیف کی۔ آپ کے والد شیخ حسن طاہر بھی مصنف تھے اور تذکروں میں ان کی کتب مفتاح القیض کا ذکر آتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبد العزیز چشتی کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔ برہم خاں

بلکہ شیخ عبدالحق تو لکھتے ہیں کہ آپ کی مجلس امرار واعنیا کی محفلوں کے مشابہ تھی۔ بعضی عادات مخالف شریعت کہ متعارف عوام باشند نیز رودادہ ہیموں کے ہاتھ سے آپ کو بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور اسی وجہ سے حرمین سے واپسی کے بعد آپ ۱۵۵۸ء میں پھر عرب واپس چلے گئے تھے، لیکن ۱۵۶۸ء میں واپس آئے اور اکبر نے سب کی تلافی کر دی۔ آپ کا روضہ بالخصوص ہاس کا بلند دروازہ ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔ آپ کی وفات ۱۵۶۸ء میں ہوئی۔

صابر سلسلہ

شیخ سلیم نے چشتیہ سلسلے میں بیعت شیخ ابراہیم چشتی سے کی تھی جو بیرون ہند کے بزرگ تھے اور شیخ حسن طاہر کا سلسلہ بیعت راجی حامد شاہ اور شیخ حمام الدین ماکپوری کی وساطت سے بنگالہ کے مشہور نظامی بزرگ شیخ نور قطب عالم پنڈوی سے ملتا ہے، لیکن اس زمانے میں شمالی ہندوستان میں چشتیہ خانوادہ کی ایک اور شاخ صابریہ نے فروغ حاصل کیا۔ ہم مخدوم احمد علاء الدین صابریہ کا حضرت بابا فرید کے خلفا کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے اپنے حالات مستند محاصرہ تذکروں میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن مرآۃ الاسرار میں جو ۱۲۲۰ء کی تالیف ہے تفصیلی حالات و روایات درج ہیں۔ ان کے پُر جوش معتقد اور بڑے شمار ہیں۔ صابریہ سلسلے میں فوق و شوق اور گرمجوشی کی فراوانی ہے۔ نظامی سلسلے کی شہرت نہیں۔ جب نظامیہ سلسلہ حکومت دہلی کے ضعف کے دوران میں اطراف ملک میں منتشر ہو گیا اور اس سلسلے کے بزرگوں نے شمالی ہندوستان کو چھوڑ کر گلبرگہ۔ جونپور۔ پنڈوہ۔ پٹن۔ کابلی وغیرہ میں ارشاد و ہدایت کے فرائض سنبھالے تو شمالی ہند میں صابریہ سلسلے کو فروغ ہوا۔ اور فیروز تغلق سے ہمالیوں کے عہد حکومت تک جو پُر شور زمانہ گزر رہا ہے۔ اس میں کسی صابری مشائخ کبار کی آتش نفسی نے مجالس ذکر و ارشاد کو حرارت دینی و روحانی عطا کی۔

مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر کلیری کے ایک ہی خلیفہ شمس الدین ترک (وفات ۱۳۱۸ء) کا نام ملتا ہے۔ ان کے خلیفہ اعظم شیخ جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی تھے۔ جن سے اس سلسلے کو صحیح طور پر وسعت اور رواج نصیب ہوا۔ ان کی وفات ۱۳۶۸ء میں ہوئی۔ آپ کے خلفاء میں سرفہرست شیخ احمد عبدالحق توشہ رودلوئی تھے۔ جنھوں نے رودلی (ضلع بارہ بنگلی) میں ایک صابریہ خانقاہ قائم کی۔ وہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے ہم عصر تھے۔ سیر و سیاحت کے دوران میں آپ نے بمقام پنڈوہ حضرت قطب عالم سے ملاقات کی، لیکن صحبت سازگار نہ آئی۔ روایت ہے کہ جب آپ حضرت کی خدمت میں تشریف لے گئے تو آپ کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے ایک برگ گیاہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا ”بابا صفا است“۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: ”بابا عزت است“ اس کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر سلسلہ سخن کو دوبارہ جنبش دے کر آپ واپس تشریف لے گئے۔ آپ کے حالات و ارشادات شیخ عبد القدوس گنگوہی نے انوار الیون کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی | شیخ عبد القدوس گنگوہی خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے کئی سلسلوں سے فیض حاصل کیا۔ لودھیوں کے عہد میں انھیں مرکزی حیثیت حاصل رہی اور صدر لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے۔ آپ کے خلفائے حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد شیخ جلال الدین تھانیسری اور شیخ عبد الغفور اعظم پوری خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ تو زک جہانگیری کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جہانگیر نے خسرو کی حمایت کی بنا پر گوردوارہ جن دیوار ایک مسلمان پیر سے مواخذہ کیا تھا۔ یہ مسلمان پیر شیخ نظام الدین بن عبد الشکور بلخی، شیخ جلال الدین تھانیسری کے خلیفہ تھے۔ انھیں ہندوستان سے جلا وطن کیا گیا۔

شیخ جلال الدین تھانیسری خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے ۹۸۹ھ یعنی ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ علوم ظاہری اور باطنی میں کامل اور عہد اکبری کے علمائے کبار میں سے سمجھے جاتے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے کہ جب اکبر بادشاہ نے

اپنے بھائی محمد حکیم میرزا کے خلاف لشکر کشی کی توراستے میں تھانیر کے مقام پر شیخ جلال الدین کی زیارت کی۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے مسئلہ توحید کی وضاحت میں یہ رباعی پڑھی۔
آفتابے درہزراں آبیگینہ تاختم پس برنگے ہریکے تاب عنال انداختہ
جملہ یک نور است مارنگہائے مختلف اختلافتے در میان این و آن انداختہ
آپ کی ایک دلچسپ تالیف تحقیق اراضی الہند ہے جس میں آپ نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اگر بادشاہ وقت کسی مسلمان کو ہندوستان میں کوئی زمین دیدے تو وہ شرعاً اس کا حق نہیں ہوتی۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ وہ زمین بیت المال کی ہے اور امام وقت جسے چاہے دے سکتا ہے۔

شیخ عبدالغنی جو عہد اکبری میں صدر الصدور تھے اور جن کا نام اس زمانے کی مذہبی مذہبی تاریخ میں کثرت سے آتا ہے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات اُن کے فرزند و سجادہ نشین شیخ زین الدین نے لطائف قدوسی کے

ردولی ناگور اور اجیر

نام سے ترتیب دیے ہیں۔ یہ کتاب بیشتر حالات زندگی ارشادات اور کرامات کا بیان ہے۔ لیکن کئی باتیں ایسی ہیں جن سے اس زمانے کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے شروع شروع میں شیخ موصوفت قصبر ردولی میں رہتے تھے، لیکن جب سلطنت کی بد نظمی کے باعث یہاں پھر ہنود کا غلبہ ہو گیا تو شیخ نے ردولی سے ہجرت کی۔ ”در طرف ہندوستان غلبہ کافراں بود۔ در پرگنہ ردولی عمل کافراں شد۔ شعار اسلام مندرس شدند۔ در بازار گوشت خوک فروختہ می شد۔ حضرت قطبی دلیگر شدہ بیرون آمدند۔ ردولی سے آپ ۱۲۹۹ھ میں شاہ آباد اور وہاں سے طویل قیام کے بعد گنگوہ دھلی سہارنپور تشریف لے گئے اور یہیں آپ کا وصال ہوا۔

ضعف حکومت سے جو حالت اس وقت ردولی کی ہو گئی تھی وہی کیفیت کئی اور اسلامی شہروں کی تھی۔ مثلاً ناگور۔ سندھ اور گجرات کے درمیان راجپوتانے کی ایک قدیمی اسلامی بستی ہے جو قاضی حمید الدین صوفی ناگوری (متوفی ۱۲۸۷ھ کے

وقت سے اہل علم کے لیے ممتاز رہی ہے۔ شیخ عبدالحق یہاں کے ایک بزرگ شیخ کبیر کی نسبت لکھتے ہیں: ”بجہت تفرقہ کہ در ناگور از دست کفار آن دیار واقع شدہ بجانب گجرات رفتہ ہماں جاساکن شدہ۔ عجب نہیں کہ ابو الفضل اور فیضی کا باپ شیخ مبارک بھی اسی کشاکش میں ناگور سے گجرات گیا ہو۔“

چند سری وغیرہ میں جو کچھ رائے سین کے ہاتھوں ہوا اس کا ذکر ہم باب کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اجیر کی حالت بھی چنداں بہتر نہ تھی۔ اخبار الانبیاء میں درج ہے

”نقل است کہ چون در اجیر غل شد و قلعہ را راناسا ناکا کہ گبرے عظیم بود از دست مسلمان گرفت

اکثر مسلمانان را شہید ساخت۔ شیخ احمد مجد پیش ازین حادثہ ہفت روزہ حکم اشارت خواہ

بزرگ خواجہ معین الحق والدین از شہر برآمد و مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے بریں شہر نظر

جلال است۔ فرمان بندگی خواجہ بریں است کہ مسلمانان از شہر برآیند۔ دو شنبہ سنہ

اثنی عشرین و تسنیم باجماع از مسلمانان از اجیر برآمد۔ دو شنبہ دیگر کافراں بربراجیر

آمدند و آن دیار را زیر دہر بر ساختند۔“

یہ شیخ احمد شیبانی وہی بزرگ ہیں جن کے مرشد خواجہ حسین ناگوری نے حضرت خواجہ بزرگ کی قبر پر پہلی شاندار عمارت تعمیر کرائی۔ مانڈو کافراں کو سلطان غیاث الدین ان کا

۱۷۰۰ء بمبار گوری شکر نے اپنی انگریزی کتاب ہسٹری آف اودے پور میں چٹوڑ کے مشہور ستون کی قیاسی تصویر (Stambha) کے کتبے کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جو ناگور کے متعلق ہے۔

”را ناگور نے سلطان گجرات سے ناگور ایک ترکیب سے فتح کر لیا۔ اس نے فیروز خاں کی بلند مسجد کو

جلادیا اور قلعہ کو ویران کر دیا۔ اس نے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مسلمان عورتوں کو قید کیا اور

بہت سے مسلمانوں کو سزا دی۔۔۔۔۔ اس نے شہر کے ساتھ اس کی تمام مسجدوں کو آگ لگا دی اور جس خاں

کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ جس سے اس کے پاس بہت سا مال و زر جمع ہو گیا۔“

اگر پٹوڑ کے اس ستون کے سارے کتبے تاریخی کتب میں جگہ پا جائیں تو اس سے راجپوتانہ کی تاریخ

کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑے!! ۱۷۰۰ء یعنی ۱۷۰۰ء میں۔

عقیدت مند تھا اور چاہتا تھا کہ وہ کوئی نذر نیاز قبول کریں۔ وہ انکار کرتے رہے، لیکن پھر بادشاہ کی درخواست قبول کی اور جو کچھ ملا۔ اُسے خواجہ بزرگ (اور شیخ حمید الدین ناگوری) کے مقبول کی تعمیر میں صرف کیا۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں: "وہ نہ مانے کہ اجیر خراب بود و حالی او بیشہ و شیراں گشتہ۔ دلاں زماں بر بلالے قبر شریف عمارت نہ بود۔ اول کسیکہ دلاں روضہ بنیاد عمارت نہاد او بود۔"

مُغلوں کی مخالفت لطائف قدوسی کے کئی اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کے اکثر مرید مغلوں

خوش نہ تھے جب ۱۵۳۵ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کا میدان پانی پت میں محرم ہو تو شیخ ابراہیم لودھی کے لشکر میں موجود تھے۔ وہ خود تو کہتے تھے کہ ابراہیم کی فتح بڑی مشتبہ ہے، لیکن بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ جب بابر کو فتح ہوئی تو یہ بھی گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھیوں کے ایک دو مرید تھے۔ ان کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر باندھ لیا گیا اور شیخ کو حکم ہوا کہ پیادہ چلیں۔ چنانچہ وہ پیادہ پانی پت سے دہلی تشریف لائے۔ لیکن بعد میں رہائی مل گئی۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی کو لودھی افغانوں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ لودھیوں بالخصوص سکندر لودھی نے پھر سے شعائر اسلام کو بلند کیا۔ اس لیے وہ ان کی برسی قدر کرتے تھے۔ سکندر لودھی کے نام ان کا ایک خط ہے جس میں اسے غم خواری خلق، بالخصوص علما اور ائمہ کی تیمارداری پر توجہ دلائی ہے۔ جب تخت دہلی پر مغل قابض ہوئے تو اپنے بابر کو ایک خط میں تاکید کی کہ شرع محمدی کی ترویج کے لیے ضروری اقدامات عمل میں لائے۔

"باید و بجز ذکر برائے شکر نعمت منعم سایہ عدل بر عالمیاں چنان کشند کہ هیچ کس ظلم نہ کند و ہر خلق و ہر سپاہ بہ او امر و نواہی شرع مستقیم بودند۔ نماز جماعت بگزاردند و علم و علما را دوست داشتند و در اندازہ ہر شہر و محنتیان بگردند۔ تا شہر و بازار را بحال شرع محمدی بیاورند و خوشی و شادمانی در میان ایشان بپراورند۔"

اسی طرح کے خط انھوں نے اپنے زمانے کے بعض امرا مثلاً خواص خاں، ہدیت خاں شروانی، ابراہیم خاں شروانی و تردی بیگ وغیرہ کو لکھے اور انھیں اتباع شریعت کی تلقین کی۔ ان خطوط کو مجدد الف ثانی کے زیادہ مشہور اور زیادہ اہم مکتوبات کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی کی وفات ۱۵۳۶ء میں ہوئی، لیکن مغلوں اور افغانوں کی کشمکش اس کے بعد بھی جاری رہی اور اس میں شیخ کے بعد مریدوں نے حصہ لیا۔ لطائف قدوسی میں کئی ایسے واقعات درج ہیں جن سے اس زمانے کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً لطائف کے مرتب نے ایک اقبہ لکھا ہے:-

"در مقام نندربار رسیدیم۔ در شب در خواب حضرت قطب الاقطاب شیخ عبد القدوس حاضر شدند فرمودند۔ اے دو۔ پیشتر بیا و پیغام گزاری ما بابران گجرات کن۔ اے دو در گجرات برو۔ کل پر این گجرات را اسلام ما برساں و بگو کہ ہمایوں بادشاہ اسلام را تاراج میکند و میدان کفر و اسلام فرق نمی کند۔ ہمہ را تاراج میکند۔ ما بعد و اسلام و بعد و شما آمدہ ایم اگر ضلے شما باشد۔ بیائیم و ما و شما یکجا شدہ ہمایوں بادشاہ را از گجرات دور کنیم۔ تا اسلام را امن و قرارے باشد۔"

ہمایوں کی یہ مخالفت مغلوں کے خلاف افغانوں سے ہمدردی کے علاوہ اس وجہ سے بھی تھی کہ اس نے گجرات کے اس بادشاہ (بہادر شاہ) کے خلاف چڑھائی کی تھی جس نے چوڑی فتح کر کے اسلام کو راجپوتانہ میں سر بلند کیا تھا۔ چنانچہ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال دیا تو بعض مذہبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا اور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے مریدان میں شامل تھے۔ لیکن یہ خوشی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ چند ہی سال بعد ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ فتح کر لیا اور اس کے بیٹے اکبر نے مغلیہ حکومت کی بنیادیں اس ملک میں اس طرح مستحکم کیں کہ صدیوں تک انھیں جنبش نہ ہوئی۔

عہدِ اکبری

اسلامی حکومت کا استحکام | خاندانِ مغلیہ کی بنیاد بوقلموں اور شکستہ مزاج بابر نے رکھی، لیکن بابر کو اصل محبت ترکستان اور افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں سے تھی اور اُس نے ہندوستان کا رخ بالکل اخیر عمر میں کیا۔

عید ہوئی ذوقِ ولے شام کو!

دہلی کی فتح کو ابھی چار سال نہ گزرے تھے کہ سلسلہ میں بابر کو موت کا پیغام آپہنچا اور دس سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے مار جھکایا۔ ہمایوں نے پندرہ سال جلاوطنی میں گزارے۔ لیکن عمر کے بالکل آخری سال میں شاہ ایران کی مدد سے اسے موقع ملا کہ شیر شاہ کے پوتے سکندر سور کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر چھپرے مغل پرچم لہرائے۔

ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندانِ سور اور مغلوں میں کشمکش ابھی جاری تھی کہ بادشاہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو گیا اور دہلی اور آگرہ پھر خاندانِ سور کے ہاتھ میں چلے گئے۔ مغلیہ حکومت کا استحکام بلکہ اس کے اصل انداز کا بار گراں اس کے سیزہ سال بیٹے اکبر کے کنڈھوں پر آن پڑا۔

اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر سے پہلے ایک اسلامی حکمران خاندان کا زمانہ حکومت سو سال سے زیادہ نہ تھا اور باقاعدہ اور مستحکم حکومت تو کسی خاندان کو نصف صدی سے زیادہ نصیب نہ ہوئی۔ اکبر سے پہلے اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ جاہ و جلال سلطان علاء الدین خلجی کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن خلجیوں کی حکومت

کتنے دن رہی؛ فقط تیس سہتیس سال۔ خاندانِ غلاماں کے تحت کسی ایسے مختلف غلام خاندان جمع کر دیے جاتے ہیں جن کا آپس میں برائے نام تعلق تھا، لیکن اگر مختلف خاندانوں کو متحدہ کریں تو کسی کی حکومت پچاس سال سے زیادہ نہیں اور سب کی ملا کر سو سال نہ ہوگی۔ خاندانِ سادات اترتیس سال برسرِ اقتدار یا برسرِ زوال رہا۔ لودھیوں کی حکومت پچھتر سال سے زیادہ نہیں۔ یہی حال تعلق خاندان کا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ دس پندرہ سال تو ایک خاندان کو پاؤں جمانے میں لگتے اور ابھی انھیں حالات کو سمجھنے اور کوئی اصول جاری کرنے ہی کا موقع نہ ملتا تھا کہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا اور پھر روزِ راول۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی مسلمان خاندانوں کی حکومت نہایت سطحی تھی اور مرکزی نظم و نسق کے علاوہ باقی اختیار ہندو پنچائتوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔

اکبر کے خاندان نے میں اسلام کی کمزوری کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے دو صدیوں میں دہلی کی حکومت بجائے ترقی کے تنزل کر رہی تھی اور ہندو مذہب کا سیاسی اور روحانی احیا ہو رہا تھا۔ روحانی احیاء نے بھگتی تحریک کی صورت اختیار کی۔ جس کے بعض راہنما مثلاً گورو نانک صلح کے حامی تھے۔ بعض (مثلاً تلخی داس) دوسرے مذہب سے بے تعلق تھے۔ بعض (مثلاً چیتنیا کے جانشین) مسلمانوں کے مخالف تھے۔ سیاسی احیاء کا سب سے اہم واقعہ جنوبی ہند میں وجے نگر کی خود مختار اور وسیع ہندو سلطنت کا قیام ہے۔ جس نے جنوب میں اسلام کی توسیع ختم کر دی اور جس کی خشتِ اول ۱۳۳۶ء میں رکھی گئی۔ شمالی ہند میں ہندو راجاؤں اور مدبرین (مثلاً رانا کنہدہ۔ رانا ساگا۔ جہرت کھوکھر۔ میدنی رائے۔ ہیموں) نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ جب بابر آیا تو شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا اقتدار حاکم ابراہیم لودھی نہ تھا۔ رانا ساگا تھا جس سے مالوہ۔ گجرات۔ خاندیش کے مسلمان بادشاہ جو بددبے اور اقتدار میں شاہِ دہلی سے بڑھ کر تھے، خم کھاتے تھے اور شکستیں کھا چکے تھے۔ اس نے خود بادشاہِ دہلی کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم لودھی نے فوجیں بھیجیں، لیکن وہ شکست کھا کر واپس آئیں اور بادشاہ کو لہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑا۔ پنجاب میں جہرت کھوکھر نے بڑا اقتدار پایا تھا مالوہ میں میدنی رائے

بظاہر وزیر لیکن فی الواقع حکمران تھا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں اکبر کا مقابل عادل شاہ سوری کا وزیر اور سپہ سالار ریواڑی کا ایک ہندو بنیا، تیموں تھا۔ اس طرح کے دوسرے بااثر ہندوؤں کے نام اس زمانے کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گے۔ ضعیف سلطنت کی وجہ سے ردولی۔ ناگور۔ اجمیر۔ چندیری اور دوسری جگہوں میں مسلمانوں کی مسجدوں اور دیگر مقدس مقامات کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بابر اور شیر شاہ نے ان حالات کی اصلاح کی اور دہلی کے مسلمان بادشاہ کا اقتدار وسیع کیا۔ لیکن وہ ہوا کے جھونکے تھے جو آئے اور نکل گئے۔ اسلامی حکومت کا اصل استحکام اکبر کو کرنا پڑا۔

فتوحات اکبری | استحکام حکومت کا یہ سب سے پہلے اکبر نے یہ کیا کہ ملک میں جو صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور مدت مدید سے آزاد تھے، انہیں پھر حکومت دہلی کے تابع کیا۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین اور ۱۵۶۰ء میں ہرم خاں کی معزولی کے بعد حاکم خود مختار ہوا۔ ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا۔ ۱۵۶۲ء میں گوندوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا۔ اس سے دو سال پہلے اکبر نے امیر (جے پور) کے راجا بہاری مل سے مصالحت کر لی تھی۔ راجا نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک کنورانی بادشاہ سے بیاہ دی۔ راجا بہاری مل کے بیٹے راجا جھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصب ملے۔ میواڑ کے راجا نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ ۱۵۶۵ء میں چوڑا اکبر کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اگلے سال کانچ اور رنچبور کے مشہور قلعے مغلوں کے قبضے میں آئے۔ ۱۵۶۷ء میں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت قبول کی۔ ۱۵۶۸ء میں گجرات فتح ہوا اور ۱۵۷۰ء میں تکرانی کی جنگ کے بعد بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ جولائی ۱۵۷۱ء تک داؤد خاں حاکم بنگالہ لڑتا رہا۔ اور اس کے بعد بھی بنگالہ میں امن و امان دیر تک قائم نہ ہوا۔

یہ فتوحات اکبری کا پہلا دور تھا۔ دوسرا دور اس زمانے سے متعلق ہے جب ۱۵۸۹ء سے ۱۵۹۵ء تک اکبر لاہور میں مقیم رہا۔ اس دوران میں کشمیر جو کبھی بھی حکومت دہلی

کے تابع نہ تھا، فتح ہوا۔ (۱۵۸۶ء)۔ ۱۵۹۱ء میں سندھ اور ۱۵۹۲ء میں ہاریہ مقبوضات اکبری میں شامل ہوئے۔ ۱۵۹۵ء میں بلوچستان فتح ہوا اور قندھار اکبر کے قبضے میں آیا۔ اب اکبر کو دکن کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی۔ ۶ نومبر ۱۵۹۹ء کو اس نے لاہور کو خیر باد کہا اور چند مہینے آگرے میں قیام کے بعد اگلے سال دکن جا پہنچا۔ چنانچہ اسی سال احمد نگر کا قلعہ فتح ہوا اور ایک وسیع مملکت اکبر کے قبضے میں آئی۔ ۱۶۰۱ء میں خاندیش کا مضبوط قلعہ اسیر گڑھ سرہو اور احمد نگر اور خاندیش کے علاقے ایک وسیع مغل صوبے میں منتقل ہو گئے۔ اکبر مئی ۱۶۰۱ء میں آگرے واپس آیا اور چار سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مغلیہ نظام حکومت | اکبر کی مسلسل فتوحات اسے تاریخ میں ایک خاص درجہ دے دیتی ہیں، لیکن ملک گیری آسان، ملک بانی مشکل۔ اکبر کا اس سے بھی اہم کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم و نسق اور ملکی حکومت کے لیے نظام مرتب کرنا تھا، جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا۔ اور کئی امور میں برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنا۔ جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں۔ مغلیہ نظام حکومت کا ماحول اکبر تھا۔ عالمگیر نے اس کے نظام سلطنت میں بعض تبدیلیاں کیں، لیکن اس کا دیباہی مودع بھی عالمگیر نامہ میں اکبر کی نسبت لکھا ہے: "حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئین جہان بانی و مشید قوانین آئین بایں سلطنت جاودانی اند (ص ۳۸۷) اکبر کی مسلسل فتوحات اور اس کے کامیاب نظم و نسق کا لازماً سب سے زیادہ ان امرا و اراکین سلطنت کی قابلیت، فرض شناسی اور وفاداری میں پنہاں ہے جو اکبر نے اپنے گرد جمع کر لیے تھے۔ جیسا کہ عالمگیر نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ "حضرت عرش آشیانی کہ نوکران خوب داشتند، از ہمیں جہت فتوحات متواترہ و مہمات متکاثرہ مے فرمودند" اکبر اس معاملے میں خوش قسمت تھا، لیکن "نوکران خوب" کے حاصل کرنے، انہیں "خوب" سے "خوب تر" بنانے، ان کی "مہمیت" اور ان کی

قدر شناسی اور دلجوئی کی جو مسلسل کوششیں عہد اکبری میں ہوتی رہیں، اس پر ابوالفضل کی تحریریں گواہ ہیں۔

مغلیہ نظام حکومت کی کامیابی، دور دراز صوبوں پر مرکزی حکومت کی مسلسل گرفت اور بلخاوتوں کے فقدان کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے تمام اعلیٰ اسامیوں کے لیے ایک منصب داری نظام قائم کر دیا، جس کے اراکین ملک کی تمام اہم اسامیوں پر فائز ہوتے تھے۔ اچھی فکر کردگی پر ان کی ترقی کے امکانات تھے۔ اور وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ وہ مرکزی حکومت کے حکم دیتے اور ان کے انتخاب اور ان کی تربیت پر برسی توجہ ہوتی۔ جیسا کہ پرسیل سپرنے لکھا ہے۔ یہ مرکزی نظام منصب داری اس امپیریل سروس سے اصولی طور پر مختلف نہ تھا، جس کے بل پر انگریزوں نے حکومت کی۔ اور جس کے فقدان کی وجہ سے ابتدائی اسلامی حکومت میں تسلسل اور گیرانی کی کمی تھی۔

اکبر کا تیسرا اہم کارنامہ معاملہ زمین کا بندوبست تھا۔ جو اب بھی معمولی ترمیمات کے ساتھ ملک میں رائج ہے۔ ایک زراعتی ملک میں اس مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہے اور اس کے بہترین حل کے لیے اکبر نے جس طرح سب سے تجربہ کار (مثلاً ٹوڈل) اور سمجھ دار (مثلاً امیر فتح اللہ شیرازی) عہدہ داروں سے کام لیا اور جو مختلف تجربے کیے، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہم امور میں کتنی عرق ریزی سے کام لیا جاتا تھا۔

اکبر نے کئی ایک غلطیاں بھی کیں۔ بالخصوص مذہبی معاملات میں ایک زمانے میں اس نے ایسی خود سری اور ناعاقبت اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ اب اس کی خوبیاں بھی نظر سے اوجھل ہیں۔ لیکن اگر صرف انتظامی امور کا یہ غور مطالعہ کریں تو خیال ہوتا ہے کہ عام طور پر انصاف، رضا جوئی حق اور خبر گیری خلق کی خواہش غالب تھی۔ یہی مطلب نظر عام طور پر مغلیہ حکمرانوں کا تھا۔ بلاشبہ بسا اوقات نیک ارادوں اور کاموں میں تفاوت رہتا اور مطلق العنان طرز حکومت میں ظلم اور

بے انصافی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے، لیکن کم از کم عدل اور رضا جوئی حق کا مقصد حکمرانوں کے سامنے تھا۔ اور اس سے نظام حکومت میں ایک اعتدال اور توازن آگیا، جس کی وجہ سے مغلیہ حکومت پائدار ہوئی اور اختتام کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد محفوظ رہی۔

علوم و فنون کی سرپرستی | توسیع مملکت اور مدبرانہ نظم و نسق کے علاوہ اکبر نے اپنے جانشینوں کے لیے علوم و فنون کی وسیع پیمانی پر سرپرستی کی وہ روایات قائم کیں جنہوں نے مغلیہ تہذیب و تمدن کو آب و تاب بخشی۔ مغلوں سے پہلے بھی تخت دہلی پر بڑے عظیم الشان بادشاہ ہوئے، لیکن شعر و ادب و فن کی باقاعدہ سرپرستی کی روایات قائم نہ ہوئیں۔ امیر خسرو جیسے شاعر سے سلطان علاء الدین خلجی نے جو کم نگہی برتی، وہ خود ایک عبرتناک حقیقت ہے۔ ملک الشعرا کا عہدہ پہلی مرتبہ اکبر کے زمانے میں قائم ہوا۔ درباری مورخ کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ مصوری اور موسیقی کی وسیع پیمانی پر سرپرستی کی گئی۔ اکبر خود ان پڑھ تھا، لیکن اہل علم کی قدر کرتا اور مشہور کتابیں باقاعدگی سے پڑھوا کر سناتا۔ جتنے کہ اس نے اپنی ناخواندگی کی بڑی حد تک تلافی کر لی اور اس کے دربار میں تصنیف و ترجمہ کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ دار الخلافہ میں ایک طرح کی اکادمی قائم ہو گئی جس میں ملک کے برگزیدہ اہل قلم تصنیف و تالیف میں مشغول تھے، جنہوں نے ادبی معیار کو بڑا بلند کر دیا۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان کتابوں کی طویل فہرست دی ہے، جو اکبر پڑھوا کر سناتا تھا۔ اس میں اخلاق، تاریخ، تصوف اور ادب کی اکثر مشہور کتابیں ہیں۔ مثلاً اخلاق نامہ، کیمیائے سعادت، گلستان، بوستان، قابوس نامہ، شاہ نامہ، مثنوی مولانا روم، پنج شہرت منیری کے مکتوبات، ملا جاتی اور امیر خسرو کی تصنیفات وغیرہ۔ بلکہ ابوالفضل تو کہتا ہے کہ مشہور کتابوں میں شاید ہی کوئی ہوگی، جو اکبر کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔

اکبر کے ادبی ذوق کا محور اس اندازہ بدایونی کے طرز تحریر کے متعلق اس کی رائے سے ہوتا ہے۔ بدایونی اکبر کا پیش امام تھا۔ اس نے اپنی منتخب التواریخ میں اکبر کی بدنامی کا جو سامان جمع کیا ہے۔ اس سے اہل علم واقف ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے ایسے شخص کو اتنی مدت کیوں اپنے قریب رکھا؟ یہ صحیح ہے کہ بدایونی اپنی کتاب چھپ چھپا کر لکھتا تھا اور اس نے کسی فرد بشر پر اس کا راز ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ شروع میں آزاد خیال گروہ کا ترجمان تھا۔ اس لیے اکبر کو کچھ عرصہ اس وجہ سے بھی غلط فہمی رہی ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ بدایونی کا مزاج اپنا تھا۔ وہ اہل شرع سے زیادہ ادیب اور فنکار تھا۔ بین خوب بجاتا تھا، جو متشرع حلقوں میں شاید ہی پسند ہو۔ طبیعت میں ایک طرح کی وارفتگی اور بے نیازی تھی۔ لیکن بدایونی خود لکھتا ہے کہ اکبر نے اس کی ”فقاہت و تعصب“ کا اندازہ لگالیا تھا۔ (مرامتہم بہ فقاہت و تعصب دانشمند) بلکہ بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا: ”کہ مافلانے را کہ عبارت از فقیر باشد، جو آنے صوفی مشربے خیال می کردم۔ اما او چنان فقیہ متعصب ظاہر شد کہ بیچ شمشیرے رگ گردن تعصب اور انتواند برید“ چنانچہ اس کے بعد طے ہوا کہ اسے اجیر میں روضہ کا متولی بنا کر بھیج دیا جائے۔ بدایونی بہت خوش تھا۔ اس نے یاد دہانی بھی کرائی لیکن کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا: ”اگرچہ از فلاںے (بدایونی) خدمت اجیر ہم خوب می آید۔ اما چون چیز بار بار و ترجمہ میفرمایم۔ بسیار خوب و خاطر خواہ مامی نویسد۔ نئے خواہیم کہ از با جلد باشد“ یعنی اکبر بدایونی کو اس کے تعصب اور فقیہ مشربی کے باوجود اس لیے اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ ترجمہ خوب اور خاطر خواہ کرتا تھا!!

اکبر نے صرف علوم و فنون کی سرپرستی نہیں کی بلکہ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی بھی پوری کوشش کی۔ ایران، کشمیر اور دوسرے ممالک کے کاریگروں کو لاہور، اگرہ، احمد آباد میں جمع کیا تاکہ وہ شال بانی، قالین سازی، ملبوسات کے کارخانے قائم کریں۔ عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں کی بنی ہوئی چیزیں پہنیں۔ نتیجہ یہ

تھا کہ بہت سی صنعتیں رائج ہو گئیں، جو اکبر کے بعد بھی جاری رہیں۔

طریق صلح کل

اکبر اپنے خاص دائرہ عمل یعنی ملک گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا اور اسلامی حکومت کو جس طرح اس نے مستحکم کیا، کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا، لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرہ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا اور خوشامدی و ربا ریوں کی واہ واہ میں بعض ایسی بالفاظیوں کا مرتکب بھی ہوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہو گئے ہیں۔ اکبر کی مذہبی بوجہوں کو کوئی واقف کار پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ جن منزلوں سے گزر کر اور جن وجوہات کی بنا پر اکبر نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی ان کا مطالعہ بڑا جبرتناک اور سبق آموز ہے، اس لیے ہم انہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ اکبر کی مذہبی پالیسی کے دو پہلو تھے ایک انتظامی اور سیاسی معاملات میں ”صلح کل“ کی پالیسی۔ اور دوسرے مریدان شاہی اور دوسروں کے لیے قواعد و آئین کا وہ مکتوبہ جسے بسا اوقات ”دین الہی“ کہا جاتا ہے، لیکن جسے بدایونی اور ابوالفضل دونوں ”آئین راہمنوی“ یا ”آرادت“ یا ”مریدی“ کا نام دیتے ہیں۔ بسا اوقات ان چیزوں کو غلط ملطہ کر دیا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت ان کی حیثیت مختلف ہے اور ان کے آغاز میں کئی سال کا فرق تھا۔ ”صلح کل“ کی پالیسی جو فی الحقیقت ایک سیاسی اور انتظامی طریق کار ہے، اکبری حکومت کی بالکل ابتدا میں اختیار کر لی گئی۔ جہاں گیر اپنے والد کی اس ”صلح کل“ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

ارباب مل مختلفہ را در وسعت آباد دولت بے بدیش جا، بخلاف سائر ولایات عالم کہ شیخ را بغیر از ایران و سنی را در (بغیر از) روم و ہندوستان و توران جانیست۔ چنانچہ در دائرہ وسیع الفضائے رحمت از دی جمیع طوائف و ارباب مل راجاست بمقتضائے آنکہ سایہ می باید کہ پر تو ذات باشند۔ در ممالک محروسہ اش کہ ہر حد بہ کنار دریائے شور منبتی گشتہ۔ ارباب ملتہائے مختلف و عقیدت ہائے صحیح و ناقص را جا بودہ راہ تعرض بستہ گشتہ۔ سنی یا شیعہ در یک مسجد و فرنگی یا یہودی

دریک کلیسا طریق عبادت می سپردند۔ صلح کل شیوہ مقرر ایشاں بود۔ بانیکاں و خواہاں
کہ ہر دین و آئین محبت می داشتند۔ و بقدر حالت و فہمیدگی التفات ہائے فرمودند۔

(تذکب جہانگیری ص ۱۷۱)

صلح کل جس کی جہانگیر نے اتنی تعریف کی ہے، اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں بالکل
نئی چیز نہ تھی۔ جہاں تک مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری اور سب طبقات کو حکومت میں
حصہ دینے کا تعلق ہے، فاتح سندھ محمد بن قاسم نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ کشمیر
میں سلطان زین العابدین کا عہد حکومت طریق صلح کل کے لیے یادگار ہے۔ فرق
لمی اور بلشی کا تھا۔ بلاشبہ اکبر نے اسے بڑی وسعت دی اور اپنی حکومت کے آغاز
سے اس پر عمل پیرا ہوا۔ پہلی راجپوت شہزادی سے شادی ۱۵۶۲ء میں ہوئی۔ راجا
بھگوان داس اور راجا مان سنگھ کو اعلیٰ مناصب اس کے فوراً بعد ملے۔ جزیہ ۱۵۶۵ء
میں برطرف ہوا۔ یا تر اٹیکس بھی اگلے سال موقوف ہو گیا۔ دربار میں اس وقت
مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زور تھا۔ لیکن ان کی طرف سے کسی مزاحمت کا
بدایونی یا کسی اور مورخ نے ذکر نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ صلح کل کی پالیسی سے مسلمانوں
کو نظام حکومت میں جو اہمیت حاصل تھی، اس میں کسی قدر کمی ہو گئی اور ایک حد تک
غیر مسلم بھی شریک حکومت ہو گئے۔ اس سے بعض پیچیدگیاں بڑھیں اور ہندوؤں
نے اطراف ملک میں اس پالیسی کا جس طرح ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا ذکر ہم آگے
چل کر کریں گے۔ لیکن چونکہ یہ اقدامات زیادہ تر سیاسی اور انتظامی تھے، مذہبی نہ
تھے۔ اور اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں (مثلاً شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کے
عہد میں) ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیے جانے کی کئی مثالیں مل جاتی تھیں،
اس لیے ان اقدامات کی مسلمان امرا یا علما نے مخالفت نہ کی اور صلح کل کا طریقہ
مغل نظام کا جزو ہو گیا، جو تغیر و تبدل کے ساتھ اکبر کے بعد بھی برقرار رہا۔

اکبر کے جن اقدامات نے مسلمانوں کو زیادہ دیکھ بھنچایا اور جن کی بجا طور پر سخت
مخالفت ہوئی، وہ اس کے کوئی پندرہ بیس سال بعد عمل میں آئے اور وہ قواعد و

احکام تھے، جن کو ”دین الہی“ کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد عبادت خانہ کی تلخ اور
شرانگیز بحثوں میں رکھی گئی۔ ان کا نتیجہ ۱۵۶۹ء کا محضر تھا، جس کے مطابق بعض حالات
میں بادشاہ کو اختلافی مسائل کے فیصلے کا اختیار دیا گیا۔ خوشامدیوں نے کہنا شروع
کیا کہ پرانی پیشینگوئیوں کے مطابق اختلافوں کے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ دکن میں ایک
بادشاہ نے ”جگت گورو“ کا لقب اختیار کیا۔ اکبر نے بھی جو زیادہ سے زیادہ اختیارات
اپنے پاس چاہتا تھا۔ دنیوی حکومت کے ساتھ دینی راہنمائی کے میدان میں قدم
رکھا اور مریدوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جن کے آئین و طریقے مختلف مذہبوں سے جمع
کئے گئے تھے اور جنہیں بعد کے بعض مورخین نے ”دین الہی“ کا نام دیا۔ ایک مسلمان
بادشاہ کی طرف سے یہ اقدامات مسلمانوں کو سخت ناپسند تھے۔ لیکن ان کا طریق صلح کل
سے جس کی جہانگیر اتنی تعریف کرتا ہے، کوئی تعلق نہ تھا اور فی الحقیقت ایک حاکم کا
ایک خاص سلسلہ کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کرنا اور اسے ایک خاص درجہ دینا
طریق صلح کل کی خلاف ورزی ہے۔

اکبر ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوا اور تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اٹھارہ بیس

اکبر کی ابتدائی مذہبی حالت

برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے خوش اعتقاد اور پابند مذہب
ترک کرتے ہیں، اسی طرح ارکان مذہب کی وہ بھی دل و جان سے بجا آوری کرتا۔ اس نے
باپ کی سحرانوردی کے زمانے میں دنیا کا سرد گرم چکھتا تھا اور طبیعت میں سوز و گداز
اور روحانی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جب بارہ برس کی مالوسی اور سرگردانی کے بعد پھر تاج
و تخت نصیب ہوا تو گردن خود بخود ریت کا ساز کے سامنے سجدہ شکر میں جھک جاتی۔
شاہان سور نے علما کو بڑا زور و اقتدار دے رکھا تھا۔ اس میں ملکی مصلحتیں بھی
تھیں اور طبیعت کا لگاؤ بھی۔ اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا۔ جابجا قاضی و مفتی
مقرر کیے۔ مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قد و منزلت بڑھادی اور صدر الصدور کو
وہ اختیار دیے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملے تھے۔ مخدوم الملک تو امور ملکی میں

اس کے مشیر اور رکن سلطنت تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالغنی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا۔ ایک دفعہ جوتے ان کے سامنے اٹھا کر رکھے۔ شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقوے و پرہیزگاری میں فرو تھے۔ ان کی تلقین و تعلیم اور فیض صحبت سے یہ حال ہوا کہ ملا باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر خود اذان دیتا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے بھاڑ دیتا۔

اکبر کا جو اپنا رنگ طبیعت تھا، وہ خانگی اثرات سے اندر گہرا ہو گیا۔ ایک دفعہ اس کا عالم شباب تھا۔ جشن سالگرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر مجلس رائے سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالغنی نے (جنہیں بعد میں شہادت نصیب ہوئی) سر دیوار ٹوکا اور اس شدت کے ساتھ کہ عصا کا سراپا بادشاہ کو جا لگا۔ اکبر چپ ہو گیا۔ لیکن اندر جا کر ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا کہ بٹیا یہ رنج کا مقام نہیں باعث نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا۔

ایک دفعہ سلطان الہند خواجہ اجیمیری سے عقیدت پیدا ہو گئی اور پھر تو یہ حال ہوا کہ سال بسال اجیمیر جاتا تھا۔ کوئی مهم یا خاص مراد ہو تو اس کے علاوہ بھی۔ ایک منزل سے پیادہ پا جاتا تھا اور بعض منبتیں (مثلاً جہانگیر کے تولد سے پہلے) تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجیمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاوا چڑھاتا اور پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔ فوج کا نعرہ "یا ہادی یا حسین" تھا اور علامہ شیرانی کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ بندگ کو دسویں صدی ہجری سے جو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے، اس میں اکبر کی ارادتمندی کو بہت دخل تھا۔

عبادت خانہ

اکبر سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصول برکت کے لیے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا اور انہی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۵۷۰ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بنی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پُرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا۔ مذہبی امور میں بالآخر اس کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۱۵۷۵ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آکر یہاں بارگاہ منقذ ہوتا تھا جس میں مشائخ وقت علماء و فضلا اور چند مقرب درگاہ شریک ہوتے تھے اور خدا شناسی اور حق پرستی کی حکایتیں اور روایتیں بیان ہوتی تھیں۔

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا لیکن بالآخر انہی نے اسے بد مذہبی کا رستا دکھایا اور ان کا ایک باعث ان علماء و فضلا کی کفر و بدعتیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے نیچے کیوں رہوں جب یہ قضیہ طے ہوا تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی بے ہالت دکھاوے۔ بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا۔ جس سے بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا اور اس نے کہا جو کوئی نامعقول باتیں کرے اسے محفل سے اٹھا دیا جائے۔ ملا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ اس وقت آصف خاں پاس کھڑا تھا۔ ملا صاحب نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اٹھنا پڑے گا۔ بادشاہ نے سنا تو بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو بدایونی کے الفاظ سنا لئے۔

اپنی عزت اور دوسروں کی خفت کے لیے علم و فضل کے دعویدار جو حربے استعمال کرتے تھے، ان کا اندازہ ایک لطیفے سے ہوتا ہے۔ جسے بدایونی نے درج کتاب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ جب مرزا مغلس نے دربار شاہی میں ایک تفسیر پیش کی تو اس وقت حاجی ابراہیم سرہندی نے ان سے سر دربار پوچھا کہ آپ یہ تو بتائیے کہ موسے کا کیا صیغہ ہے اور اس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی میں طاق تھے، لیکن اس سوال کا ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ لوگ لے اڑے کہ حاجی نے مرزا مغلس کو جواب کر دیا اور اس جیسا کوئی لائق نہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد بادشاہ نے ایک عالم سے پوچھا کہ تم ہماری علمی مجلس میں کیوں نہیں آتے۔ وہ بچار کہنے لگا کہ میں آؤں تو سی، لیکن اگر وہاں حاجی ابراہیم مجھ سے پوچھیں کہ عیسے کا کیا صیغہ ہے تو فرمائیے کیا جواب دوں!

اکبر کی اس مجلس میں ملک بھر کے منتخب علما آتے تھے، لیکن اسے علمی مجلس کہنا تکلف ہے جو لوگ شریک ہوتے تھے، ان کا مقصد علم کی توسیع نہ تھا بلکہ ان کی تسکین اور دوسروں کی تضحیک و توہی۔ جب ملا عبدالقادر بدایونی اس مجلس میں پہلے پہل آئے تو انھوں نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور حاجی ابراہیم سرہندی اور دوسرے قدامت پسندوں کو نیچا دکھا کے اپنی سر بلندی کا سامان کیا۔ بادشاہ انھیں دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ حاجی کا سر پھوڑنے والا آگیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حاجی کو خوب خوب الزام دیے اور شیخ عبدالنبی کی بھی خبر لی

اگر معاملہ ذاتی فضیلت بنانے اور ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل تک رہتا تب بھی شاید اکبر اسلام سے بدظن نہ ہوتا، لیکن علمائے اہم مسائل پر اس طرح اختلاف کیا کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ ایک عالم ایک چیز کو حرام کہتا تھا۔ دوسرا اس کے حلال ہونے کا فتوے دیتا تھا۔ بادشاہ نہ صرف دونوں سے بدظن ہو گیا بلکہ حرام اور حلال کی تعین ہی اس کے دماغ میں نہ رہی۔ اس منہول میں پہلا قدم ملا عبدالقادر بدایونی

نے دکھایا اور وہ بھی ایک نازک ذاتی مسئلے پر۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ عبادت خانہ کے مباحثوں میں تعدد ازواج پر گفتگو ہوئی تو بادشاہ کو بھی خیال ہوا کہ کسی حرم کو رخصت کیے بغیر کسی طرح شرع کی پابندی ہو جائے۔ دو ایک نے متحہ کا راستہ دکھایا۔ دوسروں نے اس کی حنفی فقہ کی رو سے مخالفت کی۔ اس پر بدایونی نے کہا کہ اگر ایک مالکی قاضی اس کے حق میں اپنے اصول کی رو سے فتوے دیدے تو ایک حنفی کے لیے بھی متحہ جائز ہے۔ بادشاہ کو اور کیا چاہیے تھا۔ دربار سے حنفی قاضی کو رخصت کیا اور اس کی جگہ مالکی قاضی حسین عرب کی کی تعیناتی ہوئی، جس نے فوراً حسب الطلب فتوے دے دیا۔

یہ واقعہ ۹۸۳ھ کا ہے۔ بدایونی اسے بیان کر کے لکھتا ہے: ”وہاں رازر صدر تاحمد دوم الملک وقاضی وغیر ایشاں ازین کار و بار حالت عجیب روئے داد۔ و ابتدائے خزاں و عہد خرویت ایشاں شد“ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۹) بادشاہ کو فقہی اختلافات نے آزادی کا راستہ دکھایا اور بقول بدایونی ”وازد روز باز راہ خلافت و اختلاف باز شد تا زمانیکہ نوبت بہ اجتہاد رسید“ بڑی خرابی اس وقت ہوئی جب سب فرقوں اور طریقوں کے عالم آگئے اور شیعہ، سنی، صوفی، مہدوی خیالات اور اختلافات بادشاہ کے سامنے آئے۔ شیعہ عالم ملا محمد یزدی جنھوں نے بعد میں بادشاہ کے کفر کا فتوے دیا اور دولت شہادت سے بہرہ یاب ہوئے، ان جھگڑوں میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے خلوت کی ملاقاتوں میں پہلے تین خلفاء، بعض دوسرے صحابہؓ، اولیائے کبار فرقہ اہل سنت والجماعت اور سنی علما کو بہت برا بھلا کہا اور سب کے گمراہ ہونے کا فتوے دیا۔ بقول بدایونی:-

و ملا محمد یزدی۔ نیز برآں صولت کہ گزشت بالا رفتہ طعن صریح و نامزائے قبیح بر خلفاء ثلاثہ گفتہ و تکفیر و تفسیق عامہ صحابہ کبر و تابعین و تبع تابعین و سلف و خلف صالحین از متقدمین و متاخرین رضی اللہ عنہم کردہ اہل سنت و جماعت را محقر و مان در نظر نون گرفت و غیر از مذکورہ ہمہ را ضال و مضل گردانید۔

تفصیل نہیں دیتا، لیکن وہ کہتا ہے کہ ان بھٹوں میں حقیقت سے پردہ اٹھ گیا۔ بادشاہ نے ہر ایک کی قابلیت اور اصلیت پہچان لی۔ بعض عقل و خرد والے جو گوشہ نشین تھے ان میں تھے، بام بلندی پر جا پہنچے اور جو لوگ تعصب و تعلید کے غلام تھے اور چرب زبانی اور نقل آرائی کے زور پر اپنے آپ کو دانشمند اور حکیم سمجھے بیٹھے تھے، ان کی اصلیت بے نقاب ہو گئی۔

مخدوم الملک و رصد الصدور | اکبر کے ابتدائی دور میں جو علماء سے دربار تھے، ان میں سب کا اثر شیخ الاسلام مخدوم الملک عبد اللہ

سلطان پوری اور شیخ عبد اللہ صدر الصدور تھے۔ مخدوم الملک سلطان پوری (نواح جالندھر) کے رہنے والے تھے۔ مولانا عبد القادر سہروردی سے کسب علم کیا۔ فقہ اور دوسرے اسلامی علوم میں کمال حاصل کیا اور سیرت کی ایک کتاب کے علاوہ شرح ملا پر بھی حاشیہ لکھا۔ گلزار ابرار کے بیان کے مطابق ان کی کھلی ہوئی تالیفات اور تعلیقات تو بہت ہیں، لیکن عصمت الانبیاء منہاج الوصول اور رسالہ تفضیل عقل بر علم بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ ۵۲۸ھ میں میر ابو البقا جو ایران اور توران کے تمام علماء اور فضلاء میں افضل تھے، ہند میں آئے اور یہاں کے علماء کے ساتھ علم آرائی کی مجلسیں ہوئیں تو انھوں نے مخدوم الملک کو سب پر ترجیح دی۔ جب ان کا شہر بلند ہوا تو ہمایوں نے انھیں مخدوم الملک کا خطاب دیا۔ شیخ الاسلام کا خطاب انھوں نے شیر شاہ سے حاصل کیا۔ جب وہ مرا اور سلیم شاہ تخت نشین ہوا تو ان کا زور اور بد بڑھ گیا۔ سلیم شاہ جانتا تھا کہ عوام پر ان کا اثر ہے اور وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کا بڑا ادب کرتا تھا اور ملاقات کے وقت برابر بٹھایا کرتا تھا۔ مخدوم الملک نے اپنا اختیار اقتدار دو کاموں کے لیے استعمال کیا۔ ایک تو کسب زر کے لیے اور دوسرے فساد مملکت کا خطرہ دکھا کے ہر اس عالم اور درویش کو اذیت پہنچانے کے لیے جو ان سے کسی مسلم میں اختلاف رکھتا تھا۔ جمع اموال کا یہ عالم تھا کہ جب وہ مرے تو تین کروڑ روپے نقد ان کے گھر سے نکلے۔ ان کے گور خانے میں سے چند صندوق لئے، جن میں سونے کی

ایٹنٹس چھپی ہوئی تھیں، جو مردوں کے بہانے سے دفن کیے ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت کارنگ بالکل ظاہر پرستی کا تھا اور اگر وہ شرعی حیلوں سے شارع کا اصل مقصد غرض کر دیتے تو انھیں ذرا تامل نہ ہوتا۔ زکوٰۃ اور حج جیسے اہم ارکان مذہبی کی نسبت ان کا عمل یہ تھا کہ سال کے اخیر میں تمام مال بی بی کو ہبہ کر دیتے اور وہ نیک بخت سال کے اندر پھر انھیں واپس کر دیتی تاکہ اس حیلہ شرعی سے زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ اس طرح جب حج کے متعلق ان سے کوئی پوچھتا کہ ”بر شما حج فرض شدہ“ تو جواب ملتاتے: ”وہ یہ بتاتے کہ خشکی سے جائیں تو رافضیوں کے ملک سے گزرنا پڑتا ہے۔ تری کی راہ جائیں تو فرنگیوں سے عہد و پیمان کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلت ہے۔ پس دونوں طرح ناجائز ہے۔ اس خیال کی تائید میں سو سے زیادہ روایتیں نکال رکھی تھیں۔ (گلزار ابرار)۔

خاندان سور کے زمانہ حکومت میں مہدویہ فرقہ زوروں پر تھا اور چونکہ اس جماعت کی بعض باتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعمیل میں تھیں، اس لیے کئی نیک اور مخلص لوگ اس میں شریک ہو گئے تھے اور بعض لوگ جو مہدی جو پوری کے قائل نہ تھے، وہ بھی مہدویوں کے طور طریقوں کی قدر کرتے تھے۔ مخدوم الملک ان سب کے سخت مخالف تھے اور انھوں نے مہدویت کا الزام دے کر بڑے بڑے پالکا اور قتل عزت بزرگوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ شیخ علانی کو جن کی نیکی۔ حق پرستی اور علم و فضل کے سب مورخ گواہ ہیں۔ کوڑوں سے اس طرح بٹوایا کہ وہ شہید ہو گئے۔ شیخ داؤد شیر گڑھی کو بھی انھوں نے اسی طرح پریشان کرنے کی کوشش کی۔ کسی پر مہدویت کی تہمت لگتی۔ کسی کی تصنیفات کے متعلق کہا جاتا: ”اندوے بوئے فتنہ می آید۔“ غرض ان کا شکنجہ ہر ایک کے لیے تیار رہتا تھا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے: ”بھول طارا عصبیت (کہ آں را محبت دین نامند) بیشتر بود۔ در پردہ دین داری استیغاسے قوت غضبی بر وجه اتم سے نمود۔“ اور تو اور، بدایونی ان کے تعصب کا

شاک ہے اور تذکرہ علمائے ہند میں بھی ان کی علمیت (مکانہ و دواں) و ترویج شریعت کی تعریف کے ساتھ ساتھ انھیں "سنی معتصب" کہا گیا ہے۔

شیخ عبدالباقی صدر الصدور مشہور صابری بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔ حرمین میں جا کر علم حدیث کا مطالعہ کیا اور محدثین کی وضع اختیار کی۔ ان کے والد نے سماع کے جواز میں رسالہ لکھا تھا۔ انھوں نے تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ اس آزادی اور شہرت دیانت نے ۱۲۵۳ھ میں صدر کی مسند پر لا بٹھایا۔ وہ مخدوم الملک کے عمر میں چھوٹے تھے اور ان کی طرح غاصب اور ظالم نہ تھے۔ لیکن مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں صدر الصدور کے دستخط سے ملتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس ضمن میں شیخ کے متوسلین رشوت لیتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے انھیں نقصان پہنچایا وہ مخدوم الملک کا عناد اور دربار کا نیازنگ تھا۔ مخدوم نے عبادت خانے کے مباحثوں میں ان پر نکتہ چینی شروع کی۔ ان کے خلاف ایک رسالہ لکھا، جس میں اس قسم کی باتیں تھیں کہ شیخ عبدالباقی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کو برا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو فرض کے الزام میں ناحق مروا ڈالا۔ اپنے والد سے جھگڑت سماع کے متعلق شیخ عبدالباقی کا اختلاف تھا اور شاید والد نے انھیں علمدہ بھی کر رکھا تھا۔ مخدوم الملک صاحب نے فتوے دیا کہ شیخ کے پیچھے نماز جائز نہیں کیونکہ اسے باپ نے حاق کر دیا ہے اور اسے خونی بوا سیر بھی ہے۔ جب مخدوم الملک نے اس طرح صدر الصدور کی مخالفت اور تضحیک شروع کی تو انھوں نے بھی مخدوم پر بے علمی اور گمراہی کے الزام لگائے اور علماء کے دو گروہ ہو گئے نئے نئے مشلوں میں جھگڑتے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے ایک دوسرے کو ذلیل کرتے۔

بدایونی نے عبد اکبری کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علماء کا اقتدار ان کی کج بختیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خوابوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے: "ہر فتویٰ کہ

دریں زماں در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ۔ از شومئ علمائے سورا ست کہ فی الحقیقت شرار مردم و نصوص دین اند۔" اور ان دو بزرگوں کو اس بیان کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ "علماء سور" سے مخدوم الملک اور شیخ عبدالباقی مراد ہیں حضرت مجدد نے "علماء سور" کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمدناظم ندوی کی رائے ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جنھوں نے تعلیمات مجددیہ کے پیش لفظ میں "علماء سور" سے "مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابوالفضل اور فیضی اور تاج الدین دہلوی (کذا)" مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خاں بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو، جنھوں نے بادشاہ کے لیے سجدہ تحیت جائز قرار دیا۔ بدایونی کے علاوہ عہد مغلیہ میں علماء کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا ماخذ منتخب التواریخ نہیں۔ ان میں بالعموم شیخ عبدالباقی اور مخدوم الملک کی تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجدد کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری حضرات القدس کے مصنف) جنھیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا سنوالات الاقیا (قلمی) میں شیخ عبدالباقی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"شیخ عبدالباقی ابن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود۔۔۔۔۔ تسرع بر کمال داشت۔ و در اتباع سنت و رفع بدعت و سوغ تمام نصیب وقت او شدہ بود۔ و در امر معروف و نہی منکر بر سلاطین و امر اشدت کردند۔۔۔ صاحب تصانیف شریفہ است۔ از انجمله وظائف النبی است۔ در سنہ نہصد و نود و یک در عہد عرش آشیانی شہادت یافت۔ صاحب فیض گفت سالت عقل لہ۔"

ملہ ذرا اس تاریخ کا بدایونی کے بیان سے مقابلہ کریں، شیخ اور اخفہ کر دند و بحق و اصل شد و شیخ کنی تاریخ یافتند۔ گرچہ شیخ کا لنبی گفتند۔ کا لنبی نیست شیخ ما کنی است۔ در بار اکبری میں آزاد لکھتے ہیں: "اس مرحوم کا دم نکل گیا۔ اور ان کا غصہ نہ نکل چکا۔۔۔۔۔ کتب (جنگ) اور بحق و اصل شد کے لفظ کو دیکھو۔ اس میں کیا کام کر گئے۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذاب حق کے ساتھ واصل ہو گئے۔ چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے۔"

اخبار الاصفیاء (قلمی) میں جو ابوالفضل کے بھانجے عبدالصمد نے اسی زمانے میں لکھی، اسی طرح کا اظہار خیال ہے۔

”شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس چشتی گنگوہی۔ عنوان صحیفہ دین و دانش و فہرست جریدہ علم و عمل بود۔ در عنوان برائی... بھرمین شریفین شتافت و حدیث در ان خیر البقاع نزد شیخ ابن حجر... استماع نمودہ بوطن گاہ خرامید۔ و ذکر ادرراج الکان شریعت غراب رستہ... آرام گاہ فتح پور۔ کتب سنن الہدایہ از ویلکا راست۔“

دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآۃ العالم میں) (سوائے ان کے جنہوں نے طبقات شاہجہانی کی طرح بدایونی پر انحصار کیا ہے) شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اور بالخصوص حضرت مجدد کے شاگرد اور سوانح نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تعریف کے بعد یہ قیاس کہ حضرت مجدد نے انہیں ”علمی“ سوار میں سے شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں اور عبادت خانہ کے مباحثوں میں علمائے بالعموم بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا، جس سے اکبر کے دل میں طبقہ علما کے لیے کوئی احترام باقی نہ رہا۔ لیکن اکبر کے علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابل اعتراض باتیں نہ تھیں بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویج شرع کی کوششیں بھی وجہ مخاصمت ہو گئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جائز اور فذنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی یا تہذیبی پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکام شرع کی پابندی میں سخت تھے، لیکن مذہبی نقطہ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اور جس واقعہ (متھرا کے برہمن کو سزا قتل پر) اکبر سے ان کا سخت اختلاف ہوا، اس میں نورے فیصدی علما بلکہ زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔ مخدوم میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں، لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے، یعنی شدت احتساب۔ وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے خوبی ہے برائی نہیں۔ انہوں نے بقول بدایونی شیخ ابوالفضل کی نسبت جو کہا تھا کہ بتا نہیں

اس شخص سے دین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے۔ اسے بھی واقعت نے درست ثابت کیا۔ اور شیخ مبارک کی راسخ الاعتقادی کی نسبت انہیں جو شبہ تھے، وہ بھی بجا نہ تھے۔ شیعوں کے متعلق ان کا جو نقطہ نظر تھا، وہی حضرت مجدد الف ثانی کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مہدویت کی مقبولیت شیعیت کی اشاعت۔ شطاری اور دیگر آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں جو روحانی انتشار رونما تھا، اس کے سد باب میں مخدوم الملک کی محنتانہ کوششیں، شیخ مبارک کی علمیت و آزاد خیالی اور شیخ علانی کی نیک نفسی اور خلوص سے زیادہ مفید تھیں۔

علما اور اکبر کے درمیان جو اصل وجہ مخاصمت تھی، اسے خود اکبر نے عبداللہ خاں ازبک کے نام ایک خط میں واضح کر دیا ہے اور عقل و براہین کی اہمیت بتاتے ہوئے علما اور بادشاہ کی شکایت کی ہے۔ ”مے خواہند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند“ اور یہ بیان غلط نہ تھا۔ خاندان سوری کے عہد حکومت اور اکبر کے ابتدائی ایام میں مخدوم الملک اور صدر الصدور کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ شرع کی ترجمانی ان کا کام تھا اور ملک کا قانون ان کے ہاتھ میں تھا۔ کئی باتوں میں بادشاہ کی کچھ مرضی ہوتی ہوگی اور ان بندگوں کے فیصلے کچھ اور۔ اکبر جیسے خود سر اور آزاد خیال بادشاہ کو جس نے چند سالوں میں بیرم خاں جیسے کار گزار اتالیق کا جو اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ کسی سے دب کر رہے۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جن اصولوں پر مجھے ملک کا نظم و نسق کرنا ہے، وہ علما کے بڑھتے ہوئے اختیار کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ علما کا زور توڑنے کے درپے ہوا۔ اتفاق سے شیخ مبارک ان کے بیٹے اور بدایونی آن پہنچے اور ان کی مدد سے یہ مشکل حل ہو گئی۔

اکبر اور علما کی کشمکش فی الواقعہ (کلیسیا یا ارباب شرع) ملحدہ اور

”از بسکہ طالب جمع ریاست دین باریاست دنیوی بودند۔ و تبعیت دیگرے را طلیف لایطاق می دانستند“ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۶۸)۔

(حکومت) علمائے کرام کی کشمکش تھی جس میں حکومت کا پتہ بھاری رہا۔ بدقسمتی سے اکبر کی اپنی مذہبی طبیعت کی وجہ سے یہ کشمکش دنیوی امور تک محدود نہ رہی بلکہ مذہبی امور و عقائد پر بھی اس کا اثر ہوا، لیکن اس کی تہ میں دنیوی اقتدار کا سوال تھا اور اکبر اور علماء دربار کے درمیان اصلی وجہ مخالفت یہ تھی کہ بادشاہ مختار کل ہے یا علماء کے فتوؤں کے تابع۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کے نقائص ضمنی اور ثانوی چیزیں تھیں۔

علماء کا زوال جن دنوں عبادت خانے کے مباحثوں میں علماء دنیا کو عجیب تماشا دکھا رہے تھے۔ دربار شاہی میں ایک ایسا شخص آپہنچا جو علم و فضل میں یگانہ روزگار تھا، جس نے تعلیم محقق و توانی کے شاگرد ابوالفضل گارونی سے حاصل کی تھی اور جس کے فیض یافتگان میں ابوالفضل فیضی اور خود عبدالقادر بدایونی تھے۔ لیکن جس نے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھایا تھا اور جو اصولی طور پر بھی احتسابی کارروائیوں کا مخالف اور آزاد خیال تھا۔ یہ شخص ابوالفضل اور فیضی کا باپ شیخ مبارک تھا۔ شیخ اور مخدوم کے اختلافات پرانے تھے۔ جب سلیم شاہ کے سامنے شیخ علانی کے متعلق علماء کا محضر جمع ہوا تب بھی شیخ نے مخدوم سے اختلاف کیا تھا اور مہدوی مشہور ہوئے۔ اس کے بعد ایک عراقی ستیزا زادہ کو بچانے کی کوشش میں شیعیت سے متہم ہوئے۔ عہد اکبری کے شروع میں شیخ کو علماء دربار کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچی تھیں، انھیں ابوالفضل نے بالتفصیل اکبر نامہ کے اخیر میں گنایا ہے اور بدایونی نے بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خاندان کی سرگزشت لکھی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جن دنوں میر حبش اور دوسرے اہل بدعت گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں شیخ عبدالنبی صدر الصدور اور مخدوم الملک وغیرہ نے مل کر بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ شیخ مبارک مہدوی بھی ہے اور اہل بدعت (شیعہ) بھی، خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ کہہ کر برائے نام اجازت لی اور شیخ کا خاتمہ کرنے کے درپے ہوئے محسبوں کو بھیجا کہ

شیخ کو حاضر کریں، لیکن شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا۔ وہ ہاتھ نہ آیا اور محتسب اس کی مسجد کا منبر توڑ کر واپس آ گئے۔

شیخ مبارک کو جان بچانے کے لیے بجا خاک چھاننی پڑی۔ مدت دہائے کی سرگردانی کے بعد ایک امیر درزا کو کہہ کی سفارش سے شیخ کی گلو خلاصی ہوئی۔ انھوں نے شیخ کی درویشی اور علم و فضل کی تحریف کی اور بادشاہ سے اسے گھر جانے اور اپنا درس شروع کرنے کی اجازت دلوائی۔ شیخ کا بڑا بیٹا فیضی تھا۔ ۱۵۶۶ء میں شاعری کے ذریعے دربار میں پہنچا اور مارچ ۱۵۶۷ء میں ابوالفضل بھی دربار میں آکر میر منشی ہو گیا۔ یعنی جب علیے دربار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کا آفتاب طلوع ہوا۔

۱۵۶۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اختیارات علماء کے مسئلے کو نہایت نازک اور نمایاں صورت میں پیش کیا۔ ابتدا اس کی اس طرح ہوئی کہ متحضر قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد بنانے کے لیے مسالہ جمع کیا، لیکن ایک مقامی مالدار برہمن نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ جب قاضی اور اس کے ساتھیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے باقی اسلام کو گالیاں دیں اور اہل اسلام کی اہانت کی۔ قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس پہنچا۔ شیخ نے برہمن کو بلا بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ چنانچہ دربار سے ابوالفضل اور بیربر کو بھیجا گیا۔ وہ جا کر برہمن کو لے آئے۔ اصل وقوعہ کی نسبت ابوالفضل نے تصدیق کی کہ برہمن نے رسول اکرم کی بے ادبی کی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اسے سزا کیا دی جائے۔ اس پر علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے کہ اہانت نبوی کی شرعی سزا موت ہے۔ دوسرے کہتے تھے کہ قتل کے علاوہ کوئی دوسری سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اور امام اعظم کا فتوہ سناتے تھے کہ اگر ایک ذمی پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ جائز نہیں ہوتا۔ شیخ نے بادشاہ سے استصواب کیا۔ بادشاہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ صریحاً کچھ نہ کہتا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ سیاسیات شرعی تمھارے متعلق ہیں مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اس کشمکش میں معاملے نے بہت طول کھینچا۔ برہمن

دیر تک قید خانے میں رہا اور بادشاہ کی راجپوت بیویاں اس کی رہائی کے لیے کوشاں ہوئیں۔ شیخ نے بادشاہ سے پھر کچھ اور وعدے زیادہ اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اس معاملے میں اپنا خیال بتا چکا ہوں۔ اب تم جانو اور یہ ملزم)۔ چنانچہ شیخ نے برہنہ کو قتل کرادیا۔ اس پر اندر رانیوں اور باہر راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان علما کو حضور نے اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر دیتے ہیں۔ بادشاہ اس واقعہ پر بہت بگڑا۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ مبارک کسی تقریب سے حضور میں آئے۔ علماء کے اختیارات کی وجہ سے جو دقتیں پیش آئی تھیں، اکبر نے ان کے سامنے بیان کیں۔ شیخ نے کہا کہ بادشاہ عادل خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے۔ احکام شرعی اور ملکی کے اجرا میں وہ اس جماعت کا جھنڈا علم سے جھوٹی شہرت کے سوا کوئی حصہ نہیں ملا۔ محتاج نہیں۔ شیخ مبارک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور علما سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ شیخ نے جو برسوں پہلے بادشاہ کو ریاست دنیوی و دینی کے اجتماع کا مشورہ دے چکا تھا۔ آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے اس مضمون کا ایک محضر مرتب کیا۔ علماء کا ایک جلسہ بلایا گیا، جس میں بحث و محیص کے بعد علماء کی مہریں ثبت ہوئیں۔ جن لوگوں نے مہر لگائیں ان میں مخدوم الملک، شیخ عبد النبی، قاضی جلال الدین، قاضی خاں بدخشی، میراں صدر جہاں تھے۔ یہ محضر حسب ذیل تھا۔

۱۔ یہ تمام تفصیلات بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۸۰ تا ۸۴ سے لی گئی ہیں۔ طبقات اکبری کے مطابق بھی شیخ مبارک دستخط کنندگان میں سے تھے۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابو الفضل جس نے محضر کے متعلق اکبر نامہ میں ایک طویل اندراج دیا ہے۔ اپنے والد شیخ مبارک بالکل ذکر نہیں کرتا بلکہ محضر پر دستخط کرنے والے جن علما کے اس نے نام لکھے ہیں ان میں شیخ مبارک کا نام نہیں دیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ محضر اجتہاد پر جس طرح عمل کیا گیا، اسے دیکھتے ہوئے ابو الفضل اس سے اپنے والد کا انتساب نہ چاہتا تھا؟

مقصود از تشیید این مبانی و تمہید این معانی آنکہ چوں ہندوستان صہبت من المحدثان بمیان من مہدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و امان و دائرہ عدل و احسان شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علمائے عرفاں شعرا و فضلاء و قائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکان مسالک او تو العلم درجات انداز عرب و عجم و بدین دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی محقول و منقول اند و بدین و دیانت و صیانت اقصاف دارند۔ بعد از تدبیر وانی و قائل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد طاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذلک من المشواہد العقلیہ و الدلائل الحقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المؤمنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملک ابداً عادل و اعلم و اعقل باللہ اند۔

بنابریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب را از اختلافات، بہت تسہیل محیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند۔ متفق علیہ می شود و اتباع آن بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و متعمم است و ایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد۔ عمل براں نمودن بر ہمہ کس لازم و متعمم است و مخالف آن موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی است۔ و این طور صدق و فور حسبہ اللہ و اظہار الالاجراء حقوق الاسلام بمحض علمائے دین و فقیہائے ہدیین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر جب ۹۸۶ھ سبع و ثمانین و تسعمائتہ۔

یہ محضر اگست ۱۵۷۹ء میں مرتب ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کا خلاصہ دے کر تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

اصلاً قریہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفہ وقت دارباب حل وعقد واصحاب شوبہ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اس کے سدباب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنا ڈالی۔

مخالفت محضر میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ امام عادل کو مجتہدین اور علما سے انہی اختلافی امور میں زیادہ اختیارات ہوں گے جو نقص شرعی کے مخالف نہ ہوں اور عوام کی خوشحالی کا باعث ہوں۔ لیکن عملی طور پر ان شرائط کی پابندی نہ ہوئی۔ خوشامدی درباری ہرنی بات کی تائید میں کوئی روایت، کوئی قول شرعی نقل کر دیتے اور بہت سی ایسی باتیں اختیار ہو گئیں جو نہ نص شرعی کے موافق تھیں نہ "تذکرہ عالمیاء" کا ذریعہ۔ اس کے علاوہ چونکہ اب عبادت خانے کی محفلوں میں مسلمان علما کے ساتھ ساتھ پرتگیزیادری۔ پارسی دستور اور جین سادھو بھی شریک ہو گئے تھے اور ان میں سے پرتگیزیادری اسلام اور بانی اسلام کے خلاف نہایت ناگوار باتیں کہتے تھے، اس لیے ملک میں دربار کی نئی روش کے خلاف بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شیخ نورالحق محدث زبدۃ التواریخ میں لکھتے ہیں کہ عبادت خانے کے مباحثوں سے بادشاہ کا مقصد فقط تحقیق حق اور حصول ثواب تھا، وہ حقیقت مطہر و مقصود آنحضرتؐ کی طلب سی و اس بات ثواب نہ بود، لیکن اہل ہوا و نفس نے اس طرح بخشیں کیں اور قدیم کے پایہ اعتبار میں اس طرح کمی آگئی کہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیل گئیں اور حقیقت حال سمجھے بغیر بادشاہ سے بدظن ہو گئے۔ (عامر خلیفہ حقیقت حال را نفہمیدہ و بہ کہنہ سخن نرسیدہ و در مقام تفرقہ و تنزل خیالات و اوہام التادہ ساعت بساعت اس اخبار نقل مجالس کا مے (۶) دیگر افتادند۔ یہ چیز بقول شیخ نورالحق باعث نلت اقدام عوام ضعیف الاعتقاد و نفرت خاطر اتراک سادہ لوح آمد۔

اسی زمانے میں آئین دربار میں بھی ایسی جدتیں ہوئیں جن سے ان بدگمانیوں کو

تقویت ہوئی اور بالآخر یہ حالت ہوئی کہ جو پورے شیعہ قاضی القضاۃ ملا محمد یزدی نے علی الاعلان فتوے دیا کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے اس پر جہاد واجب ہے۔ دربار میں قطب الدین خاں کو کہ اور شہباز خاں کنبوہ نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو بھجایا، لیکن حکومت اور اقتدار کا نشہ برا ہوتا ہے۔ بادشاہ اور بگڑا قطب الدین خاں اور شہباز خاں کو بڑا بھلا کہا۔ (مختب التواریخ جلد دوم ص ۲۷۳) اور ملا محمد یزدی اور معز الملک قاضی القضاۃ بنگالہ، وغیرہ کو ایک بہانے سے بلا بھیجا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریا سے جون کے راستے کو الیاء پہنچا دو جہاں ملکی مجرموں کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہوا کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرہ داروں نے ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا اور تھوڑی دور آگے جا کر گرداب کی گود میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سابق قاضی القضاۃ قاضی یعقوب مائیکپوری جنھوں نے منعم کے خلاف فتوے دیا تھا اور اب بنگالہ میں قاضی تھے بلائے گئے۔ ان کے لیے بھی گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم ہوا، لیکن دوسروں کی طرح انھیں بھی رستے میں ہی عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا گیا۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کو سنہ ۱۵۸۰ء کے شروع میں حج اور خیراتی کاموں کے بہانے حجاز میں جلا وطن کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ بلا اجازت نہ آئیں۔ انھیں جانا ناگوار تھا۔ جب ملک میں بادشاہ کے خلاف عام برہمی اور اضلاع شرقی میں بغاوت پھیل تو وہ غلط امیدوں کے نشے میں سرشار بلا اجازت واپس آگئے۔ لیکن ان کے یہاں پہنچنے تک مخالفت و بادی گئی تھی۔ مخدوم الملک تو واپسی پر ڈر سے ہی احمد آباد گجرات میں وفات پا گئے۔ (۱۵۸۲ء)۔

ملا عبداللہ ازبکینا کی قالب تہی کردہ بود۔ (البرنامہ جلد سوم ص ۳۸) مشہور یہ تھا کہ زہر دیا گیا۔ نعش خاموشی سے لیجا کر خاندانی قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی نسبت معلومات نہیں ہیں لیکن مخدوم کے صاحبزادہ شیخ عبدالکریم چشتی جو حرمین میں والد کے ساتھ تھے۔ لاہور کے قریب نواں کوٹ میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ انھوں نے فصول الحکم کی شرح لکھی (بزرگان لاہور از نامہ پٹرا)

شیخ عبد النبی کا انجام زیادہ حسرت ناک ہوا۔ انھیں گرفتار کر کے فتح پور سیکری لایا گیا۔ بادشاہ نے سخت باتیں کہیں اور خود بھرے دربار میں ان کے منہ پر ٹکا مارا شیخ بھی ایک قاعدے، وقار اور جرأت کے بزرگ تھے۔ جل کر کہنے لگے کہ چھری سے کیوں نہیں مارتے؟ اس کا بھی سامان ہو گیا۔ انھیں دیر تک بندی خانے میں قید رکھا گیا۔ وقتِ نجاتِ خیرات کے لیے جو شہر مزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اس کا حساب کتاب ہوتا رہا اور اسی دوران میں انھیں گلا گھونٹ کر ختم کر دیا گیا۔

بدایونی کا غصہ اب بھی ختم نہ ہوا۔ شیخ کنبی تاریخ لکھی اور کہا ”بجی واصل شد۔“ بقول آزاد ”کنب بھنگ“ اور ”بجی واصل شد“ کے لفظ کو دیکھو کہ اس میں کیا کام کر گئے ہیں۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذاتِ حق کے ساتھ واصل ہو گئے چاہو یہ کہو کہ امرِ حق کو پہنچ گئے۔“

مشہور محافل کے شہید کرانے کے علاوہ اکبر نے پنجاب کے با اثر علما کو جن کا سرغنہ مخدوم الملک کو سمجھا جاتا تھا (معلمائے پنجاب کہ عمدہ ایشاں مخدوم الملک بود) اور جو غالباً مذہبی معاملات میں زیادہ راسخ الخیال تھے، ملک کے مختلف حصوں میں منتظر کر دیا گیا۔ مثلاً بدایونی قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری کی نسبت لکھتا ہے: ”زنانیکہ اکابر لاہور را نامزد و باطراف کردہ ہر یکے را در شہرے یہ منصبے منصوب گردانیدند اورا قاضی، بندر بھروج از ولایت گجرات ساختہ فرستادند۔“ وہ بھروج میں فوت ہوا۔ قاضی عبد الشکور کو ”مجلد وطن“ کے جوہر کا قاضی مقرر کیا گیا، لیکن ابھی وہ الہ آباد پہنچے تھے کہ جوہر کی قضاۃ کسی اور کو مل گئی۔ قاضی عبد الشکور معزول ہو گئے اور چونکہ لاہور واپس جانا نہیں سکتے تھے، اس لیے الہ آباد ہی میں تعلیم و تدیس میں مشغول ہو گئے۔ لاہور ان دنوں علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ ملتان اور تلنہ کی ویرانی کے بعد وہاں پیشہ علمایاں آئے اور ایران و ترکستان کے علما کی پہلی بڑی منزل بھی لاہور تھا۔ بدایونی نے پنجاب کے علما کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اس نے شیخ منور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر نہیں کیا، جو ایک اہل علم خاندان کے چشم و چراغ،

کئی کتابوں کے مصنف اور اکبر کی تعزیری کوششوں کا نشانہ تھے۔ ہم آپ کو ٹر میں کھینچے ہیں کہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے خلیفہ اعظم شیخ حسام الدین ماکپوری کے ایک مرید حضرت شاہ کا کوٹہ موجودہ لنڈا بازار لاہور کے علاقے میں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم کی تھی۔ عہد اکبری میں یہ مدرسہ عروج پر تھا اور صدر مدرس شیخ کا کوٹہ کے فرزند شیخ اسحق کا کوٹہ تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور بقول بدایونی سو سال سے زیادہ عمر یا کر ۹۹۶ھ میں انتقال کیا۔ لاہور کے اکثر علمائے مشہور ان کے شاگرد تھے۔ ان میں سے شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل خاص طور پر ممتاز تھے۔ شیخ منور شیخ سعد اللہ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ گلزارِ ابرار میں ان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ ان میں خواہر بسندی اور شان خود نمائی بہت تھی۔ لیکن ان کی علمی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی بحرِ مواج کا عربی ترجمہ کیا۔ تفسیر در النظم کے عنوان سے قرآن کریم کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب واضح کی۔ طوابع۔ بدیع البیان اور قصیدہ بڑہ کی شرحیں لکھیں۔ فقہ میں وہ مخدوم الملک سے بھی زیادہ کڑے تھے۔ حتیٰ صریح کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں مخدوم الملک کی اس تحریر کی تردید کی کہ سب کنندگان رسول اکرم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ (غالباً متعزوا لے برہمن کے مقدمہ کے ضمن میں یہ چیزیں بھی لکھی گئی ہوں گی) ۱۰۵۵ھ میں مالوہ کے صدر مقرر ہوئے۔ لیکن پھر مستوب ہو گئے۔ پانچ سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے۔ آپ کی تمام کتابیں جو کم و بیش ڈیڑھ ہزار جلدیں تھیں، شاہی کتب خانے میں داخل ہوئیں۔ بڑا ظلم یہ ہوا کہ ان کے ساتھ آپ کی تصانیف بھی ضائع ہو گئیں۔ فقط در النظم بچ گئی، جو قید خانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد باقی وقت اگرے میں بڑی عسرت میں گزارا۔ ۱۰۶۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے شیخ کبیر نے پھر سے خاندانی روایات کو

۱۔ عبد الصغیا میں بواہر الفضل کے بھانجے عبد الصمد کی تالیف ہے، اسکی کا کوٹہ قاضی مدد الدین لاہوری کو مخدوم الملک مولانا عبد اللہ سلطانپوری کا شاگرد دکھا ہے۔

زندہ کر دیا اور بدالیونی کی منتخب التواریخ میں ان کا ذکر ہے۔

اکبر نے کئی بزرگوں کو مکاری اور حیلہ سازی سے کسی مقدمے یا داد فریاد کے بغیر شہید کر دیا، لیکن جن مشکوکوں سے سابقہ پڑا وہ ختم نہ ہوئیں۔ اس کے عقائد کے خلاف عام شورش پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ڈسٹ سمٹھ لکھتا ہے:-

۱۵۷۷ء کا سال اکبر کی زندگی کا نازک ترین سال تھا۔ ملا محمد ریزی نے شہداء کے

شروع میں اکبر کے خلاف فتوے دیا تھا اور اس زمانے میں بہار اور بنگال میں اس

خلاف جو بغاوت ہو گئی تھی وہ ابھی تک نہ تھی تھی بلکہ ٹوڑ مل جو اسے مٹانے گیا

تھا، خود منگیور میں محصور ہو گیا۔

اس کے علاوہ جو لوگ اکبر کی بد اعتقادی سے نالاں تھے، انھوں نے فقط صوبہ بجاتی بغاوت پر اکتفا نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح اکبر کو تخت سے برطرف کر کے اس کی جگہ اس کے بھائی مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا۔ اس تجویز کے محرک غالباً جو نیپور کے جاگیر دار خان معصوم خاں تھے جن کی خط و کتابت مرزا حکیم سے تھی۔

اکبر نے عملی بغاوت کا تو خاتمہ کر دیا، لیکن عبادت خانے کے مباحثوں کی جو خبریں باہر آرہی تھیں، ان کے خلاف ایک عام ہڑتالیں جاری تھی۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ کے ایک سیر حاصل باب میں بالتفصیل اسباب مخالفت

تھے اور ان اسباب کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان غلط فہمیوں کو سہارا ملتا تھا۔ اگر ابوالفضل کے عام انداز تحریر اور اس نقطہ نظر کو جو ایک مشرقی مطلق العنان بادشاہ کے درباری مؤرخ کو اختیار کرنا پڑتا تھا، ذہن میں رکھیں تو غالباً اس موضوع پر سب کے جامع اور سب سے منصفانہ تبصرہ یہی ہے۔ ابوالفضل کو بہر کیف بادشاہ کا نقطہ نظر پیش کرنا تھا، لیکن مخالفین پر لعن طعن کرنے کے باوجود اس نے ان کا نقطہ نظر بھی پوری طرح پیش کیا ہے جس کی ایک درباری مؤرخ کو کوئی ضرورت نہ تھی اور ایک آدمی جگہ تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ

آئین دربار کی پابندی کرتے ہوئے وہ طریقے طریقے سے شاہی روش سے اپنی غلطی ظاہر کر رہا ہے۔ مثلاً جہاں وہ بادشاہ سے دعوے الوہیت منسوب ہونے کا ذکر کرتا ہے، وہ اس غلط فہمی کی بنیاد بتاتا ہے کہ جب نصیری اور حلوی طریقے کے بعض لوگوں نے بادشاہ کو ”منظر حق“ قرار دے کر گفتگو شروع کی تو بادشاہ نے طریقہ صلح کل کی بنا پر ان سے ”صرف گویاں آشفتمہ عقل و ہرزہ سراپاں پریشان مغز“ کو چنداں سرزنش نہ فرمائی۔ جس سے بے سمجھ۔ بد نہاد بدخواہ غلطیوں میں مبتلا ہوئے اور ان کے کذب و افترا کو عام شہرت ہوئی۔

بادشاہ پر دوسری تہمت دعوے پیغمبری کی تھی کہ بادشاہ ہمیشہ نئے نئے آئین وضع کرتا اور چار چمن دین و دنیا کو سیراب کرتا اور مشکوک اور اختلافی معاملات کی گتھیاں سلجھاتا اس کے علاوہ قدیمی روش کے خلاف اس کا خطبہ پڑھتا اور ”منبر را ہمنوی“ پر قدم رکھنا بھی غلط اندیشی میں تقویت کا باعث ہوا۔ جب بادشاہ کے پاس ان غلط بیانیوں کا ذکر ہوتا تو وہ انھیں اہمیت نہ دیتا اور بار بار کہتا: ”سبیل اللہ در تنگناے خاطر نادان چگونہ مے در آید کہ امکانی حدوث آموذ در ماندہ طباح نسبت الوہیت بخود دہد“ اور تہمت پیغمبری کی نسبت بھی کہتا کہ اتنے بڑے پیغمبر آئے ہیں جنھوں نے ہزاروں معجزوں کے ساتھ اظہار نبوت کیا ہے۔ اس پر بہت زمانہ گزر گیا۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن انکار کرنے والے اب بھی انکاری ہیں۔ ان حالات میں مجھے کیسے اس طرح کا خیال ہو سکتا ہے اور لوگوں کو اس کا کس طرح گمان ہو سکتا ہے۔ ”مراچئیں سگالش چساں در صفو تکدہ ضمیر راہ یابد و ظاہر نگاہان صورت پرست را ایں تہ خیالی چو اسرا سیمہ دارو“ اس کے باوجود بادشاہ ان لوگوں کو اس خیال سے سرزنش نہ کرتا۔ کہ ملامت اور الزام سے بھی صاف دلوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ (از آنجا کہ ملامت کشی وطنز بندی در دہاے صافی فروغ دیگر بخشد۔ سرزنش آں تیرہ رایان نور افرا نباید کرد)۔

بادشاہ پر تعمیر الزام یہ تھا کہ وہ دین احمدی کی قدر نہیں کرتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ

بادشاہ دانا دل وسعت مشرب عام شیوہ کرم و شفقت اور وسیع سلطنت کی بنا پر دیکھو کہ انسانوں کو دوست بناتا تھا اور ہر دین و مذہب کے اہل تحقیق سے مطالبہ دینی اور مقاصد حقیقی کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ لیکن بعضوں سے بیدار نشی اور عدم تحقیق کی بنا پر مناسب جواب نہ ملتا تھا۔ بالخصوص اس دوران میں "فیلسوفان نصاریٰ" کی طرف سے ان مجالس میں متفقہا پر گرفت و گیر ہوئی اور بحث و مباحثہ برپا ہوا جن لوگوں نے بھوئی طعلیت کے بڑے بڑے دعوے باندھ رکھے تھے۔ اُن سے ان علمی اور عقلی بحثوں میں تو کچھ بن نہ آئی، لیکن انھوں نے لوگوں سے خفیہ خفیہ کہنا شروع کیا کہ ہمیں دین کا غم کھائے جا رہا ہے اور بادشاہ نے جانبداری سے ہمارے جوابات کو قبول نہ کیا۔ ان لوگوں نے بے انصافی سے بادشاہ پر ہمتیں لگائیں اور یہ بھول گئے کہ بادشاہ خاندان نبوی کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ سادات کو اس نے کیسے کیسے عمدے دے رکھے ہیں اور بوقت ملاقات کسی سید کے لیے روانہ نہیں رکھتا کہ وہ اس کے پاؤں پر سر رکھے۔

بعض کچھ بیوقوفوں نے بادشاہ کو شیعتیت سے متہم کیا۔ وجہ یہ تھی کہ جب مجالس شاہی میں دوسری قوموں کی طرح شیعہ شتی نقطہ نظر پیش کیا جاتا تو بادشاہ انصاف پسندی اور بے تعصبی سے جو اسے مضبوط ہوتی اُسے ترجیح دیتا ہے۔

بیانے کہ باشد بہ محبت قوی زنا فرخی باشد ار نشنوی
بادشاہ اس سلسلے میں فرقے کی قلت و کثرت اور اپنے بیگانے کا کوئی لحاظ نہ کرتا۔ لیکن کوتاہ بینیوں نے بہرہ گوی شروع کی۔ انھوں نے ایرانیوں کی قدر و منزلت کو (جو بیشتر شیعہ ہیں) بدگمانی کا سامان بنالیا اور تو رائیوں کو جو درجہ حاصل ہے، اسے نظر انداز کر دیا۔

بعض ناپاک طینتوں نے بادشاہ کو "کیش برہمن" کا طعنہ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ دیدہ و سراپنی فراخ جو صلیکی سے دانشمند براہمنوں کو اپنے قریب جگہ دیتا اور "مصلح ملکی و افزونی حقیقت" کی بنا پر اس نے کئی ہندوؤں کا پایہ بلند کیا تھا۔ یادہ گویوں

جوش و غضب کا سرمایہ تین چیزیں تھیں۔ "نخستیں از فزونی شناسائی بارگاہ مقدس مجمع دانشوران مل و نخل آمد و ازال جاکہ ہر آئین شائستگی چند با خود دارد۔ ہر کدام نصیبہ آفریں برگرفت و از فرط انصاف گزینی نکو ہیدگی، ہیچ طائفہ پروردہ یافت نیکوئی اور توانست شد۔ دوم ہنگامہ صلح کل در پیشگاہ خلافت رونق پذیرفت و گرد و بار گردہ مردم با گونا گوں احوال کامروائے صورت و معنی گشتند۔ سوم تباہ سرشتی و کج گرائی فرو مانگان روزگار۔"

اکبر نامہ کی ایک اور دلچسپ دستاویز اکبر کا وہ خط ہے جو اس نے اپنے خیالات کی توضیح میں ابوالفضل سے لکھوا کر عبداللہ خاں ازبک والی ترکستان کو انگست ۱۵۸۶ء میں ارسال کیا۔ عبداللہ خاں نے ایک خط میں اکبر کو لکھا تھا کہ آپ کی نسبت پیغمبری بلکہ خدائی کے دعوے سُننے میں آتے ہیں۔ اکبر نے جواب میں ایک طویل طویل خط ارسال کر دیا جس کے دو مختلف مسودے اکبر نامہ اور انشاے ابوالفضل میں ہیں۔ اس خط میں بعض علماء سے دربار کی شکایت کی ہے کہ وہ نہ صرف عقل و خرد سے خالی تھے، بلکہ کلام مجید کی غلط ترجمانی کرتے تھے اور اس کی بنا پر شاہی اختیارات میں شرکت چاہتے تھے (و فرمان آسمانی و نامہ جاودانی را کہ فرستادہ خدا و رسانیدہ پیغمبر است از شاہراہ گردانیدہ برنگ دیگر واسطے نمایند و محلات نصوص را تا ویلات و تسویلات نمودہ می خواہند در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند) جب ان باتوں کی تحقیق اور اختلافی امور کی تفتیش کے دوران میں ظاہر بنیوں کا پل کھلا اور وہ پایہ اعتبار سے گر گئے تو انھوں نے حسد اور عداوت سے غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور ہماری نسبت نبوت اور الوہیت کے دعوے منسوب کیے۔ ورنہ کہاں بندہ عاجز اور کہاں یہ دعوے!

عہد اکبری کے مذہبی مورخ | اکبر نے جب ۱۵۸۱ء میں مرزا حکیم کو شکست دے دی اور اضلاع مشرقی کی بغاوت فرو ہو گئی تو اس کے ارادوں اور منصوبوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ ان حالات میں اس نے جو طور طریقے شروع کیے اور احکام نافذ کیے وہ اکبر کی مذہبی تاریخ کا ایک رنگ تھے، لیکن

افسوس کہ معاصرانہ مؤرخین اور راویوں کے اختلافات کی وجہ سے حقیقت حال تک پہنچنا آسان نہیں۔ چونکہ ان مؤرخین کے بیانات پر ہی اس زمانے کی مذہبی تاریخ کا انحصار ہے، اس لیے ان کی تحریروں اور طریق کار کا جائزہ حقیقت حال کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے۔

عبدالکبریٰ کے واقعات کے عینی شاہد کئی تھے۔ مثلاً بخشی نظام الدین (مصنف طبقات اکبری)، ابوالفضل (مصنف اکبرنامہ و آئین اکبری)، ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ)، اسد بیگ (مصنف اکبرنامہ)، شیخ عبدالحق محدث (مصنف تاریخ حق) اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق محدث (مصنف زبدۃ التواریخ) اور پرتگیزیادری جن کے تین وفود مختلف وقتوں میں آئے اور دربار اکبری سے مدتوں تک وابستہ رہے۔ ان میں سے مذہبی تاریخ کی تفصیل کے راوی فقط تین ہیں۔ ابوالفضل۔ بدایونی اور پرتگیزیادری اور وہ اپنے بیان میں متفق نہیں۔ ابوالفضل اور دوسروں کے اندراجات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ابوالفضل تقلیدی اسلام سے اختلاف ظاہر کرتا ہے (اور شیخ مبارک اور مخدوم الملک کے نقطہ نظر میں جو اختلاف تھا وہ محتاج بیان نہیں) لیکن وہ اکبر کے احکام اور اسلام میں کوئی تناقض نہیں بتاتا اور اس کی تصانیف میں بادشاہ کا کوئی ایسا حکم نہیں جس سے اسلام کی مخالفت یا تحقیر ظاہر ہو۔ برخلاف اس بدایونی اور پرتگیزیادری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر مسلمان نہ رہا تھا بلکہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ مثلاً پرتگیزی مشنری کہتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ ہوں۔ پُرانی مسجدوں کی مرمت نہ ہو اور اس کے آخری ایام حکومت میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور مسجدوں کو اصطبل بنادیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے ایک کے سوا سب بیویاں اپنے درباریوں میں تقسیم کر دیں اور پرتگیزیادریوں سے وعدہ کیا کہ میں حج کے بہانے گواؤں گا اور وہاں عیسائی ہو جاؤں گا!

بدایونی میں اس طرح کی انتہائی بے سرو پا باتیں نہیں، لیکن اکبر کے متعلق اس کا

نقطہ نظر ابوالفضل کی نسبت پرتگیزیادریوں سے زیادہ قریب تھا۔ اس نے دربار میں قدامت پسند گروہ کے مخالف کی حیثیت سے سر اٹھایا تھا، لیکن جدت پسندوں نے جو تیز رفتاری اختیار کی، اس کا وہ ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ان کی قیادت کے لیے دوسرے لوگ آگئے، جو اختلاف نقطہ نظر کے علاوہ شاید ٹھوس علمیت میں بھی اس سے بڑھ کر تھے۔ بدایونی کی اصلی خوبیاں ادیبانہ تھیں۔ عالمانہ نہ تھیں۔ (وہ مذہبی طبقے کا ترجمان بنتا ہے، لیکن اصل روحانی خوبیوں یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، خالقوں سے انصاف، ظاہر اور باطن کی ہم آہنگی۔ ان چیزوں کا تو اس نے دعویٰ بھی نہیں کیا) دربار میں اس کے لیے جلنے اور کڑھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نئی صورت حالات سے اسے اصولی اور ذاتی اختلاف تھا۔ اس کی کتاب اکبر کے خلاف ایک چالاک بلکہ مکار وکیل استغاثہ کا بیان ہے۔ غیر جانبدار منصف کا فیصلہ نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، بے مثال نثر نگار اور نہایت ذہین انسان تھا۔ بطور مؤرخ کے بھی (اس کی درشت کلامی اور واضح جانبداری کے باوجود) اس کا ایک خاص انداز اور خاص مرتبہ ہے۔ اس کے ہاں صریح غلط بیانی کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ لیکن معمولی حذف و اضافہ قطع و برید، مواد کی ایک خاص ترتیب۔ ذومعنی الفاظ کے استعمال (Passive Construction) ترکیب مجولہ کی افراط جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کس سے کون سے خیالات یا حرکات منسوب ہیں۔ مبہم اشارے کناسے۔ ان سب کی مدد سے بدایونی نے ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے جو حقیقت کے مطابق نہیں۔ اس نے بیسیوں ایسے احکام گنائے ہیں جو اگر واقعی بادشاہ نے جاری کیے تو ان کا آئین سلطنت میں ذکر ہوتا۔ اطراف مملکت میں ان کے اجرا کے احکام جاری ہوتے۔ کوئی دوسرا مؤرخ ان کا بیان کرتا۔ غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ان میں کمی باتیں ایسی تھیں جو غالباً دربار میں گفت و شنید کی حد سے آگے نہ بڑھیں اور بعض فقط مریدان شاہی کی رہنمائی کے لیے تھیں۔ کئی مذہبی اور تاریخی امور ایسے ہیں جو عبادت خانے کے مباحثوں میں فریقین نے بیان کیے، لیکن بدایونی ان کا ذکر ایسے کرتا ہے گویا وہ

بادشاہ کے خیالات کا اظہار ہیں۔ اُن احکام کی جو واقعی جاری ہوئے، بدایونی اس طرح قطع و برید کر کے اور ایک خاص نقطہ نظر کی تائید میں پیش کرتا ہے کہ اس کے باقی اندراجات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اکبر طریقی تعلیم میں اصلاح کرنا چاہتا تھا اور ابو الفضل نے اس کی تفصیلات دی ہیں، جن کا مذہبی خیالات سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بدایونی کے نزدیک وہ بھی اکبر کی اسلام دشمنی کا ایک کرشمہ ہے، عربی خواندن و انسٹن آن شریفہ و تفسیر و حدیث و خواندن آن مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ و افسانہ رائج و مفروض، بعض جگہ حقیقت حال واضح نہ کر کے اور صرف مبہم اور الزامی اشارے کنائے سے غلط فہمیوں کا سامان کیا ہے۔ بدایونی نے کئی اقوال کو شہرت دی۔ جن کی نسبت اسے پتا تھا کہ غلط ہیں، لیکن چونکہ وہ اس کے نظریے کی تائید کرتے تھے انھیں درج کتاب کیا اور جو حقیقی چیزیں اس کی نظریوں سے مخالف تھیں۔ انھیں یا تو نظر انداز کیا یا ان کی توجیہ و تاویل کی یا انھیں اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ مثبت کے بجائے منفی پہلو نمایاں ہو۔ مثلاً جہاں تک توجیہ و تاویل کا تعلق ہے۔ فقہی کی تفسیر کلام مجید اور مثنوی نل دمن کا نعتیہ حصہ یہ دو چیزیں ایسی تھیں جو چھپ نہ سکتی تھیں اور فقہی کے خلاف بدایونی نے جو کچھ کہا تھا اس کی قطعی تردید کرتی تھیں اس لیے اُس نے تفسیر کے متعلق تو کہا کہ یہ برائے شمس بدنامی کہ تار و زجر البصدا ب شمس نگر دو لکھی گئی اور نعت کے متعلق کہا کہ وہ نزدیک بموت بہ مبالغہ و الحاح بحدہ آشنایاں درج ہوئی۔ جہاں تک مخالف مطلب واقعات نظر انداز کرنے کا تعلق ہے۔ ان کی تفصیل دینے میں یہ دشواری ہے کہ بدایونی کے سوا دوسرے مؤرخین نے مذہبی تاریخ پر توجہ نہیں دی۔ مؤرخین عہد کی نظر عام دستور کے مطابق سیاسی اور جنگی تاریخ پر رہی ہے ماسوائے ابو الفضل کے جو صلح کل کی اونچی کرسی پر براجمان تھے۔ چنانچہ اکبر نے شاعر اسلامی کی جہاں بیروی کی ہے اس کی انھوں نے تفصیل نہیں دی، لیکن اس کے باوجود مساعدا تصانیف میں مذہبی تاریخ کی چند ایسی اہم جزئیات مل جاتی ہیں جو بدایونی جیسے مذہبی مؤرخ کو اگر اس کا

ایک خاص نقطہ نظر نہ ہوتا ضرور درج کتاب کرنی چاہیے تھیں، لیکن جنھیں اس نے مخالف مطلب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مثلاً محضر کے واقعہ اور زیارت اجمیر کے بعد ملا نظام الدین بخشی کا بیان ہے کہ واپسی پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک طولانی خیمہ (بارگاہ) مسجد کے نام سے دولت خانے کے پاس کھڑا کیا جائے اور اس میں وہ پانچ وقت یا جماعت نماز ادا کرتے تھے۔ اسی طرح ۱۵۸۶ء کے ضمن میں (یعنی محضر سے سات سال بعد) ملا نظام الدین لکھتے ہیں۔ "خود بدولت کوچ کوچ تا دہلی در بیچ جام مقام فرمودند و طواف مزار فاضل الانوار پیر بزرگوار نمودہ تمامی مزارات بزرگواراں را زیارت فرمودہ فقر و صاحبین دہلی را بہ انعام عام سرسبز و شاداب ساختند۔ ہمدیں در دہلی ہلال شوال نمایاں گشتہ صبح پنج شنبہ لوازم عید بجا آوردہ از دہلی کوچ فرمودند" یہ عید جس کے "لوازم" اکبر بجالایا۔ ۱۵ ستمبر ۱۵۸۶ء کو تھی۔

سال محضر ۱۵۸۹ء کے بعد جب بدایونی کہتا ہے کہ قیامت آگئی اور اکبر اسلام سے باغی ہو گیا۔ اس کا نماز پنجگانہ کے لیے بارگاہ (مسجد) کا قیام اور نماز باجماعت کی ادائیگی اور اس کے سات سال بعد بندگان دہلی کی زیارت اور لوازم عید کی بجا آوری ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ایک غیر جانبدار مورخ انھیں نظر انداز کر دیتا۔ اسی طرح پرتگیز مشنریوں کی تحریریں ہیں۔ وہ گواہ اس امید پر آئے تھے کہ اور یہاں اگر گوا اور لڑکوں میں مسلسل یہ اطلاعات بھیج رہے تھے کہ اکبر اسلام کا دشمن ہے اور پتسمہ لینے کے لیے تیار۔ اس لیے ان کے خطوں میں اکبر کے موافق اسلام ہونے کی روئداد ڈھونڈنا بے کار ہے، لیکن ان رپورٹوں میں بھی ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے بدایونی نے نظر انداز کر دیا!

مثلاً جب اکبر ۱۵۸۹ء میں حکیم مرزا کے تعاقب میں کابل گیا تو پرتگیز مشنری ہمایوں کے ہمراہ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس سفر میں اکبر نے عیسائیت پر کئی اعتراض کیے۔ ابو الفضل نے بھی انجیل اور تورات کی نسبت ٹیڑھے سوال پوچھے اور جب ایک پرتگیز یادری نے کہا کہ انجیل میں خدا سے روحانی ہے تو ابو الفضل نے

کہا کہ وہ تو قرآن شریف میں بھی ہے۔

جب کابل سے واپسی پر شاہی لشکر درہ خیبر کے قریب علی مسجد کے پاس پہنچا جس کی نسبت بعضوں کا کہنا تھا کہ خلیفہ چارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ وہاں تشریف لائے تو پرتگیزیوں کے بیان کے مطابق اکبر نے وہاں نماز ادا کی۔

جب سب لوگ دار الخلافہ میں واپس پہنچ گئے تو پادریوں نے علما کے ساتھ پھر مناظرہ کرنا چاہا۔ بادشاہ کو یہ بہت ناپسند تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ علما پھر ہار جائیں گے۔ بالآخر پادریوں کے اصرار پر ایک مباحثہ منعقد ہوا۔ پادری کہتے ہیں کہ جب انھوں نے علما کو جواب کر دیا تو بادشاہ نے بحث میں قدم بڑھایا اور علما کی طرف سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ پادری بادشاہ سے اب اس قدر مایوس ہو گئے کہ انھوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انھیں روکنا چاہتا تھا، لیکن ایک پادری اپریل ۱۵۸۲ء میں اور دوسرا فروری ۱۵۸۳ء میں واپس چلا گیا۔

پرتگیزی پادریوں کا دوسرا وفد ۱۵۹۲ء میں آیا۔ اس کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس وفد نے صورتِ حالات پہلے سے بہت بدتر پائی اور بہت جلد واپس بلا لیا گیا۔

بدایونی اس مزاحمت کا کیسے ذکر کرتا جو پادریوں کے کام میں اکبر اور ابوالفضل کی طرف سے پیش آ رہی تھی، لیکن شاید اس سے بھی زیادہ دلچسپ اس کا واقعات کو موڑ کر پیش کرتا ہے یا اکبر کے خلاف ایسی باتیں کہتا ہے، جن پر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کسی اور چیز کی پروردہ لڑائی ہو رہی ہے۔

ملا صاحب ۹۸۹ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب اکبر بے راہروی کی قریب ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔ گاؤں کشی بند ہو چکی ہے۔ ریش تراشی عام ہے۔ بعض

نوشادی دنیا دار، دین اسلام مجازی و تقلیدی، کو ترک کرنے کے عہد نامے لکھ رہے عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ بادشاہ نبوت بلکہ الوہیت کا دعوتے دار ہے۔ ملا خیری کے اس شعر کو لکھے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کر رہا است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواهد شدن!

اور ملا صاحب اس سال کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ ”دریں ایام بجاعت نماز فاذان کچ ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند۔ بر طرف شد۔ یعنی کم از کم اس زمانے تک تو عین دربار میں پانچ وقت تک نماز باجماعت ادا ہوتی تھی!! اسی طرح انھوں نے ایک جگہ حکیم مصری کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جن دنوں واقعہ حکومت میں اکبر دیر تک لاہور میں مقیم تھا تو اس نے قلعہ لاہور میں دیوان عام کے سامنے ایک مختصر سی مسجد بنوا دی تاکہ جو لوگ کارِ ضروری میں مشغول ہوں انھیں نماز کے لیے دور نہ جانا پڑے۔ اس پر حکیم مصری نے ازراہ تمسخر کہا۔

شاہ ما کرد مسجدے بنیاد ایہا المومنین مبارک باد
واندریں نیز مصلحت دارد تا نمازاں گزار بشمارد!

ملا صاحب اور حکیم صاحب جو چاہیں حاشیے پڑھائیں، لیکن خیر ان کے اس بیان سے ضمناً اس بات کا پتا لگ گیا کہ اس زمانے میں جب عیسائی مؤرخین کہتے تھے کہ شہر لاہور میں کوئی مسجد نہیں رہی، اور سب مسجدیں ہاتھی گھوڑوں کے اھبل بنادیے گئے ہیں۔ اس وقت خود اکبر نے قلعہ شاہی میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی!!

بدایونی نے بیان واقعات میں اس طرح قطع و برید اور کج نگاہی سے کام لیا ہے کہ اس کی روئداد کو اکبر کی کامل اور صحیح مذہبی تاریخ سمجھنا انصاف کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے مذہبی آئین و احکام میں فقط وہی باتیں مستند اور اہم ہیں جنہیں درباری مؤرخ نے آئین اکبری میں درج کیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ویسے ہی ظاہر ہے کہ ان باتوں کو کیسے اہمیت دی جاسکتی ہے اور مستند

مانا جاسکتا ہے جن کے مانتے والا ان کا اقرار نہ کرے۔ وہ آئین ہی کیا، جن کا اعلان نہ کیا جائے اور وہ احکام ہی کیا، جو نافذ نہ ہوں اور ملک کے دستور العمل میں درج ہو کر عمال و حکام کی راہنمائی کا ذریعہ نہ بنیں۔ دوسرے آئین اکبری کو بغور دیکھنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اس میں حقیقت حال کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اس میں مذہبی امور کے متعلق کسی مہمل، احمقانہ اور شعائر اسلامی کے مخالف احکام ہیں اور اکبر کو مورد اعتراض کرنے والی باتیں ہیں۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اکبر قائل تھا اور انھیں جاری کرنا چاہتا تھا، وہ آئین اکبری میں موجود ہیں۔

اکبر کے مذہبی آئین و احکام کی نسبت معتبر معلومات تو آئین اکبری میں ملیں گی۔ ان کے علاوہ جو کچھ بدایونی کی تاریخ یا پرنگیز پادریوں کی تحریروں میں ملتا ہے وہ یا تو غلط بازاری افواہوں پر مبنی ہے یا ان نیم بخت تجاویز کا رنگ آمیز بیان ہے جو بادشاہ یا اس کے معتمد درباریوں کے سامنے پیش ہوئیں، لیکن احکام کا درجہ نہ حاصل کر سکیں۔

علماء کے محض نے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا حق اکبر کو دے دیا تھا۔ جب ہندو، جینی اور پارسی سادھو اور اہل علم مذہبی مجالس میں شریک ہوئے تو ان میں سے بعض نے بادشاہ کو جگت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی کتابوں سے ثابت کیا کہ وہ اقوام و ادیان کے اختلافات مٹائے گا۔

خوشامدی درباریوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اکبر کو یہ نظریہ ویسے بھی پسند ہوگا کہ دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ وہ روحانی راہنمائی بھی کرے۔ چنانچہ بالآخر اس نے لوگوں کو مرید کرنا اور ان کے لیے احکام جاری کرنا شروع کر دیا۔ مریدین شاہی کے اس نظام (System) میں اکبر کا جو مقام تھا اور اس کی بنا پر جو اقوام انہیں عوام الناس میں پھیلے ان کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ دار ہے اور شیری نے لکھا ہے شاہ ما امسال دعویٰ نبوت کردہ است گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواهد شدن یہی شیری بعد میں اکبر کے مرید ہوئے اور مثنوی ہزار شعاع بہ طریق تدریس

کی۔ شاید انھوں نے دیکھا ہوگا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ نہ نہیں اور یہ مریدی کا سلسلہ محض عقیدت و خوشامد کا اظہار ہے۔ بدایونی بھی جو آخر عمر میں اکبر کے مذہبی خیالات کا سب سے بڑا مخالف ہو گیا تھا اکبر سے لفظی دعویٰ نبوت منسوب نہیں کرتا بلکہ اکبر کے احکامات کا ذکر کر کے لکھتا ہے: ”ایں ہمہ باعث نبوت شد اما بہ لفظ نبوت“۔

اکبر نے دعویٰ نبوت سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن مریدان شاہی کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا اور اس کے جو عجیب و غریب قواعد و ضوابط مقرر ہو گئے، ان میں صدہا گمراہوں اور ہزار ہا غلط فہمیوں کی گنجائش تھی اور صرف اکبر ہی نہیں بلکہ اس کے مشیروں مثلاً علامی ابوالفضل کو تاریخ افسوس اور ملامت سے یاد کرتی ہے۔

اکبر (اور اس کے خوشامدی درباریوں) نے جو نظام ترتیب دیا تھا، انگریز مؤرخین اسے دین الہی کا نام دیتے ہیں، لیکن ابوالفضل جو بدایونی کے بیان کے مطابق اس طریقے کا خلیفہ اعظم تھا، یہ نام استعمال نہیں کرتا اور اکبر کے روحانی کارناموں کو آئین اکبری میں ”آئین رمنونی“ کے تحت درج کرتا ہے۔ ابوالفضل مختلف مذاہب کے بنیادی اتحاد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ جب بنی نوع انسان کی خوش قسمتی سے ایسا وقت آجاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو پیشوائی جہان مہنی بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زار کثرت میں وحدت کا سررشتہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اکبر بادشاہ کو یہ ”پر تو آگمی“ میسر تھا۔ اور اگرچہ اس نے اپنے آپ کو ایک عرصہ تک اس کام سے علیحدہ رکھا، لیکن جو مشیت ایزدی ہو، وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اب تو ”راہمنونی“ کو رضا مندی ایزدی سمجھ کر ہدایت کا دروازہ کھول رکھا ہے اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتا ہے۔ بہت سے ارباب تہجد مثلاً سنیا سی، یوگی، صوفی اور حکیم اور ارباب تعلق مثلاً سپاہی، سوداگر اس کی بدولت حقیقت سے ہمکنار ہیں۔ اور اس کی نگاہ اور فیض انفاس سے وہ فیوض حاصل کرتے ہیں جو چلوں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ بادشاہ لوگوں کو مرید ہونے سے روکتا ہے اور بار بار ان سے

مانا جاسکتا ہے، جن کے مانتے والا ان کا اقرار نہ کرے۔ وہ آئین ہی کیا، جن کا اعلان نہ کیا جائے اور وہ احکام ہی کیا، جو نافذ نہ ہوں اور ملک کے دستور العمل میں درج ہو کر عمال و حکام کی راہنمائی کا ذریعہ نہ بنیں۔ دوسرے آئین اکبری کو بغور دیکھنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اس میں حقیقت حال کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اس میں مذہبی امور کے متعلق کسی مہمل، احمقانہ اور شعائر اسلامی کے مخالف احکام ہیں اور اکبر کو مورد اعتراض کرنے والی باتیں ہیں۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اکبر قائل تھا اور انھیں جاری کرنا چاہتا تھا، وہ آئین اکبری میں موجود ہیں۔

اکبر کے مذہبی آئین و احکام کی نسبت معتبر معلومات تو آئین اکبری میں ملیں گی۔ ان کے علاوہ جو کچھ بدایونی کی تاریخ یا پرتگیز پادریوں کی تحریروں میں ملتا ہے وہ یا تو غلط بازاری افواہوں پر مبنی ہے یا ان نیم بخت تجاویز کا رنگ آمیز بیان ہے جو بادشاہ یا اس کے معتمد درباریوں کے سامنے پیش ہوئیں، لیکن احکام کا درجہ نہ حاصل کر سکیں۔

علماء کے محض نے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا حق اکبر کو دے دیا تھا۔ جب ہندو، جینی اور پارسی، سادھو اور اہل علم مذہبی مجالس میں شریک ہوئے تو ان میں سے بعض نے بادشاہ کو جگت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی کتابوں سے ثابت کیا کہ وہ اقوام و ادیان کے اختلافات مٹائے گا۔

خوشامدی درباریوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اکبر کو یہ نظریہ ویسے بھی پسند ہوگا کہ دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ وہ روحانی راہنمائی بھی کرے۔ چنانچہ بالآخر اس نے لوگوں کو مرید کرنا اور ان کے لیے احکام جاری کرنا شروع کر دیا۔ مریدان شاہی کے اس نظام (Sect) میں اکبر کا جو مقام تھا اور اس کی بنا پر جو اقوام انہیں عوام الناس میں پھیلانے کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ دار ہے اور شیری نے لکھا ہے شاہ ماہ سال دعویٰ نبوت کردہ است۔ گر خدا خواہ پس از سالے خدا خواہ شدن یہی شیری بعد میں اکبر کے مرید ہوئے اور مثنوی ہزار شعاع بہ طریق نذر پیش

کی۔ شاید انھوں نے دیکھا ہوگا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ نہیں اور یہ مریدی کا سلسلہ محض عقیدت و خوشامدی کا اظہار ہے۔ بدایونی بھی جو آخر عمر میں اکبر کے مذہبی خیالات کا سب سے بڑا مخالف ہو گیا تھا، اکبر سے لفظی دعویٰ نبوت منسوب نہیں کرتا بلکہ اکبر کے احکامات کا ذکر کر کے لکھتا ہے: ”ایں ہمہ باعث نبوت شد اما بہ لفظ نبوت“۔

اکبر نے دعویٰ نبوت سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن مریدان شاہی کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا اور اس کے جو عجیب و غریب قواعد و ضوابط مقرر ہو گئے، ان میں صدمہ گراہوں اور ہزار ہا غلط فہمیوں کی گنجائش تھی اور صرف اکبر ہی نہیں بلکہ اس کے مشیروں مثلاً علامی ابوالفضل کو تاریخ افسوس اور ملامت سے یاد کرتی ہے۔

اکبر (اور اس کے خوشامدی درباریوں) نے جو نظام ترتیب دیا تھا، انگریز مؤرخین اسے دین الہی کا نام دیتے ہیں، لیکن ابوالفضل جو بدایونی کے بیان کے مطابق اس طریقے کا خلیفہ اعظم تھا، یہ نام استعمال نہیں کرتا اور اکبر کے روحانی کارناموں کو آئین اکبری میں ”آئین زہنونی“ کے تحت درج کرتا ہے۔ ابوالفضل مختلف مذاہب کے بنیادی اتحاد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ جب بنی نوع انسان کی خوش قسمتی سے ایسا وقت آجاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو پیشوائی جہان معنی ”بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زار کثرت میں وحدت کا سررشتہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اکبر بادشاہ کو یہ ”پیر تو آگئی“ میسر تھا۔ اور اگرچہ اس نے اپنے آپ کو ایک عرصہ تک اس کام سے علیحدہ رکھا، لیکن جو مشیت ایزدی ہو، وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اب تو ”راہنمونی“ کو رضا مندی ایزدی سمجھ کر ہدایت کا دروازہ کھول رکھا ہے اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتا ہے۔ بہت سے ارباب تجر و مثلاً سنیاسی، یوگی، صوفی اور حکیم اور ارباب تعلق مثلاً سپاہی، سوداگر اس کی بدولت حقیقت سے ہمکنار ہیں۔ اور اس کی نگاہ اور فیض انفاس سے وہ فیوض حاصل کرتے ہیں جو چلوں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ بادشاہ لوگوں کو مرید ہونے سے روکتا ہے اور بارہا ان سے

کہتا ہے کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ خود کہیں پہنچے بغیر دوسروں کی رہنمائی کا کام بھروسے
لیکن لوگ نہیں مانتے اور ہزاروں اس کی مریدی میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب کوئی
بہت اصرار کرتا ہے اور بادشاہ اس کی پیشانی پر اخلاص و راستی کا نشان دیکھتا ہے
تو اس کی بیعت قبول کرتا ہے۔ بیعت اتوار کے روز جب آفتاب نصف النہار پر ہو
نی جاتی ہے۔ مرید اپنی دستار ہاتھ میں لیے بادشاہ کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ گویا
بزبان حال یہ کہتا ہے کہ میں نے خود آرائی اور خوشن گزینی کو ترک کیا۔ عاجزی اختیار
کی اور دروے جہل بخش کی تلاش میں آیا ہوں۔ بادشاہ دست نوازش دراز کر کے طالب
کو اٹھاتا ہے۔ اس کی دستار کو اس کے سر پر رکھ دیتا ہے اور ایک شخصت خاص جس پر
اسم اعظم اللہ اکبر کندہ ہے اسے عطا کرتا ہے۔

بادشاہ نے اپنے مریدوں کے لیے جو آئین و اصول وضع کیے تھے وہ ابو الفضل
کے بیان کے مطابق حسب ذیل تھے :-

”آئین ارادت گزینان ہنگام دیدار ہم آنکہ یکے اللہ اکبر گوید و دیگرے جل جلالہ مراد۔
ہنگی قدسی بیچ آنست از سرچہ ہستی فراموشی نیارند۔ یاد کرد الہی سیراب دل و ترزین
و شیریں کام باشند و نیز بفرمائش آن پیشوا آگاہ دلائل ہشیار خرام آتش کہ مردم پس از
فرو شدن بکار بند در زندگی سرانجام دہند و توشہ واپسین سفر پیش رواں شود۔ ہر
سال روز ولادت انجمن بر سازند و خوان گوناگون نعمت برکشند۔ دست نوال برکشایند و
زاد راہ دراز آماہ گرد و نیز بآئین مقدس در نا خوردن گوشت ہمت گمارند و بہتے
در ہماں ہنگام کہ ہنگام زار بار دارند دست بدینا لایند۔ لیکن در ماہ ولادت خود
نزد آن نشوند و نیز پیرامون کشہ خود نگردند۔ و بخوردن آن نشایند و باقصاب و
ماہی شکار و کج شک گیر ہم کا سگی نکنند۔ و آبستن و کس سال و فلانی و ناس نہ پویند۔
مریدوں کی بیعت کا جو طریقہ تھا۔ اُسے ابو الفضل نے وضاحت سے بیان کر دیا ہے
اس میں کسی تحریری بیعت نامہ کا کوئی ذکر نہیں، لیکن چونکہ سارا سلسلہ بادشاہ سے اظہار
عقیدت کا تھا، آگے چل کر بعض وفا شعاروں نے اس میں نئی جدتیں پیدا کیں۔ بدآئینی

۱۵۸۲ء کے واقعات کا ذکر کر کے سندھ کے حاکم مرزا جانی کی نسبت، جسے عبدالرحیم خان خاناں
نے شکست دی تھی۔ اور جواب یہ علاقہ اکبر کے موبیدار کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتا
تھا، لکھتا ہے، ”تا کار بعد از دہ دوازده سال بجای رسید کہ اکثر مخالفین چوں مرزا جانی
حاکم تہ و دیگر اہل ارتداد خط خود نوشتہ دادند باین مضمون ہندہ صورت۔ منکہ فلاں بن فلاں
باشم۔ بطور و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ و
شنیدہ بودم۔ ابرا، و تیرہ نمودم و در دین الہی اکبر شاہی در آدمم و مراتب چہارگانہ
اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول کردم و این خطوط کہ لعنت نامہ پیش
نہود۔ بجهت شرع جدید سپردہ باعث اعتماد و تربیت ایشان مے شد۔ لیکن جیسا کہ ہم
کہہ چکے ہیں کہ یہ خوشامد اور دربار داری کے کرتھے تھے یا ممکن ہے کہ جانی خاں کو صحیح
صورت حالات سے واقفیت نہ ہو اور اس نے عام افواہوں پر قیاس کر کے نئے
گل بوٹے پیدا کیے ہوں، لیکن ابو الفضل کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کی
طرف سے اس طرح کے بیعت نامہ کوئی طریقہ جاری نہ ہوا تھا۔

اکبر کے احکام عمومی | اکبری طریقہ اور مرد حقہ مذہب اسلام میں سب کو صلح خلیج
مریدان شاہی کے ان شعار و اعمال میں نظر آتی ہے،
جنہیں ہم نے گزشتہ اوراق میں آئین اکبری سے نقل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات
بعض معمولی پیر اور مرشد بھی اپنے مریدوں کو (کچھ وقت کے لیے یا دائمی طور پر)
گوشت خوردی ترک کرنے اور اس طرح کے دوسرے احکام دے دیتے ہیں یا طریقی بیعت
اور اظہار عقیدت کے مختلف آئین بنا لیتے ہیں اور انہیں کوئی اسلام سے باہر نہیں
سمجھتا اور آج سے تین سو سال پہلے تو ان معاملات میں بہت آزادی تھی۔ ایک مسلمان
بادشاہ ملک کی طرف سے اس طرح کے احکام و آئین ضرور قابل اعتراض ہیں اور
ضعف اسلام کا ذریعہ، لیکن بہر کیف وہ ایک مختصر طبقے کے لیے تھے۔ اکبر کے
خلاف سب وزنی اعتراض یہ ہے کہ اس نے اس طرح کے احکام کو اپنے مریدوں
کے لیے محدود نہیں رکھا اور صرف شخصی پسند اور عقیدہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شعائر اسلام

کے خلاف کئی احکام ایسے تھے جن کی بجا آوری کے لیے سرکاری عمال مثلاً کوتوال اور صوبیدار کی مدد لی جاتی۔ آئین اکبری میں صوبیدار (یا سپہ سالار) کے نام جو ہدایتیں ہیں ان میں اس سے کہا گیا ہے:-

”دید بانی نماید که ارادت گزینان همگام در خوردن خرد الله اکبر گوید و بزرگ جل جلاله بر خواند۔ کمتر از یک ساله گوشت و میز را غذا سازد و از روز زاد خویش یک ماه از گوشت خوردن پرهیزد۔ کشته خود را نخورد۔ آبستے که مردم پس فروشدگان بکار بند۔ ہر سال روز زاد سامان نماید و تہیدستان را کامیاب گرداند۔“

برگ عیشے بگور خویش فرست کس نیار دہلےس تو پیش فرست
چوں آفتاب از بے بے بے خرامد (یعنی آدھی رات اور دوپہر کے وقت) ہر پاس
گزاری بر نشیند و برائے ہشیار نمودن غنودگان بخبری توپ و بندوق را بہ خروش آورد
غنغوان نور افروزی آفتاب عالم تاب (یعنی علی الصبح) و نیم شب کہ آغار بر شندیاں
باشد نقارہ بر نواز دواگئی فرزند۔

صوبیدار کو یہ بھی حکم تھا کہ

و نیایش آفتاب و چراغ خورشید محمودی و آتش پرستی نداند۔

کوتوال کے نام جو ہدایتیں تھیں اس میں کہا گیا تھا کہ گائے بھینس گھوڑے اور اونٹ کو ذبح نہ کیا جائے۔ بارہ سال سے کم عمر بچے کا ختنہ نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔
وچان کند کہ گاد و گادویش واسپ و شتر قسلیخ نہ شود۔۔۔ و نگذارد کہ کم از دو از وہ سالہ را ختنہ کنند۔ چوں ازین پایہ بگذرد بد و گزارد۔ ملنگان و قلندران و دکاتلاران
ریاکار را بیرون کنند یا از روش باز دارد و آگاہ باشد کہ دریں میاں گوشت نشینے
ایزد پرست آزرده نگردد۔ و برہتہ پایاں بادیه طلب راگزندے نہ رسد۔ قصاب
و صیاد و غسال و کناس را از مردم جدا بنگاہ دہد و مردم را از آمیزہ این سنگدلان
سیہ دروں برکنار دارد۔ و ہر کہ با جلا دہم کا سہ شود۔ بدست او آسیب رساند
و اگر کوچ او با گشت (؟) و گورستان را بیرون شہر مغرب رویہ قرار دہد۔

وارادت گزینان را در سوگواری از کبود پوشی باز دارد و بہ سرخ پوشیدن کہ شش
نماید۔ فرودیں ماہ تاشرف (یعنی فروردین کی ایتیسویں) ہنگی آبان ماہ روز طے
تحويل (یعنی غرة ماہ شمسی شانزدہم آن) الہی جشنہا روز گزشتی آفتاب و ماہ یکشنبہ
آدم را از قسلیخ باز دارد۔ و شکاری جانور و بیمار را ناگزیر وادارد۔ و جان شکاری بیرون
شہر کشد۔ و الہی جشنہا را کار بندد۔ شب نوروز و شب شرف (یعنی نورزدہم فروردین)
چو اغال افروزد۔ سر آغاز کہ آبستن معید باشد و بہ روزاں ہر پاسے کوس را بلند
آوازہ گرداند و در تعویبات پارسی و ہندی تاریخ الہی را رواج دہد۔

بیاض شادی کے معاملے میں اکبر کے بعض خیالات اسلامی طریق کار سے مختلف تھے۔
اس نے قومی بیگی کا ایک محکمہ جاری کر کے دو ذمہ دار آدمیوں کو اس امر کے لیے متعین کیا
تھا کہ وہ دولہاؤں کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ ابو الفضل آئین کد خدائی کے
ضمن میں لکھا ہے:-

(وزنا شوی) در زن و مرد نارسیدہ (نا بالغ) نکو میدہ شمارد۔۔۔ و در خوشاوندان
نزدیک نامزدانند و ہر زبان قدسی چناں رود۔ آنکہ در باستان دختر بتوام ندادے
نقل بندگان را زبان بند گرداند۔ تقلید پیشگان احمدی کیش را بیوگان بنی اعمام شہورش
در نیاورد۔ سر آغاز دیں بہ غنغوان آفرینش مردم زادماند۔۔۔ و افروں از یک زن
بہر کس نہ پسندد۔ و شورش طبیعت و آشوب خانہ اندیشد۔

و دو فرسیدہ کم از برگزارد۔ یکے از حال مرداں پرورش کند و دیگرے در کار زبان
دید بانی کند و ہر دورا قومی بی نامند و بے باشد کہ اس شغل شگرف یکے باز گردد۔

ان قواعد و آئین کے علاوہ اکبر کی اپنی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں جو مسلمانوں
کو ضرور کھٹکتی ہوں گی۔ مثلاً اس کا گوشت خوری سے جتنے الوسع اجتناب اس کے
تورانی اور ایرانی درباریوں کو ضرور عجیب معلوم ہوتا ہوگا۔ خیر ترک گوشت خوری مذہبی
نقطہ نظر سے گناہ نہیں۔ لیکن سورج اور روشنی کے متعلق اکبر کے جو معمولات تھے،
انہیں عام مسلمان آفتاب پرستی کہتے تھے۔ اور واقعی اکبر کی طریق کار میں اس غلط فہمی

کی بڑی گنجائش تھی۔ ابو الفضل آئین چراغ افروزی کے ضمن میں لکھتا ہے:-

گیساں فروز روشن دل نور دوستی را ایند پرستی شمارد۔ دستائش الہی اندیشد۔ تاوان تیرہ خاطر داد فرامشی و آذر پرستی خیال کند۔ خود پڑوہ زرف میں نیکو داند۔

چوں از روز یک گھڑی ماند۔ خدیو عالم اگر سوار باشد۔ فرود آید اگر غنودہ بیدار گردد و از ہر نقاب جمال جہاں آرا یکسو شدہ ظاہر را ہر رنگ باطنی گرداند۔ و چہل روشنی بخش جہان نور خویش برگیرد۔ خدائے سعادۃ گراے درد و از دہ لگنہاے زریں و سیس کا فوری شمع افروختہ در بینک گاہ حضور آوند و یکے از سرانندگان شیوا زبان شمع در دست یزدی سپاس بر گزارد۔ و بگونہ گون نمط سراپد۔ دسپس دعائے دولت روز افروز بر خواند۔ و انجام سخن بدلاں کند۔ گیتی خدیو نیایش و نیاز را پایہ بر تر بند۔ و تازہ فروغ در یوزہ کند۔

اکبر کو معلوم تھا کہ سورج اور روشنی کے متعلق اس کے جو معمولات تھے ان کو آذر پرستی کہا جاتا تھا اور اس نے اپنے طریق کار کی توضیح کرنی چاہی بلکہ اس کی تائید میں کلام مجید کی سورۃ الشمس کا حوالہ دیا۔ آئین اکبری کے آخر میں اکبر کے جو کلمات ابو الفضل نے جمع کیے ہیں، اس میں لکھا ہے:

”مے فرمودند۔ خورشید و الارابہ فرمانروایان عنایتے است خاص و ازین رو نیایشگری بدو نمایند و الہی پرستش بر شمرند و کوتاہ میں بہ بدگمانی در افتد۔۔۔۔۔ و از نابینائی در احترام این چشمہ نور کو تھی رود۔ و بر نیایشگر زبان پیچارہ برکشاند۔ اگر خرد آفتے نہ رسید۔ سورۃ الشمس چرا از یاد رفت؟

ابو الفضل نے بھی نور کے احترام میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا قول نقل کیا۔ ”ہر کرا آفتاب فرو شود اگر با چراغ فسا زد چہ کند۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قول کی غلط توجیہ سے قطع نظر عامۃ المسلمین اکبر کے خیالات سے متفق نہ ہو سکتے تھے۔ اکبر کی عبادت کے جو اوقات تھے وہ بھی نرالے تھے اور سب سورج کی گردش سے متعلق تھے۔ ابو الفضل آئین شباروزی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ خدیو عالم اکثر وقت

عبادت اور محاسبہ روحانی میں صرف کرتے ہیں۔ ”خاصہ سحر گاہ کہ دیباچہ بہر فزنی و غفوان نور پاشی است و نیمہ روز کہ فروغ آفتاب عالم تاب جہاں را در گیر دو سرمایہ نشا طر گونا گور مردم آید و شام گاہ کہ مایہ وہ روشنی ہا از چشم خاکیان پنهان شود و نور دوستان را سراپاسی در گیر و نیم شبان کہ آن روشنی افزاے انجمن ہستی رو بفرار نہند و غمزگان تیرہ شب را نوید خوش دلی رساند۔“

تعظیم آفتاب نور کے متعلق اکبر کے معمولات غالباً پارسی مذہب سے ماخوذ ہیں۔ ہندوؤں کی بھی کئی رسمیں اختیار ہو گئی تھیں۔ مثلاً تالادان۔ اسی طرح دیوالی کے موقع پر ہندو گائے کی پرستش کرتے ہیں۔ اکبر نے اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنے کے لیے یہ شروع کیا کہ دیوالی کے روز کئی گاؤں کو سجا کر منگواتا اور ”صید دلہا“ کا اہتمام کرتا۔ ”وروز دیوالی کہ از دیریں جشنائے اس مرزا است و گروہا گروہ ہندی بوم درال روز بدو (گاؤ) نیایش نمایند۔ و بزرگ داشت آل را عبادت اندیشند۔ بفرمائش شاہنشاہی لختے آراستہ بہ نظر ہمالیوں در آورند۔ و صید دلہا شود۔“

مندرجہ بالا طویل اقتباسات سے دو باتیں ظاہر ہیں۔ ایک تو یہ کہ آئین اکبری کے مطابق بھی جو اعمال و اشغال مریدان شاہی کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ وہ بھی اسلامی نقطہ نظر سے، بلکہ عقل انسانی کی رُو سے قابل اعتراض تھے۔ دوسرے اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اکبری بدعتوں کی تفصیلات دینے میں ابو الفضل نے مبالغہ انت سے کام نہیں لیا۔ اُس کے ہاں وہ غیر مصدقہ افواہیں نہیں جنھوں نے (بقول شیخ نور الحق محدث ابن شیخ عبد الحق محدث) عوام میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن جو قابل اعتراض، بلکہ مضحکہ خیز طریقے مریدان شاہی وغیرہ کے لیے مقرر ہوئے اور ”آئین راہمنوی“ کا جزو بن گئے، وہ آئین اکبری میں موجود ہیں ان شاہی احکام کی ابو الفضل جو تاویل و توجیہ کرتا ہے، وہ اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے اکبر نامہ اور آئین اکبری میں حقیقت حال کو چھپایا ہے۔

اکبر کے جو معمولات شعائر اسلامی سے متناقض تھے، ان کی تشریح و تائید ہوتی اور ان کی مصلحتیں بیان کی جاتیں۔ اکبر اور ابوالفضل کے بیانات میں اسلام کی شکائتیں نہیں صرف مسلمانوں کے ایک گروہ کا شکوہ ہے۔ دوسرے مذہبوں مثلاً ہنود کا اس سے زیادہ شکوہ ہے۔ مسلمانوں میں صرف ارباب تقلید کا۔ اس کے علاوہ اکبر نے بعض تبدیلیاں جن کا وہ مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں سمجھتا تھا۔ عام مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لیے ترک کر دیں۔ (مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ الہی کے سلسلے میں ابوالفضل کا بیان) لیکن امور ملکی میں اکبر کا جو بنیادی طریق کار تھا، مسلمان اسے بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر اور ابوالفضل اسے صلح کل کہتے تھے، لیکن یہ طریقہ فقط صلح کل اور رواداری کا نہ رہا۔ کئی مسلمان بادشاہوں (مثلاً کشمیر کے سلطان زین العابدین) نے مسلمان رہتے ہوئے کامل صلح کل اور رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اکبر کا راستہ دوسرا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مختلف الاقوام ملک میں بادشاہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہندو اسے ہندو سمجھیں۔ مسلمان اسے مسلمان خیال کریں اور پارسی، جین اور عیسائی سب اپنا اپنا ہم عقیدہ تصور کریں۔ مسلمان امرا، علما اور عوام کو قدرتی طور پر یہ طریق کار ناپسند تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے آفتاب اور نور کی تعظیم و تکریم اور مریدوں کی معاشرت خوراک اور تدفین کے لیے جو انوکھے بلکہ مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے، انھوں نے بادشاہ سے

ملہ ہمارا خیال ہے کہ ان مضحکہ خیز جدتوں میں سب سے زیادہ دخل بیربر کو تھا۔ یہ ایک قابل ذکر حقیقت ہے کہ بدایونی اس معاملے میں سب سے زیادہ ابوالفضل اور بیربر کو مطعون کرتا ہے، بلکہ بیربر کو خاص پرگالیاں دیتا ہے۔ ابوالفضل تو خیر اکبر کا خلیفہ اعظم اور شاہی خیالات کا ترجمان تھا۔ لیکن بدایونی اکبر کے گمراہ کرنے والوں میں بیربر کو اس قدر اہمیت دینا بے وجہ نہیں۔ ہمارے خیال میں اکبر سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے بیربر کی شخصیت کا غلط اندازہ لگایا۔ اس برہمن کو جو ہندو دنیا کا کے مطابق ایک گمراہ تھا۔ ایک مخلص مرید شاہی سمجھا اور اس کے مشوروں اور رفاقت کا اہمیت دے کر یہ خیال کیا کہ ان کے اختیار کرنے سے سارے ہندو شاہی چیلے بن کر موحا (بانی اچھے منھے)

مسلمانوں کا دل کھٹا کر دیا اور بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ جو خلافت اسلام عمل و عقیدہ بادشاہ سے منسوب ہوتا اور جو کچھ بادشاہ کے خلاف کہا جاتا۔ عوام اسے درست تسلیم کر لیتے۔

کیا اکبر نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟ | اکبر کی مذہبی تاریخ کا اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟ ہم

نے اس کے جاری کردہ قواعد و آئین کو تفصیل سے منضبط کر دیا ہے اور قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انھیں ایک مذہب کہا جائے یا ایک طریقہ۔ اس فیصلے میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ شیخ عبدالحق محدث جیسے متقی اور محتاط بزرگ تو اسے نبوت کہتے تھے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اکبر نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اکبری طریقے کا سب سے بڑا مخالفت بدایونی ان احکام کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ "اس ہمہ باعث دعویٰ نبوت شد۔ اما نہ بہ لفظ نبوت"۔ پرتگیز یادری ۱۵۹۲ء میں لکھتے ہیں کہ "بادشاہ سب مذہبوں کو کچھ نہ کچھ اخذ کرنا چاہتا ہے اور مشہور ہے کہ وہ اپنا مذہب جاری کرنے والا ہے"۔ یعنی کم از کم اس وقت تک اس نے ایک نیا مذہب جاری نہیں کیا تھا اور اس کے بعد تو یقیناً اکبر نے کوئی خاص نئی بات نہیں کی۔ حال کے مورخین اکبر کو ایک نئے مذہب دین الہی کا بانی سمجھتے ہیں۔ لیکن عہد اکبری کی تواریخ میں یہ نام اس صورت میں کہیں نہیں ملتا۔ بدایونی نے فقط مرزا جانی خاں حاکم تہ کی ایک تحریر کی نقل کی ہے جس میں "دین الہی اکبر شاہی" کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تحریر خوشامدی عہدہ داروں کی جدت طرازی تھی۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اکبر کے مرید عام طور پر اس طرح کی تحریر لکھ کر دیا کرتے تھے (ہمارے نزدیک یہ خیال ہی کہ خان اعظم یا میراں صدر جہاں یا حضرت موسیٰ پاک شہید نے جو بقول

[بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۳۷]

ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس معاملے میں دیانند اور اکبر کے اصل ہی خواہ ہندوؤں کا جو طرز عمل تھا اس کا ذکر ہم راجا جھگوان داس اور راجا مان سنگھ کے ضمن میں کریں گے۔ اکبر نے بیربر کی صلاحیتوں کا جو غلط اندازہ لگایا تھا، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے اس مسخرے بھاٹ کو راجا کا خطاب دیا۔ اور اپنے دربار کا مہاکوی (ملک الشعرا) بنایا!

لیکن یہ تو بتایا جائے کہ ان سے بہتر فرقہ کو نسا ہے تاکہ ہم اس کے قائل ہو سکیں۔ چنانچہ بدایونی جس نے یہ گفتگو نقل کی ہے لکھتا ہے کہ بادشاہ بھی لاجواب ہو گیا۔ (اندکے محقول شدہ از شدت گزشتہ)۔

اس واقعہ کے چند سال بعد جب ^{۱۸۵۸ء} میں راجا مان سنگھ بہار کا گورنر ہو کر جانے لگا اور اکبر نے غلوت میں خاص اظہارِ شفقت کے مریدی کا ذکر کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر حضور کی مراد مذہب سے ہے تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ دوسرا رستہ مجھے معلوم نہیں کونسا ہے کہ اختیار کروں چنانچہ اکبر ٹال گیا۔

یہ سوال کہ اکبر کا جلدی کردہ طریقہ ایک نیا مذہب تھا یا فقط ایک ”روش“ (cult) اور ”مریدی“ کا سلسلہ اس لیے اہم ہے کہ اگر یہ ایک مذہب تھا تو نہ صرف اس کا بانی بلکہ اس کے اختیار کرنے والے اپنے پرانے مذاہب (مثلاً اسلام) سے خارج سمجھے جائیں گے۔ لیکن ”مریدی“ کے احکام اور ریاضتیں اصل مذہب پر مستند اور ہوتی ہیں۔ ان کے اختیار کرنے سے اصل مذہب کا ترک لازم نہیں آتا۔ اگر اکبر کے جاری کردہ طریقے کو ایک علیحدہ مذہب سمجھیں تو نہ صرف اکبر بلکہ خان اعظم، میاں صدر جہاں اور کتنے دوسروں کی نسبت یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور بدایونی کے اندراجات بغور پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ جو لوگ مریدوں میں داخل ہوئے تھے انھوں نے ترکِ اسلام نہیں کیا تھا اور احکام اسلامی پر عمل تھے۔ مثلاً بدایونی تو لکھتا ہے کہ سلطان کے مشہور

۱۔ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۳۳۳ ۲۔ منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۶۴ ۳۔ مثلاً بیر
جسے اکبری بدعتوں میں ابو الفضل سے کم دخل نہ تھا اور جو واحد ہندو درباری تھا جس نے مریدی کی سب منزلیں طے کی تھیں۔ اسے ہندو یا ہندو کے خارج نہیں سمجھتے۔

بزرگ حضرت موسیٰ پاک شہید بھی رسمی طور پر بادشاہ کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے۔
”و دریں ایام شیخ موسیٰ بعد از زہد و عبادت و مجاہدت و مشیخت چندین سالہ ارادت متعارف رسمی بہ پادشاہ آورد و شخصت سپاہگری یافتہ تسلیم نوکری کردہ داخل امر“
پانصدی شد۔ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۲)

لیکن اسی صفحہ پر بدایونی صاف لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسیٰ بادشاہ کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ دیوانخانہ خاص و عام میں ہی اذان دے کر نماز شروع کر دیتے۔ اور کوئی انھیں کچھ نہ کہہ سکتا!

اسی طرح بدایونی کے بیان کے مطابق میراں صدر جہاں ^{۱۵۵۵ء} میں اپنے دو بیٹوں کے ساتھ حلقہ ارادت میں داخل ہوا، لیکن مکتوبات خواجہ باقی باللہ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے پانچ چھ سال بعد یعنی اکبر کی زندگی میں وہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انھوں نے اسے ”ذکر“ سکھانے کے بعد حضرت مجدد کے پاس ”توجہ“ کے لیے بھیجا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہی ظاہر ہے کہ خواہ جانی بیگ جیسے مفتوح مخالف خوشامد کی خاطر کیا کہیں۔ مریدی اب عقیدت و وفاداری بتانے کا ذریعہ رہ گئی تھی اس سے ترک اسلام اخذ کرنا صحیح نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام سلسلہ اسلام کے ضعف کا باعث اور مسلمانوں کے لیے بڑا رنجیدہ تھا۔ ملکی نقطہ نظر سے بھی، سوائے اس کے کہ ایک بااثر طبقہ کے دل مجروح ہوئے۔ اس سے کوئی نتیجہ مثبت نہیں نکلا۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا بادشاہ جو اپنے دائرہ عمل یعنی ملک گیری و ملک رانی میں اتنا سمجھ دار اور فرض شناس تھا، خود پسندی اور خوشامد کا شکار ہو کر کیسی کیسی حماقتوں اور لوجبیلوں کا مرکب ہوا۔ اور ابو الفضل کی نسبت کیا کہا جائے کہ عقل کے ستارے دعویٰ کے باوجود ان خام خیالیوں کی توجیہ کرتا

ہے اور ان کے لیے جواز فراہم کرتا ہے! **ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بالقابہ کا محاکمہ** | اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت اس کی

زندگی میں اختلاف رائے تھا اور عہد حاضر میں بھی یہ اختلاف باقی ہے۔ ہمارے خیال میں اس معاملے میں سبک چھی ٹلی اور منصفانہ رائے پاکستان کے مشہور عالم اور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کی ہے جنہوں نے اپنی کتاب *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-continent* میں اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ یہیں ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور ہم متعلقہ اندراج کا ترجمہ اردو دان حضرات کی خاطر پیش خدمت کرتے ہیں:-

”دورِ حاضر کے مصنفوں نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض نے زیادہ تر بدایونی پر انحصار کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نے اسلام بالکل ترک کر دیا اور ایک نئے مذہب کی بنا ڈالی۔ دوسروں کی رائے ہے کہ وہ مسلمان رہا۔ اور مذہب اسلام سے اس کا تجاؤ (Deviation) اہم نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مصنفین نے بدایونی کے بیانات کو زیادہ وسیع مفہوم دیا ہے اس کے لیے اس کے (مغربی) مترجمین ذمہ دار ہیں۔ بدایونی ایک ذہین اور چالاک (clever) اہل قلم تھا۔ اس میں اتنی قابلیت تھی کہ جو کچھ وہ کہے، اس سے زیادہ سمجھا دے۔ اس کے کئی اندراجات ذومعنی ہیں اور ان کا ترجمہ بڑا مشکل ہے۔ جہاں ایسی صورتِ حالات نہیں وہاں بھی اس کی کتاب کے (انگریزی) ترجمے درست نہیں اور کئی اہم الفاظ جن سے اس کے الزامی اندراجات میں کمی ہوتی ہے چھوڑ گئے ہیں بعض مصنفین نے پرتگیز پادریوں کے جن بیانات سے اپنی رائے کے لیے تائید حاصل کی ہے، ان بیانات کو غلط یا انتہائی طور پر مبالغہ آمیز ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے بعد بھی ان لوگوں کی رائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اکبر نے اسلام سے تجاوز نہیں کیا، صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جان بوجھ کر ترکِ اسلام (کا اظہار) بہت خفیف ہے [It is true that of conscious abjuring of Islam there was very little.]

معلوم ہوتا ہے، اکبر کو یقین تھا کہ اسلام کا جو مفہوم اس کا تھا، وہ ان صلا کی ترجمانی سے زیادہ معقول تھا۔ جن سے اس نے اختلاف کیا۔ عبداللہ خاں ازبک کے نام کے خط میں جب اس نے ترکِ اسلام کے الزام پر احتجاج کیا تو غالباً اس کا اظہار دیا تھا۔ اس کا ذہن پیچیدہ (Complex) تھا اور اس کی اتنی تربیت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زاویہ ہائے نگاہ کے تناقض کو سمجھ سکتا۔ اس نے کئی ایسی چیزیں کیں بلکہ اس کے کئی محققات ایسے تھے جن سے معمولاً آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً آفتاب کے لیے اس کی تعظیم عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس کا یہ خیال نہ تھا اور اس معاملے میں وہ اس ذہنی انتشار کو شاید انتہائی صورت میں پیش کرتا ہے جو کئی مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ (مر ۴۴-۱۲۵)

اکبر کے آخری ایام

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی آگے چل کر لکھتے ہیں:- ”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۵۹۵ء کے بعد اکبر کی مذہبی بوجھیاں ٹھنڈی پڑ گئیں“ (مر ۱۴۹)۔ مریدی کا سلسلہ غالباً آخر تک جاری رہا۔ لیکن اب یہ بادشاہ سے وفاداری اور عقیدت کا اظہار زیادہ تھا مذہبی عقائد اور طریقوں کا کم۔ پروفیسر جی ہمدی کا جنہوں نے دین الہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ خیال ہے کہ ۱۵۹۵ء میں جب قلعہ لاہور میں نوروز کا جشن منایا جا رہا تھا، آسمان سے آگ برسی (بجلی پڑی) جس سے شاہی سائبان اور بہت سا ساز و سامان بھی جل گیا اور بڑا نقصان ہوا۔ اس ساعقہ آسمانی کو بادشاہ کی خود پسندی اور غلط روی کی سزا سمجھا گیا۔ بادشاہ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا اور اس کی انانیت اور مطلق العنانی میں کمی آگئی۔

فیضی کی تفسیر غیر منقوٹ | اظہار ڈاکٹر قریشی اور پروفیسر رائے چوہدری کی رائے قیاس پر مبنی ہے، لیکن قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور متعدد شواہد ایسے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ فیضی نے

اپنی کوتاہیوں کی جو وضاحت کی وہ قبول نہ ہوئی بلکہ بادشاہ نے بھی ان شکایتوں کو وزن دیا۔ حتیٰ کہ ۲۱ مئی ۱۵۹۵ء کو ابوالفضل اس حد تک گرفتہ خاطر تھا کہ اس نے دربار جانا بند کر دیا اور اپنے پرانے سے طنا چھوڑ دیا۔ اکبر نے اسے بلایا، لیکن اس نے جلیے کٹے جواب بھیجے اور اس بات کے لیے بھی آمادہ تھا کہ وہ اپنے الزام کنندہ کے ساتھ جلتی آگ میں کود پڑے۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ حیب ابوالفضل خود کشی یا خانہ بدوشی کی بھی سوچا رہا۔

ابوالفضل نے اپنے مخالف مدعی کا نام نہیں لکھا اور نہ ہی کسی اور کتاب میں یہ وضاحت ہے۔ لیکن "اقبال نامہ جہانگیری" (نو کشور) کا مصنف جو ایک معاصر راوی ہے، لکھتا ہے کہ شیخ مبارک نے جب تفسیر لکھی تو وہ بادشاہ کو نہ دکھائی۔ اور اس کی وفات کے بعد ابوالفضل نے بے اجازت اس کی بہت سی نقیص کر کے بلاد اسلامی میں بھیجیں ایک موقع پر اکبر کو اس کی اطلاع ہوئی۔ شہزادہ سلیم نے بھی بادشاہ کو بتایا کہ ابوالفضل کتنا کچھ ہے اور کتنا کچھ ہے۔ "وہ دلائل و براہین خاطر نشان نمودند کہ آنچہ دریں مدت از اخلاص و کرم نگری خودلاف سے نزد از فروغ صدق بہرہ نداشت۔ و زیاتش با دل آشت ناست" (اقبال نامہ جہانگیری جلد دوم ص ۴۵۸-۴۵۹) مآثر الامراء میں جو بعد کی تالیف ہے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ سلیم ابوالفضل کے گھر آیا۔ دیکھا کہ چالیس کاتب قرآن و تفسیر لکھتے ہیں مصروف ہیں۔ وہ سب کو بلو شاہ کے حضور میں لے گیا۔ ہر راہب جزائے کتب نزد بادشاہ بردہ مظنہ ساخت۔ کہ مالا بہ چیز یا سے دیگر می نماید۔ و چوں خلوت می رود۔ آن کار دیگر میکند (مآثر الامراء جلد دوم ص ۴۶۱) کئی درباریوں (مجسمے از مقریان بساط عزت) نے جو موقع کی تلاش میں تھیں پریل الا از گوشہ کنار بہ کنایہ صریح مقدمات بعرض رسانیدند [اقبال نامہ جہانگیری]

ابوالفضل نے بلا غرور و دبدبہ آنا شروع کر دیا، لیکن اب اس کے دشمنوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کیے۔ وہ اکبر نامہ میں لکھتا ہے کہ چونکہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنی رائے میں مستحکم رہتا تھا اور قوی دلائل سے وہی کہتا تھا، جس میں حکومت کی مصلحت ہو۔ اس لیے اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف چھوٹی سیجی باتیں کیں اور ان کی سازشوں

کی وجہ سے ۱۰ پانچ جنوری ۱۵۹۹ء کو اسے دکن بھیج دیا گیا تاکہ شہزادہ مراد کو واپس لائے۔ دکن میں ابوالفضل پر جو گزری اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ دکن کی طرف ابوالفضل کی روانگی دربار کو آخری الوداع تھا۔ پھر اسے دار الخلافہ میں زندہ قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا!

ابوالفضل نے اپنے مخالفوں کے نام نہیں بتائے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ کافی بااثر ہوں گے۔ اکبر کے رضائی بھائی اور وکیل مطلق خان اعظم کی ابوالفضل کی نسبت جو رائے تھی اس کا اندازہ اس تاریخ سے ہو سکتا ہے جو اس نے ابوالفضل کے قتل کی لکھی۔

شیخ اعجاز رسول اللہ سر باغی برید

دکن سے لکھے ہوئے ایک رقمہ میں بخشی الملک (شیخ فرید) کی بالوضاحت شکایت ہے۔ ان دنوں شیخ فرید نے بادشاہ پر کافی اثر حاصل کر لیا تھا۔ اکبر نامہ میں جہاں ابوالفضل کے خلاف سازشوں اور ان کی وجہ سے اس کے دکن بھیجے جانے کا ذکر ہے اس سے ایک ہفتہ پہلے بادشاہ کا شیخ فرید کے ہاں جانے اور اس کے ہمان ہونے کا بھی بیان ہے۔ یہ شیخ فرید وہی ہیں جو سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے قدر دان تھے اور جنہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی خالقاہ کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مادر النہر میں مولانا خواجگی سے (جن کا عبداللہ خاں ازبک بڑا معتقد تھا) بیعت کے بعد حضرت خواجہ اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں واپس ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ اور ان دنوں لاہور میں مقیم تھے۔

پریگیز مشنری اور مسلمان امرا | خان اعظم اور شیخ فرید کی نسبت ہم آئندہ صفحات میں زیادہ تفصیلات دیں گے، لیکن پریگیز مشنریوں کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے کہ خواہ اکبر کے مذہبی خیالات کچھ ہی ہوں آخری ایام میں دربار اور کاروبار سلطنت پر متشرع مسلمان امرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

اکبر نے پریگیز پادریوں کو تحریر و تقریر کی بڑی آزادی دے رکھی تھی اور انھوں نے

اس سے فائدہ اٹھاتے وقت تہذیب اور خوش اخلاقی کے تمام اصول نظر انداز کر دیے لیکن عام مسلمان اُمرا کا دل ان کی بد مذہبی سے جس طرح کڑھتا تھا، اس کا اندازہ ایک مسلمان امیر کے اظہار خیال سے ہو سکتا ہے جو اس نے پادری زیور کی تقریر کے بعد کیا۔ مسٹر مین صاحبانہ بیان کا خلاصہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

بہت سے مسلمان درباری جو اس وقت بلاشاہ کے ساتھ تھے، پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا، اسے سمجھا یا کہ جب وہ شرع اسلامی کا ذکر کرے تو اسے زیادہ احتیاط اور ادب سے گفتگو کرنی چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا: ”یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں اور جب تم شرع اسلامی کی نفرت کرتے ہو تو وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور اگرچہ میں تمہارا دلی اور محکم دوست ہوں۔ جب تم ہمارے نبی کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ تمہارے جسم میں خنجر بھونک ڈوں۔“

گوا سے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ مندرجہ بالا اندراج تیسرے مشن کے متعلق ہے، جو ۱۵۹۷ء میں لاہور پہنچا اور اکبر کی وفات تک ملک میں موجود تھا۔ دوسرا مشن ۱۵۹۸ء میں بھیجا گیا، لیکن اگلے سال واپس بلایا گیا۔ اس مشن کے ارکان کو بعض شاہزادوں اور امرا کے بیٹوں کو پرتگیزی زبان (بقول ابو الفضل لاطینی زبان) سکھانے پر لگایا گیا۔ اس مشن کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اور معاصرانہ رپورٹ کو، جو لاطینی زبان میں ہے، درج کرنے کے بعد مسٹر مین لکھتے ہیں:-

”اس (رپورٹ) سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرز عمل کیا ہو، اس کے اُمرا یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبیر کا ثبوت نہیں دیا جس کی صورت حالات متقاضی تھی اور اُمرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا۔“

اکبر کے آخری ایام میں خان اعظم وکیل مطلق اور امیر الامرا تھا۔ وہ دربار کا سب سے بااقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی فہر اس کی تحویل میں تھی۔ دار الخلافہ میں بخشی شیخ فرید نے بادشاہ کا بڑا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ لاہور کا گورنر گلچ خاں جس کی بیٹی سے اکبر کا ایک بیٹا دانیال بیٹا ہوا تھا، سخت متشعر مسلمان تھا۔ دکن میں مرزا عبدالرحیم خان خاں کسی قدر آزاد خیال تھا، لیکن وہ بھی خواجہ باقی باللہ کا معترف اور عام طور پر اسی گروہ کے ساتھ تھا۔ ان امرا اور ان کے رفقاء نے کارنے ملک کی فضا کو بگڑنے نہ دیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی ماوراء النہر سے واپسی (۱۵۹۷ء) کے بعد تو ملک بھر میں ایک نئی روحانی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بند ٹوٹ چکا ہے اور فیضانِ روحانی کا دریا موجزن ہے۔

حضرت خواجہ کے تفصیلی حالات ہم آئندہ صفحات میں دیں گے۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری ایام میں وہ ماوراء النہر سے لاہور پہنچے۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی کو اپنی دینی و روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اکبر اور اس کے امرا دکن میں کچھ عرصہ گزار کے آگے آگئے۔ ان دنوں آگرے میں نقشبندیہ سلسلے کے ایک اور مشہور بزرگ تشریف لائے، جن کے حالات سے اُس زمانے کی روحانی فضا پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت الیشاں تھے۔ جن کا پُر شکوہ مقبرہ لاہور کی زیب و زینت ہے۔ وہ بعد میں کشمیر چلے گئے اور وہاں

۱۷ لاہور میں نئی انجینئرنگ یونیورسٹی سے بالکل قریب ہے۔ اور فی تعمیر کے لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے۔ اس علاقے میں (جو ایک زمانے میں مچلیوڑ کہلاتا تھا) کئی تاریخی عمارتیں ہیں۔ مثلاً نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ، جنھوں نے بندہ بیرگی کا قلع قمع کیا تھا۔ اور ان کے بیٹے زکریا خاں حاکم پنجاب کی قبریں شرف النساء زویہ عبدالصمد خاں کا مقبرہ، جس کے متعلق اقبال نے قصہ شرف النساء کے عنوان سے جاوید نامہ میں ایک پُر اثر نظم لکھی ہے۔ علی مردان خاں کا مقبرہ وغیرہ۔ سٹا لامار باغ بھی یہاں سے دور نہیں ہے۔

لاہور تشریف لائے، لیکن اکبر کے آخری ایام میں آگرہ میں تھے۔ ان کے حالات ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معین الدین نے مرآۃ طیبہ میں مرتب کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت ایشاں آگرے پہنچے تو کئی امرا جن میں سے ایک خان اعظم تھا۔ اور شاہی خاندان کی کئی خواتین نے ان کی بیعت کر لی تھی۔ موخر الذکر میں سے ایک تو سلیم سلطان بیگم تھیں (جو اکبر کے حرم میں تھیں) دوسری گلرخ بیگم (جن کی بیٹی سے اکبر نے سلیم کی شادی کر دی تھی)۔ گلرخ بیگم نے تو فرط عقیدت سے حضرت ایشاں کے لیے ایک جامہ اس طرح سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانگے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین کے بیان کے مطابق اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعائے خیر (فاتحہ) کی درخواست کی۔ اس سے اس زمانے کی روحانی فضا کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابوالفضل کا انجام | ہم مخالفوں کی سازش کی بنا پر ۹ جنوری ۱۵۹۹ء میں ابوالفضل کے دکن بھیجے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ چند مہینے بعد اکبر خود دکن پہنچا۔ ابوالفضل کی اس سے وہاں ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۶ مئی ۱۵۹۹ء میں ابوالفضل

لے وہ خود ایک بڑے عالم، مشہور صوفی اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث کے شاگرد تھے۔ جب ان کے والد کو عبد شاہ جہانی میں لاہور آنا پڑا تو انھوں نے کشمیر میں ان کی جانشینی کی اور بڑا نام پیدا کیا۔ تاریخ کشمیر (عظمیٰ) میں تفصیلی حالات ہیں۔ ان کی تصانیف میں کنز السعادات مرآۃ القلوب۔ سیر خیر البشر۔ مرآۃ طیبہ کے نام تاریخ کشمیر (عظمیٰ) کے مصحح مفتی محمد شاہ صاحب نے اضافہ کیے ہیں۔ اور فتاویٰ نقشبندیہ کا ذکر تاریخ کشمیر کے متن میں ہے۔ خزینۃ الاصفا میں رسالہ رضوانی کا ذکر ہے۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفاسیر ہیں۔ زبدۃ التفاسیر عربی میں اور شرح القرآن فارسی میں ہیں جن کی تفصیل معارف ماریج ۱۹۶۷ء میں قاضی محمد عمران خاں صاحب کے ایک مضمون میں دی گئی۔

بادشاہ کے ساتھ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شریک تھا۔ جب اکبر شیر گڑھ کی فتح کے بعد شمال کو مڑا تو خانخاناں نے جو اکبر کی طرف سے دکن کی فتح پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کی ابوالفضل کو میری مدد کے لیے یہاں چھوڑ جائیے۔ چنانچہ بادشاہ نے ابوالفضل کو دکن میں چھوڑا اور خود آگرے روانہ ہوا۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد خانخاناں نے شیخ کو اس قدر وق کیا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ شیخ کے خط اس درود اندوہ سے بھرے ہوئے ہیں جو اسے دکن کے قیام میں اٹھانے پڑے۔ ایک خط میں بادشاہ کی نسبت لکھا ہے:-

”بخدمت دکن حسب الحکم ایشاں آدم۔ آماجہ محنت ہائے کہ نکشیدم وچہ درشتیائے کہ ندیدم قبلہ من عسا کہ ہجران غلبہ نموده است و ہجوم علی العموم فرمودہ من بکس بے یلاق و صلاح در میدان ہجوم و عرصہ غموم فروماندہ۔ نہ یارائے کہ بخت دارم نہ قدرت آویختن۔“

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ کاش میں پیدا نہ ہوتا! تاکہ دکن کا سفر اور اس کی مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں۔ از محنت ہائے چرخ کج رفتار و کلفت ہائے زمانہ غدار چہ گوئم و چہ نویسم کہ یہاں نے بنیم و نئے کشم۔ حق علیم اعلام است کہ زندگی بر من گرانی کند۔ پیدا کنندہ عالم و آدم کاش کہ مرا بوجہ تھے آورو تا محنت ہائے دکن دامنگیر حیات نئے گردید۔ شیخ نے اس طرح کے کئی خط شاہزادوں، شاہزادیوں، بادشاہ کی ملکہ اور والدہ کے نام لکھے کہ بادشاہ سے کہہ کر مجھے واپس بلوالو۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ میں کئی عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں، لیکن خانخاناں کے جو حامی دربار میں ہیں، وہ میری عرضیاں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے (جماعہ کہ اعوان و انصار اویند۔ عرضیہ مرا بنظر اقدس حضرت نئے آوند) ایک خط میں بالتصریح بخشی الملک شیخ فرید کی نسبت لکھا ہے کہ میں بادشاہ کو سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلہ کی نسبت ہزار تاکید سے لکھتا ہوں لیکن بخشی الملک کی طرف سے کوئی اور ہی مشورہ ملتا ہے (حرفے را کہ ہزار تاکید محقول حضرت اعلیٰ می سازم۔ ملازمان بخشی الملک علی الرغم آں نوسے دیگر عرض اشرف

سے (رسانہ)۔

ابوالفضل اس کشمکش میں گرفتار تھا کہ نیرنگی زمانہ نے ایک اور کھیل کھیلا۔ جہانگیر نے الہ آباد میں اپنی بادشاہت کا ساز و سامان کر لیا۔ دربار کے کئی با اثر امراء اکبر کے خیالات سے متغیر تھے۔ انھیں جہانگیر سے ہمدردی تھی۔ جہانگیر کے پاس الہ آباد میں اکبر کے نمائندے میراں صدر جہاں خود جہانگیر کے پرنسے استاد اور دلی خیر خواہ تھے۔ وہ بادشاہی مریدوں میں شامل ہو چکے تھے اور بدایونی نے ان کی کئی لغزشوں کا ذکر کیا ہے لیکن اسے غالباً پورے حالات کا پتہ نہ تھا۔ صدر جہاں شیخ عبدالغنی کے شاگرد تھے اور حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔ یا ایک دو سال میں (یعنی اکبر کی زندگی میں) حضرت خواجہ اور حضرت مجدد الف ثانی سے فیض یاب ہونے والے تھے۔ نئے حالات میں اکبر کو اپنا دیرینہ خادم بھریا دیا۔ ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمن کے سپرد کر کے فوراً ادھر روانہ ہو جاؤ۔ خبر دینے والوں نے جہانگیر کو خبر دی۔ وہ ڈرا کہ اگر ابوالفضل دربار میں آئے پہنچا تو اور الجھنیں پڑ جائیں گی۔ اُس نے بندھیا کے راجا زنگھ دیو کو جس کے ملک سے شیخ کو گزند نہ تھا، لکھا کہ شیخ کا کام تمام کر دو، بڑی رعایتیں پاؤ گے۔ چنانچہ وہ تین چار ہزار فوج لے کر آگیا۔ شیخ کو ان باتوں کی خبر نہ تھی اور اس کے پاس مختصر سی جماعت تھی۔ بڑی بہادری سے لڑا، لیکن معاملہ اس کے بس کا نہ تھا۔ بارہ زخم کھائے اور میدان جنگ میں کھیت رہا۔ سر جہانگیر کو بھیجا گیا اور جلد بے سر گویا کے پاس انٹری میں دفن ہوا۔

اکبر کے آخری ایام میں حالات کے سدھارنے میں جن اراکین سلطنت کو دخل تھا، ان میں سب سے

خان اعظم مرزا عزیز کوکہ

ابوالفضل کے بہنوئی خواجہ حسام الدین نے منصب ترک کر کے خواجہ باقی باللہ کی بیعت کر لی تھی۔ ابوالفضل اس کے بہت خلاف تھا اور خواجہ حسام الدین کو بہت دق کرتا تھا۔ انھوں نے مرشد کے پاس گایت کی تو انھوں نے غلطی سے جمع دار کو کارواں ابوالفضل (دریں چند روز بیم شوق چنانچہ ایسا ہی ہوا۔) (زبدۃ المقامات)

سربراہ اور وہ اکبر کا رضاعی بھائی اور وکیل مطلق مرزا عزیز کوکہ تھا۔ افسوس کہ اس کے ساتھ مؤرخین نے انصاف نہیں کیا۔ ابوالفضل کے متعلق اس کے جو خیالات تھے اور ابوالفضل کے عام زاویہ نگاہ سے اسے جو اختلاف تھا، اس کے پیش نظر اکبر نامہ کے مصنف سے کسی ہمدردی کی توقع بے کار ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی سے یہ توقع ہو سکتی تھی بلکہ بدایونی کی طبیعت ایسی تھی کہ اسے قبا حقیں اور برائیاں ڈھونڈنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ (اس نے شیخ عبدالحق محدث کی سند حدیث اور حضرت موسیٰ پاک شہید کے متعلق جس طرح طنز و تعریف کے تیر چلپے ہیں، ان کا ذکر شیخ محدث کے حالات میں آئے گا) مثبت باتوں میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ اُس نے خان اعظم کے مرید شاہی ہونے کا ذکر تو تفصیل سے اور مزے لے لے کر کیا ہے، لیکن خان نے ۱۵۹۴ء میں جو طویل خط اکبر کو اس کے مذہبی خیالات کے متعلق لکھا تھا، اُسے ایک سطر میں گول کر دیا۔ بلکہ اُس نے عریضہ درشتے طویل الذیل کا ذکر اس طرح کیا کہ گویا خان اعظم اپنے وہموں کا شکار تھا۔ اور اسے دین کا غم نہ تھا۔ شمس العلماء آزاد نے بھی کچھ بدایونی کی مدد سے اور کچھ ترک جہانگیری کے مخالفانہ اندراجات کی بنا پر دربار اکبری میں خان اعظم کا اچھا خاصا کارٹون پیش کیا ہے اور اسے ایک اکٹھر سپاہی، بلکہ ایک احسان فرموش ملازم شاہی کے روپ میں دکھایا ہے۔ عہد جہانگیری میں بادشاہ کے باغی بیٹے خسرو سے قریبی تعلقات کی بنا پر خان کا ستارہ گردش میں رہا۔ اس لیے اس زمانے کے مؤرخین نے بھی اس کی شکایتیں ہی لکھی ہیں۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ خان اعظم ایک بڑا تدبیر دیا تھا اور جرات مند مشیر اکبر کا سچا ہی خواہ، اکبری بدعتوں کا سخت مخالف اور جو کہ تمدن اسلام کا سربراہ تھا!

خوش قسمتی سے عہد عالمگیری میں خانی خاں نے اس خط کا خلاصہ دے دیا، جو اکبری بدعتوں کی نسبت اس جری دل مسلمان نے اکبر کو لکھا تھا۔ اور بعض ایسی تفصیل دیں، جن سے خان اعظم اور ابوالفضل اور بیربر کی چپقلش واضح ہو جاتی ہے۔ پرتگیز مشنریوں کے بیانات میں بھی خان اعظم کے ایک اہم خط کا خلاصہ ملتا ہے جو

اس نے حاکم خاندیش کو لکھا اور دربار اکبری کے تتمہ میں بھی آزاد نے ایک قدیمی مجموعہ سے لے کر وہ عرصہ داشت درج کر دی ہے جو خان اعظم نے مکہ معظمہ سے فرمان شاہی کے جواب میں لکھی تھی۔ تزک جہانگیری میں خان اعظم کے متعلق متعدد اندراجات ہیں اور ذخیرۃ الخوانین میں بھی اس کے متعلق ایک طویل باب ہے۔ ان سب کی روشنی میں حقیقت حال کو دیکھنا اور خان اعظم کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

خان اعظم مرزا عزیز کو گلشن اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اکبر ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ بگم (حمیدہ بانو) نے مرزا عزیز کی والدہ سے کہہ دیا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا تو اسے تم دودھ پلانا۔ اکبر کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اکبر کو دودھ پلانا شروع کیا اور زیادہ تر انھی نے یہ خدمت انجام دی۔ اکبر کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہمایوں اور بادشاہ بگم ایران چلے گئے۔ اور اکبر کی نگہداشت مرزا عزیز کی والدہ اور والد کے سپرد کر گئے۔ وہ اسے لے کر ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری کے پاس پہنچے اور بچے کی خبر گیری کرتے رہے۔ دو ڈھائی سال بعد ہمایوں ایران سے افغانستان آیا اور کابل فتح کر لیا تو اکبر اپنی حقیقی ماں ابد باب سے ملا۔ لیکن بچے کی نگہداشت اب بھی مرزا عزیز کی والدہ کے سپرد تھی۔ اکبر پونے پانچ برس کا تھا جب ہمایوں کے خلاف اس کے دوسرے بھائی کامران نے بغاوت کر دی۔ کامران اس وقت کابل کے اندر تھا اور ہمایوں باہر گھیر ڈالے تھا۔ بے در و چہانے یہ ظلم کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا، وہاں دیوار پر محصور بچے کو بٹھا دیا۔ لیکن اس وقت بھی مرزا عزیز کی والدہ نے بڑی محبت اور وفاداری دکھائی۔ اس نے بچے کو گود میں لیا اور جدھر سے گولے آرہے تھے، اُدھر کو پشت کر کے پیٹھ گئی تاکہ اگر گولہ لگے تو پہلے مجھے لگے اور پھر بچے کو اکبری اقبال سے یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ اکبر پیار سے مرزا عزیز کی ماں کو جی جی کہتا تھا۔ اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا۔ (دربار اکبری)

اکبر اور مرزا عزیز ہم سن تھے اور بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکبر تخت نشین ہوا تو

اس نے اس خاندان سے یگانگت قائم رکھی۔ مرزا عزیز کے والد شمس الدین کو اکبر (رضاعی باپ) کا خطاب دیا۔ اپنی والدہ اور دوسری بیگمات کو جو ابھی کابل میں تھیں، لانے کے لیے بھیجا۔ پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ بیرم خاں کو شکست اسی نے دی۔ اس پر اکبر نے اسے خان اعظم کا خطاب دیا۔ اور جب وہ ۱۵۶۲ء میں ادھم خاں کے ہاتھوں مارا گیا تو اکبر نے مرزا عزیز کی بہت دلداری کی۔ چند روز بعد خان اعظم کا خطاب عطا کیا۔ ہمیشہ پیار سے اسے مرزا عزیز یا مرزا کو کہہ کرتا تھا۔ اسے ہر وقت مصاحبت میں رکھتا۔ ہاتھی پر سوار ہوتا تو اکثر اسی کو خواصی میں بٹھاتا۔ مرزا کو کہہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ کا عزیز بلکہ بھائی سمجھتے تھے۔ اکبر کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ صاف گوئی ان کا ترکانہ شیوہ تھا۔ جو سمجھ میں آتا، خواہ وہ آداب شاہی کے خلاف ہو یا موافق، بدھل کر کہہ دیتے۔ اکبر بھی اس سے بُرا نہ مانتا۔ بلکہ کہتا کہ میرے اور مرزا عزیز کے درمیان دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر بھی آئے، تو جب تک یہ وار نہ کرے۔ میل لاکھ اس پر نہ اٹھے گا۔ [دربار اکبری]

خان اعظم کی تعلیم و تربیت توجہ سے ہوئی۔ وہ نہ صرف فنون سپاہگری سے پوری طرح واقف تھا بلکہ مورخین اس کی انشا پردازی اور لطیفہ گوئی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ بدایونی نے بھی زمرہ شعرا میں اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے بلکہ لکھا ہے یہ وہ فہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر ازمرا نشان غے دہندہ اور کمی شعر درج کیے ہیں۔ جن میں سے دو نقل کرتے کو جی چاہتا ہے ۵

چوں نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازین خواہم زدن بر شیشہ ناموس سنگ

اور ۵ گشت بیمار دل از درد غم تنہائی اے طبیب دل بیمار چہ فرمائی؟

علم سیر و تاریخ میں بھی اسے پورا دخل تھا، لیکن اس کا اصل مرتبہ بطور ایک سپہ سالار اور رکن سلطنت کے تھا۔ اس نے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں کیے۔ گجرات کی فتح میں اس کا ہاتھ تھا۔ اور جب ایک زمانے میں وہ تھوڑی فوج کے ساتھ

غنیم کی بے شمار جمعیت کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا اور اسے پٹن میں محصور ہونا پڑا تو اکبر فتحپور سیکری سے مارا مار کر تاشتر سوار فوج لے کر اس کی کمک کو پہنچا۔ اور تائیس دن کی منزلیں اس طرح نو دن میں طے کیں کہ مورخین اسے عجائب روزگار میں شمار کرتے تھے۔ اس کے بعد جب طریقہ دارغ اور اکبر کی بدعتوں کی وجہ سے اس کے خلاف بہار و بنگال میں بغاوت ہو گئی تو باوجودیکہ خان اعظم نے دارغ کی مخالفت کی تھی اور دربار اکبری کی نئی روش سے وہ متفق تھا، اُس نے بطور ایک وفادار رکن سلطنت کے 'جان کو خطے میں ڈال کر اس بغاوت کو فرو کیا۔

تاریخ میں خان اعظم کا بلند مقام اس لیے ہے کہ اس نے عبد اکبری میں قریب قریب وہی دینی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کی جو علاء الدین خلجی کی محفل خاص میں علاء الملک کو تو ال سے ظہور میں آئی۔ بظاہر وہ اس میں ناکام رہا۔ کیونکہ اکبر کے ساتھ ابوالفضل جیسے اہل علم تھے، لیکن اپنے فریضہ کی ادائیگی میں اس نے علاء الملک سے کم جرات نہیں دکھائی اور زیادہ قربانیاں دیں اور بالآخر حالات کو بہت حد تک سدھار میں کامیاب ہو گیا۔

خان اعظم جب بنگالہ سے فتح پور واپس آیا تو مذہبی بحثیں زوروں پر تھیں۔ بدایونی لکھتا ہے :-

در نیم محرم سنہ تسعین و تسعمایہ (۹۹۰ھ) اعظم خان از بنگالہ آمد۔ و شبے در شانے محاورہ باو گفتند کہ ما دلائل قطعی بر حقیقت تناسخ یافتہ ایم۔ شیخ ابوالفضل خاطر نشان شما خواهد کرد۔ او ہم قبول نمود۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۰)

ممکن ہے خان اعظم نے (دوسروں کے سامنے) بادشاہ کی تردید مناسب نہ سمجھی ہو۔ لیکن بدایونی کا یہ بیان کہ خان اعظم تناسخ کا قائل ہو گیا تھا، قرآن کے خلاف ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کا مصنف جو خان اعظم کا جانتے والا تھا۔ اس کی نسبت لکھتا ہے :-

خان اعظم در سوخت دین و اسلام و تعصب در مذہب اہل سنت بے نظیر بود۔

اس کے علاوہ خود بدایونی آگے چل کر خان اعظم کی نسبت لکھتا ہے کہ جب وہ

بنگالہ سے فتحپور آیا تو اس نے مذہبی معاملات کے متعلق "سخنان درشت" سکے۔ اور "متعصبانہ" (ذرا بدایونی کا انتخاب الفاظ ملاحظہ ہو) شیخ ابوالفضل اور میر بر کو بادشاہ کے حضور میں گھسیٹ لایا۔ بدایونی کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :-

"ہوں در مرتبہ اخیر کہ از بنگالہ بہ فتحپور آمدہ۔ سخنان درشت در وادی مذہب و

ہمت گفتہ۔ متعصبانہ شیخ ابوالفضل و میر بر را بحضور بادشاہ پیش کشیدہ و سخنان

بجائے عجب رسانیدہ مخاطب خاص و عام بود۔ (مر ۳۸۷)

منتخب اللباب میں خافی خان، جس نے خان اعظم کی مکہ معظمہ والی عرضداشت کا پہلی مرتبہ خلاصہ پیش کیا۔ اور جس کے سامنے بعض ایسی تحریریں ہوں گی، جو اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔ سنلہ کے ضمن میں خان کی نسبت لکھتا ہے :-

"و در ریش تراشیدن و سجدہ نمودن خلاف امر لے دیگر کہ اطاعت امر مے نمودند

بعل نیادہ در ریش را دراز گذاشتہ بود۔ و مدام با مقربان حضور خصوص با شیخ

ابوالفضل و فیضی دریں مادہ نزاع دینی داشت۔ لہذا ہر دو برادر و مقربان دیگر

ماندن اور حضور مصلحت ندانستہ تجویز موبہ داری احمد آباد بعد تخریر آن بمیان

آوردہ اور از بادشاہ جدا ساختند۔

خان اعظم کو بادشاہ سے جدا کرنے کے لیے جب اس کے مخالفوں نے اسے گجرات بھجوا دیا تو وہ چھ سال تک دار السلطنت میں نہ آیا۔ حالانکہ قاعدہ تھا کہ اطراف کے گورنر گاہ بگاہ حضور میں آتے رہیں۔ اس کی طلب میں کئی فرمان گئے، لیکن وہ بھی نہ آیا۔ ایک خط میں تو طنزاً یہ لکھا گیا "مگر ریش تو گرانی میکند کہ نمی آئی" اس نے جواب میں ایک سخت خط لکھا (بقول بدایونی "اور فیضہ درشتے طویل الذیل در جواب ارسال نمودہ")۔ افسوس کہ ملا صاحب نے یہ اہم خط نقل نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنے متعلق معمولی خط (تھے کہ فیضی کے نوشتے ابھی درج کتاب کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی کہ "وہ بے بخاطرش راہ یافت و بعضے از اہل نفاق نیز از بادشاہ نسبت باو سخنان گفتہ از جا بردند" اس ضمن میں شمس العلماء آزاد نے خان اعظم کی ایک ایسی عرضداشت خلاصہ

دیا ہے۔ (دربار اکبری ص ۲۶) جو ان کے بیان کے مطابق اس نے مکہ معظمہ کو روانگی سے پہلے بلکہ "عین روانگی کے وقت لکھی" لیکن فی الحقیقت یہ خلاصہ خانی خاں کی اس تلخیص کا ترجمہ ہے جو اس نے مکہ معظمہ والی عرضداشت کی تھی۔ روانگی سے پہلے جو طویل الذیل "عریضہ درشتے" لکھا گیا، اس کے مفہوم کے متعلق ہمیں فقط دو سطریں آثار الامرایں ملی ہیں۔ جہاں گرانی ریش والے فقرے کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ "گویند مرزا ہم در مقام مذہب حرفہائے پوست کندہ و تند نوشتن آید بجائے عثمان علی فاضل راقر دادہ اند۔ آیا بجائے شیخ کرامی گرفتہ اند۔" (جلد اول ص ۶۸۳، ۶۸۴)

بادشاہ سے خان اعظم کی یہ خط و کتابت جاری تھی کہ اس نے جو ناگزیر چڑھائی کی۔ اسے فتح کر لیا اور قریب کے بعض ہندو راجاؤں کو شکست دے کر بڑا زور مال جمع کیا اور تمام اہل و عیال کو لے کر دیو کی بندرگاہ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گیا۔ بدایونی کے خان اعظم کے متعلق جو خیالات تھے، ان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے "عریضہ درشتے طویل الذیل" کی نسبت لکھے۔ لیکن چونکہ خان کی مکہ معظمہ کو روانگی سے اکبر پر چوٹ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تاریخ لکھی۔

برجائے راستاں شد خان اعظم و لے در زعم شاہنشاہ کج رفت
چو رسیدیم ز دل تاریخ این سال بگفتا میرزا کو کہ برج رفت
اور آگے ایک فقرہ بڑھا کہ خان اعظم کے متعلق بھی اپنا مافیہ ظاہر کر دیا۔ وایں
کار اور کہ ارکار سلطان التارکین ابن ادہم سے شمرند آخرفرہ و نارفہ مسادی بود
(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۸۷)

خان اعظم مکہ معظمہ چلا گیا تو اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ اس کی ماں جو اکبر کی رضاعی والدہ تھی غم و فکر سے نیم جاں ہو گئی۔ اکبر کو اس وجہ سے بھی بڑی تشویش تھی، لیکن اس نے بڑے حوصلے اور تدبیر سے کام لیا۔ خان اعظم کی تلخ کلامیوں کو بالکل پی گیا۔ بلا اجازت اور جن حالات میں وہ ملک سے چلا گیا تھا، اس پر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا خان اعظم کے جو بیٹے اور عزیز دار السلطنت میں رہ گئے تھے، ان کے منصب بڑھا دیے۔

اور خان اعظم کو ایک بڑا محبت بھرا برادرانہ خط بھیجا، جو انشائے ابوالفضل دفر اول میں درج ہے۔ اس میں لکھا کہ ہم تمھاری آمد کے منتظر تھے۔ جب یہ پتا چلا کہ تم زیارت حرمین شریفین زاد ہما اللہ شرفاً کو چل دیے اور اس دہشتناک سمندر میں اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے تو بڑا تعجب ہوا کہ ایسا غلص اور مستحسن الخدمت ملازم ہمارے حقوق نظر انداز کر کے ہم سے اجازت لینے بغیر رخصت ہو گیا۔ اور نہ ہی اس نے اپنی والدہ شریفہ کی رضامندی حاصل کی۔ حالانکہ سارے اہل اللہ نے جملہ معاملات بالخصوص اس طرح کی عبادات میں ماں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا اور اس کی اجازت بغیر ان عبادات و طاعات کو باعث ثواب نہیں سمجھا۔ اگر اس مکرر تقدس تک پہنچنے کا شوق دامنگیر تھا، تو چاہیے تھا کہ اجازت لیتے۔ اور اگر بہت جلدی تھی تو کم از کم اہل و عیال کو یہاں بھیج دیتے۔ خیر، اس خاندان کی خدمات مستحسن ایسی ہیں اور بالخصوص جی جی کی خاطر اشرف ہمیں اس طرح عزیز ہے کہ اگر ہمیں ملال ہوا تو وہ بھی عارضی تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم پردیس میں مارے مارے پھرو۔ اور خاص و عام کے طعنے سہو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چاہیے کہ تم یہاں پہنچنے کا قصد کر کے ہمیں اپنی آمد سے دلشاد کرو۔ اور جی جی کے زخم دل پر د جس کی تمھارے فراق میں یہ حالت ہے کہ خدا کسی کو نہ دکھائے، مرہم رکھو اور دنیوی و اخروی عقوبت و عذاب سے نجات حاصل کرو۔

اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل عرضداشت لکھی، جس کا بدایونی نے مطلق ذکر نہیں کیا، لیکن اس کا خلاصہ بڑی معذرتوں کے ساتھ خانی خاں نے دے دیا تھا اور اب تتمہ دربار اکبری میں پوری عرضداشت چھپ چکی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے خیال سے ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں:-

کمینہ فراشاں آستان کیوان مکان ملائک آشیاں خاقان جمشید نشان فرید وں شان
کینخورد سنگاہ کیو مرث بارگاہ سکندر جہاد عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خروگاہ ظل سبحانی
عزیز کو کہ بعض می رساند کہ لے انور بر طلب ایں غلام کمینہ فاض و صادر گشتہ بود

جہان و دل را خلاصہ آب و گل ست۔ با جمعی کثیر از روسائے اخلاص و ابہتال
بخدمت حجاب در گاہ گہمان پناہ کہ مبدائے سخا و منشاء عظمت و کبریاست فرستادن
چون مفتی عقل و فتوے قاضی گمان بلکہ نقیین محل بحراں مجوری کہ در دلیست بے دردن
نوشته داده بود۔ بر ناقابلی فرسوده دست ملالت در گردن کرده ماند چوں دانست
بہ یقین کہ احادیث تحریک اعدا موثر و کارگر افتاده مزاج اشرف بالغنیت و تمتی
چند کہ بمساح جاہ و جلال رسانیده از کینہ در گاہ منحرف ساخته اند وادی ملے
عالم آرائے بساط بوسان آن در گاہ بہ قتل و قح ایں بے گناہ را ہنموں گشتہ بہ
خاطر رسید کہ چشم خاکسار بے مقدار را کہ در خدمت قابللن آن در کار آسمان نشان
پرورش یافته بمرتبہ اعظم خانی و عزیز کوگی و حکومت گجرات سرفراز شدہ ہم بواسطہ
ایں تشرفات بجا کہ محکمہ مقایسہ منورہ رسانیده کہ با کافران ہندوستان سبی را
کہ پروردہ خوان الوان انعام و احسان بادشاہ جہاں پناہ باشد در یک خاک و
در یک محل مدفون سازد محض گستاخی و قایت بے ادبی است و لاجرم گجرات
را کہ آنکہ معمورہ دار السلطنت بود بہ محمدان سپردہ غبار ملال و اختلال خویش را
از گوشہ خاطر خاک و بان آن آستان ملائک آشیان شستہ دست از مطالبات آنجا
و پائے ادب را کوتاہ ساختہ مواشی کہ محض لبعی جل سپاری خود از معانک کفہ
جمع ساختہ بود بدست عدل بیرون آید از حلال ترین چیز ہا دانستہ سفر گزیدہ
آن قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آورده کہ اگر خواہند منصب اعظم خانی
را در بار گاہ بادشاہ روم کہ اشرف مملکت ریح مسکون بقصر ایشانت می تواند
خرید۔ اما خلاصہ جہت مصروف آنست کہ وظیفہ بمر دم مستحق مصالح پاک دین آن ملک
مقرر سازد و مدرسہ بنام نامی حجاب بار گاہ بندہ پرور حضرت خاقانی با تمام رساند کہ
تا انقراض عالم و روز بان مؤرخان جہاں باشد و خود در آن مدرسہ بہ بحث علوم دینی
و فکر شرکہ عبارت از توحید و نعت و منقبت اصحاب بودہ باشد و دعا سے دولت
روناز و اشتغال می داشتہ باشد۔ امید آنست کہ از رفیق ایں کمترین

غلامان بر حاشیہ ضمیر خاک و بان آستان غبار سے خواہد نشست بلکہ مطلب سخن چینل
و عیب کنندگان کہ حدم بود ایں محرم است بحصول خواہد پرست کہ منصب اعظم خانی
و حکومت گجرات و عشرت عزیز کوگی را باین محرم نئے شوند بناچار جمع مذکورات را
پیشکش مدعیان نموده کہ ایشان را حق نیست بدول بندہ و ممکن کہ ایں کینہ را بقتل
باشد بدول ایشان چوں آخوا لا مرسم لطف شامل حال بوستان مطالب و مقاصد
دیگران شد و نہال امید و حقوق بندہ را بسموم محرومی خشک سالی بخشیدند۔
بندہ از فدوی کہ نہاد عاقبت اندیشی ہا بسگان آستان چند کلمہ گستاخی نموده
بعرض می رساند کہ جمعی خاطر اشرف را از دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیگانہ و تحت
می سازد و حاشا کہ دوست باشند و کینہ کہ نیک نامی دنیا و عقبہ می طلبد و دشمن
و واجب الاخراج باشم و الاکار دنیا باز بچہ ایست ناپائدار بر جوف دوسہ خوش
گوئی آخرت بدنیافروش اعتماد نہ باید کرد۔ ہمہ عالم را گوش ہوش است پیش ازین
سلاطین بودہ اند کہ ہمہ صاحب تمکین بودند، بیچ بادشاہ را دغدغہ نہ شد کہ
دعوی بخیبری و نسخ دین محمدی نماید۔ بل مادامی کہ چون مصحف اعجازی چوں
چہار بار چند بار پسندیدہ باشد و شوق قمر با مثال ایں چیز واقع نہ بود مردم میکند
یا رب دغدغہ چہار بار بودی کلام جماعت را می شدہ باشد۔ کلج خلص صفائی
ظاہر و باطن و عصمت جلی دار و صادق خاں کہ شرف رکابداری از یرم خلل یافتہ
یا ابو الفضل کہ شجاعت و حیالش بجائے علی عثمان می تواند بود۔ بخداوند
بخاکپائے بادشاہ قسم جو عزیز کسی کہ نیک نامی طلب باشند نیست و ہمہ ملایک و فرشتہ
در روزگزارند و آنگہ نیک نامی طلب بندہ است کہ تا بود جو حرف نیک نامی باشد

خلافت پیغمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید
فرقے کہ میان اکابر مجلس بہشت آمین و بندہ کمترین است ہمیں است کہ ابو الفازی
در فرمان بندہ اضافہ کردہ دیگر کافران را بر مسلمانان ترجیح دادند کہ بر صحت لیل و نہا
خواہد ماند۔ آنچه بر بندہ واجب است در آن تقصیر نہفت و اللہ اعلم۔

اس عرضداشت کی نسبت شمس العلماء آزاد نے عجیب طرز عمل اختیار کیا۔ یہ عرضداشت ان کے پاس تھی اور انھوں نے اسے شائع کر کے تاریخ دالوں کو زیر بار احسان کیا، لیکن انھوں نے اس کے اندراجات پر غور نہیں کیا بلکہ اس کے اندراجات کا اندازہ ابوالفضل کے اس طویل طویل خط سے لگانا چاہا ہے جو اس نے اکبر کی طرف سے اس عرضداشت کے جواب میں خان اعظم کو لکھا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیال کہ یہ خوش اعتقاد امیر جویش دینداری میں ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا غلط ہے۔ فرماتے ہیں، "حقیقت میں کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں اور بچوں کی سی ضدیں تھیں وہاں ایک یہ بھی تھی۔" اور اصل میں کلیج خاں اور ٹوڈرل کے ساتھ مسابقت کا جھگڑا تھا۔

اس نقطہ نظر کی جسے پہلے بدایونی نے ہوادی (حالانکہ شمس العلماء) بالکل خلاف واقعہ یہ لکھتے ہیں۔ "ملا صاحب (بدایونی) نے تو اس کی دینداری پر اپنی انشا پر داری کے سہرے چڑھائے ہیں" (مندرجہ بالا عرضداشت سے پوری پوری تردید ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خان اعظم نے یہ عرضداشت ابھی طرح سوچ سمجھ کر اور آداب دربار داری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر لکھی۔ لیکن اس کا عندیہ بالکل واضح ہے۔ اس میں ایک تو اس امر کی شکایت ہے کہ ہندوؤں کو اعلیٰ منصب دیے گئے۔ اور کہا کہ صفحات تاریخ پر یہ بات ثبت رہ جائے گی اور بدنامی کا باعث ہوگی کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی اور بڑے دلچسپ اور مدبرانہ انداز میں لکھا کہ مجھ پر اپنے اتنی عنایتیں کیں خان اعظم اور عزیز کو کہ بنایا۔ گجرات کی حکومت سے سرفراز کیا اور اس طرح "مکہ معظمہ متہرہ منورہ" پہنچانے کا انتظام کیا۔ میرے لیے تو حضور کے ساتھ یہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہے کہ وہ جسم جو آپ کے انعام و احسان سے پرورش یافتہ ہے، اسے "کافران ہندوستان" کے ساتھ ایک ہی جگہ سپرد خاک کیا جائے! دوسرے سید اور اس پر زیادہ زور دیا کہ جو لوگ اعلیٰ حضرت کو دین محمدی سے بیگانہ اور مجتنب بناتے ہیں۔ ہرگز ہرگز آپ کے خیر خواہ نہیں۔ دنیا ناپائدار ہے۔ اور ان دو تین خوشامد گو آخرت بدنیافروش لوگوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے بھی بادشاہ گزرے ہیں جنھیں بڑا جاہ و جلال

حاصل تھا۔ کسی کے دل میں یہ "دغدغہ" نہ ہوا کہ وہ دین محمدی میں ترمیم اور دھڑی بھری کا خیال کرے۔ اور سعدی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

خلافت بیکبر کسے رہ گزید کمر ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور قسم لے کر کہا کہ عزیز کے سوا آپ کی نیک نامی کا خواہاں کوئی نہیں۔ سب خوشامد گو اور اپنا اتو سیدھا کرنے والے ہیں۔ میں آپ کی نیک نامی کے سوا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا اور عرضداشت میں اس کی مثالیں دیں کہ میں تو اس دامن میں نگاہوں کہ مجاز میں مستحق لوگوں کے وظیفے مقرر کروں اور حضور کے نام پر ایک ایسا مدرسہ قائم کروں جس کی مورخان جہاں ہمیشہ تعریف کریں اور جس میں علوم دینی کی تعلیم اور فکر شعر یعنی "توحید و نعت و منقبت" کے علاوہ حضور کی دولت روز افزوں کے لیے دعا ہوتی رہے۔

خان اعظم کا جو نقطہ نظر تھا اور اکبر کو جس راستے پر وہ لانا چاہتا تھا، وہ اس کی تحریک سے ظاہر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں اپنا اور دربار کے ایک گروہ کا موازنہ کیا گیا ہے اور اپنی خیر خواہی پر زور دیا ہے، لیکن یہ موازنہ کسی قرابت، خدمات یا دوسرے حقوق پر مبنی نہیں۔ دونوں کے طریق کار اور مذہب کے متعلق متضاد مشوروں کی بنا پر ہے۔ یہ ایک شخصی مسئلہ نہ تھا۔ اصول کا سوال تھا۔ بادشاہ کو طے کرنا تھا کہ اس کے اصل خیر خواہ کون ہیں اور اس کے لیے نیک نامی کا راستا کونسا ہے۔ بادشاہ نے جو فیصلہ کیا اس کا اندازہ اس منصب اور اقتدار سے ہو سکتا ہے جو خان اعظم کو واپسی پر ملا لیکن ابوالفضل کا وہ خط جو دفتر دوم میں خان کے نام ہے، بادشاہ کے نقطہ نظر کا اظہار ہے۔ اس میں خان اعظم کو "دو تنخواہ حقیقی" کہا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بادشاہ نے فرمایا کہ اگر اعظم خاں در درخانہ (کذا) باشد و متوجہ این خدمت شود۔ اول و اولی است۔ چنانچہ امیر لام است۔ امیر المعاملہ نیز بود و ہمہ اینہما تابع او خواہند بود۔ یعنی معاملات اسی کے سپرد کیے جائیں گے۔ اور اسی کا طریق کار چلے گا۔

لے اس مدبرانہ طرز عمل اور اس کے نتائج کا محمد و الملک اور شیخ عبدالحی کے اس طریق کار سے مقابلہ کریں جو انھوں نے مجاز میں اکبر کے متعلق اختیار کیا۔

خان اعظم نے حجاز میں کار خیر کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا۔ ذخیرۃ الخوانین میں بتقریب ۱۵۰۰ اور مستند تذکرہ ہے، لکھا ہے، کہ خان اعظم نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بڑا خرچ کیا۔ اور نام چھوڑا۔ روضۃ نبوی کے متعلقہ اخراجات کا حساب بنوایا اور پچاس سال کا خرچ تذکر کیا۔ اسی حساب سے (مسجد نبوی کے لیے) فرش (قالین) سانبلیں، پردے اور سراپردے بھی۔ متعدد حجرے خرید کر وقف کیے اور شریف مکہ اور اس کے اہل و عیال کو اس قدر زر و زیور دیا کہ اس کا حساب نہیں ہو سکتا۔ (ص ۸۰-۸۱)

خان اعظم کی شخصیت پر پردہ ڈالنے میں سب سے زیادہ بدایونی کی تحریروں کو دخل ہے۔ وہ ان نیک کاموں کے بارے میں جو حجاز میں ہوئے بالکل خاموش ہے۔ اور نہ ہی اکبر اور خان اعظم کے درمیان جو خط و کتابت ہندوستان سے روانگی کے بعد ہوئی اور جس کی بنا پر وہ واپس آیا، اس کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ لکھتا ہے کہ خان اعظم کو شرفائے مکہ سے بڑا آزار پہنچا۔ اس کا وہ استغنا جاتا رہا۔ اور وہ واپس آکر مریدوں میں داخل ہو گیا۔ سجدہ اور دوسرے لوازم اللہوت بجالایا بلکہ (بادشاہ کی) ہم زبان میں سب سے آگے تھا۔ اس کی اصل عبارت درج ذیل ہے:-

و دریں ایام اعظم خان کہ از شرفائے مکہ معظمہ آزار بسیار کشیدہ و آن استغنا بباد دادہ بود از حج بازگشتہ داخل سلسلہ مریدان گشت، ہم سجدہ و ہم سائر لوازم ارادت

لے یہ نہ خیال کریں کہ بدایونی کبھی زمین بوس (سجدہ) جو آئین دربار ہو گیا تھا۔ (اور حمید جاگیر فیضی میں بھی جاری رہا) بجا نہیں لایا۔ وہ بحر الاسماء کا ذکر کرتے ہوئے اکبر کی نسبت لکھتا ہے "مقلد" اس حال شبہ در خواہ گاہ خاصہ خویش نزدیک یہ پایہ تخت طلبیدہ کا بلاد حکایات از ہر باب پر سید حکم فرمودند۔ کہ چوں در جلد لقل بحر الاسماء کہ سلطان زین العابدین ترجمہ فرمودہ فارسی قدیم غیر متعارف است آں را ہم از سر نو بہ عبارتے فارس بنویس۔۔۔ زمین بوس نمودہ بہ دل و جان قبول نمود و شروع در ان کرد و بعد از التفات بسیار وہ ہزار تک مرادی انعام و اسب بخشیدند"

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۴۳-۴۴)

بجا آوردہ و در ان محاسن گفت و در صحبتہا و ہم زبانہا ہمہ جا پیش بود۔ و صوبہ غازی پور و حاجی پور جائز یافت و احکام مذہب نو از خدمت علانی یاد می گرفت۔ دریں تعلیم شدہ عمر و سنوز ابجد ہی خوانم۔ ندانم کہ رقوم آموز خواہم شد بدیوانش و دفع ممالی راست آمد اکذا)

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۹)

یہ ممکن ہے کہ خان اعظم نے آئین دربار کے مطابق سجدہ زمین بوس کیا ہو اور یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ بادشاہ کے وکیل ہونے کے لیے ارادت کی جو شرط تھی، اسے بھی اس نے پورا کیا۔ لیکن بدایونی کا یہ اظہار کہ شرفائے مکہ سے تنگ آکر اس نے اپنا نقطہ نظر ترک کر دیا تھا اور اکبر اور ابوالفضل کا ہم خیال ہو گیا تھا، بہتان سے کم نہیں۔ یوں تو بدایونی نے خان کے سفر حجاز کے متعلق تحریری دستاویزوں کو جس طرح نظر انداز کر دیا ہے، اس سے ہی اس کی صحت بیان کے متعلق شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن مندرجہ بالا سطور سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے (اور جسے ہم نے خود بدایونی کی تحریکی بنا پر قبول کر لیا تھا) اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ ابوالفضل کی نسبت خان اعظم کے جو خیالات تھے، ان کا اندازہ اس تاریخی مصرع سے ہوتا ہے، جو خان نے اس کے قتل پر (عہد اکبری میں) لکھا تھا:-

تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی بُرید

اس کے علاوہ خان اعظم (اور اس کے حجاز سے واپس آنے کے بعد بیشتر مسلمان عہدیداروں) کا جو طریق کار تھا، اس پر ایک دلچسپ واقعہ سے روشنی پڑتی ہے، جو پرتگیزیادریوں کو پیش آیا اور جس کی تفصیلات C.H. Payne کی کتاب *Alber and the Jesuits* کے سولہویں باب میں بہ عنوان "ایک شاہی فرمان" درج ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ پرتگیز مشنریوں نے جنہیں اکبر نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں گوا سے پھر بلایا تھا، کچھ لوگوں (بیشتر اچھوت ہندوؤں) کو لاہور میں تبدیل مذہب پر آمادہ کیا تھا۔ جب سنہ ۱۵۸۱ء میں قلعہ خان پنجاب کا حاکم ہو کر آیا تو

لے یہ طلبی بظاہر طریقہ صلح کل کا کرشمہ تھی، لیکن ان پادریوں کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ پرتگیزیادریوں سے (باقی اگلے صفحے پر)

شق میں بڑی دشواریاں ہیں۔ اس سے شرع اسلامی (Mohammaden Law) کو صحت پہنچتا ہے اور حاکم لاہور (قلچ خاں) بھی اس کے خلاف ہوگا اس لیے جب تک اس کے متعلق بادشاہ سے میں خود نہ پوچھ لوں اسے درج نہیں کیا جاسکتا۔ اگلے روز جب وہ عہدہ دار بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور پادریوں نے کہا کہ وہ بادشاہ سے استفسار کرے۔ تو عہدے دار نے جواب دیا کہ یہ وقت اس کے لیے موزوں نہیں۔ میں بادشاہ سے علیحدگی میں استفسار کروں گا۔ پادری کہتے ہیں کہ یہ وعدہ بالکل جھوٹا تھا اور عہدے دار کی مرضی تھی کہ معاملے کو رکھا کر اس قصے کو ختم کر دے۔

بالآخر پادری بادشاہ کے وعدے کے مطابق فرمان لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی صورت اس طرح ہوئی کہ انھیں ایک با اثر فوجوان ایسا مل گیا، جو کسی وقت ایک پادری کا شاگرد رہ چکا تھا اور جس کی بادشاہ تک رسائی تھی۔ وہ تین مرتبہ بادشاہ کو ملا۔ اور بالآخر یہ فرمان جاری ہو گیا۔ لیکن پرتگیزی پادری اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ امرائے کبار جو زیادہ تر مسلمان تھے، اس فرمان کو "شرع اسلام کے خلاف" (مر ۱۵۷) سمجھتے تھے۔ اور اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے "بالخصوص (خان اعظم) عزیز کو کہنے" اس کی شدت سے مخالفت کی اور اس کے اجرا پر بہت بگڑے۔

اس فرمان کے اجرا کے بعد بھی قلچ خاں نے لاہور میں پادریوں کو جو ناک چنے چبوائے۔ وہ ایک علیحدہ داستان ہے (اس کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا انیسواں باب دیکھنا چاہیے) لیکن اس واقعہ کی جزئیات سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اگرچہ خاص اتفاقات اور خاص وجوہ کی بنا پر کبھی کبھار ایسے احکام جاری ہو جاتے تھے جن میں شرع کی پابندی نہ تھی، لیکن خان اعظم کے زمانہ اقتدار میں جو فضا دار الحکومت اور اطراف ملک میں تھی، وہ اسلام کے حق میں تھی۔ جن امور پر بادشاہ احکام صادر کر چکا تھا، ان پر شرع اسلام کی رو سے اعتراض ہوتے تھے۔ اور یہ خیال کہ خان اعظم کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ ابوالفضل کا ہم خیال بلکہ شاگرد و رشید ہو گیا تھا۔ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

اس نے ان کاموں میں روٹے انکانے شروع کیے۔ اس پر جو پادری دار الحکومت میں تھے، اکبر کے پاس پہنچے۔ حاکمان گوا کی چند تصویریں نذر کیں اور جب بادشاہ نے انھیں غلام پشیلانی سے قبول کیا تو عرض کی کہ ایک فرمان جاری کیا جائے کہ اگر کوئی شخص عیسائی ہونا چاہے تو اس کی مزاحمت نہ کی جائے۔ بادشاہ نے یہ استدعا قبول کر لی اور ایک اہل کار سے کہا کہ پادریوں کے لیے فرمان تیار کیا جائے۔ اہل کار جب یہ فرمان تیار کرنے بیٹھا اور پادریوں نے کہا کہ اس کی ایک شق یہ ہونی چاہیے کہ جو کوئی عیسائی ہونا چاہے، وہ اس معاملے میں آزاد ہوگا۔ تو وہ اہل کار رک گیا اور کہنے لگا کہ جب تک بادشاہ سے اس بارے میں پوچھا نہ جائے، اسے درج نہیں کیا جاسکتا۔ جب چند روز بعد اس نے بادشاہ سے پوچھا تو بادشاہ نے کہا کہ جو وعدہ میں نے پادریوں سے کیا ہے، میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور یہ شق فرمان میں درج کر دی جائے۔

چنانچہ اہل کار نے حسب الامر فرمان تیار کیا اور ایک اعلیٰ عہدیدار کے پاس لے گیا، جو مجوزہ فرامین دیکھا کرتا تھا۔ جب اس نے یہ شق دیکھی تو وہ بھی محترض ہوا۔ اور معاملے کو لٹکا تا رہا۔ جب پرتگیزی پادری اس کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا کہ اس

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۳۹)

رابطہ ضبط قائم کرنے اور ان کا خاص خیال رکھنے میں سیاسی اور عسکری منصوبے بھی پیش نظر تھے مثلاً قلعہ اسیر کے محاصرے کے وقت اکبر نے کوشش کی کہ پادری زلیور کے ذریعے پرتگیزیوں سے بڑی توپیں اور گولہ بارود مل جائے۔ اس کے علاوہ یہی پادری لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکبر کا پکا ارادہ تھا کہ دکن کی فتح کے بعد پرتگیزیوں کو ملک سے نکال دے۔ اور وہ اس ارادے کا اپنے رفقاء کے ساتھ بار بار اظہار کرتا تھا۔ (مر ۱۱۲-۱۱۳) پرتگیزی پادری یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکبر نے کئی دفع اپنے آدمی گوا بھیجے۔ بظاہر تو وہ سفیر ہوتے لیکن "ان کا اصل کام یہ دیکھنا تھا کہ پرتگیزی کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کی عسکری طاقت کتنی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کارند اس وقت بھیجتا۔ جب پرتگال سے جہاز آنے والے ہوتے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں کیا سلامتی اور کتنے آدمی آئے ہیں (مر ۱۱۳-۱۱۴) غالباً ان منصوبوں میں خان اعظم اور قلچ خاں کو دخل ہوگا جو گجرات رہ چکے تھے اور پرتگیزی خطروں سے آگاہ تھے۔

بدایونی نے شعرا کے ضمن میں بھی خان اعظم کا تعریف سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ بھی نیش زنی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں: "کارنامہ چند از در عالم ماندہ۔ یکے از ان عالی ہمتانہ برج رفتن بود۔ اما آمدن نہ آچنان۔" لیکن ایک پر معنی فقرہ اور ہے۔ "وایں ہمہ معتضائے زمان است۔" حقیقت یہ ہے کہ خان اعظم کا مکہ معظمہ بنانا بھی مبارک اقدام تھا اور وہاں سے واپس اگر اس نے ملک میں جو فضا پیدا کر دی، اس کے لحاظ سے واپس آنا بھی کار ثواب تھا۔

خان اعظم کا زمانہ اقدار اکبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس موقع پر اس سے ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اکبر کا جانشین جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہا جس سے اس کی اپنی بیٹی بیاہی تھی۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ جہانگیر کے با اثر طرفداروں (مثلاً شیخ فرید اسے اس کے اچھے تعلقات ہوں گے جو انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی سے پہلے اس سے وعدہ لیا کہ وہ خسرو کے طرفداروں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں نہ کرے گا۔ جہانگیر نے اس کا ایسا کیا لیکن جب اس کے باوجود خسرو نے بغاوت کر دی تو خان اعظم کی طرف پھر شبے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایرانی امرا جو عہد جہانگیری میں شروع سے (جہانگیر کے بچپن کے دوست شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیل مطلق ہو جانے کے باعث) با اثر تھے۔ اس کے سخت مخالف تھے۔ اور اس کے خلاف جہانگیر کو ابھارتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر لیا گیا۔ وہاں سے رہائی عجب دلچسپ طریقے سے ہوئی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔ کہ عرش آشیانی (اکبر) مجھے خواب میں ملے۔ اور کہا۔ "بابا۔ گناہ عزیز خاں را کہ خان اعظم است، بجهت خاطر من بہ بخش۔ چنانچہ جہانگیر نے اس خواب کے بعد اسے قلعہ سے بلایا، آزاد کر دیا اور تھوڑے عرصے کے بعد اس کا منصب بحال کر دیا۔

لے بیماری کی وجہ سے شریف خاں کو زیادہ مدت امیر الامرا رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس کا جانشین بھی ایک اور ایرانی (آصف خاں) بنا۔

عہد جہانگیری میں خان اعظم کا ستارہ گردش میں رہا۔ پھر بھی اس سے ایک ایسا کام سرانجام ہوا جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ایرانی اہل قلم تو اس معاملے میں خاموش ہیں، لیکن ذخیرہ الخوانین میں شیخ فرید بھگتری لکھتے ہیں۔ کہ جہانگیر کے پہلے سال جلوس میں امیر الامرا (شریف خاں) نے جو وکیل مطلق ہو گیا تھا، بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ قوم افغانہ خاندان مغلیہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ عرش آشیانی (اکبر بھی ان کے خلاف کوشاں رہے۔ اور انھوں نے سپاہ گری چھوڑ کر سوداگری شروع کی۔ اب چاہیے کہ ملک سے ان کا اخراج کر کے انھیں اپنے وطن روم میں واپس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں حکام اطراف کے لیے فرامین تیار ہوئے۔ لیکن خان اعظم نے خدمت میں عرض کیا۔ کہ اس اقدام سے ملک میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو جائے گا۔ اس گروہ میں کئی مومن، موحدا، خدا پرست اور سپاہی ہیں۔ یہ تدابیر انسانی سے برطرف نہیں ہو سکتے۔ ممالک محروسہ میں ان کی تعداد کم از کم ایک کروڑ ہوگی۔ اتنے قبیلہ انسانوں کو بے گناہ ملک بدر کرنا گناہ عظیم ہے۔ اور خلق خدا میں بھی بدنامی کا باعث۔ بادشاہ نے خان اعظم کی عقل و دانش پر آفرین کہی۔ اور ان فرامین کا اجرا روک دیا۔

(ذخیرۃ الخوانین حصہ اول ص ۹۸-۹۹)

خواجہ خاوند محمود (حضرت ایشاں) نقشبندی کے جو حالات ان کے صاحبزادے نے مرتب کیے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ خان اعظم نے ان سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت کی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں دو خط خان اعظم کے نام ہیں۔ جن میں ایک خاص طور پر اہم ہے۔

خان اعظم کی وفات ۱۰۳۳ھ ہجری میں بمقام احمد آباد (گجرات) ہوئی۔ ع۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

شیخ ابوالفضل ۱۰۲۴ھ عیسوی میں قتل ہوا۔ اکبر اس کے بعد تین سال تک بقید حیات رہا۔ جہانگیر کی چھوٹی

اکبر کی وفات
اور
جہانگیر کی تخت نشینی

ترک میں لکھا ہے کہ اکبر نے مرتے وقت کلمہ شہادت دہرایا۔ سورہ یسین پڑھوا کر سُنی اور بطور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان کے مرا۔ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے لیکن سفیر انگلستان سر طامس راول بھی جو اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکر شاہی سے لکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات بطور ایک مسلمان کے ہوئی۔ اسی طرح جب پرتگیز پادری بوشلیو سے بیجا پور کے عادل شاہی بادشاہ نے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہوا تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا کہ میری تو خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمدی پر ہی مرا۔

اس وقت اسلام کے لیے اکبر کے عقاید سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا۔ اکبر کا جانشین جہانگیر ہوا اور اس نے عہد اکبری کے بیشتر قواعد جو شرع اور اسلام کے خلاف تھے، موقوف کر دیے۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہانگیر کی بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو۔ خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی اور وہ راجا مان سنگھ کا بھی قرابت دار تھا۔ ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن شیخ فرید بخاری نے جنہیں بعد میں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا اور دوسرے مسلمان امراء نے اس موقع پر بڑی قابلیت دکھائی۔ انھوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا!

پرتگیز پادری جو اس زمانے میں آگرہ میں موجود تھے اور اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دینے کے لیے لختہ لختہ کی خبر منگاتے رہتے تھے، اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں۔

لہ اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن چھوٹی ترک ہے بہت پرانی۔ اور اس کے عہد شاہجہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ آثار الامراء اور دربار اکبری کے مصنفین نے اس پر بڑا بھروسہ کیا ہے۔

۲۰۴ Akbar and the Jesuits

”امراء نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اُسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانوناً حقدار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر جسے دوسروں نے اپنا نمائندہ چنا تھا۔ شاہزادہ اجانگیر کے پاس آیا اور امراء کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے۔ بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدی کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے طرفداروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شاہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے پہرواؤں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو چلا۔“

مقامی مورخین اس وعدے کا ذکر نہیں کرتے، لیکن جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی جو احکام جاری کیے، ان سے شرع اسلام کی شروع سے پیروی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً توڑک جہانگیری کے مطابق جہانگیر کا تیسرا حکم تھا کہ جو لوگ لاوارث مرحائیں، ان کی جائداد ”بمصارف شرعی“ کہ ساختن مساجد و سراہا و مرقم پلہائے شکستہ و احداث تالابہا و چاہ با باسختن صرف کی جائے۔ مساجد کی تعمیر اور ”مصارف شرعی“ کی تعین سے ظاہر ہے کہ بالکل ابتدا سے شرع محمدی کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔

جہانگیر نے بالعموم شرع اسلامی کی پاسداری کے وعدے کا ایفا کیا اور اگر اکبر کی مذہبی بوجھبجیوں کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ عہد جہانگیری میں ناپید ہو گیا۔

عہد اکبری میں علم و فن!

اکبر کے دربار کے مذہبی قضیوں کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن دربار میں جو مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی ملک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ عام ملک میں اسلامی اعتقادات برقرار رہے، بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے۔

لہ اس پر ایڈیٹر کا مافیہ ہے۔ ”یہ شیخ فرید تھا جسے عام طور پر مرتضیٰ خاں کہتے ہیں۔“

اس وقت جو نوپور۔ دہلی۔ لاہور۔ سیالکوٹ۔ احمد آباد اور دوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی اور قابل علمائے کمی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری تمام ہستیوں سے قطع نظر جس زمانے میں حضرت باقی باللہ شیخ مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحی محدث ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب کریں اُسے روحانی نقطہ کارمانہ نہیں کہا جاسکتا! اکبر کے زمانے میں درس و تدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ غلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں علوم و فنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں اور فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لودھیوں کے زمانے میں محققات کی چند کتابیں بڑھیں لیکن اکبر کے عہد میں محققات میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علمائے آمد تھی۔ جنہوں نے منطق اور فلسفے کو رواج دیا۔ ان میں شاہ فتح اللہ شیرازی بہت ممتاز تھے جنہیں اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا تھا۔ ان کی نسبت میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں: "تصانیف علمائے متاخرین ولایت (ایران) مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند از ان عہد محققات را رواج دے دیگر شد۔"

شاہ سلیمان سجادہ نشین بھلواری شریف کا خیال ہے کہ درس نظامی کے اصلی بانی ملا فتح اللہ شیرازی تھے۔ وہ اندودہ کے ایک پرچے میں لکھتے ہیں:-

اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستانی علماء عوام اور اہل یارب خصوصاً انھیں انداز تعلیم پر چلنے لگے۔ ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصاب تعلیم قائم ہوا۔۔۔۔۔ میرا مقصود فقط یہ ہے کہ درس نظامی جس کا ہیوٹے ملا فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا اور صورت نوعیہ اس کی روپ بدلائی۔ یہاں تک کہ درس کا مروجہ موجودہ حال پر استقرار ہوا۔"

۱۔ اکبری دور کا سب سے بڑا فلسفی تھا لیکن اپنے عقیدے پر سختی سے قائم تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر کے عین دیوان خاص میں جہاں اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ علانیہ نماز پڑھے۔ وہ پورے اطمینان سے جمعہ نماز کے ساتھ مذہب امامیہ کے مطابق نماز پڑھا کرتا تھا (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۱۵)

لیکن محققات کے فروغ میں جو بعد میں ایک علمی و باکی حد تک پہنچ گیا۔ علمائے ماوراء النہر کو بھی خاصہ دخل تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ جب منطق کا علم سمرقند اور بخارا میں پہنچا تو بڑا مقبول ہوا اور مصالح ایسا تیز لگا کہ ہر شخص محققی اور منطقی ہو گیا اور جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی اڑاتے کہ گدھا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں منطقی دلیل یہ دیتے کہ یہ لاجیون ہے اور حیوان عام ہے انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں پھر گدھا بھی نہیں تو کیا ہے۔ جب یہ بوالفضہ لیاں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ صوفیہ نے منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دے دیا اور بادشاہ وقت، عبداللہ خاں ازبک سے استدعا کی کہ اس فن کے استادوں کو ملکات کیا جائے چنانچہ کئی محققی مثلاً قاضی ابوالسالی مرزا جان۔ ملا عصام وغیرہ وہاں سے نکالے گئے۔ ان میں سے بعض نے ہندوستان کی راہ لی اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ خود بداینی نے قاضی ابوالسالی سے چند سبق پڑھے تھے۔ یقین ہے کہ محققات کی مقبولیت میں ان بزرگوں کو بھی دخل ہوگا۔ دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عبدالاکبری میں پھر استوار ہوئے گجرات اہل زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا۔ ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے اور یہاں کے لوگوں کو عرب جانے میں آسانی تھی۔ دوسرے شاہان گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی کر کے انھیں بہت فروغ دیا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عبدالاکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم و فضل میں دہلی پر فوقیت تھی۔ لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا۔ گجرات کے علماء دہلی پہنچے شروع ہوئے اور گجرات کی بندرگاہوں کے رستے عام ہندوستانی طلباء کو بھی مکہ، مصر اور مدینہ منورہ کا حصول علم کا موقع ملا۔

علوم اسلامی کی اشاعت اور محققات کی توسیع کے علاوہ اکبر کا زمانہ جس بات کے لیے نمایاں ہے وہ فنون لطیفہ کی ترقی ہے۔ فن تعمیر، مصوری، موسیقی، شاعری، ان سب کو اکبر کے زمانے میں فروغ حاصل ہوا۔ اکبری عہد کے فن تعمیر کے بہترین نمونے فتح پور سیکری میں ہیں

جو مذکور اس کا دار الخلافہ رہا۔ اکثر عمارتیں سُرخ پتھر کی ہیں اور ان کو بالخصوص مزار شیخ سلیم چشتی کے بلند دروازے کو دیکھ کر حیرت اور مُسترت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لاہور میں بھی جہاں اکبر آخر میں کمی برس مقیم رہا، اس نے قلعہ تعمیر کرایا اور اٹک۔ اگرہ اور دوسرے کمی منتخب مقامات پر قلعے بنوائے، جن سے نہ صرف عسکری اور حفاظتی ضروریات کا انتظام ہوا بلکہ جو فنِ تعمیر کے بھی جاذبِ نظر نمونے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ جسے تاج محل کا نقشِ اولین سمجھا جاتا ہے اسی زمانے میں تعمیر ہوا۔ اس کے علاوہ مغلِیہ مصوری کا فروغ اکبر کے زمانے میں ہوا۔ اس کا آغاز تو ہمایوں کے آخری سالوں میں ہوا جس نے اپنی بیاباں نوردی کے دوران میں تبریز اور ہرات کے حکمرانوں کے شاہکار دیکھے اور دوسٹوروں کو اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اکبر کے زمانے میں بھی ایران سے کمی مستور آئے، جن سے ہندوستانی صناعتوں نے مصوری کی تکمیل کی اور رفتہ رفتہ یہاں بھی فنِ مصوری اس عروج پر پہنچ گیا کہ ایران ہندوستان سے پیچھے گیا۔ موسیقی میں مان سین بہت مشہور تھا، جو اکبر کے نورتنوں میں سے تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے ادبیات کی سرپرستی کی۔ سنسکرت۔ عربی۔ ترکی۔ یونانی سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کرائیں سنسکرت جو کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، اتھروید اور ریاضی کی ایک کتاب لیلادتی مشہور ہیں۔ ہندی زبان نے بھی اس زمانے میں بڑا فروغ حاصل کیا اور ہندی کے دو بہترین شاعر سور داس اور تلسی داس اکبر کے محاصرے تھے۔ برہم گن کا لڑکا عبدالرحیم خانخاناں خود ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ملک الشعر کا عہدہ بھی غالباً اکبر کے زمانے سے شروع ہوا جس پر پہلے غزالی اور پھر فیضی مامور ہوا جو ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں گنا جاتا ہے۔ اس عہدہ پر جو شخص مامور ہوتا تھا اس کا کافی وقت مدحیہ قصائد اور بادشاہِ ہوشاہزادوں کے کارنامے نظم کرنے میں صرف ہوتا تھا لیکن بہر کیف اس سے حکومت کی طرف سے شعرو سخن میں دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا اور بالواسطہ ادب کے فروغ کا سامان ہوتا تھا کی شاہی سرپرستی کی راہیں سلطنتِ تعلیم کرتے۔ اور شعرو سخن کو رونق دیتی۔ چنانچہ عہدِ اکبری میں عبدالرحیم خانخاناں جیسے ادب نواز تھے جس کی سرکار سے غزنی شیلازی وابستہ تھا۔

مورخین میں علامہ عبدالقادر بدایینی مصنف منتخب التواریخ، علامہ نظام الدین احمد مصنف طبقاتِ اکبری، علامہ بدایونی کے سال وفات کی نسبت عام طور پر بے غری ہے۔ طبقاتِ شاہجہانی (علمی) میں ربابی لکھے گئے ہیں۔

اور علامہ ابو الفضل مستفاد میں اکبری و اکبر نامہ مشہور ہیں۔ ان میں سے اکبر نامہ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس سے سرکاری واقعہ نویسی کی رپورٹوں اور دوسرے مستند قرائع سے ہر عہد کی تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا جس کی تعلیم میں جہانگیر نامہ، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، عالمگیر نامہ وغیرہ لکھے گئے۔ ان میں سے جہانگیر نامہ کو ترک جہانگیری کی چمک دمک نے ماند کر دیا ہے۔ لیکن درباری مورخین کی لکھی ہوئی دوسری کتابیں اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی تالیفات میں بادشاہوں اور بادشاہزادوں کے کارنامے زیادہ ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے حالات اور معاشی امور کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر۔ آئینِ اکبری فی الحقیقت اکبر نامہ کی آخری جلد ہے۔ لیکن اس کا موضوع خاص ہے۔ اکبر کے آئینِ حکومت دینے کے علاوہ اس میں ملک کے مختلف حصوں کے متعلق پیش بہا معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اور کتاب ایک طرح کا گزٹیر بن گئی ہے۔ ان مورخین کے علاوہ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم جس نے ہمایوں نامہ لکھا ہے بڑی قابل اور عالم خاتون تھیں۔ عہدِ مغلِیہ کی مشہور خواتین کا ممتاز سلسلہ انھی سے شروع ہوا اور جس طرح چاندنی بی نورجہاں، جہاں آرا اور زیب النساء کی قابلیت اور اثر و اقتدار سے عیسائی مورخین کا یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مستورات کو جائز و جہیز نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح گلبدن بیگم کی علمیت اور زہد و تقویٰ بھی قوم اور ملک کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اس زمانے میں بہت سے قابل اطباء بھی ایران سے آئے تھے۔

عہدِ اکبری کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ تمباکو شمالی ہندوستان میں پہلی مرتبہ اسی زمانے میں آیا اور اسد بیگ نے اپنے اکبر نامہ میں اس دلچسپ اور سبق آموز مباحثہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو تمباکو نوشی کے فوائد و نقصانات پر اکبر کے دربار میں ہوا۔

عہدِ اکبری کی محرومیاں | عہدِ مغلِیہ کا علمی، فنی اور انتظامی نظام اکبر کے عہد میں ایک سانچے میں ڈھالا گیا۔ عالمگیر نامہ جو عہدِ عالمگیری یعنی اس زمانے میں لکھی گئی، جب اکبری نظام کی ایک اہم فنی یعنی مذہبی معاملات میں

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۱۴۸)
جہاں اس کی بہت تعریف کی گئی ہے لکھا ہے۔ درجہ ہزار و پست و چار از عالم انتقال نمود در عہدِ جہانگیر بادشاہ
لے ملاحظہ ہو۔ اطباء عہدِ مغلِیہ (کوثر چاند پوری)

اکبری طریق کار کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ عالمگیر کا درباری مورخ لکھتا ہے۔
”حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئین جہانبانی
و مشید قوانین اس سلطنت جاودانی اند“ (ص ۳۸)

مخلیہ نظام اور تہذیب و تمدن اپنے دور میں کسی دوسری مشرقی حکومت کے نظام سے پیچھے
نہ تھا بلکہ روسی مورخ بارگولڈ لکھتا ہے ”فقط ہندوستان میں مخلوں کے تابع حالات مختلف
تھے۔ اور اس ملک کی اسلامی حکومت مال و ثروت اور مذہبی رواداری میں محاصرہ یورپ سے
بڑھ کر تھی۔ تمام یورپ میں مخلوں کو مغلان اعظم کہہ کر یاد کیا جاتا تھا، لیکن جب دو ڈھال
سوی سال بعد مخلیہ حکومت کے خاتمے کا وقت آیا تھا تو نہ صرف یہ ہندوستان تانہ ع للبقا
کی جنگ میں یورپ کے آگے یا اس کے برابر نہ رہا۔ بلکہ ایک یورپی طاقت کے زیر نگیں آ گیا۔
اگر اس سانحے کا سبب بھی عہد اکبری کے عوامل و رجحانات میں ڈھونڈنا پڑے گا۔ مولانا
ابوالاعلیٰ مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجددین اور اسلامی علماء و زعماء کے اسباب
ناکامی کا تجزیہ کیا ہے۔ اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی ذہنی اور علمی پسماندگی کا
نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ سید
پیدا ہوئے۔ اسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ
کھڑا ہوا اور وہاں علم و فن کے محققین، کشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے

کہ انھوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ اس کے بعد وہ آدھے پورے صفحے پر اٹھا روئے،
انیسویں صدی کے مشہور مغربی حکماء، سائنسدانوں اور محاشیات و غیرہ کے ماہرین کے نام
گنا کر کہتے ہیں کہ ان میں ”ان جیسے لوگ پیدا ہوئے“ جنھوں نے اخلاقیات، ادب، قانون،
مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمرانی پر زبردست اثر ڈالا۔ اور انتہائی جرأت و
بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔
پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی
زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت

وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انھوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر
کیا۔ ذہنیاتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیے۔ نظام تعلیم بدل دیا۔ نظریہ حیات اور مقصد
زندگی بدل دیا اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔۔۔۔۔

اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا۔ جس نے ایک نیا تمدن، نئی
طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانے میں انجینئرنگ کو غیر معمولی ترقی
ہوئی، جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پچھلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھیں۔
اسی زمانے میں قدیم فی جنگ کی جگہ نیا فن جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا
ہوا۔ باقاعدہ ڈبل کے ذریعے سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، جس کی وجہ سے
میدان جنگ میں پلٹیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے
مقابلے میں ٹھیرنا مشکل ہو گیا۔ ص ۷۶-۷۷

مولانا مودودی نے جو حقائق بیان کیے ہیں، ان کی صحت و اہمیت انکار نہیں ہو سکتا
لیکن انھوں نے پکی ہوئی، تیار شدہ فصل کی تفصیل دی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اس کے لیے
زمین کب تیار ہوئی اور بیج کب بوئے گئے؟

اٹھارویں، انیسویں صدی میں یورپ کی جن ترقیوں اور مشرق کی جس پس ماندگی کا مولانا
نے ذکر کیا ہے، وہ ان عوامل و اثرات کا قدرتی نتیجہ تھیں جو صدیوں سے کارفرما تھے۔ اور
جنھوں نے عہد اکبری تک ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔

جب ۱۵۱۷ء میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کیا، اس وقت تک
علمی، اخلاقی، روحانی اور عسکری اعتبار سے مسلمانوں کا پلہ اہل مغرب سے بھاری تھا اس کے
بعد اسلامی ممالک پر منگولوں کی یورش ہوئی۔ اور ۱۵۱۷ء میں سقوط بغداد کا سانحہ پیش آیا۔
اس سیلابِ بلا سے جو عظیم سیاسی اور دینی خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ تو اللہ کے فضل سے
عارضی ثابت ہوئے اور اہل یورپ نے لاندہب منگولوں سے مل کر دنیا سے اسلام کے خلاف
جو منصوبے بنائے چاہے، انھیں بعض باتدیر مسلمان زعماء نے ناکام بنا دیا، لیکن ”فتنہ منول“
میں مسلمانوں کی علمی برتری کا خاتمہ کر دیا۔ خوارزم، بخارا، خراسان، ایران اور بغداد کے

علمی مرکزوں کی ویرانی مکتب خاتون، مدرسوں اور تجربہ کاموں کی تباہی اور علما کے قتل و انتشار سے علم کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ پھر اس کی بحالی نہ ہو سکی۔ بلکہ علم و تہذیب پرانے گہواروں میں قہقہہ دیر بریریت اور سفاکانہ جہالت کا دور دورہ رہا کہ ہمیں بہت ہو گئیں اور خیالات بدل گئے مغلوں کی تباہ کاریوں سے پہلے اور بعد کے حالات پر غور کریں تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سانچا جس میں ابروی جیسے محققین اور دانش دانوں کے ذہن ڈھلتے تھے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا و اقصیت پسندی کی جگہ قرارت اور علم کی جگہ تصوف کو فروغ ہوا علم کا مفہوم بہت محدود ہو گیا یعنی نئے علوم اخذ کرنا تو ایک طرف زوال بغداد سے پہلے جو علوم رائج تھے وہ بھی متروک و مردود ہو گئے۔ ذہن گویا منفلوج ہو گئے اور جو لوگ اہل علم کہلاتے تھے ان کا مفہوم مقصود حق کی تلاش نہ رہا بلکہ ایک نقطہ نظر کی ترویج۔

اس کے برعکس یورپ میں بالکل ایک نئی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور اس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ یا Renaissance کہتے ہیں۔ اس میں ایک حد تک ان اثرات کو دخل تھا جو عقلیہ اور اندلس میں عربوں کے بلند علمی اور تدریسی معیار کی بدولت قریبی یورپی ممالک کے اہل علم پر پڑا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں کے تمدن اور علم و فن سے اہل مغرب کو جو واقفیت ہوئی اس سے بھی ان کا اپنی ذہنی وسیع اور معیار علمی بلند ہوا۔ لیکن یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کا اصل ذریعہ وہ یونیورسٹیاں تھیں جو اس زمانے میں کثرت یورپ کے مرکزوں میں قائم ہوئیں۔ اس وقت وہاں بھی احاطہ اسلام کی طرح احاطہ قدس کی باگ علمائے مذہب ہاتھ میں تھی (مثلاً اسکسفورڈ اور کیمریج کی یونیورسٹیاں بھی شروع میں دینی درس گاہیں تھیں) لیکن یورپ میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نصاب میں توسیع ہوتی رہی اور یہ یونیورسٹیاں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کا مرکز بن گئیں۔ اس زمانے میں یورپ میں سچا بہ خانہ کا آغاز ہوا جس سے علم کی بے پناہ اشاعت ہوئی۔ کتابیں سستی ہو گئیں اور کتب خانے خاص خاص امرا یا اداروں کا اجارہ ہونے کی بجائے عوام کو بھی میسر ہونے لگے اس کے علاوہ مغرب کی عسکری برتری کا بالخصوص سمندروں پر اس کے بے روک ٹوک اقتدار کا آغاز بھی اس زمانے میں ہوا۔ اور اکبر کی تخت نشینی بلکہ بابر کی فتح پانی پت سے پہلے

بحر ہند ایک پرتگیزی جھیل بن گیا تھا جس میں جہاز رانی پرتگیزی اجازت ناموں کے بغیر غزوہ شد بلکہ ناممکن تھی۔

اکبر نے جو انتظامی عسکری مالی تہذیبی نظام قائم کیا وہ مشرقی معیار کے مطابق خاصہ بلند تھا لیکن چونکہ وہ اور اس کے رفقاء کا ترقی اور عقلیت کے دعویدار تھے دیکھنا یہ ہے کہ مغرب میں جو ترقیاں ہوئیں اور جن سے وہ بے خبر نہ تھا ان کے مقابلے میں اس نے کیا کیا؟ اکبر کی سب سے بڑی حماقت امور مذہبی میں ہوئی مغرب کی تمام ترقیاں علما سے مذہبی اور حکومت و عوام میں کشمکش اور اختلافات پیدا کیے بغیر رونما ہوئیں۔ بلکہ بعض دنیوی ترقیوں مثلاً مشرقی سمندروں میں اقتدار کے حصول میں تو دنیوی فوائد سے زیادہ جذبہ مذہبی یعنی عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کو نچا دکھانے کی خواہش کا رفا تھا۔ یونیورسٹیوں کی ابتدا اور توسیع میں بھی مذہبی علما اور حکومت کا پورا اشتراک کا رہا تھا۔ یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ اکبر اور مذہبی علما کی کشمکش کی وجہ سے نہ صرف یہ اشتراک عمل ناپید ہوا بلکہ ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ اکبر اور اس کے عقل پسند رفقاء کا رجحان و تیز پیش کرتے وہ بے ضرر بھی ہوئیں تو علما ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ اور فی الحقیقت اکبر کی مذہبی خام خیالیوں نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی۔ [اور (ان کے مخالفین کے بیان کے مطابق) نام نہاد عقلیت کے دعویداروں نے انبیاء و عظیم الصلوٰۃ والسلام اور حکماء کو اس طرح ہم پایہ قرار دے دیا تھا کہ عقلیت پسندی اور دنیوی علوم کے خلاف ایک نہ درست رد عمل شروع ہوا۔ اور وہ دنیوی علوم بھی جو دوسرے ملکوں میں علما کو اراکری لیتے تھے۔ وہ بھی یہاں متروک و مردود ٹھہرائے گئے۔ اس کا سب سے موثر اثر اظہار حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں ملے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت مجدد نے علوم دنیوی و معقولات کو پوری طرح حاصل کیا تھا۔ جس استاد (علامہ کمال الدین سیالکوٹی) کے وہ شاگرد تھے وہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا بھی استاد تھا۔ انھوں نے خود ایک مدت تک ان علوم کا درس بھی دیا۔ وہ ایک جگہ ان علوم سے ذاتی طور پر روحانی فائدے اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔

بسیارے از تحقیقات کلامی و فلسفی دریں سیر و سلوک مدونہ است و واسطہ معارف

الہی جل شانہ نگشتہ - (۲)

لیکن جب علوم عقلیہ کا مرتبہ معین کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے حکما و فلاسفہ کی نسبت لکھا :-
یہ لوگ بہت ہی بے خود اور بیوقوف ہیں۔ اور ان سے زیادہ کمینہ اور بیوقوف و حق وہ شخص ہے
جو ان کو دانا اور عقلمند جانتا ہے۔ ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لایعنی اور بیہودہ
اور لاطائل ہے۔ بھلا مثلث کے تینوں زاویہ قائمہ کے ساتھ برابر ہونا کس کام آئے گا اور کج عروسی
اور ناقصی جو ان کے نزدیک بڑی مشکل اور جانکاح ہے۔ کس غرض کے لیے ہے؟

علم طب و نجوم اور علم تہذیب و اخلاق جو ان کے تمام علوم میں سے بہتر علم ہیں گزشتہ انبیاء کی کتابوں
سے پڑا کر اپنے باطل اور بیہودہ علوم کو رائج کیا ہے۔ جیسے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے
رسالہ المنقذ عن الضلال میں اس امر کی تشریح و توضیح کی ہے۔

حضرت عیسیٰ کی دعوت جب افلاطون کو جو ان بدعقول کا رئیس ہے پہنچی تو اس نے کہا کہ
ہم ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔ ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو ہدایت دے۔

اس بیوقوف کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو جو فردوں کو زندہ کرتا اور مادر زاد اندھوں اور
کوڑھیوں کو تندرست کرتا ہے [جو ان حکماء کے اصول و قوانین کے خلاف ہے] اسے
پہلے دیکھتا اس کے حالات کو دریافت کرتا اور پھر اسے جواب دیتا۔ بغیر دیکھے اس کا یہ
جواب دینا اس کی کمال عداوت اور کمینہ پن ہے۔

فلسفہ جو ان اکثرین باشندہ پس کُل آں ہم سفہ باشد کہ حکیم کُل حکم اکثر است
.... فزندی محمد معصوم نے انہی دونوں میں جو اہر شرح مواقف کو تمام کیا ہے۔ آٹھ سبتوں میں

ان بے قوفوں کی بڑی بڑی قباحتیں ظاہر ہوئیں :- (۱۶۶)

یہ مواقف وہی کتاب ہے جس کی ملاحظہ حکیم سیالکوٹی سے لے کر اکثر فضلاء ہند نے عرض
لکھیں اور جس کے مصنف قاضی محمد الدین شیرازی کی نسبت خواجہ حافظ نے کہا :-
دگر شمشیر دانش عضد کہ در سببش بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد
اس زمانے میں تحقیق حالات میں جو دشواریاں تھیں ان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت مجدد
کا یہ خیال کہ افلاطون نے حضرت عیسیٰ کا زمانہ پایا۔ صحیح نہیں۔ افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق۔ م)

حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کوئی تین سارے تین سو سال پہلے وفات پا چکا تھا۔

حضرت مجدد نے مقررہ رسوم کے ایک خط میں بھی انہی امور سے بحث کی ہے علوم فلسفہ کی نسبت ہیں
بعض لوگ جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور فلسفی تسمیلات پر فریفتہ ہیں ان کو حکماء جان کر
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برابر سمجھتے ہیں بلکہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء کی شراعی
پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اعوذ باللہ سبحانہ عن الاعتقاد المسموع۔ ہاں جب ان کو حکما ملتے
ہیں۔ اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں تو بھی کوئی نکر اس بلا میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ حکمت مراد کسی
کا وہ علم ہے جو نفس الامر کے مطابق ہو بلکہ علم جو ان کے مخالف ہوں۔ وہ نفس الامر کے غیر مطابق ہوں گے۔
غرض ان کی امدان کے علوم کی تصدیق سے انبیاء اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ
یہ دونوں علم ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اب جو چاہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مذہب کو
لازم کر لے۔ اور حق تعالیٰ کے گروہ سے ہو جائے۔ اور نجات پا جائے۔ اور چاہے فلسفی بن جائے۔

اور شیطان کے گروہ میں داخل ہو جائے اور جہنم کے لیے زبانی گارا اور نا امید بن جائے۔ (۱۶۷)
حضرت مجدد حکماء کے تو اس لیے خلاف تھے کہ ان کے خیال میں حکماء کے علوم کی تصدیق سے
انبیاء کرام کی تکذیب لازم آتی ہے۔ لیکن علم ہندسہ کے وہ اس لیے مخالف تھے کہ اس کا کوئی فائدہ
نہیں۔ اور اس سے وبال و عذاب آخرت بچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ فرماتے ہیں :-
”باقی رہا علم ہندسہ جو خاص طور پر ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر وہ منظم یعنی کامل اور تمام بھی
ہوگا تو کس کام آئے گا۔ اور آخرت کے کوئے عذاب وبال کو دور کرے گا۔ بندہ کی حق تعالیٰ سے
روگردانی کی علامت بندہ کا یہودہ کاموں میں مشغول ہونا ہے۔

جو کچھ آخرت میں کام نہ آئے۔ وہ لایعنی اور بیہودہ ہے“ (۱۶۸)

حضرت مجدد کے علم ہندسہ کے متعلق مخالفانہ ارشادات پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ
انھوں نے علم ہندسہ کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں بعض اہم امور کو علم ہندسہ

نے غالباً ابو الفضل فیثی اور حکیم ابو الفتح کی طرف اشارہ ہوگا۔ ابو الفضل کی قریباً ساری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں
متعلقہ اندراج نظر سے نہیں گزرا۔ دوسروں کی تصانیف چھپ جائیں تو شاید حقیقت حال پر روشنی پڑے ممکن ہے
حضرت مجدد کا زبانی باتوں کی طرف اشارہ ہو۔

اصولوں سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً معارف لدنیہ میں وجود باری تعالیٰ کے متعلق بعض لطیف و دقیق حقائق کے اثبات میں لکھتے ہیں:-

”دوم۔ آنکہ برہان ہندی ثابت شدہ است کہ مرکز دائرہ نقطہ است کہ برہم و انعام و کرم“

سوم۔ آنکہ برہان ہندی ثابت شدہ است کہ..... الخ“ [رسالہ مجذوبہ ص ۱۵۳]

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نسبت تو شاید یہ کہا جاسکے کہ عہد اکبری میں علوم عقلیہ کے تجزیوں سے جو بے اعتدالیاں ہوئیں ان کے رد عمل کے طور پر ان علوم کے متعلق ان کے خیالات مخالفانہ ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منگولوں کی تباہ کاریوں کے بعد علما کا نقطہ نظر علوم کی نسبت بڑا محدود ہو گیا۔ ظالم منگولوں نے اسلامی کتب خانے برباد کر کے اسلامی علوم کے آثار نشانہ اس طرح منسلکے کہ خود مسلمانوں کو یاد نہ رہا کہ انھوں نے اپنے عہد عروج میں علوم و معارف کو کتنی وسعت اور بلندی دی تھی؟ البتہ اگس نے ایجاد کیا تھا؟ یونانی علوم کو کس نے زندہ رکھا؟ اہل ہند کے علوم (مثلاً نجوم ہندیا) کو کس نے دنیا میں عام کیا؟ طب ہیئت۔ ریاضی کیمیا طبیعیات میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کیے اور ان ساری علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اسلام کی محبت، احکام اسلام کی متابعت اور عظیم ترین اخلاقی اور روحانی سر بلندی سے کس طرح سرفراز رہے؟ دہلی میں اسلامی حکومت اس وقت قائم ہوئی، جب منگولوں کے سیلاب بلا کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ ان درندوں سے جان بچا کر جو علما و صلحا بخارا، خوارزم، خراسان اور پھر ایران، عراق سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ان سے یہاں اشاعت اسلام، نئی حکومت کے استحکام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی زیب و آرائش میں بڑی مدد ملی۔ لیکن جو افراد اس طرح جان بچا کر بھاگے تھے، وہ اپنے کتب خانے ساتھ نہ لاسکے تھے۔ تجربہ گاہوں اور علمی آلات کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں انھیں چیزوں نے فروغ پایا، جن کے لیے صدیوں جمع کیے ہوئے علمی سرمایہ کی ضرورت نہ تھی یعنی تصوف، شعر و شاعری، انشا، زیادہ سے زیادہ فقہ اور اصول حکومت پر چند کتابیں اور مقامی تاریخ نگاری۔

اسلامی ہندوستان میں بغداد اور غرناطہ، بلکہ بخارا اور خوارزم کی بھی ٹھوس علمی روایات قائم نہ ہوئیں۔ اور دہلی کا علمی افق یہاں کی عسکری اور سیاسی سر بلندیوں کے مقابلے میں نسبت

رہا۔ لیکن ہندوستان سے باہر بھی جو انحطاط آچکا تھا۔ اور علم کا مفہوم اسلام کے عہد زریں کے مقابلے میں جس طرح محدود ہو گیا تھا، اس کا اندازہ مقدمہ ابن خلدون کے ایک فقرے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو فلسفہ تدریج کے ارتقا میں جو مقام حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ بلاشبہ علامہ ابن خلدون کی علمی حیثیت عالم اسلام کے لیے باعث فخر ہے۔ حکماء اور انبیاء کے طریق کار سے اس نے بھی بحث کی ہے۔ اور اس معاملے میں اس کے اور حضرت مجددؒ کے نقطہ نظر میں ایک لطیف لیکن اہم فرق ہے۔ وہ نبوت اور حکمت کے بنیادی تخالف کا قائل نہیں۔ بلکہ نبوت کو حکمت بالا اور ماوراء سمجھتا ہے۔ جس میں حکمت کی حقیقتی خوبیاں بھی ہیں اور (وحی کے توسط کی وجہ سے) اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں۔ احکام نبوت کو بہر کیف حکیمانہ استدلال پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر عقیدہ اسلامی ہے۔ اور حکمت کی بھی خیر ضروری نفی نہیں کرتا۔ لیکن علم طبعیات کے متعلق ایک ایسا فقرہ ہے، جو علمائے وقت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور قریب قریب اسی انداز میں جو حضرت مجددؒ نے علم ہندسہ کے متعلق اختیار کیا۔ طبعیات کے مسائل ہمارے دینی معاملات میں ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

..... لہذا ہمیں ان سے کنارہ کش ہی رہنا چاہیے۔

مغرب کی علمی ترقیوں ہی نہیں مسلمانوں کے علمی عہد زریں کے مقابلے میں بھی اب علم کا مفہوم جس طرح محدود ہو گیا۔ اور بعض علوم کے دروازے جس طرح مقفل کر دیے گئے بلکہ صحیح علمی اندازہ فکر جس طرح خیر باد کہہ دیا گیا، اس میں عہد اکبری کی بے اعتدالیوں کے علاوہ دوسرے اثرات کو بھی دخل تھا لیکن اسلامی ہندوستان کی روز افزوں علمی لپیٹ مندی کے بعض اسباب ایسے تھے جن کے لیے اکبر کی اپنی کوتاہیاں ذمہ دار تھیں۔ اور اس باب میں جہاں ہم نے عہد اکبری کی علمی ترقیوں کو گنایا ہے، مناسب ہے کہ ان کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔

ہم مغرب کی علمی ترقیوں کے ضمن میں متحدہ دینی یونیورسٹیوں کے قیام اور طباعت کی ترویج کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان معاملات میں اکبر نے کیا کیا؟

اکبر علم کا مربی تھا۔ ایک زمانے میں علما و صلحا کی امداد و سرپرستی کے لیے صدر الصدور کو برکۃ وسیع اختیارات دے رکھے تھے، جن کا بسا اوقات دل کھول کر استعمال کیا گیا۔ لیکن اس نے

یا ابوالفضل نے کتنی یونیورسٹیاں قائم کیں؟ ایک نہیں، بلکہ اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں اس کی طرف سے فیروز تخلق کے قائم کردہ مدرسہ فیروزی یا ابتدائی اسلامی حکومت کے مدرسہ محضریہ یا مدرسہ ناصرہ کے پایہ کی کسی علمی درسگاہ کے قیام کا کہیں ذکر نہیں (اور بعد میں تو اکبر نے علما اور علمائے المسلمین سے اپنے آپ کو اس قدر دُور کر لیا تھا کہ اگر وہ کوئی مدرسہ قائم کرتا تو کوئی راسخ الحقیدہ مسلمان وہاں پڑھنے پڑھانے کے لیے نہ آتا۔ یا وہ مدرسہ ہی ذہنی انتشار کا سرچشمہ بن جاتا!)

چھاپہ خانہ سے بے اعتنائی اسی طرح افسوسناک ہے۔ عہد اکبری سے بہت پہلے یورپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگیزیوں نے چھاپہ خانے قائم کر رکھے تھے۔ اکبر کے سامنے یہ کتابیں پیش بھی ہوئیں، لیکن اس نے انھیں (خوشنما خطاطی کے مقابلے میں ابتدائی عہد کی بُری چھپائی کو دیکھ کر؟) پسند نہ کیا۔ اور علم کی وسیع اشاعت کا سبب کار آمد ذریعہ ہاتھ سے کھو دیا۔

علم کی توسیع کے ان بنیادی ذرائع کو نظر انداز کرنے کے علاوہ اکبری علم نوازی کی کمزوریاں اور کوتاہیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں، جب ہم ان کتابوں کا جو شاہی سرپرستی میں ترجمہ ہوئیں ان علمی کتب سے مقابلہ کریں جو درعباسیہ میں یونانی یا سنسکرت عربی میں منتقل ہوئیں۔ اکبر نے تالیف و ترجمہ کا انتظام کر کے یقیناً علمی خدمت کی۔ اور اس معاملے میں اپنے پیشرو شاہانِ دہلی پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ لیکن اس کی سرپرستی میں کتنی اور کس قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں؟ تعداد کے لحاظ سے ان کو ان کتب کوئی نسبت نہیں۔ جو اتنی ہی مدت میں بغداد کے دارالحکمت میں ترجمہ کی گئیں۔ تعداد سے بھی زیادہ اہم کتب کی نوعیت ہے۔ عہد اکبری میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں یا لکھی گئیں۔ ان کے موضوع کیا تھے۔ اور ان میں علمی کتابیں کتنی تھیں؟ ان میں سے بعض کتابیں تو ہندو کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ جن کا مقصد ظاہر ہے، سیاسی تھا۔ بعض داستانیں اور افسانے تھے۔ جن کے ترجمہ سے بادشاہ اور بیگمات کی سیاحت طبع کا اہتمام مقصود تھا۔ چند کتابیں تاریخ کی تھیں۔ اس ساری فہرست پر غور کریں تو خالص علمی کتابیں فقط دو یا تین نظر آتی ہیں۔ ایک ریاضی میں سیلاوتی

۱۷۴ عہد اکبری کا ایک شیخ (Deringham) لکھتا ہے کہ کتابوں کے اقتصادی مفاد کی خاطر مغل نے چھاپہ خانہ کھولا۔

کا ترجمہ دوسری علم ہیئت میں۔

عہد اکبری کی علم نوازی کا اگر مغرب کی معاصرانہ علمی ترقیوں سے نہیں، عہد عباسی کے علمی کارناموں سے مقابلہ کریں جنھوں نے ہر طرف سے اخذ فیض کر کے عربی میں متعدد نئے، مستقل علوم کی مستحکم بنیادیں قائم کر دیں۔ تو بتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی سطح کس حد تک گر گئی تھی۔ بلکہ ذہن کس طرح بدل گئے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ اکبر اور اس کے رفقاء کے سامنے زیادہ سے زیادہ ہرلت کے سلطان حسین مرزا جیسے مریدانِ ادب و فن کی مثالیں تھیں۔ بغداد اور غرناطہ کی علمی سرگرمیوں سے وہ بے خبر تھے۔ اور اس زمانے میں علم نہیں، ادب و فنوں لطیفہ کو عروج ہوا۔

ملکی اور عسکری معاملات کو دیکھیں تو یہاں بھی کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ عہد اکبری میں پرتگیزی بحیرہ مندر سلطہ تھے۔ بیگمات شاہی کے جہاز بھی پرتگیزیوں کے اجازت نامے لے کر سفر کرتے تھے۔ اکبر نے اس صورتِ حالات کا کیا مداوا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ پرتگیزیوں کو سواحل ہند سے نکلانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ (اور یہ خواب تو شیر شاہ سوری بھی دیکھتا تھا) لیکن عملاً اس نے کیا کیا۔ پرتگیزیوں کو ان علاقوں سے نکالنا تو بعد کی بات تھی۔ وہ کوئی قابل ذکر بحری بیڑہ بھی تیار نہ کر سکا۔ غرضیکہ عہد اکبری میں توسیع مملکت اور برہمی ترقی و تنظیم کے باوجود ایسی کمزوریاں تھیں جو آگے چل کر مملکت ثابت ہوئیں اور جن کی وجہ سے مغرب کا پلہ روز بروز زیادہ بھاری ہو گیا۔ لیکن ان کوتاہیوں کا سبب فقط اکبر اور اس کے مشیروں کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب ایک معاشرہ میں جمود یا انحطاط آتا ہے تو اس سے فقط ایک طبقہ متاثر نہیں ہوتا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی یہی عمل کار فرما ہوتا ہے۔

عہد اکبری صحیح معنوں میں جمود یا انحطاط کا دور نہ تھا۔ سیاسی اور انتظامی معاملات میں یہ ٹھوس ترقی کا دور تھا، لیکن اگر اس ترقی کا مغرب کی معاصرانہ ترقیوں سے مقابلہ کریں تو رفتار سست اور ترقی محدود نظر آتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا عمل علما اور صوفیہ کے ضمن میں کار فرما تھا۔ پہلے علما کو بھیجیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں تعلیم و تعلم میں بنیادی اضافے ہوئے۔ گجرات کی ساحلی بندرگاہوں کے ایک مدت مدید کے بعد دہلی

کے تابع آجانے سے علما کو حج و زیارت کے لیے ہی نہیں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے بھی حجاز جانے کا موقع ملا۔ چنانچہ علم حدیث کو شمالی ہند میں ایک نیا فروغ ہوا۔ جس میں سب سے روشن نام شیخ عبدالحق محدث کا تھا۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ محققات میں ہوا۔ ایک وسیع سلطنت کے قیام اور اکبر کی علمی سرپرستی کا شہرہ سن کر ایران و توران سے جو علما اور دانشور آئے انھوں نے محققات کو رواج دیا۔ اور علم حدیث کی طرح حضرت مجدد الف ثانی جیسے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود ان علوم نے بھی ہمارے درس میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی۔ لیکن اس وقت تو علمی ترقی کی رفتار کا مغربی ترقیوں سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو رفتار بہت سست اور ترقی بہت محدود نظر آتی ہے۔ امیر فتح اللہ شیرازی جیسے بزرگ چاہتے تو یہاں بھی کم از کم منتخب اداروں میں سائنس کی تعلیم کا آغاز ہو سکتا تھا۔ مغرب میں اس وقت گلیلیو پیدا ہو چکا تھا جس نے نئی ایجاد شدہ دوربین کی مدد سے علم ہیئت اور فلکیات میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور فی الحقیقت سائنس میں مغربی ترقیوں کے نئے دور کا آغاز کیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ قائم نہ ہوا بلکہ امیر فتح اللہ شیرازی نے جو کلیں اور مشینیں ایجاد کیں۔ ان کا سلسلہ بھی انفرادی نمود و نمائش کے کھیل سے آگے نہ بڑھا۔ اور یہ سلسلہ بھی امیر کے ساتھ ختم ہو گیا۔

محدود بلکہ ظاہری ترقی کا یہی عمل صوفیہ کے باب میں کارفرما تھا۔ عہد اکبری کے آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کا آغاز ہوا، جو شرح سے قریب تھا۔ اور جس کی تعلیم زیادہ مدفن اور تعلیم زیادہ بچتہ تھی۔ اس سے متحدہ اہم فوائد رونما ہوئے۔ لیکن سوال تو محاصرہ مغربی ترقیوں سے موازنہ کا ہے۔ یورپ میں اُس وقت اللہ سے لوگانے اور دنیا پر آخرت کے ترجیح دینے والوں کے طریق کار میں ایک بنیادی انقلاب رونما تھا۔ رضائے الہی کے لیے اب عبادتوں، ریاضتوں اور اشغال روحانی میں غلو کی بجائے خدمت خلق کو راہ نجات سمجھا گیا۔ متحدہ ایسے سلسلے قائم ہوئے جو محدود مسیحی عبادتوں اور روزوں اور اس طرح کے احکام مذہبی کی بجائے آدمی میں کوتاہی نہ کرتے۔

لیکن جن کا اصل زور خدمت خلق یعنی تبلیغ مذہب، توسیع تعلیم غریبوں، بیماروں اور دوسرے حاجت مندوں کی خدمت اور اصلاح معاشرہ پر تھا۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اس جذبے کی نشوونما نہ ہوئی۔ اللہ سے محبت کرنے والوں نے خلق اللہ سے محبت اور مخلوق کی عملی خدمت کا راستہ اختیار نہ کیا، بلکہ زیادہ تر ریاضتوں اور مجاہدوں میں مستغرق رہے۔ اور آج بھی خدمت خلق کے معاملے میں مسلمان اہل مغرب سے ہی نہیں، بلکہ ہندوؤں اور بودھوں سے بھی پیچھے ہیں!

ہم اپنی تاریخ اور عہد اکبری کے حالات پر غور کریں تو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافے ظاہر ہیں زیادہ احتیاط اور اشغال و اعمال کی بہتر تدوین کے باوجود روحانی امور میں ایک ترقی معکوس نظر آتی ہے۔ ہمارے قدیمی صوفیائے کبار کی نسبت مستند مواد کم ہے۔ ملفوظات کے اکثر مجموعے جعلی ہیں۔ لیکن فوائد الفوائد کی صحت میں کلام نہیں۔ اسے بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے۔ کہ کس پر اثر طریقے سے اور کتنے تواتر کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیا اخلاقی پاکیزگی و بلندی اور بہتر انسان بننے کا سبق دیتے تھے۔ فوائد الفوائد کا عہد مغلیہ کے صوفی شاہکاروں سے موازنہ کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ اگرچہ شرع کی پابندی پر زیادہ زور ہے۔ نادر اور لطیف "معارف عالیہ" کی افراط ہے۔ "واقعات" کا کثرت سے بیان ہے۔ (فی الحقیقت "متخیلات" کو "واقعات" کا نام دینا ہی ایک افسوسناک رجحان کی نشاندہی کرتا ہے)۔ نئے نئے اہد اور مسمریزم جیسا اثر رکھنے والے اشغال و اعمال کا سبق ہے۔ لیکن اخلاقی پاکیزگی اور باطنی سر بلندی (یعنی بقول سلطان باہو "دل دا کوڑ" دور کرنے) سے وہ شغف جو حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ گویا پابند شرع اور جو شیعہ مسلمان بنانے کا سامان تو ہو رہا ہے۔ لیکن بہتر انسان بننے پر جو سچا مسلمان ہونے کے لیے اتنا ہی (یا شاید زیادہ) ضروری ہے۔ پہلی سی توجہ نہیں رہی! مولانا مودودی نے تو مغرب کے مقابلے میں اسلامی ممالک کی فقط عقلی اور علمی پس ماندگی کا ذکر کیا ہے، لیکن فی الحقیقت اس پس ماندگی کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اور اس کا آغاز اٹھارویں صدی سے بہت پہلے۔ عہد اکبری میں، بلکہ اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

رکن سلطنت نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید

گماں میر کہ یہ یک شیوہ عشق مے بازند

قباب و شگل و لاله بے جنوں چاک است!

علماء اور مشائخ نے عہد اکبری کی مذہبی کشمکش میں جو حصہ لیا، اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں لیکن اسلام میں مذہب کی حمایت کسی ایک خاص طبقہ کا فرض یا اجارہ نہیں۔ اسلام میں بعض دوسرے مذہبوں کی طرح پر وہتوں یا پجاریوں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں۔ جن کے بغیر مذہبی رسوم اور اہمی نہیں ہو سکتیں۔ ہر ایک مسلمان بطور خود نماز پڑھ سکتا ہے عبادت کے لیے اسے کسی پجاری کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ انسانی فطرت کے اس لازدار (بانی اسلام) نے توہدایت کی تھی کہ نماز جمعہ کا خطبہ بجائے قاضی یا خطیب کے مسلمان حاکم پڑھے۔ دین کو کسی خاص طبقہ کا اجارہ نہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اسلام پر جب کوئی کشمکش کا زمانہ آیا تو اسلام کی حفاظت کے لیے فقط مذہبی جماعتیں نہ اٹھیں بلکہ دنیا دار مسلمانوں نے بھی اس میں اپنی بساط کے موافق حصہ لیا۔ ہندوستان میں یہ رجحان دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی زیادہ ہے۔ جب غلجیوں کے زوال کے بعد ایک نیم مسلم غلام خسرو تخت دہلی پر بیٹھا اور مسجدوں اور قرآنوں کی بے حرمتی ہونے لگی تو جس شخص نے اس صورت حالات کو ختم کیا۔ وہ دیپالپور کا حاکم غیاث الدین تغلق تھا۔ ۸۵۷ھ کے بعد اسلام پر مشنریوں کے حملے ہوئے تو ان کے جواب کے لیے فقط مولانا محمد قاسم۔ مولانا رحمت اللہ اور دوسرے علمائے کرام ہی نہ اٹھے، بلکہ سید احمد خاں۔ سید امیر علی اور خواجہ کمال الدین نے بھی اس بارے میں کچھ کم کام نہ کیا۔

عہد اکبری میں بھی یہی ہوا۔ اکبر کے خیالات بگاڑنے میں جتنا دخل بعض علماء و مشائخ (مثلاً شیخ مبارک۔ ابوالفضل۔ حاجی ابراہیم سرسندی۔ شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابوسعید) کو تھا۔ امر کو نہ تھا، لیکن علماء میں ہی بعض بزرگوں نے حالات کو

سنوارنے کے لیے بڑی قربانیاں کیں۔ امر کا معاملہ بھی اسی طرح تھا۔ انھوں نے دربار کے قواعد و آئین تسلیم کر لیے، لیکن بعضوں (مثلاً شہباز خاں کنہوہ۔ قطب الدین کوکہ۔ خاں اعظم) نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا اور جب یہ کوشش ناکام رہی تو اپنے اثر و رسوخ سے اکبری بے قاعدگی کو دربار اور محل سے باہر عام ہونے سے رکھا۔ عہد اکبری کے متدین امرا میں خاں اعظم۔ قلیج خاں اور دوسرے نام آتے ہیں، لیکن ان میں جو خاص مرتبہ شیخ فرید کا تھا، اسی اور کا نہ تھا اور چونکہ انھوں نے دوسرے نیک اور برگزیدہ کاموں کے علاوہ طایفہ نقشبندیہ کو غیر معمولی مدد دے کر اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس لیے ان کے حالات تفصیل سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے مؤرخین سے اس کام میں بہت تھوڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ فرید کا ستارہ اس وقت چمکا۔ جب عہد اکبری کے مشہور مؤرخ مثلاً بدایونی اور خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری، وفات پا چکے تھے اور عہد جاگیر کے مؤرخین بیشتر ان کی ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے سارے کارنامے کسی نے نہیں گنوائے۔ شیخ کے اپنے ایما پر دو تاریخیں لکھی گئیں۔ ایک شیخ عبدالحق محدث کے صاحبزادے شیخ نور الحق نے، جن کی شادی شیخ فرید کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ شیخ کے ایما پر اپنے والد کی تالیف تاریخ حق کو اضافہ کے بعد زبدۃ التواریخ کے نام سے مرتب کیا۔ دوسری کتاب اکبر نامہ ہے جسے شیخ ابرار داد فیضی سرسندی ابن ملا علی شیر نے لکھا، جو شیخ کی ملازمت میں تھا اور جس کے والد کے شاگردوں میں طبقات اکبری کے مؤلف بخشی نظام الدین احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ یہاں دونوں کتابوں میں بھی یہ تقاضائے موضوع فقط ملکی خدمات کا ذکر ہے۔ شیخ فرید کے باقی کارنامے کسی میں نہیں۔ ہم کچھ حضرت مجدد اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے مکتوبات اور موقوفات سے اور کچھ مآثر الامرا اور دوسری تاریخی کتب سے پھول پتی جمع کر کے اس فخر روزگار کے مزار پر اعتراف و عقیدت کا گلہ سہ پیش کرتے ہیں۔

شیخ فرید بخاری سید تھے۔ حکومت اسلامی کے دوران میں سادات مشائخ کی

قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے آباؤ اجداد کو بھی مدد معاش ملتی تھی اور اسی پر ان کی نگر تھی۔ شیخ کے جد چہارم سید عبدالغفار دہلوی کو خیال ہوا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ مدد معاش ترک کر دینی چاہیے۔ اور نوکری سپاہ گری اختیار کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی پر ان کی اولاد کا عمل رہا۔

شیخ فرید کے والد کا نام احمد بخاری تھا۔ ان کے ایک بھائی محمد بخاری تھے جو شیخ فرید کے بھائی سید جعفر کے ساتھ گجرات کے ایک معرکے میں شہداء میں کام آئے تھے۔ احمد بخاری کے تو کوئی حالات نہیں ملتے لیکن شیخ محمد کا ذکر تواریخ کی کتب میں آتا ہے۔ اکبر کو ان کی وفاداری اور عقل پر بڑا بھروسہ تھا اور چنار کا قلعہ اسے شیخ کی کوششوں ہی سے ملا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک اجمیر میں حضرت خواجہ کی درگاہ کے مہتمم رہے۔

شیخ فرید جن کا پورا نام ان کے لوح مزار پر شیخ فرید الدین لکھا ہے دہلی میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں ہی اکبر کے ملازم ہوئے اور اپنی معاملہ فہمی، ذہانت، دیانتداری اور بہادری کی وجہ سے جلد شہرت حاصل کر لی۔ چنانچہ اکبر نے انھیں کئی اہم کام سرانجام دینے پر مامور کیا۔ ۱۵۹۵ء-۱۵۹۸ء میں جب ہندوستان میں سخت قحط پڑا تو لوگوں میں روپیہ اور اشیائے ضروری تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے انھیں مقرر کیا اور سرکاری مدد کے علاوہ انھوں نے اپنے پاس سے بھی غریبوں اور محتاجوں کی بے انتہا مدد کی۔ اس کے بعد جب سن ۱۵۹۸ء میں اسیر گڑھ کے معرکے کے وقت حاکم خاندیش سے اکبر کے نمائندوں کی گفت و شنید تو شیخ فرید نے ہی اس موقع پر شہنشاہ کی نمایندگی کی۔ شیخ فرید کا منصب بہت بڑا نہ تھا۔ (اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک وہ ابھی ڈیرہ ہزاری تھے) لیکن چونکہ دیانتداری اور کارگزاری مسلمہ تھی۔ اس لیے انھیں اکثر ذمہ داری کے کام سونپے جاتے۔ جب انھیں میرنجشتی بنایا گیا تو ان کا اثر و اقتدار اور بھی بڑھ گیا بلکہ دیوان تن کے بھی

لے دیوان تن دیوان تنخواہ کو کہتے تھے۔ سلطنت مغلیہ میں دیوان کل (وزیر عظم) کے دو نائب تھے۔ ایک دیوان تن اور دوسرا دیوان خالصہ۔ پہلے کے متعلق تمام محکمات کے ملازمان اور جاگیرداروں کی

(باقی اگلے صفحے پر)

کئی اختیارات ان سے متعلق ہو گئے۔ (اقبال نامہ جہانگیری)

شیخ فرید نے عہد اکبری کی مہموں میں حصہ لیا۔ ۸۳ھ میں جب بنگالہ میں افغانوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور سپہ سالار جنگ خان اعظم اپنے جانشین کا انتظار کیے بغیر اپنی جائیں پر حاجی پور (بہار) چلا گیا تو شیخ نے ہی ایک اور رفیق کے ساتھ معاملے کو ہاتھ میں لیا۔ بلکہ افغانوں کے سرگروہ قتل کی غداری کی وجہ سے مرتے مرتے بمشکل بچا۔ کشمیر کی مہم میں بھی شیخ فرید نے نمایاں حصہ لیا۔ (۸۶ھ) اس کے پانچ سال بعد مرزا یادگار نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اکبر نے جن امرا کو بطور مراول کے بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ ان میں خواجہ محمد اعظم مصطفیٰ تاریخ کشمیر "امیر الامرا" شیخ فرید بخاری میرنجشتی "کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ (۱۱۷ھ) ان کے پاس مختصر فوج تھی، لیکن لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ مرزا یادگار کا سر کٹ کر اکبر کے پیش ہوا۔ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شیخ نے سن ۹۶ھ میں جو کچھ کیا، ابوالفضل اس کی جا بجا تعریف کرتا ہے۔ "تمہ اکبر نامہ کے مطابق ۱۰۳ھ میں شیخ کا منصب ٹھاکر "چہار ہزاری دو ہزار سوار" علم اور نقارے کے ساتھ کر دیا گیا۔ لیکن شیخ کی اہمیت اور اکبر کے دل میں اس کی قدر و منزلت کا اس سے بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوسرے قرائن پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ ایشیائی ملکوں میں ایک بادشاہ کا کسی امیر کے گھر جا کر قیام کرنا جس احترام اور اختلاط کا پتا دیتا ہے وہ ظاہر ہے۔ آئین اکبری اور توذک جہانگیری سے پتا چلتا ہے کہ اکبر (اور پھر جہانگیر) نے کئی مرتبہ دہلی میں شیخ فرید کے ہاں قیام کیا۔ دہلی میں لال قلعہ کے قریب سلیم گڑھ ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ عہد اکبری میں اس کے سب طرف جہنا بہتی تھی۔ اکبر نے یہ عمارت شیخ فرید کو عطا کی ہوئی تھی اور وہ کئی مرتبہ اس میں شیخ فرید کا مہمان ہوا۔ آئین اکبری میں ۹۸۵ھ

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۵۶)

تنخواہ کا حساب کتاب تھا۔ دوسرے کے متعلق خالصہ شریعہ کا دفتر رہتا تھا۔ وزیر عظم کے بعد یہ دونوں عہدے بہت محترم سمجھے جاتے تھے۔

کے ذکر میں ہے :-

”دار الملک دہلی بقدم شاہنشی فروغ سعادت یافت منازل شیخ فرید بخشی بگی
بمقتضائے التماس آں اخلاص گزین خدمت گزار از پر تو گہان خدیو نور آئیں شد۔“
تو تک جہانگیری میں جہانگیر سلیم گڑھ میں اپنے قیام کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

”رفند بخشیدہ ہیز دہم“ دہلی محل نزول گردید و در منزلے کہ سلیم خان افغان و در ایام
حکومت خود در میان آب بمن ساختہ برد سلیم گڑھ نام نہادہ و والد بزرگوارم آنجا را
بر مرقطے خاں شیخ فرید کہ دہلی وطن اصلی دوست وادہ بودند فرو آدم۔ خان مذکور
بر دریا صغرا سنگ ساختہ در غایت لطافت ... در ایامیکہ حضرت جنت آشیانی در

دہلی تشریف داشتند۔ اکثر اوقات آنجا نشستہ با مصاحبان و مجلسیان خود صحبت میداشتند۔“

شیخ فرید کا عہدہ میر بخشی کا تھا، لیکن جب ابوالفضل دکن کو رخصت ہوا اور پھر مارا
گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتد افسر شیخ
فرید ہی تھے اور انھیں ہر قسم کے فرائض سپرد ہوتے تھے۔ مثلاً آئین اکبری میں لکھا
ہے کہ جب اکبری کی ماں مریم مکانی وفات پا گئیں اور دربار میں ماتمی رسوم و آئین جاری
تھے تو اس دوران میں دسہرہ کا تہوار آگیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ ہندوؤں کو یہ خوشی
کا تہوار منانے کا موقع دینا چاہیے اور ماتم کی میعاد ختم کرنی چاہیے۔ چنانچہ شیخ فرید
کو اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا حکم ہوا۔ حالانکہ میر بخشی کا ان معاملات سے کوئی
تعلق نہ تھا۔

اس کے علاوہ اور کئی اہم موقعوں پر شیخ فرید کو پیچیدہ معاملات ہاتھ میں لینے
پڑے۔ اکبر نامہ کے تتمہ میں جو ابوالفضل کی وفات کے بعد لکھا گیا، درج ہے کہ
جب ابوالفضل کے قتل کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی تو کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ
بادشاہ سے جا کر حقیقت حال کہے۔ آخر شیخ فرید کو یہ فرض ادا کرنا پڑا۔ اسی طرح
جب اکبر کے مرض الموت میں حکیم علی گیلانی کے معالجے سے تمام بیگیاں ناراض
تھیں بلکہ جہانگیر بھی کہتا تھا کہ میرے باپ کو حکیم علی نے غلط علاج سے ہلاک کر دیا تو

حکیم نے شیخ فرید کے گھر جا کر پناہ لی۔ اکبر نامہ کا تتمہ نگار شیخ کے اس فعل کی شکایت
کرتا ہے کہ انھوں نے کیوں حکیم علی کو امان دی۔ لیکن شیخ کے اثر و رسوخ کا اس بات ہی
اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمام بیگیاں اور نئے بادشاہ کے غیظ و غضب کے باوجود انھیں
نے حکیم کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا۔

عہدہ جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بڑھ گیا بلکہ آثار الامرا میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں
بلکہ تمام اعیان سلطنت سے باڑی لے گئے (اعتبار و رتبہ اور اقران و امثال بلکہ
جمع اعیان و ارکان سلطنت برگزشت) اس کا باعث ان کے دوہم کام تھے جو
انھوں نے بڑی خوبی سے سر انجام دیے۔ ایک تو جہانگیر کی تخت نشینی کا اہتمام
جس سے خوش ہو کر جہانگیر نے ”صاحب سیف و قلم“ کا خطاب دیا اور ان کا منصب
بڑھا کر پانچماری کر دیا۔ دوسرا اہم کام خسرو کی شکست تھا، جس پر اظہار خوشنودی
کے لیے بادشاہ خود شیخ کے خیمے میں گیا۔ اس سے بغل گیر ہوا اور شیخ کو نواب مرفعی
خان کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ واقعہ جہانگیر کے پہلے سال جلوس
میں ہوا۔ اس کے چار سال بعد شیخ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا اور اسی عہدے پر انھوں نے
۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ بادشاہ نے انھیں قلعہ کانگرہ کی فتح پر مامور کیا تھا، کہ
پٹھان کوٹ میں انھیں موت کا بلاوا آن پہنچا۔ حسب وصیت نعش کو دہلی میں
لا کر ان کے بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

۱۔ لیکن یہ سورت حالات عارضی ثابت ہوئی۔ جہانگیر نے امیر الامرا اور وکیل مطلق اپنے بچپن
کے دوست شریف خاں (ابن عبدالصمد خاں مصور) کو کیا اور آہستہ آہستہ ایرانی امرا دربار پر چھا گئے
شریف خاں شیخ فرید کا شروع سے بدخواہ تھا۔ چنانچہ جب شیخ فرید خسرو کے تعاقب میں گئے تو
شریف خاں نے کہنا شروع کیا کہ شیخ دانستہ معاملے کو طول دے رہا ہے اور اس کی نیت نیک نہیں
ہے۔ (جہانگیر نامہ)۔ جہانگیر آخر تک ان کا معترف رہا، لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ جو وسیع اثر و اقتدار
شیخ فرید کو اکبر کے آخری سالوں میں حاصل تھا پھر نصیب نہیں ہوا۔

نواب مرقضے خاں شیخ فرید کی اسلامی ہندوستان کے امرا میں ایک عظیم النظیر حیثیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وجہ شخصیت دی تھی۔ ”بسیار خوش قد بالابلند خوش محاورہ بود“ لیکن ان کا اصل مرتبہ ان کے کاموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے نیک کاموں کا سلسلہ بڑا وسیع تھا اور بزرگان کبار ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجدد ایک خط میں ان کی تعمیر مسجد کا ذکر کرتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں: ”ایک درویش لاہور کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ شیخ جیو پرائی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوئے تھے اور میاں رفیع الدین نے آپ کی التفات کے اظہار کے بعد کہا کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی تھی (یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نواب شیخ فرید لاہور کے گورنر تھے)۔ الحمد للہ علی ذالک۔ حق تعالیٰ آپ کو زیادہ توفیق عنایت فرمائے مخلصوں اور یاروں کی اس قسم کی باتیں سن کر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ نے انفاس الحارین میں ایک ضیافت کا ذکر کیا ہے، جو نواب شیخ نے کسی رفاہ عام کی عمارت بنانے کے سلسلے میں منعقد کی تھی اور جس میں شہر کے سارے مشائخ کو دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:-

”شیخ فرید بخاری کہ از احاطہ امراے آن زمان بود و جامع بود در میان نجابت و صلاح و اعتقاد مشائخ صوفیہ عمارتے تعمیر داد۔ کاروانسرائے مشہور یاد گیرے۔“

تاثر الامرا میں ان کی داد و دہش کی داستان تفصیل سے لکھی ہے جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اسلامی ہندوستان کی ساری تاریخ میں اس پایہ کا کوئی اور علیٰ عملہ امیر کوئی نہیں ہوا۔ نواب شاہنواز لکھتے ہیں:-

”ذخیرۃ الخوائین ص ۱۴۱۔ ہم نے اسلامی حکومت کی جو تاریخ انگریزی میں لکھی ہے، اس میں شیخ فرید کی تصویر ایک معاصرانہ مرقع سے لے کر پیش کی ہے۔

لے اقبال نامہ جاگیر میں شیخ کی نسبت لکھا ہے: ”اگرچہ اسمت بخشی داخت لیکن بخشی بود وزیر نشان و چند سال دفتر تن را، کہ لازمہ خدمت دیوانی است از بے رشدی دیوان بجانب خود کشیدہ۔ محال جاگیر را بار باب طلب تنخواہ سے نمود۔ ظاہر و باطن شیخ بغایت آراستہ و [باقی اگلے صفحے پر]“

”شیخ ظاہر و باطن آراستہ داشت۔ شجاعت را با سخاوت جمع نموده بخشش عام اور در فیض بر دے خلق باز کردہ۔ ہر کہ باور سیدے۔ چہرہ کامی و آئینہ خیال ندیدے۔“

آگے چل کر ان کی فیاضی کی تفصیلات دی ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ دربار پہنچنے تک تبا اور کسبل اور چادر اور پافر از راستے کے درویشوں میں تقسیم کرتے اور اشرافیوں اور دیوان کی ریزگاری اپنے ہاتھ سے خیرات کرتے۔ ایک دفعہ ایک درویش نے سات مرتبہ ان کو ان سے خیرات لی۔ آٹھویں بار پھر آیا۔ اس وقت شیخ نے اس کے کان میں کہا کہ سات دفعہ جو کچھ لے گئے ہو اسے چھپا کر رکھنا۔ کہیں دوسرے درویش تم سے چھین نہ لیں۔ شیخ نے بیواؤں اور اہل خانقاہ اور ارباب توکل و احتیاج کا سایہ مقرر کر رکھا تھا، جو خواہ وہ حاضر ہوں یا غیر حاضر انھیں باقاعدہ پہنچاتا تھا۔ جو لوگ ان کی ملازمت میں وفات پا گئے تھے، ان کے بچوں کے لیے شیخ نے مناسب ماہانہ مقرر کر رکھا تھا اور استاد مقرر کر کے ان کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بچے شیخ کی گود میں اس طرح کھیلتے کہ گویا ان کے اپنے بچے ہیں۔ گجرات میں انھوں نے سادات کی فرست بنا کر ان کے بچوں کے لیے شادی کے اخراجات اپنی سرکار سے مقرر کیے تھے، لیکن شیخ بھاٹوں اور میراثیوں کو جو امر کی تعریف میں کبت پڑھ کر ان سے روپیہ بٹورتے تھے کچھ نہ دیتے۔ انھوں نے کئی مسافر خانے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ احمد آباد میں ایک محلہ تعمیر کیا، جو ان کے نام پر بخاری محلہ کہلاتا ہے مشہور احمد آبادی عالم، شاہ وجہ الدین کا روضہ اور مسجد بھی انھی کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ دہلی کے قریب فرید آباد اور اس کی عمارتیں اور تالاب شیخ کی یادگار ہیں حضرت سلطان گلشاہ کے مزار پر انھوں نے صندل کا چھپر کھٹ بنوایا تھا اور اس پر سیپ کی چتر کاری کرائی تھی۔ لاہور میں بھی ایک محلہ انھوں نے بنوایا۔ لیکن اپنے لیے کبھی کوئی مکان یا

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۶۰)

سجیدہ بود۔ بزرگی و دولت از وقدر و شرف داخت، نہ اواز بزرگی و دولت۔ شجاعت را بہ سخاوت فراہم آوردہ خیر بالذات بود۔

سویلی تعمیر نہیں کرائی۔ ہمیشہ اس طرح قیام کرتے کہ گویا کوچ پر ہیں۔ سپاہ کی تنخواہ اپنے رو برو تقسیم کر دیتے۔ ہر روز ایک ہزار آدمی کو ان کی سرکار سے کھانا ملتا۔ پانسو کا کھانا تو ان کے گھر پر بھیجوا یا جاتا اور پانسو کے ساتھ شیخ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لوگ کتنا بھی شور مچاتے، لیکن شیخ کی پیشانی پر شکن نہ آتا۔

نواب شاہنواز مصنف آثار الامرانے بڑے بڑے امرا دیکھے تھے۔ وہ خود نظام الملک آصف جاہ کے زمانے میں برار کے دیوان اور پھر نواب ناصر جنگ کے وزیر رہ چکے تھے۔ سادات بارہ اور دوسرے عظیم الشان امرا کی فیاضیوں سے واقف تھے، لیکن وہ افسوس کرتے ہیں کہ شیخ فرید کے پائے کا انسان اس زمانے میں نہیں ملتا۔ وہ شیخ کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ وہی دن ہے اور وہی رات اور وہی ستاروں کی گردش، لیکن ملک اس قسم کے انسانوں سے خالی ہو گیا ہے۔ شاید وہ لوگ کہیں دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ سبحان اللہ! اگرچہ ہماں قلب لیل و نہار است و میر کو اک و دور سپر۔ لیکن دریں جزو زماناں ایں ولایت انریں مردم خالی است۔ شاید کہ بختہ دیگر مملکتے رفتہ اند۔ نواب شیخ فرید فوت ہوئے تو ان کی تاریخ ہوئی داد۔ خورد۔ برد یعنی اس نے لوگوں میں اپنا مال و زر تقسیم کر دیا۔ خود خرچ کیا اور دارین کی سعادتیں ساتھ لے گیا۔ جب وفات کے بعد اس امیر کبیر کا اثاثہ لگنا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ چونکہ اس حاتم ثانی نے اپنی زندگی میں ہی اپنا سب کچھ لوگوں کی حاجت و روائی میں خرچ کر دیا تھا۔ اثاثہ میں ایک ہزار اشرفی کے سوا کچھ نہیں۔

عظیم النیر فیاضی اور خدمات ملکی کے علاوہ شیخ فرید کا بڑا کام طریقہ نقشبندیہ کی حمایت اور سرپرستی ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلہ کا صحیح آغاز حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے کیا جو اپنی وفات سے چار پانچ سال پہلے اس کام پر مامور ہوئے۔ اس قلیل مدت میں ان کا سلسلہ بڑا وسیع نہ ہوتا، لیکن شیخ فرید نے

۱۔ حضرت مجددؒ کی سوانح عمری حضرت اقدس میں شیخ فرید کا ذکر حاتم وقت کر کیا گیا ہے (ص ۱۵۱)

ان کی اور ان کے سلسلے والوں کی کمال خدمت کی۔ خانقاہ کے سارے اخراجات اپنے فتنے لیے اور درویشوں اور دوسرے متعلقین کے لیے معقول و ظیفہ مقرر کر دیے تاکہ وہ فیکری سے اللہ اللہ کریں اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہیں۔ شیخ فریدؒ اور خواجہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ہی نکتہ چیں کہتے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی کامیابی شیخ فریدؒ کی وجہ سے ہے۔ یہ اعتراض کسی نے حضرت خواجہؒ تک بھی پہنچایا، لیکن آپ شیخ فریدؒ کی عظمت و فضیلت سے واقف تھے۔ آپ نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ شیخ فریدؒ کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کے ملفوظات میں لکھا ہے۔

ایک عزیز نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں بیان کیا کہ بعض کوتاہ بین سیاہ دل کہتے ہیں کہ حضورؐ کی مشیخت کا مدار (یگانہ زمانہ مرجع خلق) نواب قدس القاسم شیخ فریدؒ علیہ السلامؒ کی دوستی پر ہے اور ہمیشہ رتعات میں جو شیخ کی طرف لکھتے ہیں ان کا سترہ قبلہ کا ہی سلامت باشند۔ تحریر فرماتے ہیں۔ فقرا سے اس قسم کی خوشامد بھی نہیں حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں۔ اور ان کے وجود کی برکت

۲۔ حضرت مجدد الف ثانی کے بعض مکتوبات سے جو حضرت خواجہؒ کے نام لکھے گئے، خیال ہوتا ہے کہ نہ صرف خانقاہ باقیہ کے درویشوں کا ذمہ شیخ فریدؒ نے لیا تھا، بلکہ دوسرے فقرا، علما اور مستحقین کو جو کچھ شیخ فریدؒ کی سرکار سے ملتا۔ وہ حضرت خواجہؒ کی وساطت سے تقسیم ہوتا تھا۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں مرشد کو لکھتے ہیں "شکریہ سے ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ دہلی اور سرہند کے وظیفہ دار فقرا کا روپیہ گزشتہ خریف کی بابت حضورؐ کی بلند درگاہ کے خادموں کے حوالے ہوا ہے تاکہ حق ثابت کرنے کے بعد حق داروں کو پہنچا دیں۔۔۔ ہزار تنکہ فضلانہ شیخ ابوالحسن حافظ و اہل علم کے نام اور ہزار تنکہ فضلانہ شیخ شاہ محمد حافظ کے نام نواب شیخ کی سرکار سے مقرر ہے۔ دونوں مذکورہ بالا شخص زندہ ہیں۔۔۔ ان دونوں... کار و پیہ حامل عریضہ ہذا کے حوالے کر دیں۔" اس سے اگلا خط حبیب اللہ سرہندی کی والدہ اور اس کی بیوی اور دوسرے بزرگوں کے وظائف کی ادائیگی کے متعلق ہے۔

ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔ اب بھی ہمیں کوئی ایسی وجہ شرعی معلوم نہیں ہوتی جس کے باعث شیخ موسوف سے دوستی کا تعلق قطع کر لیں۔

حضرت مجدد الف ثانی بھی ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں: حضرت قبلہ کا ہی قدس (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمعیت کا باعث آپ ہی ہیں۔ یہ مکتوب حضرت مجدد نے شیخ موسوف کو مرشد کی وفات پر لکھا تھا۔ اس میں حضرت خواجہ کی وفات پر اظہار کرم کے لکھتے ہیں:-

”لیکن اللہ تعالیٰ کی حمد اور احسان ہے کہ اس ہولناک حادثہ اور دشت خاک واقعہ کے باوجود ان بے سروسامان فقرا کا مرنی اور مدگار بھی دین و دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت سے مقرر ہوا ہے۔ (شیخ فرید کی سیادت کی طرف اشارہ ہے) جو اس سلسلہ علیہ کے انتظام اور نسبت نقشبندیہ کی جمعیت کا وسیلہ ہے۔

ان یہ نسبت علیہ بھی جو اس ملک میں بہت غریب ہے اور اس نسبت والے لوگ ان ملکوں میں بہت تھوڑے ہیں۔ چونکہ اہل بیت کی نسبت کی طرح ہے تو اس کا مرنی بھی اہل بیت ہی سے ہونا مناسب ہے۔ اس کی تقویت کے لیے بھی انہی نسبت والوں سے ہونا بہتر ہے تاکہ اس بڑی دولت کی تکمیل غیروں کے حوالے نہ کی جائے۔ جس طرح اُس بڑی نعمت کا شکر فقرا پر واجب ہے اسی طرح اس دولت کا شکر بھی ان کے ذمے لازم ہے۔ انسان جس طرح باطنی جمعیت کا محتاج ہے، اسی طرح ظاہری جمعیت کی بھی اس کو احتیاج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کی توفیق سے ان فقرا کی ظاہری جمعیت کے منامن اور کفیل آپ ہی ہیں۔

ایک اور خط میں حضرت مجدد لکھتے ہیں:-

”ہر کسے کہ شکر آدمی بجا نیلے۔ شکر خدائے عزوجل بجا نیلے۔ پس بر ما فقیان ذکر احسان شما لازم است۔ اولاً سبب جمعیت خاطر حضرت خواجہ (حضرت

خواجہ باقی باللہ) شما بودہ اید۔ بطیفیل شما در ای جمعیت طلب حق سبحانہ و تعالیٰ کردیم و مظلماے وافر بردیم و ثانیاً چون بحکم کبریت بمشاککبیراء نوبت بایں طبقہ رسید۔ واسطہ اجتماع فقر و باعث انتظام طالبان نیز شما سید جزاکم اللہ

گر بر تن من زباں شود ہر مٹوے

یک شکر تو از ہزار نتواں کرد

شیخ فرید کے حُسن عقیدت اور دستِ کرم نے بہت سے مزارات کی شان و شوکت بڑھائی، لیکن ان کا اپنا مزار کس میرسی کی حالت میں ہے۔ دہلی سے قطب کو جو راستا جاتا ہے، اس پر ایک سڑک حضرت چراغ دہلی کو مڑتی ہے، اس سڑک پر ایک سرخ گنبد کے سامنے ایک قبرستان میں شکستہ چار دیواری کے اندر بہت سی قبریں ہیں ان کے درمیان لوہے کے ایک مختصر کھڑے کے اندر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی قبر ہے۔ سر ہائے قد آدم کتبہ سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:-

یا اللہ

سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوت وَلَا يَفُوت

در زمان دولت حضرت عرش آشیانی جلال الدین اکبر بادشاہ غازی شیخ فرید الدین سید احمد بخاری بعنایات آنحضرت ممتاز بود و در عہد عدالت نور الدین جاگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ بظاہر مرقضی خاں سرفراز گردید تاریخ ۹۰۰ جلوس مطابق ۱۲۵۰ ہجری برحمت الہی پیوست۔

مرقضی خاں چون دواصل شد گشت اقلیم بقا مفتوحش
بہر تاریخ ملائک گفتند باد پر نور الہی روحش

۱۔ ذخیرۃ الخواص سے پتا چلا۔ کہ یہ شیخ کی اپنی مرضی کے مطابق تھا۔ چون شیخ بجزیمت ہم کانگرہ بدلی رسید بطواف پدر و اجداد بنزد گوار خود رفت۔ جائے قبر خود را در تحت اقدام بزرگان خود نشان داد کہ در آنجا مدفون سازند۔ و زہار عمارت بر سر قبر باکھنند۔ در رنگ قبر غریباں باخند۔ (ص ۱۲۸)

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ

خواجہ باقی باللہ | عبد اکبری میں علما و علماء کی کوئی کمی نہ تھی۔ موزنین عہد نے ان کی جڑ طویل فرستیں دی ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علم اور تصوف کا عہد بتیں سمجھنا چاہیے، لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہد اکبری کی مذہبی بوجہوں کو روکنے کے لیے کوئی موثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے قبیلہ دار) وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریک کار ہو گئے۔ جو شیخ عبدالحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے، وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشہ تنہائی میں اللہ تبارک و تعالیٰ سے گفتگو کرنے لگے۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنسی صدر الصدور کو آپس کی مخالفتوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا۔ جنہوں نے ملا محمد یزدی اور پنجاب کے علما اکبر کی تحریری کوششوں کا شکار ہو گئے۔ فتنے کا سد باب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا جنہوں نے حصول فیض اور ارشاد و ہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراء النہر گئے اور نقشبندیہ سلسلے میں منسلک ہونے کے بعد عہد اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد انہیں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہیں ہوا، لیکن اپنی روحانی پاکیزگی اور سر بلندی سے انہوں نے اکبر کے اراکین سلطنت (مثلاً شیخ فرید، قلیچ خاں، صدر جہاں) اور علما و مشائخ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث) کو اس طرح مستحکم کیا۔ اور بالجمہ ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑادی اور اکبر کی براہ راست مخالفت کیے بغیر اس طرح ایک نئی دینی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہو گیا۔

خواجہ باقی باللہ کا طریق کار وقت کی ضرورت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔

عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقدار سے الگ تھلگ رہے۔ چنتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشہ تنہائی میں یا بندہ کرنے کی ہیں، لیکن اس وقت دربار شاہی سے بدعت و تجدید کی لہریں آرہی تھیں اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا تھا، بعض درباریوں کے طور طریقے بگڑ گئے تھے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ دربار فیض دربار شاہی اور ارباب اقدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشرتی بدعتوں نے پیدا کر دی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریقہ کار کے سب سے پہلے پُر زور ترجمان نقشبندی حضرات ہیں، جن کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کئی مکتوبات میں نقل ہوا ہے:-

”اگر ماضی سے کریم۔ دین روزگار بھی مرید نے یافت، لیکن مارا کار دیگر فرمودہ اللہ کہ مسلمانان را از شر ظلم نگاہداریم۔ بواسطہ ایں بیاد شاہان بالیست اختلاط کردن و نفوس ایشان را مستحضر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن۔“

ہندوستان میں جس بزرگ نے اس اصول پر سب سے پہلے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف ہندوستان میں نقشبندی سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امرا و اکابر سے اختلاط پیدا کر کے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امرا کا محاذ قائم کیا، وہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ بزرگ تھے، جنہیں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ انہوں نے سلسلہ احرار کے نام سے جو رباعیات لکھیں ان میں سے ایک یہ ہے:-

ایں سکھ کہ من ز دم بنام فقر است دیں روشنی از نور تمام فقر است
بر خیز درہ خواجہ احرار بکھر کل راہ ز سرحد مقام فقر است
حضرت خواجہ باقی باللہؒ ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ یعنی ۱۵ جولائی ۱۵۹۷ء کو بمقام کابل

۱۵ یہ تاریخ حافظ عزیز حسن نقشبندی کی تالیف سیرت باقی میں درج ہے۔ اس کتاب میں اسما و سنین کی بعض غلطیاں ہیں، لیکن چونکہ مصنف حضرت خواجہ کی اولاد سے تھے، اس لیے ہم نے [باقی اگلے صفحہ پر]

پیدا ہوئے۔ اسم مبارک محمد رضی اللہ عنہ، لیکن زیادہ تر باقی باللہ یا محمد باقی باللہ یا عبد الباقی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد قاضی عبدالسلام خود اہل علم تھے۔ انھوں نے شروع سے آپ کی تعلیم و تدریس پر نظر رکھی۔ جب ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو آپ ملا صادق حلوانی کی خدمت میں پہنچے جو اس زمانے کے ایک مشہور فاضل اور ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کا وطن سمرقند تھا، لیکن جب وہ ۱۲۵۷ھ میں حج سے واپس آئے تو اکبر کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا حکمران تھا انھیں آمادہ کیا کہ وہ کابل میں کچھ عرصہ قیام فرما کے وہاں سلسلہ تدریس شروع کریں۔ خواجہ باقی باللہ وہیں ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور جب وہ کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے تو خواجہ بھی ساتھ تھے۔

خواجہ صاحب نے علوم متداول بڑی تیزی سے حاصل کرنے شروع کیے۔ آپ کے عزیز و اقارب اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور ان کی خواہش تھی کہ آپ بھی تکمیل تعلیم کے بعد اسی سلسلے میں منسلک ہو جائیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تحصیل علوم کا ابھی کچھ حصہ باقی تھا کہ آپ کو بعض ایسے معاملات پیش آئے کہ آپ کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف منحط ہو گئی اور مرشد ہادہ نما کی تلاش شروع ہوئی۔ پہلے اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائی اور ماوراء النہر اور افغانستان میں جو صوفی اور مشائخ تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیہ نفس کی کوشش شروع کی، لیکن دل کا مقصود حاصل نہ ہوا۔ حضرت خواجہ کی جو روحانی سرگزشت ان کے ملفوظات میں ان کے ایک خط سے ماخوذ ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ نگاہ بڑی اونچی تھی۔ اس لیے خاطر خواہ صفائی قلب اور تسکین میسر نہ آتی تھی۔ پہلے خواجہ عبید کی خدمت میں حاضر ہو کر گناہوں کو توبہ کی، لیکن اس پر اپنے کڑے معیار کے مطابق قائم نہ رہ سکے۔ پھر حضرت شیخ افتخار کی خدمت میں حاضر [بقیہ مکرر رفتہ] اختیار کیا۔ نذرۃ القلائد ماہ دیوم نہیں۔ سال وفات باختلاف قولین ۹۷۱ھ یا ۹۷۲ھ ہجری لکھا ہے۔ حیات باقیہ میں اس اختلاف کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ۹۷۱ھ ہجری کی اخیر تاریخوں یا ۹۷۲ھ ہجری کے ابتدائی ایام میں پیدا ہوئے۔ سیرت باقی کی درج کردہ تاریخ اس قیاس پر پوری آتی ہے۔

ہو کر اصلاح حال کی کوشش کی۔ وہ بزرگ راضی نہ تھے اور فرماتے تھے کہ تم جوان ہو لیکن چونکہ حضرت کا ارادہ پکا تھا اس لیے چار و ناچار فاتحہ پڑھا اور دعا فرمائی کہ خدائے تعالیٰ استقامت بخشے، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی اور طرح طرح کی خوابیاں پڑیں۔ اس کے بعد آپ نے امیر عبداللہ بلخی کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر از سر نو توبہ کی۔ اب طبیعت کو استقامت حاصل ہوئی۔ آئینہ طبیعت صاف ہو گیا اور مدارج روحانی میں ترقی شروع ہوئی، لیکن ہمت غضب کی تھی اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی دل نہ مانتا تھا کہ فیض کے کسی سرچشمے سے محروم رہ جائیں۔

بیچ کہ ذوق طلب از جستجو باز مندانست
دانہ سے چیدم دلاں کف نہ سے کہ خرمی داشتم

زبدۃ المقامات میں آپ کی نسبت لکھا ہے:-

”و تقریر ایشان را آن پایه بود کہ از بدایت تا نہایت بیچ یک از احوال بلند و مکاشف
ارجمند سرسمت ایشان فرود نہ آید۔ در عین بحر یافت دم از نایافت زدہ خشک لب
بودند۔ این رباعیہ شریفہ نیز دلالت بر حال ایشان نماید۔ رباعی

در راہ خدا جملہ ادب باید بود تا جاں باقیست در طلب باید بود
دریا دریا اگر بکامت ریزند گم باید کرد و خشک لب باید بود

چنانچہ پیران کمال کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں آپ عنفوان شباب میں ہی (در آغاز برائی) برکوچک ہندو پاکستان میں آگئے اور مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے ملفوظات میں کشمیر جاکر شیخ بابا والی سے فیض حاصل کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

۱۷ شیعہ چکوں کی حکومت پر کشمیر کے مسلمانوں کی حکومت کو اس طرح ترجیح دیتے تھے کہ بابا داد و خلک اور
شیخ یعقوب میرفی کشمیری نے اکبر کے پاس حاضر ہو کر اسے کشمیر فتح کرنے کی ترغیب دی اور جب مرزا داد گار نے اکبر
کے خلاف بغاوت شروع کر کے عوام کو اکبری حکام کے خلاف درغلنا چاہا تو شیخ بابا والی نے عوام کی تسکین کی
اور اس کوشش میں جان دی۔ بغاوت فرو کرنے کے لیے اکبر نے جو ہر اولی امر بھیجا ان میں شیخ فرید بر فرست تھے۔ اس وقت
خواجہ باقی باللہ شیخ بابا والی کی درگاہ میں تھے۔ کیا شیخ فرید اور حضرت خواجہ کے تعلقات پہلی مرتبہ اس زمانے میں استوار ہوئے؟
(ملاحظہ ہو تاریخ اعظمی)

وہ ترکستان کے رہنے والے تھے۔ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ مخلص تھے۔ ۹۹۹ء میں کثیر تشیع ہوئے، لیکن دو سال بعد مرزا یادگار نے جس نے اکر کے خلافت علم بناوت بلند کیا تھا، انھیں زہر دلا دیا۔ تفصیل اس کی تاریخ کشمیر (اعظمی) میں بدیں الفاظ درج ہے: ”مرزا یادگار کہ میان مردم کشمیر و کسان اکبر بادشاہ نفاق شدہ کار بہ فتنہ عظیمہ انجامیدہ بود۔ جناب شیخ خود توجہ فرمودہ دفع نزاع کردند۔ بہرہاں قضیہ مخالفان دین و دولت شریعت مسموم بہ شیخ رسانیدہ شہید ساختند“ (ص ۱۰۹)۔ حضرت خواجہ اس دوران میں کشمیر میں آکر ان سے مستفید ہوئے۔ خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ خواجہ دو سال تک شیخ بابا والی کی صحبت میں رہے۔ انھیں سلسلہ نقشبندیہ میں بھی تعلیم کی اجازت تھی۔ اور طالب کی استعداد بھی اپنے بزرگوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اس سلسلہ سے تعلق خاطر ہو گیا۔ بیرون طریقت سے فیض حاصل کرنے کے لیے اور مرشد کی تلاش میں خواجہ باقی باللہ جا بجا گئے۔ سنبھل میں شیخ الہ بخش سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ خرد کے رسالہ رباعیات و شرح رباعیات میں سید علی لودی (۱۹) اور شیخ الہ بخش گڑھ مکتیری کے بھی نام اس سلسلے میں آتے ہیں۔ ایک تذکرے میں آپ کے سفر سرہند اور وہاں کے قیام کے دوران حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد کے متعلق استفسار کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وہ ان دنوں سرہند سے باہر تھے۔ آخر میں آپ دہلی آئے اور حشمتیہ سلسلہ کے نامور بزرگ شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب العالم کی خدمت میں رہ کر یاد دہی کرنے لگے۔ شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ قطب العالم پر منکشف ہوا کہ حضرت خواجہ کا حصہ بخارا میں ہے۔ وہ اُسی وقت باہر آئے۔ اور حضرت خواجہ سے کہا

”شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ”بعد از آنکہ خواجہ محمد باقی بہ نشر طریقہ نقشبندیہ مشغول شد قطب العالم بسیار بخدمت سے رسید۔ و فیض صحبت کہ عمدہ دریں طریقہ ہماں است حاصل سے کرد۔ اگرچہ درمباد حال بخدمت شیخ تلمذ کردہ اند۔ و در خانقاہ ایشان سوتے مجاورت نمودند“

کہ آپ کو مشایخ بخارا بلاتے ہیں۔ رواتر ہو جائیے۔ اس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ فقط ایک ازار تھی۔ شیخ نے وہ عنایت کی۔ حضرت خواجہ نے اسی کو بطور دستار کے لپیٹا اور بخارا روانہ ہو گئے۔ شاہ صاحب نے یہ روایت اپنے بزرگوں سے یاد دہلی میں خلفاء باقیہ کے کسی بزرگ سے سنی ہوگی۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا ضروری نہیں۔ حضرت خواجہ کو سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق خاطر پہلے سے تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آپ کا میلان دیکھ کر یا اپنے کشف سے اندازہ لگا کر شیخ قطب العالم نے آپ کو بخارا جانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن حضرت خواجہ کے ایک رقعہ سے جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ ماوراء النہر کا سفر بغیر کسی تیاری یا سوچ کے اضطراری حالت میں نہیں ہوا۔ اس رقعہ میں وہ لکھتے ہیں: ”دریں روزہ با داعیہ سیر ولایت قوی گشتہ۔ امید است کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شوم“۔

ماوراء النہر میں آپ اکمنہ (مضافات سمرقند) کے مولانا خواجہ کی خدمت میں پہنچے جن کا عبداللہ خاں ازبک والی توران بڑا معتقد تھا اور جنھوں نے عزلت گزینی اور ستر احوال کے باوجود ملکی معاملات میں نتیجہ خیز حصہ لیا تھا۔ انھوں نے کمال محبت سے آپ کے نقشبندی سلسلے میں تعلیم دی۔ خلافت عطا کی اور ہندوستان کو واپسی کا حکم دیا۔ مولانا شمس کشمی زبدۃ المقامات میں مولانا خواجہ کی امکنگی کے بعض عزیزوں کی بانی لکھتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ کو چند روز کی حاضری کے بعد خلافت مل گئی تو مولانا کے قدیمی دوستوں نے شکایت کی، لیکن مولانا نے فرمایا کہ اس کا معاملہ تربیت کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ فقط تصحیح احوال کی ضرورت تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی حضرت خواجہ نے اپنی ہمت بلند کی و جب سے ارشاد کا وسیع سلسلہ شروع نہ کیا تھا، لیکن وہ مقامات عالیہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور سفر ماوراء النہر سے پہلے ہی اہل نظر ان کے پاس کھینچ کر آتے تھے۔ ان کے برگزیدہ خلفاء میں سے کم از کم تین اس سفر سے پہلے ان کی

خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ ایک تو [ابوالفضل کے بہنوئی] خواجہ حسام الدین تھے جنہوں نے بیعت تو سفر ماوراء النہر کے بعد کی، لیکن اس سے پہلے وہ آپ کی صحبت میں رہ چکے تھے (زبدۃ المقامات)۔ دوسرے آپ کے اولین مُرید شیخ تاج الدین سنبھلی تھے اور تیسرے شیخ الداد جنہیں آپ نے اپنی غیر حاضری میں اپنے دفعتا کی خبر گیری سپرد کی چنانچہ ایک مخلص کے نام اس زمانے کا ایک خط ہے۔

”دیں روز باداعیہ سیر ولایت قوی گشتہ۔ امید است کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم۔ و خدمت شیخ الداد توفیق داری کردہ خود را بہر دوں و مخلص قریب و نزدیک

داغ بے یاری و درو بیملی

اینمہ بر خود پسندیدیم درفت

بارے ہر کلامت الیصال قیہ شود۔ غنیمت است۔۔۔۔۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان گرمانہ رسیدیم، تو شاید برسی

ماوراء النہر سے واپسی کے بعد حضرت خواجہ پہلے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ کی آمد کا سال تذکروں میں نہیں ملتا۔ لیکن لاہور سے آپ دہلی آئے اور یہاں کچھ عرصے کے بعد حضرت مجددؒ نے آپ کی بیعت کی۔ اس بیعت کا سال زبدۃ المقامات میں سنہ ۱۵۹۹ء (جس کا آغاز ۲۴ جولائی ۱۵۹۹ء کو ہوا) درج ہے۔ قرین قیاس ہے کہ اس بیعت سے پہلے حضرت خواجہ کو دہلی میں قیام کرتے آئے عرصہ گزر گیا ہوگا کہ ان کا بلند مرتبہ روحانی معلقوں میں مستم ہو جائے۔ ورنہ حضرت مجددؒ جو ج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے، علم و عرفان کی اتنی منزلیں طے کر چکے تھے اور عمر میں بھی حضرت خواجہ سے کم نہ تھے شاید ہی ان کی طرف متوجہ ہوتے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس بیعت سے پہلے دہلی میں حضرت خواجہ کو قیام فرمائے کم از کم ایک سال ہو گیا ہوگا۔ اور یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ دہلی آنے سے پہلے آپ نے زبدۃ المقامات کے ایک اندراج کے مطابق لاہور میں ایک سال گزارا۔ (ممکن ہے مدت قیام کچھ اس سے زیادہ ہو، تو قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۵۹۹ء میں (یا شاید اس سے پہلے) لاہور پہنچ گئے

ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اکبر اپنے درباریوں کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا۔ لہذا لاہور میں جو آپ کی وفات کے دس سال بعد مکمل ہوئی، لکھا ہے۔ ”جب آپ دارالسلطنت لاہور میں پہنچے تو شیخ فرید بخاری اکبر شاہ کے بخشی بگی جو نہایت غریب دوست شخص تھے۔ انہوں نے آپ کے روزینہ مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لازم کر لی۔ اس عبارت میں اس انتظام کی طرف اشارہ ہے، جس کے تحت شیخ فرید نے آپ کی خانقاہ کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آپ لاہور اس زمانے میں تشریف لائے جب شیخ فرید (اور اکبر اور اس کے دو کئے بار) ابھی لاہور میں تھے۔ اس امر کی تائید ایک اور بات سے ہوتی ہے۔ زبدۃ المقامات میں حضرت خواجہ کی نسبت لکھا ہے۔ ”آپ کی شفقت و رحمدلی کی یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ شہر لاہور میں سخت قحط سالی واقع ہوئی۔ اس زمانے میں آپ شہر لاہور میں تشریف رکھتے تھے۔ کئی روز تک آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ جب آپ کے سامنے کھانا لایا جاتا۔ فرماتے: انصاف سے بعید ہے کہ کوئی بھوکا پیاسا گلی کوچوں میں جان دے اور ہم کھانا کھائیں۔ جس قدر کھانا ہوتا۔ سب آپ بھوکوں کے لیے بھجوا دیتے۔“ (زبدۃ المقامات) اس اندراج میں یقیناً اس عظیم قحط کی طرف اشارہ ہے، جو شمالی ہندوستان میں ۱۵۹۵ء سے ۱۵۹۸ء تک جاری رہا۔ اور جس میں اکبر نے لوگوں میں روپیہ اور اشیا سے ضروری کی تقسیم کا کام شیخ فرید کے سپرد کر رکھا تھا۔

اکبر ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ وہ بلاآخر یہاں سے ۴ نومبر ۱۵۹۸ء کو آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری دو سال اس لیے اہم ہیں کہ اس دوران میں ابوالفضل کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اور شیخ فرید کا مسالوت علی میں عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مئی ۱۵۹۶ء میں ابوالفضل کی یہ حالت تھی کہ اس نے دوبارہ جانا ترک کر دیا۔ بلکہ خود کشی یا خانہ بدوشی کے ارادے بھی اس کے ذہن میں آئے۔ پھر جنوری ۱۵۹۹ء میں اس کے مخالفوں نے اسے دکن بھجوا دیا۔ جہاں سے اسے آگرے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ (اکبر نامہ)

لاہور سے حضرت خواجہ دہلی تشریف لے گئے۔ قلعہ فیروزی میں قیام فرمایا اور ہدایت خلق میں مشغول ہوئے۔ یہاں آپ کو بڑا عروج ہوا اور حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث جیسی ہستیاں آپ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوئیں، لیکن افسوس کہ آپ کو طویل عمر نصیب نہیں ہوئی۔ دہلی میں آپ کا قیام تین چار سال سے زیادہ نہیں ہوا۔ اور آپ نے ابھی عمر کے چالیس سال ہی ختم کیے تھے کہ تیس دسمبر ۱۰۲۷ھ کو روح مبارک قید جسم سے آزاد ہو گئی۔

حضرت خواجہ کے واقعات زندگی کہیں تفصیل سے جمع نہیں ہوئے۔ فقط ان کے چند روز کے ملفوظات اور مختصر حالات ایک ایسے بزرگ کی بدولت جمع ہو گئے ہیں، جنہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن جن کی نسبت ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ”استاذی“ میاں شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی) کے شاگرد تھے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں بھی حالات ہیں، لیکن معاصرانہ تذکروں کو بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ حالات بالکل ناممکن ہیں۔ اور ان سے حضرت خواجہ کے کام اور ان کے فیض یافتگان کی تفصیل کا بالکل اندازہ نہیں ہو سکتا۔ معاصرانہ اور قریب الہمد تذکروں مثلاً طبقات شاہجہانی میں متعدد ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں جنہوں نے آپ سے فیض پایا یا جنہیں آپ نے حضورِ سی تعلیم دے کر مزید تربیت کے لیے حضرت مجدد کے سپرد کیا۔ لیکن آپ کے حالات میں ان کا بالکل ذکر نہیں۔ ان منتشر بیانات پر غور کریں اور دیکھیں کہ آپ کے فیض یافتگان ملک کے کس کس حصے سے تھے تو خواجہ بدرالدین سرہندی (مرید حضرت مجدد الف ثانی) کے بیان کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اور خیال آتا ہے کہ آپ نے مختصر مدت میں ایک زبردست روحانی تحریک جاری کر دی تھی۔ اور ملک کے گوشے گوشے سے علما و فضلا، اور مشائخ و مجاہدین بزرگ ”چول مورو ملخ“ پروانہ وار آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ خواجہ بدرالدین سنوالات الاتقیاء میں حضرت خواجہ کی نسبت لکھتے ہیں:-

”رواج سلسلہ عالیہ نقشبندیہ و اشتہار و انتشار این ملافہ انیقہ در دیار ہندوستان

از آنحضرت است۔ قطب وقت بودند۔ علما و فضلا و مشائخ و مجاہد نشینان از راہ دُور و نزدیک بہ درگاہ ولایت پناہ او چوں مورد ملخ سے ریختند۔ و عرفا و صلحا از کنار زمین بجناب عرفاں مآب او چوں پروانہ بر شمع گردے آمدند۔ دوسرے ذرائع سے بھی خواجہ بدرالدین کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:-

بعض طلاب دُور دراز جگہوں سے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ اور بہتوں کو تو اٹائے راہ میں آپ کے انتقال کی خبر ملی (ترجمہ)

اسی کتاب میں خواجہ ہاشم کشمی لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری کے بعد شہر دہلی کے بعض مشائخ کبار آپ سے رشک و غیرت کرنے لگے۔ انہوں نے آپ کے خلاف توجہ اور کوشش کی۔ لیکن نقصان اٹھایا۔ اور بالآخر آپ کے مخلصین میں داخل ہوئے۔

آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دُور دُور سے جس طرح کھچ کر آرہے تھے، اس کا اندازہ آپ کی مختصر سوانح عمری سے اتنا نہیں ہوتا، جتنا حضرت مجدد کے تفصیلی تذکروں سے۔ حضرات القدس میں حضرت مجدد کے خلفائے کبار کے حالات غور سے پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ ان میں سے خاصی تعداد ان کی تھی، جو پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر حضرت مجدد کے سپرد ہوئے یا حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کئیے گھر سے نکلے، لیکن چونکہ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کے پاس سرہند جا کر فیض حاصل کیا۔ حضرت مجدد کے صاحبزادہ بزرگ (خواجہ محمد صادق) جو تکمیل علوم اور راہ سلوک کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد عین جوانی میں وفات پا گئے، آٹھ برس کی عمر سے حضرت خواجہ کے مرید تھے۔ ان کے اور حضرت خواجہ کے درمیان جو گہرا قلبی تعلق تھا، اس کے لیے زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کا مطالعہ کرنا چاہیے باقی اولین خلفائے سرپرست میر محمد نعمان برہانپوری تھے۔ جن کا مرتبہ اتنا تھا کہ جب ایک دفعہ حضرت مجدد سخت بیمار ہوئے اور خیال ہوا کہ شاید ہماری وفات اس

بیماری میں ہو جائے تو حضرات خواجگان قدس اللہ تعالیٰ نے اسرار کی امانت کا متحمل حضرت خواجہ محمد صادق اور حضرت میر (میر محمد نعمان) کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پس امانت ان دونوں کے سپرد فرمائی۔ (حضرات القدس ص ۲۶۹)۔ میر محمد نعمان بھی پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچے تھے اور انھوں نے تربیت باطنی کے لیے حضرت مجدد کے سپرد کیا تھا۔ اسی طرح حضرات القدس کے بیان کے مطابق مولانا یوسف (ص ۱۳۶)۔ شیخ نور محمد مٹنی (ص ۱۲۹) اور مولانا عبدالہادی بدایونی (ص ۲۱۴) پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ذکر وغیرہ کی تعلیم کے بعد تکمیل کے لیے حضرت مجدد کی خدمت میں بھیجے گئے۔ خواجہ محمد صادق کابلی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے گھر سے نکلے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد دہلی پہنچے۔ انھیں خواجہ حسام الدین نے سرہند بھیجا (ص ۲۱۵)۔

خواجہ محمد صدیق کشمی کا معاملہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ وہ بدخشاں کے قریب کشم کے رہنے والے تھے۔ عنفوان شباب میں ہندوستان آئے اور محب الفقرا عبدالرحیم خانخانان کی صحبت اختیار کی۔ شاعر تھے۔ ہدایت تخلص کرتے تھے۔ کئی منظومیاں اور غزلیں لکھیں۔ ایک غزل کے چند شعر بڑے پُر اثر ہیں۔

خوش وقت آں دے کہ بکاسے رسید است خوش روز شہر دے کہ بیارے رسید است
از فرق تا قدم ہمہ عطر م عجب مدار دستم بچین زلف نگارے رسید است
خوش روز گلر عیش ہدایت کہ در خواں رختش بہ تازہ رنگ بہارے رسید است

حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچے۔ ان سے ذکر سیکھا۔ حضرت خواجہ بہت مہربانی کرتے تھے۔ لیکن برابر اقتضائے جوانی و شغف شعر خوانی و کامرانی بہت ترقی نہ کی۔ حضرت خواجہ نے انھیں سرہند میں حضرت مجدد کے پاس جانے کے لیے کہا۔ یہ آمادہ نہ ہوئے۔ وہ اس دوران میں وفات پا گئے۔ خواب میں نظر آئے اور سخت تاکید کی کہ سرہند جا کے فیض حاصل کرو۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچے۔ حضرت مجدد سے بے حد متاثر ہوئے (اوسے راجحضرت ایشاں اخلاص و عشق فراواں)۔ کئی مکاتیب ان کے نام

ہیں۔ مبداء و معاد میں حضرت مجدد کے ارشادات ان کی بیاضوں سے نقل کر کے مرتب کیے۔ اکثر سفر میں رہتے تھے۔ جس سال مبداء و معاد مرتب ہوئی (۱۹۱۰ ہجری) اس سال پہلے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید ظہیر الدین حسن کے ساتھ دکن پہنچے۔ مانڈو میں گلزار ابرار کے مؤلف غوثی سے ملے۔ اس نے ان سے لے کر حضرت مجدد کے ایک رسالے کا مختص درج کتاب کیا۔ جس کے اکثر اندراجات مبداء و معاد میں ملتے ہیں۔ گلزار ابرار میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا تذکرہ "صوفی محمد صدیق ہدایت تخلص" کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کی شخصیت سے کس طرح متاثر ہو چکا تھا۔

زبدۃ المقامات میں حضرت مجدد کے کئی دوسرے خلفائے کبار کے حالات درج ہیں جنھیں حضرت خواجہ باقی باللہ نے سرہند بھیجا۔ یا جنھوں نے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے دہلی کا قصد کیا اور ان کی وفات کی بنا پر حضرت مجدد کی خدمت میں پہنچے۔ مثلاً شیخ طاہر بدخشی (ص ۳۵۲) مولانا یوسف سمرقندی (ص ۱۵۵) مولانا قاسم علی (ص ۳۶۶) مولانا عبدالواحد لاہوری (ص ۳۷۶)۔

طبقات شاہجہانی میں سید مصطفیٰ باغیت کا ذکر ہے جنھوں نے مدقوں بزرگوں کی مسند مشیخت پر بیٹھ کر سجادہ نشینی کی۔ لیکن جب خواجہ باقی باللہ کی ارشاد و ہدایت کا شہرہ سنا، تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ میں ان سے بیعت کی۔ "سالہا بر مسند مشیخت قیام داشت۔ و صاحب سجادہ پدران خود بود و مردم را ہدایت می کرد۔ انا نجا کہ صدق و راستی تمام داشت، ہم آوازہ ارشاد و ہدایت حضرت خواجہ ما خواجہ محمد باقی قدس سرہندیدہ، ترک مشیخت کردہ، پیش آنحضرت آمدہ و در اندک مدت طریقہ نقشبندیہ ازوے در گرفت و نہایت یافتہ بوطن اصلی رفت (ورق ۳۶۸)۔

حضرات القدس میں میر نعمان کی زبانی لکھا ہے کہ انھوں نے آگرہ کے شفا خانہ میں خواسان کے ایک نوجوان کو بیمار دیکھا۔ حال و احوال پوچھا تو بتایا چلا کہ وہ دکن میں تھا۔

حضرت خواجہ کو خواب میں دیکھا اور ان کے اشتیاق میں وہاں روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر ان کے انتقال کی خبر ملی۔ اسے اتنا صدمہ ہوا کہ بیمار ہو گیا۔ وہ اپنا حال بیان کرتا تھا اور زلزلہ روتا تھا۔

طبقات شاہجہانی کا مطالعہ کریں تو حضرت خواجہ کے بعض ایسے مریدوں کے نام ملتے ہیں جن کا ان کی سوانح عمری اور نقشبندیہ تذکروں میں ذکر نہیں۔ مثلاً شیخ احمد بکری (مر ۴۰۳) شیخ مرتضیٰ سنبھلی (ایضاً) شیخ نعمت اللہ جو پوری (مر ۴۰۶) شیخ نور الحق ابن مولانا عبدالحی (مر ۴۱۹) ہم شیخ قطب عالم کا ذکر کر چکے ہیں جن کی خانقاہ میں کچھ عرصہ حضرت نے یاد خدا فرمائی ان کے بیٹے شیخ رفیع الدین محمد کی شادی تھی اور وہ مہر ہوئے کہ حضرت خواجہ بھی شرکت کریں۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی اور شادی ہو بھی رہی تھی دہلی سے بہت دور اعظم پور میں۔ آپ نے ضعف و علالت کی بنا پر معذرت چاہی۔ لیکن شیخ نہ مانے۔ بلکہ کہا کہ اگر آپ نہیں آتے تو میں بھی شادی کے لیے نہیں جاؤں گا۔ حضرت خواجہ نے شیخ کے والد سے فیض حاصل کیا تھا۔ ان کے اصرار کو رد نہ کر سکے۔ اس پر شاہ ولی اللہ الفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ جب صوفیہ کو معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ اس تقریب پر آرہے ہیں تو اہل اللہ کا بڑا ہجوم ہوا اور سو سو کو س تک کوئی مشہور صوفی نہ تھا جو حضرت خواجہ کی زیارت کے لیے اس تقریب میں شریک نہ ہوا ہو۔

صوفیہ آن ناحیہ چوں مقدم خواجہ شنیدند۔ ہمہ جمع آمدند و در نواحی مدد کوہ کم کسے باشند از صوفیہ کہ در آن صحبت حاضر نہ شد۔ مجلس عجیب کہ ہرگز محل آن مسجوع نہ شدہ منعقد گشت۔

خداے تعالیٰ نے اس شادی کو اسلامی ہندوستان کے لیے بڑا مبارک بتلایا اور شیخ رفیع الدین کے ہاں اس زوجہ سے جو بیٹی ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا لگانہ روزگار پوتا عطا ہوا۔ حضرت خواجہ کی ہمت اور کارشناسی کی داد دینی چاہیے کہ اگرچہ طریقہ نقشبندیہ میں منسلک ہونے کے بعد انھیں ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس مدت میں طبیعت نحیف ہی رہی، لیکن اس قلیل عرصے میں

انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے اس ملک میں رکھ دی۔ آپ کو خوش قسمتی سے ایک تومرید حضرت مجدد الف ثانی جیسا متبر آیا۔ جس کے فیض سے اس سلسلے کا مستحکم ہو جانا لازمی تھا، لیکن ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقا کا سامان ہوا بلکہ ملک میں اسلام کو تقویت ہوئی اور جو پرانگیں اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں اس کا ازالہ ہوا۔

ہم کلمہ چکے ہیں کہ خواجہ عبید اللہ احقر کا اصول تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کے بجائے ان سے ربط بڑھاتے اور انھیں مستحضر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ عمر باقی باللہ بیرنگ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے اور جب وہ ہندوستان تشریف لائے تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ اکبری بدعتوں نے اگرچہ عام مسلمانوں کو متاثر نہ کیا تھا، لیکن اونچے طبقوں میں جو دربار سے قریب تھے، خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لیے اس طبقے کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔ بدقسمتی سے ان کے تفصیلی حالات صحیح طور پر جمع نہیں ہوئے۔ ان کے جو مکتوبات موجود ہیں ان میں سے اکثر کے متعلق ہمیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کی طرف لکھے گئے۔ مطبوعہ نسخوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ کسی امیر کے نام یا کسی مخلص کے نام لکھے گئے۔

لے جب حضرت خواجہ باقی باللہ بار دوم دہلی تشریف لائے تو اس وقت عہد اکبری کے تمام شہزادے مثلاً میرزا غلام الدین مصنف طبقات اکبری ملا عبد القادر بدایونی وفات پا چکے تھے۔ اس لیے ان کے حالات کتب تواریخ میں پورے طور پر درج نہیں۔ خافی خاں آپ کی نسبت لکھتا ہے: دیگر از واصلان حضرت خواجہ باقی باللہ دہلی آمد مقتدائے زماں بود۔ صفات ذاتی و کسبی و خوارق ایشان زیادہ از ان است کہ بزبان قلم دادہ شود۔ اکثر داندگان زانکہ با مخلوق کم صحبت و اندک از علوم عقلی و نقلی بہرہ تمام داشتند۔

صرف شیخ احمد سرہندی یا بعض دوسرے خلفاء کے نام کے خطوط میں وضاحت سے مکتوب الیہ کا نام درج ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتا لگانا دشوار نہیں کہ حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں عہد اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امرا شامل تھے، بالخصوص نواب مرتضیٰ خاں جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے کٹھن مراحل طے ہوئے اور جنہوں نے جہانگیر سے پاس شریعت کا عہد لیا۔ حضرت خواجہ کا بڑا معتقد تھا۔

ہم حضرت خواجہ اور نواب مرتضیٰ خاں کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن حضرت خواجہ کے تعلقات فقط نواب مرتضیٰ خاں تک محدود نہ تھے۔ محاصرہ تندرکوں (مثلاً زبدۃ المقامات) کا بیان ہے کہ طبقہ امرا میں ان کے کئی معتقد (امراے مخلص) تھے جو انہیں زبردست بھیجتے رہتے اور حضرت خواجہ اسے محابوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک خاص معتقد عبدالرحیم خانخاناں تھا (”بہ حضرت خواجہ عقیدت و ارادت تمام داشت“) جن نے یہ سن کر کہ حضرت خواجہ کوچ پر جانے کی خواہش ہے ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھجوایا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس طرح دوسروں سے پیسے لے کر جج پر جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں بھی آپ کا عقیدت مند تھا۔ حضرت مجدد کو ایک خط میں لکھا ہے۔

”جناب صدر جہاں نے ذکر و مراقبہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذکر توبہ دیا گیا لیکن چونکہ اس گروہ کا خاص مراقبہ درس اور بیان کی قسم سے نہیں ہے اور ان کا ارادہ بھی یہی تھا۔ اس لیے یہی مناسب دیکھا گیا کہ آپ کی خدمت میں اس کی صحت کو بے ... اب فقیر بضعف بہت غالب ہے صحبت کی فرصت اور توجہ کی طاقت نہیں رہی۔“

قلیچ خاں عہد اکبری کا ایک سربراہ اور وہ سردار تھا۔ اکبر کا بڑا بیٹا و آئیال اس کی بیٹی سے بیاہا تھا۔ وہ خود مختلف علاقوں کی صوبیداری پر مامور رہا اور اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ ایک دلیر، متدین، اسلام کا درد رکھنے والا مسلمان تھا۔ مائثر امرا میں لکھا ہے کہ وہ لاہور کی گورنری کے دوران میں ہر روز مدرسہ میں جا کر

تین گھنٹے تک فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیتا۔ علوم شرعی کی ترویج کرتا اور لاہور کے بہت سے لوگ اس کی خوشنودی اور اپنے (دینی) مقاصد کے حصول کے لیے ان علوم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے!

قلیچ خاں صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود۔ وہ ہمیشہ بدین علوم و افادہ طلب اشتغال سے نمود۔ گویند در صوبہ داری لاہور یک پاس بدین فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام سے ورزید و باقی غایت در ترویج علوم شرعیہ سے کوشید۔ مردم آنجا بامید و شناسی و انجراح مطالب غلوئے تمام تحصیل علوم کنند پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے در سے لرزہ بر اندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے، وہ ان سے خالی کرالیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں، جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانی بھی اسے مخاطب کر کے لکھتے ہیں:-

”ثانیاً اظہار محبت گزاری ایشان سے تمنا ہے کہ در بلدہ معظمہ لاہور بہ وجود ایشان بسیار سے از احکام شرعیہ دیں طور زمانہ رواجے پیدا کردہ است۔ و تقویت دین و ترویج ملت در ان بقعہ حاصل گشتہ است۔“

حضرت خواجہ باقی باللہ کے تذکروں میں تو قلیچ خاں کا کہیں ذکر نہیں (!) لیکن حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اس امیر کے تعلقات بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑے گہرے تھے اور چونکہ اس کی گورنری کے ذمے میں حضرت خواجہ ایک سال سے زیادہ لاہور میں مقیم رہے۔ قرین قیاس ہے کہ قلیچ خاں کی کوششوں میں حضرات خواجہ کے فیض صحبت کو بھی دخل ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانی کا قلیچ خاں سے تعارف نہیں۔ لیکن اسے ایک سفارشی خط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ میرے مرشد اور آپ کے درمیان بڑی گہری محبت تھی اس لیے آپ کو یہ خط بطور

لکھنے کی جرات ہوئی :-

پہوں ایشان را رشتہ ارتباطی بہ حضرت معرفت پناہی قبلہ گاہی خواہ با حکم بود۔
بنابر آن بہ تسوید چند کلمہ محرک آن نسبت گشت ۔

حضرت خواجہ کے ایک خط (رقم ۴۲) میں ”مرزا کو کہ (خان اعظم) اور اس کی والدہ“ کا ذکر ہے۔ مطبوعہ مکتوبات میں ایسے رقعے کئی ہیں جن کے متعلق لکھا ہے۔ ”ایک امیر کی طرف لکھا۔“ ایک عالی شان امیر کی طرف لکھا، بعض میں حاجتمندوں کی سفارشیں ہیں بعض میں فقط ارشاد و ہدایت۔ ان کا ایک دلچسپ رقم ہے ”ایک دوست کے نام“ اس کے نصف اول سے (جو حضرت مجدد کے تذکروں میں عام طور پر نقل ہوتا ہے) ایک نو حضرت مجدد کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے اُس مرید کی فہم و فراست سے واقفیت ہوتی ہے جس کی نگاہ دور بین نے اپنے مرید کی آئندہ عظمت کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ نصف ثانی سے (جو ان تذکروں میں نہیں ملتا) خواجہ صاحب کی اس کوشش کا پتا لگتا ہے جو وہ اپنے مریدوں مثلاً حضرت مجدد کی صلاح و امداد کے لیے ہر پہلو میں کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں :-

سرمد میں شیخ احمد نام ایک آدمی بڑے علم والا اور قوی عمل والا ہے چندویں فقیر کی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اور اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں مشاہدہ کیں۔ امید ہے کہ وہ ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہاں متور ہو جائے گا۔ اس کے احوال کاملہ یقینی ہیں۔ اس کے کامل احوال دیکھ کر میرا بخچہ یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہوگا۔ الحمد للہ شیخ مذکور کے جتنے بھائی اور قوی رشتہ دار ہیں سب سب نیک و عالم آدمی ہیں۔ اس دعا گو نے بعض سے ملاقات کی ہے۔ سب میں قیمت مروتی

۱۔ یہ رقعہ آخری سفر اور انہر سے پہلے لکھا گیا اور خان اعظم نے حمید اکبری کے اواخر میں خواجہ خاوند محمد نقشبندی سے بیعت کی۔ لیکن اس رقعے سے پتا چلتا ہے کہ اس سفر اور انہر سے پہلے ہی بلاتر لوگوں سے حضرت کے روابط تھے۔ اور ان میں سے بعض آپ کے مخلصوں میں داخل تھے۔

ہیں اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزند جو اپنے بچے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اسرار میں۔

غرض سب کے سب خجرو طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں۔ لیکن عیال کی کثرت اور فقر و تنگدستی کی زیادتی اور وجہ معاش کے نہ ہونے کے باعث ان سب اوقات میں پرگندگی آرہی ہے۔ اگر ہر سال زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ محبتیں ہو جائے اور تقسیم کرنے والا منتظم ان کے درمیان مناسب طور پر بانٹ دیا کرے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اور بہت ہی فکری اور اجر کا باعث ہے۔ تقویر اجست جس قدر بھی مقرر ہو جائے۔ خیرات اور نیکیوں کا کارکن عظیم ہوگا۔ فقیر اللہ تعالیٰ کے دروازے ہوتے ہیں اور بہت ہی عجیب دل رکھتے ہیں۔ زیادہ لکھنا ہے ادبی نہ۔

(مکتوبات خواجہ باقی باللہ رقم ۶۱)

خواجہ باقی باللہ کے متعلق منتشر اور نامکمل اندراجات بھی دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مند امر میں بخشی الملک شیخ فرید۔ قلیچ خاں حاکم پنجاب۔ (خان اعظم) مرزا کو کہ۔ امیر الامرا مرزا عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار و کن۔ صدر جہاں صدر الصدوق اور ابو الفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل تھے۔ علما میں شیخ عبدالحی محدث کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور حضرت مجدد الف ثانی تو ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اگر یہ بات دھیان میں رکھیں کہ یہی وہ مبارک ہستیاں تھیں جنہوں نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تو حضرت خواجہ باقی باللہ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان بزرگوں کے درمیان رشتہ تبیین کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اکبر بادشاہ خواجہ باقی باللہ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس کی تائید میں کوئی قابل اعتماد شہادت ہماری نظر سے نہیں گزری لیکن

آپ کے رفات میں ایک فقرہ ہے جس کا سبب ارشاد پوری طرح روشن نہیں، لیکن اس کے واضح مفہوم سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں کہ آپ نے حالات پر پوری طرح قابو پالیا تھا۔ اور آپ بادشاہ کے خیالات و افعال سے بے پروا تھے۔ یہ فقرہ حضرت مجدد الف ثانی کے نام کے ایک رقعہ میں ہے۔ اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

”اندیشہ بادشاہ را در خاطر نیارند“ [رقعہ ۱]

حضرت خواجہ کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ طبیعت میں مسکنت بحدہ تھی اور تالیفِ قلوب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک اہم خط کے اخیر میں جس کا ایک حصہ ان کے محفوظات میں نقل ہوا ہے فرماتے ہیں:- ”اے اللہ! تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین ہی مار اور مسکینوں کے گروہ میں اٹھا۔“ فروتنی اور کسر نفسی ان کی رگ رگ میں تھی۔ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی اتنی تعریف کی ہے کہ بعض کوتاہ فہم سخت غلطی، بلکہ بے انصافی اور بے ادبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر حضرت خواجہ کے ان ارشادات سے جو انھوں نے حضرت مجدد کی نسبت فرمائے ہیں اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں اپنے مرید کی تھی تو اس بلند بہت مرشد کی بھی تعریف کرنی چاہیے جس نے یہ خوبیاں دیکھ لیں اور انھیں اس طرح سراہنے سے نہ ہچکچایا۔

بعض مجددی تذکرہ نگاروں (مثلاً مناقب الحضرات اور روضۃ القیومیہ کے مصنفین) نے احوال و مکاشفات کے اظہار کے متعلق جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ اس معاملے میں حضرت خواجہ باقی باللہ ان کی عین صند تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے واقعات اور روحانی مدارج کو چھپاتے اور انتہائی روحانی سر بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی عالی ظرفی ”ہل من مزید“ کا نعرہ لگاتی۔ ان کے سب سے قدیمی تذکرے میں ان کی جس خصوصیت پر سب زیادہ زور دیا گیا ہے وہ ”ستر احوال“ اور غایت انکسار ہے۔ زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:-

”مشہورہ مرضیہ حضرت خواجہ باقدس سرہنگی ستر احوال و اخفاء و خمول و انزوا و بود و ناز

غایت انکسار ہمیشہ دیدہ قصور احوال و متمم دانش نیت نصب عین ایشاں۔“

حضرت خواجہ عجز و انکسار میں اتنا غلو کرتے کہ جب کوئی طالب ان کے پاس بیعت کی غرض سے آتا تو وہ کسر نفسی سے یہی کہتے کہ میں اس کا رِ عظیم کے لائق نہیں ہوں کہیں دوسری جگہ طلب کا دامن بڑھاؤ اور اگر مرد کامل کا پتا ملے تو مجھے بھی خبر دینا تاکہ اس کی خدمت میں پہنچوں۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ یہی ماجرا پیش آیا اور وہ آپ کی عذر و معذرت سے مجبور ہو کر مرشد کی تلاش میں آگرے گئے۔ وہاں سر اسیمہ اور حیران پھر رہے تھے کہ ایک جگہ سے قوالی کی آواز آئی۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو قوال یہ گارہے تھے:-

تو خواہی آستیں افشاں و خواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکان حلوائی

چنانچہ آپ پھر حضرت خواجہ کی خدمت میں واپس آگئے اور بڑے اصرار کے بعد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح کا واقعہ ایک خراسانی نوجوان کو پیش آیا جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر متکلف تھا اور کسی زندہ مرشد کے ملنے کا طالب تھا۔ اسے خواب میں اشارہ ہوا کہ نقش بند یہ سلسلہ کے ایک مرد کامل اس شہر میں آئے ہیں تو جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پوچھتا پوچھتا خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور اپنے خواب کا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے کہا کہ میں مرد کامل کہاں؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے! یہ کہا اور کثرت انکسار سے اس طرح معذرت کی کہ وہ نوجوان بھی پلٹ گیا۔ دوسری رات اسے پھر اشارہ ہوا کہ وہ بزرگ وہی ہیں جن کی خدمت میں تم پہنچے تھے۔ اور ان کی عاجزی تو ان کا زیور ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان پھر واپس آیا اور جب تک آپ نے اس کی رہنمائی قبول نہ کر لی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

”غایت انکسار“ کے علاوہ تذکرہ نگار آپ کی جس صفت پر زور دیتے ہیں وہ مشغفت و ترقم ہے۔ لاہور میں قحط سالی کے دوران میں آپ نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اس کے بارے میں زبدۃ المقامات کا بیان نقل ہو چکا ہے۔ فی الواقع

آپ کے ترجم اور تھم و بُرد باری کی اتنی مثالیں تذکروں میں ملتی ہیں کہ اگر ہم چند مستند واقعات کو ہی جمع کرنا شروع کریں تو ایک دفتر کی ضرورت ہو۔

علم زلف و رخت را شرح و اطن

شعبے باید دراز و ماہتابے!

آپ کی غیر معمولی فہم و فراست کی بھی قدیمی تذکروں میں بڑی تعریف ہے۔ مثلاً زبدۃ المقامات میں لکھا ہے کہ اگرچہ آپ نے علوم ظاہری پوری طرح نہیں حاصل کیے، لیکن ”ذکائے فطرت“ اور ”صفائے نسبت“ سے آپ کی عقل سمجھ کا پایہ بلند تھا ”دانش الیشاہ پایہ بلند داشتہ“۔

آپ کا اصل جوہر آپ کی اخلاقی پاکیزگی تھی، جسے دیکھنے والے ”نفس ملکی“ (زبدۃ المقامات) کے نام سے موسوم کرتے۔ آپ کو شروع میں ہی استخارہ میں بتادیا گیا تھا کہ ”حاصل سلوک تہذیب الاخلاق“ ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تمام کوششیں تزکیۂ نفس اور روحانی پاکیزگی پر مبذول کیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کی خوبیاں فقط منصفیانہ قسم کی تھیں۔ آپ کو علمی دنیا میں وہ پایہ حاصل نہیں جو آپ کے ایک معتقد شیخ عبدالحق محدث کو میسر تھا اور نہ ہی آپ کو اپنے دوسرے جلیل القدر مرید حضرت مجدد و کار و قلم نصیب ہوا، لیکن جہاں تک اصل کام یعنی ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے آپ اپنے زمانے میں منفرد تھے اور ہندوستان کی تاریخ تصوف میں آپ کی جگہ حضرت خواجہ بزرگ۔ حضرت سلطان المشائخ اور حضرت مجدد کے ساتھ ساتھ ہے جو اس ملک میں اہم نئے سلسلوں کے موسس ہوئے۔

جس شریعت سے آپ نے تین چار سال کے قلیل عرصے میں نقشبندیہ سلسلے کی بنیادیں مستحکم طور پر اس ملک میں رکھ دیں، وہی آپ کی روحانی عظمت کا بین ثبوت ہے اور شروع سے تذکرہ نگار اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مرید خواجہ محمد ہاشم کشمی لکھتے ہیں :-

”شاہد عظیم بر علو رتبہ الیشاہ ہمیں بس۔ کہ دوسرے سال بر مسند شریعت بودند دریں

مدت قلیلہ چہ۔ م کہ از خوان دولت الیشاہ روزی مند گردیدند۔ و چہ برکات و آثار کہ در کشور وسیع ہندوستان از لیشاہ انبساط گرفت و ایں سلسلہ طریقہ نقشبندیہ کہ دریں دیار غریب بود، تر و بیج تمام یافت۔ با آنکہ بسیار دریاں دیار ماندہ بودند۔ اما برکات ایں دوسرے سالہ در آن سالہا کجا بود؟“

حضرت خواجہ کے مُرشدِ کامل ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی ثانوی دلائل درکار نہیں۔ ان کے سبب نامور مرید نے اپنی ایک تصنیف میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت کے طریقہ تعلیم اور مرشدانہ شان کی اس پُر زور انداز سے تعریف کی ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے اس سے زیادہ زور دار اظہار تصور میں نہیں آسکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی مبداء و معاد میں لکھتے ہیں :-

”اچار کسے بوزیم در ملازمت حضرت خواجہ خود کہ پیش مردم در میان سائر یاران امتیاز داشتیم۔ و ہر کدام مارا نسبت بحضرت خواجہ قدس سرہ اعتقاد ملحدہ و معاملہ جدا بود۔ ایں فقیر بہ یقین میدانست کہ مثل ایں صحبت اجتماع و مانند آن تربیت و ارشاد بعد از زمان آل سرور علیہ و علیہ آلہ الصلوٰت و تسلیات ہرگز بوجہ نیامدہ است۔ و شکری نعمت بجائی باید آورد کہ اگرچہ بشری صحبت خیر البشر علیہ و علیہ آلہ الصلوٰت و السلام مشرف نشدیم۔ بارے از سعادت ایں صحبت محروم نماذیم۔“

خواجہ کلال۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات سے کوئی دو سال پہلے، قریباً چار مہینوں کے تفاوت سے، ان کے دو بیٹے دو بیویوں سے پیدا ہوئے۔ وہ ابھی نو دس سال اور آٹھ کی گود میں تھے کہ حضرت خواجہ نے حضرت مجدد سے انھیں توجہ دلائی۔ اور اپنے بلند مرتبہ مرید سے فرمایا کہ ضعف بدن مجھ پر غالب ہو گیا ہے اور امید حیات کم رہ گئی ہے۔ آپ ان بچوں کے حال کی خبر گیری رکھیں۔ ان دو میں سے بڑے کا نام ”جو غرہ ربیع الاول سنہ ۹۱۰ھ یعنی ۱۳ نومبر سنہ ۱۵۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ اسرار کے نام پر عبید اللہ رکھا گیا، لیکن وہ زیادہ تر خواجہ کلال کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی

ولادت کی حضرت کو بڑی خوشی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان کی ولادت، اذانِ اقامت اور تسمیہ کی نسبت کئی اشعار لکھے۔ انھوں نے بڑے ہو کر طریقہ نقشبندیہ کے اشتغال شیخ الہ داد سے اخذ کیے۔ (زبدۃ المقامات) اور تکمیل حضرت مجدد کے زیر ہدایت کی۔ اور کئی مکتوبات ان کے نام ایسے لکھے جن میں بڑی نیاز مندی کا اظہار ہے۔

خواجہ کلاں نے علوم ظاہری کی بھی ریشخ عبدالحق محدث کی نگرانی میں تکمیل کی۔ حضرات القدس میں جو زبدۃ المقامات کے کچھ سال بعد مکمل ہوئی، آپ کی نسبت لکھا ہے: ”آپ علم تاریخ اور انساب میں حصہ کامل رکھتے ہیں اور تصوف میں آپ کو شغف خاص اور علم انشا میں قدرت کاملہ حاصل ہے اور مطالعہ کتب آپ کا انیس و رفیق ہے۔ آپ کے اکثر اوقات تصنیف میں صرف ہوتے ہیں۔ تذکرہ مشائخ بقدر ایک لاکھ اشعار (سطور؟) یا کم و بیش آپ نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کے سوا بھی آپ کی کئی تصانیف ہیں“ (ص ۲۶۱)۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ خواجہ حسام الدین کے مقامات کے بیان میں آپ کی ایک علیحدہ کتاب کا ذکر ہے۔ (ص ۲۷۵)۔ روضۃ الصومیہ میں (رکن اول ص ۲۱۱ پر) ”حضرت خواجہ کلاں کے کلیات“ کا ذکر ہے جس میں بظاہر وہ مکتوبات بھی ہیں جو خواجہ حسام الدین کی طرف مختلف اشخاص نے لکھے۔ اور شیخ عبدالحق محدث کا وہ خط دیا ہے جو انھوں نے خواجہ حسام الدین کو حضرت مجدد سے غایت محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔ اسی طرح طبقات شاہجہانی میں آپ کی تصنیفات نافع“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”احوال صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین تا وقت خود نوشتہ“ (شاید یہ وہی کتاب ہو جسے حضرات القدس میں تذکرۃ المشائخ کہا گیا ہے)۔

افسوس کہ ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرہ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف مبلغ الرجال پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصد تصنیف اس انتشار کو

رفع کرنا تھا۔ جو ”آراء اہل فکر و نظر و اقوال ارباب کشف و شہود“ کی وجہ سے معرفت حقیقت عالم کے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔ کتابچہ کا کافی حصہ قرامطہ اور ملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر ابوالفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفی تصانیف اور ان صوفیوں کی جو علت ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے، شکایت کی ہے۔ اور حضرت مجدد کا ذکر اپنے والد کے ”اعظم الخلفا“ کہہ کر کیا ہے۔ حضرت مجدد کے خاوند باقویہ سے قریبی تعلقات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ کلاں کی صاحبزادی حضرت مجدد کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جو والد کی وفات وقت خرد سال تھے، بیامی گئیں۔

حضرت خواجہ کے دوسرے صاحبزادے ۶ رجب سنہ ۸۰۰
خواجہ خرد یعنی ۴ فروری سنہ ۸۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اسم گرامی خواجہ محمد عبد اللہ تھا۔ لیکن خواجہ خرد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی ولادت پر بھی حضرت خواجہ نے زور دار شعر لکھا۔

یارب کہ طلسم خود کشائی	ایں طفلک ما باو نمائی
خود را بہ تمام خود گزارد	چوں نخل ز دانتہ سر بر آرد
چندیں ہمہ آفتاب رفتند	در بحر تو چوں حباب رفتند
ایں قطر ہم از شمار ایشاں	در موج خودش کن پریشاں
با شد کام ازو بر آید	چوں بنیمش از تو یادم آید
ہر جا کہ ترشح تو بینم	در اعطش آیم و تشنیم
لے بحر طرب یکام من شو	امروز کیے بہ جام من شو
من جام چہ مے کنم گدا یم	مشتاق تو ام دہن کشایم

خواجہ خرد کو خواجہ کلاں کی نسبت حضرت مجدد سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں سر ہند اور ایک مرتبہ لاہور پہنچے اور دیر تک وہاں قیام کیا۔ زبدۃ المقامات کے بیان کے مطابق آپ نے حضرت مجدد سے بعض

کتب علم کلام جیسے شرح مواقف وغیرہ یا بعض رسائل صوفیہ بھی پڑھے۔
خواجہ خرد ربا عیات و شرح ربا عیات میں لکھتے ہیں کہ آپ کو حضرت مجدد سے
”اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم“ حاصل تھی۔

”اے فقیر خجندہ از وطن مالوت بخد مت ایساں در سر بند و یکبار در لاہور مشرف شد
و ہر بار خجند گاہ در خدمت بسر بندہ۔ الطاف بسیار مے فرمودند۔ و امید واری چنانست
کہ آن الطاف سبب نجات اخروی گردد۔ اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا
نیز فرمودند۔ و بشارتہا میدادند“

حضرات القدس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ”...چند بار پیادہ و سوار نہایت
مسکنت و انکساری اور تجرید و تغرید کے ساتھ دہلی سے سر بند تک آنحضرت قدس سرہ
کی عتبہ بوسی کے لیے آئے۔ اور مدلول تک آنحضرت کی خدمت میں بسر کی اور فیض و
برکات پائے۔ اور آنحضرت کی خلافت و اجازت سے سعادت گیر ہوئے“

خواجہ خرد کے مزاج میں کسی قدر وارستگی تھی۔ حضرت مجددؒ اس خواجہ زادہ
کے وسعت مشرب سے ہمیشہ ہر اسان رہتے تھے کہ ان تمام تعینات کے ساتھ
اپنے والد ماجد کے مسند ارشاد اور سجادہ پر جانشین ہو سکیں گے یا نہیں۔ اور
طالبوں کو فائدہ رسانی میں دباغ سوزی اور سرگرمی دکھا سکیں گے یا نہیں چنانچہ
اسی طرح واقعہ ہوا کہ دو ایک شخصوں کو حکم حضرت کی تعمیل کے لیے طریقہ کی تعلیم
دی اور حضرت وارستگی اور بے تعینتی سے اس امر جلیل القدر کی پابندی نہ کر سکے۔
حضرات القدس کے اس اندراج کی شاہ ولی اللہ کے بیان سے تائید ہوتی
ہے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم خواجہ خرد کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اور وہ بھی
ان کے جد شیخ قطب عالم اوس شیخ رفیع الدین کے اپنے والد بزرگوار سے تعلقات کی
وجہ سے انھیں بڑا عزیز رکھتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے خواجہ خرد سے حاشیہ خیالی
کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے بیعت کے لیے کہا تو خواجہ صاحب
نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ چونکہ مجھ سے بعض بے قاعد گیاں ہوئی ہیں، میں نہیں چاہتا

کہ علاقہ بیعت کی وجہ سے تم کو کوئی ضرر پہنچے۔ اور مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری
کے کسی خلیفہ سے بیعت کریں۔

خواجہ خرد نے کئی صوفیانہ رسائل لکھے اور اتفاق سے وہ قریباً سارے کے سارے
محفوظ ہیں۔ ان میں سے دو ایک تو چھپ چکے ہیں، لیکن شاید ان کا سب سے مکمل مجموعہ
انڈیا آفس لائبریری (ذخیرہ دہلی) میں ہے۔ ان میں بیان احوال و ملفوظات خواجہ خرد
(جس میں آپ کے بعض مکتوبات بھی ہیں) کے علاوہ رسالہ سماع۔ رسالہ خواجہ خرد
(توحید و جدوی کے متعلق) رسالہ فرائح۔ پردہ بر انداخت و پردہ کہ شناخت۔
پردہ عشق۔ رسالہ سید اور شرح تسویہ کے علاوہ ایک دلچسپ تصنیف ربا عیات
و شرح ربا عیات ہے۔ موزن الذکر میں بعض معاصرانہ ہزرگوں کی نسبت مدحیہ ربا عیات
لکھ کر ان کے متعلق واقعات اور اپنے تاثرات دیے ہیں، جو حضرت باقی باللہؒ اور
حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات کے طالبین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلیفہ اعظم حضرت مجدد الف ثانیؒ
خواجہ حسام الدینؒ تھے۔ ان کا تفصیلی ذکر علیحدہ آئے گا۔ ان کے علاوہ

آپ کے کئی اور خلفا تھے، جن میں سے شیخ تاج الدین سنہلی۔ شیخ الہ داد۔ خواجہ
محمد نور اور مرزا حسام الدین احمد زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے مرزا حسام الدین کے
حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ وہ ۱۰۷۹ ہجری (۱۶۶۹ء) میں بلا دیر خشاں کے
قصبہ قندوز میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی نظام الدین بدخشی مخاطب غاریاں
اکبر کے مقربین میں سے تھے۔ بلکہ بدایونی کہتا ہے کہ ”سجدہ زمیں بوس“ کی تجویز انھی
نے پیش کی۔ مرزا حسام الدین خود شیخ مبارک کے داماد تھے اور ابو الفضل اور فیضی کی
بہن ان سے بیاہی تھی۔ باپ کی وفات پر موروثی منصب انھیں ملا اور خانخانان

۱۷ چشتی (کم از کم نظامی) حضرات مرشد کو سجدہ تعظیمی جائز قرار دیتے ہیں۔ (خواجہ حسن نظامی نے
اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا) اور قدیم سلاطین میں ملہن نے اسے شروع کیا تھا۔

کے ساتھ دکن کی مہم کو گئے۔ اس اثنا میں فقرا سے ملتے رہے۔ اور محبت الہی کا جذبہ ایسا غالب ہوا کہ ترک دنیا کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں نے جو آپ کے والد کا شاگرد تھا۔ مخالفت کی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اگر ترک منصب کی درخواست دول کا تو منظور نہ ہوگی۔ میں دیوانہ ہو جاتا ہوں اور قیود دنیوی سے رہائی پا کر باقی عمر سلطان الشاہ کے مزار پر گزار دوں گا۔ خانخاناں نے منتیں کیں، لیکن آپ نہ مانے۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر بھینک دیے۔ بدن کو کچھ ملا اور دیوانوں کی طرح گلی کو چوں میں پھرنے لگے۔ خانخاناں نے اب بھی انھیں روکنا چاہا۔ دوسرے امر کو ساتھ لے کر بڑے اعزاز سے انھیں اپنی قیام گاہ پر لایا اور پھر وعظ و نصیحت شروع کی۔ انھوں نے جو تک نہ دیا۔ ناچار خانخاناں نے ان کی عرضی بادشاہ کے پاس بھیجی۔ وہاں سے دلی آنے کی اجازت ہوئی۔ یہاں پہنچے تو خواجہ باقی باللہ کے مرید ہوئے اور اتنی خدمت کرنے کا موقع ملا کہ جب مُرشد دم توڑ رہا تھا تو مرزا حسام الدین کے سوا کوئی دوسرا خدمت میں موجود نہ تھا۔

جب حضرت خواجہ نے وفات پائی تو ان کے دونوں بیٹے خرد سال تھے۔ ان کی عمر دو دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ انھوں نے حضرت مجددؒ سے کئی طرح کے روحانی فیوض حاصل کیے۔ لیکن ان کی عام خبر گیری کی سعادت مرزا حسام الدین کے ہتھ میں آئی۔ حضرت مجددؒ خود ایک خط میں اپنے مرشد کے احسانات کا ذکر کر کے اپنے مُرشد زادوں کو لکھتے ہیں:-

”وہر گاہ اس دولت رفیع القدر از حضرت ایشاں بدیں فقیر رسیدہ باشد۔ اگر وہ پیر مرخورد یا شمال اقدم خدمت عتبہ عالیہ فرما کردہ باشد۔ سچ نکرده باشد۔ از تعصبات خود چہ عرض کند از شرمندگی ہائے خود چہ اظهار نماید۔ آما سارت آگاہ خواجہ حسام الدین راسخ سبحانہ از ما جزا سے خیر دہا کہ معونت ما متھوان بر خود التوام نمودہ کمر تہمت را در خدمت عتبہ عالیہ بستہ اند و ما دور افتادگان را فارغ ساختہ“۔
شاہ ولی اللہ القاسم العارفین میں لکھتے ہیں:-

”محقق نمائند کہ خواجہ حسام الدین در اوائل حال در سلک امرائے وقت اختتام داشتند والد ایشاں از احاطہ امرائے زمان بود۔ چون بصحبت خواجہ رسیدند و جذبہ طریقت ایشاں تاثیر کرد۔ ہمدار ترک کردند۔ و طوعاً و رغبتاً از ہجر برآمدند۔ چون اقلید ایشاں کی گرفتار کہ وضع فقرائے بخود قرار دہند۔ خود را بدیوانگی انداختند و در مجمع بر مزار شہید و خود را ملوث ساختند۔ انرا باز دست کشویش آں جماعہ از ایشاں کوتاہ شد۔ آنقدر ملاقات جانب خواجہ دربارہ اولاد ایشاں و اتباع ایشاں و طریقہ ایشاں و اشغال ایشاں کہ ازین دو عزیز خواجہ حسام الدین و شیخ الادا بطریق پیوست۔ از دیگران بوقوع نیامد“۔
خواجہ حسام الدین کی مفصل سوانح عمری حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ کلال نے لکھی۔ وہ اب دستیاب نہیں ہوتی، لیکن منتشر حالات معاصرانہ کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں مسکنیت بے حد تھی بلکہ خواجہ خود جو آپ کو افضل و اکمل اصحاب حضرت خواجہ باقی باللہ کے جانشین حقیقی کہتے ہیں۔ رباعیات و شرح رباعیات (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ کو حضرت خواجہ سے خلافت عطا ہوئی تھی اور آپ ارشاد و ہدایت کے مجاز تھے، لیکن آپ یہ کہتے رہے کہ میں اس اہم ذمہ داری کے قابل نہیں۔ اور سلسلہ ارشاد شروع نہ کیا:-

در مقام عبودیت کہ نہایت مقامات ولایت است۔ مستقر داشتند۔ بالکمال از حضرت خواجہ مجاز و از غیب با ذوق بودند۔ بہ شیخت و ارشاد متوجہ نشدند و از کمال علو ہمت و نہایت تجرید طریقہ شیخی اختیار نہ فرمودند۔

خاست انکسار و انزوای کے باوجود آپ کا اپنے زمانے میں بڑا اثر تھا۔ شیخ عبدالحق محدث سے جو حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں سے تھے، آپ کے بڑے روابط تھے۔ بلکہ سفینۃ الاولیاء میں دارالکھوہ لکھتا ہے۔ کہ بعض ”سخان غیر واقع“ کی بنا پر جہانگیر نے جب وہ کشمیر میں تھا۔ آپ کو اور شیخ محدث کو دہلی سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اس روایت میں بعض غلطیاں ہیں (مثلاً آپ کو از مریدان بالکمال

شیخ احمد سہندی "لکھا ہے"۔ لیکن اگر نفس مضمون میں کچھ صحت ہے تو غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ (اور شیخ محدث) شہزادہ خرم (شاہجہاں) کے طرفدار سمجھے جاتے ہوں گے۔ جو ایک زمانے میں نورجہاں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے والد جہانگیر کے خلاف بغاوت پر مجبور ہو گیا تھا۔ مثلاً طبقات شاہجہانی کا مصنف بڑی تفصیل سے لکھتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کی بڑی خواہش تھی کہ خرم (شاہجہاں) پادشاہ ہو۔ مخفی اور علانیہ اس خواہش کا اظہار کرتے۔ خود اس کے لیے دُعا کرتے اور درویشوں اور گوشہ نشینوں سے اس مقصد کے لیے دُعا کی درخواست کرتے۔ طبقات کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے:-

باوجود کمال اجتناب و احتراز حضرت حسام اولیا (خواجہ حسام الدین) از دنیا و اہل دنیا و ملاقات ملوک و سلاطین، چوں دینداری و دیں پروری حضرت صاحبقران ثانی در خاطر شریف وے ممکن بودہ۔ ہمیشہ بدعا و زاری از درگاہ حضرت قادر باری سلطنت ادا میخواستہ و سر او علانیہ طالب آں بود کہ لوائے سلطنت حضرت بادشاہ دین پناہ شاہ جہاں مرفوع شود۔ و شب و روز زنجت رفاہیت خلق اللہ از درویشان و گوشہ نشینان التماس فاتحہ برائے بر آمدن ایں مطلب میگردہ تا آنکہ حضرت صاحبقران ثانی نیز چوں از زبان شاہزادگی سوابق دوستداری و دولت خواہی وے میدیدند۔ حسن عقیدہ تام بوسے داشتند۔ بعد از وفات آنجناب چنانچہ باید بر احوال فرزندواں برداشتند۔ خلد اللہ۔

خواجہ حسام الدین کا ذکر حضرت مجدد الف ثانی کے دونوں قریب الحدتذکروں ازبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں بڑی تفصیل اور تعریف کے ساتھ ہوا ہے۔ دونوں مولفین لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ عزت گریں تھے۔ اور امر اور وسوسے اختلاط پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑے حریص تھے۔ اور ان کی سفارش کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے۔ بلکہ کبھی ایسے ایسے امرا سے بھی سفارش کرتے کہ آپ کے مخلصین کو ناگوار ہوتا۔ اور آپ کے فرزند اعتراف

کرتے، لیکن آپ نے اس طریق کار کو نہ چھوڑا۔

آپ نے مرشد کے مزار کے گرد ایک باغیچہ لگوایا تھا۔ بقول خواجہ ہاشم کشمی "امروز بہمن سہی خدمت خواجہ حسام الدین احمد سلمہ اللہ تعالیٰ حوالی آں مزار از آبخار و اشجار و انساہ بہشتی شدہ یزار و تبرک و نفع"۔ آپ دن کا زیادہ حصہ وہاں گزارتے اور تلاوت قرآن شریف اور نماز اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔ آپ کی وفات اگست ۱۶۳۳ء کو آگرہ میں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جسدِ خاکی کو وہاں سے دہلی لا کر مرشد کے پائیں مزار دفن کیا گیا۔ خواجہ حسام الدین کی وفات کے بعد ان کی بی بی نے ان کے نیک کام جاری رکھے۔ اپنے بھائیوں اور خویشوں سے منہ موڑ لیا اور جب تک جیتی رہی، ۱۲ ہزار روپے سالانہ جو خانخاناں کی دی ہوئی جاگیر سے آتا تھا حضرت خواجہ کی خانقاہ کے خرچ کے لیے بھیجتی رہی۔ خواجہ حسام الدین کی وفات پر طبقات شاہجہانی کے مصنف نے جو پراثر قطعہ لکھا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

چوں حسام الحق از جہاں بگزشت حصن دیں را اساس محکم رفت
بایزید و جنید دوراں شد شبلی وقت و ابن ادھم رفت
یار بیچارگان خستہ نماںد اہل دیں را انیس ہدم رفت

شیخ تاج الدین منہلی | خواجہ خرد سے شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم، خواجہ محمد باقی کے بڑے مداح اور ان کے خاص طریقے کے

لہ محضاح نام۔ شیخ عبدالحی محدث سے ان کے بڑے روابط تھے۔ ان کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ یہ ایک دفعہ بیمار ہوئے اور علالت نے طول کھینچا۔ شیخ ہر روز بیمار پرسی اور تسلی کے لیے رقعہ لکھتے۔ کبھی دن میں دوبار۔ "قریب صد و پنجاہ رقعہ آنحضرت پیش فقیر کہ ہمہ بدستخط خاص نوشتہ اند۔ جمع شدہ یہ طبقات شاہجہانی میں شیخ عبدالحی محدث کے کئی رفات نقل ہوئے ہیں۔

پیرو تھے۔ وہ اسے نقشبندیہ طریقہ کے دوسرے شعبوں پر فضیلت دیتے تھے شاہ ولی اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

”معنی نماز کہ حضرت ایشاں (شاہ عبدالرحیم) از شعبات طریقہ نقشبندیہ آقا شریعت خواجہ محمد باقی را پسند میکردند و میل نمودند کہ مثل ایں میل بدگر شعب نبود۔ ہمارا شاہ و تربیت ایشاں بایں شعبہ بود است۔ شیخ تاج الدین سنبھلی کہ اول خلفائے حضرت خواجہ بودند و در آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہما بخاندان شند و ایں فقیر از متاخران مشائخ اہل ہندیکہ کس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج مستعدا باشند کہ اہانت و سے روایت کنند۔ در بیان اشغال شعبہ باقوتیہ کہ ہماں طریقہ نقشبندیہ است بے افراط و تفریط۔ رسالہ عربیہ دارند و حضرت ایشاں (واللہ من) ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند طے نظر از عبارات سلف۔ ایں فقیر ایں ہر دورا بخد مت حضرت ایشاں گزرا ندہ والحمد للہ“

شیخ تاج الدین سنبھلی جن کے اشغال نقشبندیہ کے متعلق عربی رسالے کا فارسی ترجمہ شاہ عبدالرحیم نے کیا تھا، خواجہ باقی باللہ کے سب سے پہلے مرید تھے۔ (زبدۃ المقامات) وہ غالباً ان کے حلقہ ارادت میں اس وقت داخل ہوئے، جب حضرت خواجہ بندگوں کی تلاش میں سنبھلی آئے تھے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے جلد بعد وہ بلاد عرب میں چلے گئے تھے۔ ان کی نسبت علامہ مرتضیٰ زبیدی نے جن کی عمر کا بیشتر حصہ من، حجاز اور مصر میں گزرا، فتح القدوسیہ میں لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین نے بصرہ۔ یمن۔ احسا۔ نجد اور خود حجاز میں طریقہ نقشبندیہ کو پھیلا دیا اور ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ انھوں نے عربی میں متعدد کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ اور اہل عرب کو نقشبندیہ سلسلے سے روشناس کروایا۔ اس سلسلے کے متعلق آپ کی مشہور تصنیف الرسالہ فی سلوک خلاصۃ السادات نقشبندیہ ہے۔ جس کی علامہ عبدالغنی النابلسی نے تفصیلی شرح مفتاح الحیث فی طریقہ نقشبندیہ کے نام سے لکھی ہے۔ آپ نے ایک عربی رسالہ پیری مریدی

کے حجاز میں منکرین کو قائل کرنے کے لیے لکھا۔ تصوف کی کئی مشہور کتب (مثلاً جامی کی نفحات الانس اور ملا و اعظم کا شفی کی رفحات) کا عربی میں ترجمہ کیا۔ نفحات الانس کے اس عربی ترجمے کا ایک نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔

حجاز میں شیخ تاج الدین کو غیر معمولی کامیابی کچھ اس وجہ سے ہوئی کہ شیخ محمد علان جو اعیان و اکابر حرم میں سے تھے اور جنھیں طریقہ نقشبندیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، آپ کے حلقہ ارادت میں آئے اور دیار عرب میں آپ کو شیخ ایشاں علان کہا جانے لگا۔

حجاز میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن پھر واپس چلے گئے۔ اور اپنی طویل عمر کا کافی حصہ حجاز اور عربستان گزارا۔ آپ کو وہاں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آخری دفعہ بصرہ و کوفہ کی طرف گئے تو حاکم بصرہ آپ کے مخلصین میں داخل ہوا (زبدہ)۔ بالآخر آپ نے بیت اللہ شریف کے قریب زمین خریدی اور وہاں سکونت اختیار کی۔ آپ کی وفات نواسے برس کی عمر میں ۷۸۰ھ ہجری میں ہوئی اور مکہ معظمہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے حالات میں ایک مستقل عربی کتاب بانکے پورا لاٹبریری میں ہے۔

اب ہم حضرت خواجہ کے سب سے نامور خلیفہ اور ہندوستان کے بطل عظیم حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر خیر کریں گے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ

حضرت مجدد الف ثانی ۱۲ اشوال ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۲ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی احمد تھا۔ لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کی اولاد سے تھے۔ اور آپ کا سلسلہ نسب کابل کے ایک ممتاز خاندان سے ملتا ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ مغربی پاکستان کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہم جد تھے۔ کیونکہ دونوں کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ الفاروقی الکابلی سے ملتا ہے۔

تعلیم | حضرت مجدد الف ثانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالاحد سے حاصل کی۔ اور سرہند کے دوسرے علمائے حاصل کی۔ اس کے بعد ملک کے بعض بہترین علمائے فیض حاصل کیا۔ سیالکوٹ میں آپ نے علامہ کمال الدین کشمیری سے جن کے حلقہ درس سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے فاضل روزگار اٹھے۔ حضرت کی اس قسم کی دوسری مشکل کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے سب سے مشہور استاد شیخ یعقوب مرنئی کشمیری تھے جن کا ذکر آئندہ سطوح میں آئے گا۔ ان کے علاوہ قاضی بہلول بدخشی سے تفسیر واحدی مع دیگر مولفات واحدی (مثلاً بسیط و وسیط و اسباب و احوال) تفسیر بیضاوی مع دیگر مصنفات قاضی بیضاوی (مثلاً منہاج الوصول وغایت القصویٰ) صحیح بخاری اور امام بخاری کی دوسری تالیفات (مثلاً ثلاثیات و ادب المفرد و افعال العباد و تاریخ وغیرہ) مشکوٰۃ مصابیح۔ شمائل ترمذی۔ جامع صغیر سیوطی اور قصیدہ بردہ و حدیث مسلسل کی اجازت حاصل کی (مفسوس کہ قاضی بہلول بدخشی کے متعلق تفصیل نہیں ملیں۔ لیکن زبدۃ المقات میں جہاں ان کی اسناد حدیث درج ہیں، یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حدیث میں ان کے استاد معظم شیخ عبدالرحمان بن فہد تھے جو حجاز کے ایک مشہور محدث خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

مخدوم عبدالاحد

مخدوم عبدالاحد جو حضرت مجدد کے والد استاد اور پیر و مرشد تھے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادہ شیخ رکن الدین کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ آپ کئی صوفیانہ کتب مثلاً کنوز الحقائق اور رسالہ تشہد کے مصنف اور بڑے سیاح تھے۔ چنانچہ زبدۃ المقامات میں آپ کے بنگالہ۔ جونپور۔ رہتاس وغیرہ کے سفر اور اٹائے سفر میں اولیائے اور علمائے کرام سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔

آپ نے شیخ اکبر محمد الدین ابن العربی اور شیخ شہاب الدین سروردی کی کتابوں کا غار مطالعہ کیا تھا اور فصوص الحکم اور تصوف کی دوسری اہم کتابوں مثلاً عوارف المحارف کا درس دیا کرتے تھے۔ بلکہ زبدۃ المقامات کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر لاہوری نے فصوص الحکم آپ سے پڑھی تھی (مولانا ہاشم کشمیری لکھتے ہیں "تذوۃ المشائخ جناب شیخ میر جو آج کل شہر لاہور میں سکونت فرما اور نہایت عزت پسند ہیں۔ آپ کے تلامذہ فصوص الحکم سے ہیں۔")

سب والدین کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نگار بالصراحت اور تفصیل لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب کو اپنے بلند اقبال صاحبزادے سے غیر معمولی محبت تھی۔ والد ماجد ایشاں راہ ایشاں القبت تمام بودہ و از جان عزیز خود عزیز تر سے داشتند۔ و ہمیشہ صحبت ایشاں مشغوف بودند۔ و از دقائق علوم دینی و اسرار یقینی در میان سے آوردند۔ (زبدۃ المقامات ص ۱۳۳)

اور حضرت مجدد نے بھی ان سے پوری طرح اخذ فیض کیا۔
مترجم خدمت و صحبت والا بزرگوار شدہ و ہمگی اقتباس انوار آں بزرگ عالم ہمدرد گردید
و فوائد باطنیہ کثیرہ از ایشاں دیدہ (ایضاً)

یہ صرف ایک شفیق باپ اور سعادت مند صاحبزادے کا تعلق نہ تھا بلکہ مخدوم صاحب ان کے استاد اور پیر و مرشد بھی تھے۔ حضرت مجدد نے شروع میں اکثر علوم ان سے پڑھے۔ چشتیہ اور قادریہ سلسلے میں ان کے مرید ہوئے۔ اور جیسا کہ انھوں نے

مبارک و محاد میں لکھا ہے۔ "منسبت فردیت" ان سے حاصل کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجددؑ کی اکثر صلاحیتیں خدا وادھتیں اور ان کے جوہر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت اور حضرت باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد کھلے۔ لیکن شاید ان کے خیالات کی ساخت میں سب سے زیادہ دخل ان کے خفیق باپ کی صحبت اور ابتدائی ماحول کو تھا۔ (مخدوم عبدالاحد کو شیخ ابن العربی کے خیالات سے بڑا خشک تھا۔ اس کا اثر ان کے فخر پر صاحبزادہ پر بڑا گہرا اور وسیع ہوا۔ حضرت مجدد الوعد ثانی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

مکرما! مستعد فقیر از خردی بامشرب اہل توحید بود۔ والد فقیر قدس سرہ بظاہر برہمیں مشرب بودند۔ و بر سبیل دوام برہمیں طریقہ اشتغال داشتہ اند۔ بحکم ابن الفقیہ نصف الفقیہ فقیر ازین مشرب از روئے علم حظ وافر بود و لذت عظیم داشت۔

نقشبندیہ سلسلے میں داخل ہونے کے بعد بھی مدت تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد حضرت مجددؑ پر وحدت شہود کی کیفیت منکشف ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے شیخ ابن العربی اور ان کی تصانیف کے متعلق بعض مخالفانہ فقرے لکھے۔ شیخ کی مخالف شرع باتوں سے اختلاف ظاہر کیا۔ لیکن شیخ کی عظمت و بزرگی کے ہمیشہ معترف رہے۔ بقول خواجہ ہاشم کشمیری "شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ را بس بزرگ سے دانستند و نیک یاد سے کردند" انھوں نے توحید و جود کی پوری نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے توحید شہودی سے نیچے ایک مقام قرار دیا۔ اور "توحید وغیرہ امور خلافیہ" کے متعلق کہا۔ "علما ان امور کی قباحت کے قائل ہیں۔ اور فقیر بشرط عبودیت ان امور کے حسن کا" (دفتر دوم ۴۲) قطب۔ ابدال۔ اوتلو کے جس باطنی نظام کو شیخ ابن العربی نے تصوف میں داخل کیا تھا، اسے آپ نے ترقی اور تقویت دی اور طریقہ مجددیہ کے قیوم کو شیخ ابن العربی کے قطب کی اگلی منزل سمجھنا چاہیے۔

شیخ یعقوب صرئی کشمیری حضرت مجددؑ کے دوسرے با اثر استاد شیخ

یعقوب صرئی کشمیری تھے، جن سے انھوں نے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سلسلہ کبریہ میں بیعت کی (حضرات اقدس) برصغیر کی روحانی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم ظاہری کے بعد سمرقند جا کر شیخ حسین خوارزمی کے مرید ہوئے۔ مرشد نے خاص توجہ اور مہربانی کی۔ واپس کشمیر آئے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ فیض کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے بعد خراسان کے رستے حجاز کا رخ کیا۔ شیخ ابن حجرؒ سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ بڑے سفر کیے اور کئی اولیائے اللہ سے ملاقات کی واپس کشمیر پہنچے تو یہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر تنہید کرا دیا اور اہل سنت کے لیے حالات بہت ناسازگار ہو گئے تو شیخ یعقوب، بابا داؤد خاکی کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت دی۔ اکبر تو اس موقع کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء میں کشمیر مملکت مغللیہ کا حصہ ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط ہو جانا عجب نہیں۔ لیکن بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ روابط پہلے سے تھے۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ ہمایوں کو بھی شیخ سے غیر معمولی اعتقاد تھا :-

وہم بادشاہ منقرت پناہ (ہمایوں) وہم شاہنشاہی (اکبر) نسبت سے اعتقاد غریب بود۔ بشرف صحبت اختصاص داختم و منظور نظر شفقت از گشتہ معزز و مکرم محمدؑ و شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے، اس کا اندازہ ان اقوال سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے قاضی موسیٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن ان کی

ملحہ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوبؒ اٹائے سفر میں شاہ طہماسپ کے ایام حکومت میں ایلان پہنچے تھے۔ غالباً بعد زمانہ تھا جب ہمایوں بھی وہاں مقیم تھا۔ شاید ان ایام میں ہمایوں سے روابط قائم ہوئے ہوں۔

مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد اپنی کتاب پاکستان میں فارسی ادب (جلد اول) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرنی کا سر تیکر میں ایک استاد تھے۔ ان کا تعلق ملاحصریہ بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگ ان کے حلقہ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملاحصریہ بھی مائل بہ تشیع ہیں تو شیخ صرنی ان کے مدرسے سے اٹھ آئے۔

حضرت مجدد کا شیعیت کی نسبت ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ اور ان کی ابتدائی تصانیف میں ایک رسالہ تھا ردِ روافض۔ کیا اس نقطہ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان کے مرشد اور استاد شیخ یعقوب صرنی کا اثر بھی کار فرما تھا؟ شیخ یعقوب کی ہستی جامع صفات تھی۔ وہ عالم اور شیخ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ختمہ کا جواب لکھا۔ پاکستان میں فارسی ادب میں ان کا تذکرہ ساٹھ صفحات پر محیط ہے۔ بدایونی نے ان کے متعلق جو طویل اندراج دیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے فیضی سے بڑے مراسم تھے۔ اس کی علمی اور ادبی صحبتوں میں وہ اکثر شریک ہوتے۔ ان کی لکھی ہوئی تفسیری کی تکمیل کی تاریخ اکثر موزنین نے نقل کی ہے۔ حضرت مجدد کی بھی فیضی اور ابوالفضل کے ہاں کافی آمد و رفت تھی۔ اور ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے تفسیر بے نقط کی تکمیل میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ کیا فیضی (اور ابوالفضل) سے ان تعلقات کی استواری میں ان کے استاد کو بھی دخل تھا؟

شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب اور حضرت مجدد کے اشتراک احساسات اور فیضی سے دونوں کے قریبی تعلقات کی بنا پر بعض سوالات ان کے سوانح نگار کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کا یقینی جواب نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ حضرت مجدد اپنی تمام عمر میں تین بزرگوں کے حلقہ ربیعیہ میں داخل ہوئے۔ ایک ان کے والد بزرگوار تھے۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ تیسرے شیخ یعقوب صرنی کشمیری۔ مؤخر الذکر کا بھی ان کی علمی اور روحانی زندگی میں ایک اہم مقام ہے۔

جب حضرت مجدد علوم عقلیہ و نقلیہ سے استفادہ کر چکے تو آپ نے سرسبز میں درس علوم کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبان علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ (بیس سال کی عمر میں) اکبر آباد تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔

قیام اکبر آباد سوانح نگار لکھتے ہیں کہ قیام اکبر آباد کے دوران میں آپ کو ابوالفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا موقع ہوا اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف ہو گئے۔ آپ کے مشہور خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں لکھا ہے در ترجمہ

چونکہ ابوالفضل اہل علم کی قدر کرتا تھا اور اہل علم کو بھی بعض مجبور یوں کی بنا پر اس سے ملنا پڑتا تھا۔ اس لیے حضرت مجدد کئی بار اس کی مجلس میں آئے۔ اور چونکہ وہ بھی آپ کی متعدد خوبیوں سے واقف تھا اس لیے وہ آپ کا خاص پاس کرتا۔ چنانچہ اس کے ایک شاگرد نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ ایک دفعہ ابوالفضل کسی دوست کو چند باتیں لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک واقعہ درج کیا جو اس نے حضرت شیخ (مجدد) سے سنا تھا اور اس ضمن میں حضرت کی بڑی تعریف لکھی۔

ابوالفضل کا ایک اور مصاحب مجھ سے کہتا تھا کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد ابوالفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابوالفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا کہ علماء اسلام کی توہین منہم ہوتی تھی حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالیٰ سے نہ رہا گیا اور انھوں نے فرمایا کہ امام غزالی قدس سرہ نے سالہائے

۱۰ حضرات القدس میں لکھا ہے تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد ماجد کے حضور میں درس علوم میں مشغول ہوئے۔ زبدۃ المقامات میں "والد ماجد کے حضور" کا ذکر نہیں۔ چوں کہ حضرت ایشان استفادہ علوم معقول و منقول و فروع و اصول فارغ شدہ اند۔ رخت بہستاد فادہ کشیدہ اند۔ و مدت طلبہ علوم را از برکات خویش بہرہ ور گردانیدہ۔" ممکن ہے اکبر آباد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا ہو۔

منقذ عن الضلال میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو کام کے ہیں مثلاً ہیئت - نجوم - ہیئت - طب - وہ انھوں نے قدیم انبیاء کی کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں۔ اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں مثلاً ریاضی وغیرہ۔ وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابو الفضل یہ سُن کر جوش میں آگیا اور کہنے لگا کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا بُرا مانا۔ فوراً ابو الفضل کی مجلس سے اُٹھے اور فرمایا کہ اگر اہل علم کی صحبت کا شوق ہے تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکلنے چاہئیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابو الفضل کے پاس نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انھیں بلا بھیجا۔

ایک روز حضرت (مجدد) ابو الفضل کے بھائی ابو الفیض [فیضی] کے مکان پر گئے وہ تفسیر غیر مجربہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقووظ الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی، لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت باوجودیکہ آپ کو غیر منقووظ عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔

حضرات القدس میں بھی جو حضرت مجدد کی دوسری قریب الحد سوانح عمری ہے، آپ کے خلیفہ اور شاگرد مولانا بدرالدین سرمنہدی نے لکھا ہے کہ آپ نے تفسیر غیر منقووظ کی تحریر میں (فیضی کو) بڑی مدد دی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصہ لکھ کر دیا تھا۔ (صرا) تفسیر کے مقام تصنیف کے متعلق ہم آئندہ سطور میں اظہار خیال کریں گے۔

لہ ترجمان زبدۃ المقامات (نولکھنور) ص ۱۳۱-۱۳۲ اے اردو ترجمہ میں ابو الفضل چھاپا ہے جو صحیح نہیں۔ شاید اصل میں ابو الفیض ہو۔ یا چونکہ اس سے پہلے ابو الفضل کا ذکر تھا، کسی نقل کرنے والے نے ابو الفضل لکھ دیا۔

لیکن اتنا یقینی ہے کہ اگر (یا فتح پور سیکری) میں حضرت مجدد کا ابو الفضل اور فیضی کے ہاں آنا جانا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا، جب وہ درس و تدریس اور افاضتہ طلباء میں مشغول تھے۔

عجب نہیں کہ ابو الفضل نے آئین اکبری کے آخر میں جن فضلاء عصر کا ذکر کیا ہے، ان میں شمارہ ۳۱ پر شیخ احمد آپ کا اسم گرامی ہو۔ اکبر نے اپنے دار الحکومت کو علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بنا دیا تھا۔ فیضی اور ابو الفضل دونوں بڑے عالم اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اور ان کے ہاں اہل علم کا جھگڑا رہتا تھا۔ یقین ہے کہ وہاں کتابوں کی، علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کئی کتابیں، جو عام اہل مدرسہ کو تیسرے نہ تھیں۔ ان کا ذکر ہوتا ہوگا۔ مصنفوں کے انداز بیان پر تبصرے ہوتے ہوں گے اور عبارت آسانی اور زور بیان کے طریقے سوچے جاتے ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل دین کے لیے ان محفلوں میں دماغی کوفت کا بڑا سامان تھا۔ لیکن شاید یہ محض اتفاق نہیں کہ طبقہ علما کے دو سب سے بڑے نثر نگار (حضرت مجدد اور شیخ عبدالحق محدث) اور خود بدایونی ان مجلسوں میں بیٹھنے والے تھے۔ ان تینوں (بلکہ ابو الفضل، فیضی کو ملا کر پانچوں) کا طرز تحریر جداگانہ ہے۔ اس میں ان کی اپنی اپنی شخصیت جھلکتی ہے۔ بدایونی کی نثر میں ایک موسیقی کے رسیا، خوش الحان قاری کی شعری دلاویزی ہے۔ حضرت مجدد کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کے طرز تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ ہیں۔ کہیں زور و خطابت ہے، کہیں متکلمانہ موثر گافی اور کہیں علمی متانت۔ اور ان سب میں اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت۔ شیخ عبدالحق حتیٰ کے ہاں عالمانہ وقار کے ساتھ دینی کی شستگی و نفاست ہے۔ علامی ابو الفضل کا طرز تحریر ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ لیکن اُس کی عربیت، علم و فضل اور شکوہ سلطانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح فیضی کے ہاں زور کلام، جوش، علمیت اور شعروں کی فراوانی ہے۔ ان سب کا رنگ اپنا اپنا ہے۔ ہر گلے کا رنگ و بوئے دیگر است۔ لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے انداز بیان کی اہمیت کا احساس۔ دوسرے علما (حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ) بالعموم

منقہ عن الفضل میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو کام کے ہیں مثلاً ہیئت - نجوم - ہیئت - طب - وہ انھوں نے قدیم انبیاء کی کتابوں اور ان کے کلام سے چرائے ہیں۔ اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں مثلاً ریاضی وغیرہ۔ وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابو الفضل یہ سب کچھ جوش میں آگیا اور کہنے لگا کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا برا مانا۔ فوراً ابو الفضل کی مجلس سے اٹھے اور فرمایا کہ اگر اہل علم کی صحبت کا شوق ہے تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالنے چاہئیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابو الفضل کے پاس نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انھیں بلا بھیجا۔

ایک روز حضرت (مجدد) ابو الفضل کے بھائی ابو الفیض [فیضی] کے کان پر گئے وہ تفسیر غیر مجربہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوڑی کی، لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔

حضرات القدس میں بھی جو حضرت مجدد کی دوسری قریب الہد سوانح عمری ہے، آپ کے خلیفہ اور شاگرد مولانا بدر الدین سرمندی نے لکھا ہے کہ آپ نے تفسیر غیر منقوط کی تحریر میں (فیضی کو) بڑی مدد دی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصہ لکھ کر دیا تھا۔ (ص ۱۱) تفسیر کے مقام تصنیف کے متعلق ہم آئندہ سطور میں اظہار خیال کریں گے۔

۱۳۲-۱۳۱ھ (نولکھنور ۱۳۱-۱۳۲ھ) اردو ترجمہ میں ابو الفضل چھاپا ہے جو صحیح نہیں۔ شاید اصل میں ابو الفیض جو یا چونکہ اس پہلے ابو الفضل کا ذکر تھا کسی نقل کرنے والے نے ابراہیم لکھ دیا۔

لیکن اتنا یقینی ہے کہ اگر (یا فتح پور سیکری) میں حضرت مجدد کا ابو الفضل اور فیضی کے ہاں آنا جانا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا، جب وہ درس و تدریس اور افتاء طلباء میں مشغول تھے۔

عجب نہیں کہ ابو الفضل نے آئین اکبری کے آخر میں جن فضلاء عصر کا ذکر کیا ہے، ان میں شمار ہوتا ہے شیخ احمد آپ کا اسم گرامی ہو۔ اکبر نے اپنے دار الحکومت کو علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بنادیا تھا۔ فیضی اور ابو الفضل دونوں بڑے عالم اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اور ان کے ہاں اہل علم کا جھگڑا رہتا تھا۔ یقین ہے کہ وہاں کتابوں کی علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کئی کتابیں جو عام اہل مدرسہ کو تیر نہ تھیں۔ ان کا ذکر ہوتا ہوگا مصنفوں کے انداز بیان پر تبصرے ہوتے ہوں گے اور عبارت آسانی اور زور بیان کے طریقے سوچے جاتے ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل دین کے لیے ان محفلوں میں دماغی کوفت کا بڑا سامان تھا۔ لیکن شاید یہ محض اتفاق نہیں کہ طبقہ علما کے دو سب سے بڑے نثر نگار (حضرت مجدد اور شیخ عبدالحق محدث) اور خود بدایونی ان مجلسوں میں بیٹھنے والے تھے۔ ان تینوں (بلکہ ابو الفضل - فیضی کو ملا کر تینوں) کا طرز تحریر جدا گانہ ہے۔ اس میں ان کی اپنی اپنی شخصیت جھلکتی ہے۔ بدایونی کی نثر میں ایک موسیقی کے رسیا، خوش الحان قادی کی شعری دلآویزی ہے۔ حضرت مجدد کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کے طرز تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ ہیں کہیں زور و خطابت ہے، کہیں متکلمانہ موثر کافی اور کہیں علمی متانت۔ اور ان سب میں اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت۔ شیخ عبدالحق حقی کے ہاں عالمانہ وقار کے ساتھ ولی کی شستگی و نفاست ہے۔ علامی ابو الفضل کا طرز تحریر ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ لیکن اُس کی عربیت، علم و فضل اور شکوہ سلطانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح فیضی کے ہاں زور کلام، جوش، علمیت اور شعروں کی فراوانی ہے۔ ان سب کا رنگ اپنا اپنا ہے۔ ہر گلے کا رنگ و بوئے دیگر است۔ لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے انداز بیان کی اہمیت کا احساس۔ دوسرے علما (حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ بالعموم

اس بات پر قانع ہیں کہ ان کا مافی الضمیر موزوں الفاظ میں ادا ہو جائے۔ لیکن عہدِ اکبری کے اہل علم، بالخصوص جو لوگ فیضی۔ ابو الفضل کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے، طرزِ ادا کی خوبیوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اور عبارت کی نوک پلک سنوارنے پر بھی توجہ دیتے تھے۔ //

قیامِ اکبر آباد میں حضرت مجدد کو اپنی معلومات بڑھانے، علمی اور فکری مسائل پر مختلف نقطہ نظر جاننے اور اندازِ بیان کی پختگی کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن آپ کا زاویہ نگاہ فیضی۔ ابو الفضل سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا اندازہ آپ کے رسالہ اثبات النبوت سے ہوتا ہے۔ جس کی ضرورت، ممکن ہے، آپ نے ابو الفضل سے اس زبانی بحث کے بعد محسوس کی ہو۔ جس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ہے۔ اور جس میں غزالی کی منقذ من الضلال کے طویل اندراجات ہیں۔

رسالہ اثبات النبوة | بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کی موجودہ تصانیف میں سب سے قدیم اثبات النبوة ہے۔ اس کے ابھی تک نامکمل نسخے ہی ملے ہیں، جنہیں پہلے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اردو ترجمہ کے ساتھ اور اب مولوی محبوب الہی صاحب نے رسائلِ مجددیہ میں شامل کر کے شائع کر دیا ہے۔

رسالہ اثبات النبوة جس کا بعض نسخوں میں تحقیق النبوة نام لکھا ہے۔ چھوٹے سائز کا چوالیس صفحے کا رسالہ ہے۔ اس میں تمہیدی عبارت کے بعد دو بحثیں ہیں۔ ایک نبوة کے معنی کی تحقیق میں۔ دوسری مجرہ کے بارے میں۔ اس کے بعد ایک طویل مقالہ ہے، جس کا ”پہلا مسلک بحث اور نبوت کی حقیقت“ اور اس کی ضرورت کے بیان میں اور دوسرا مسلک خاتم الانبیاء کی نبوت کے اثبات میں ہے۔

دوسرا مقالہ ”فلاسفہ کی مذمت میں اور ان کے علوم کی ممارست اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے جو ضرر ہوتا ہے“ اس کے بیان میں ہے۔ لیکن ابھی تک جو تین قلمی نسخے ملے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ مقالہ موجود نہیں۔ چنانچہ

اس کا کیا سبب ہے۔ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا ہو۔ یا شاید موجود نسخے کسی ابتدائی، غیر مکمل نسخے کی نقلیں ہوں۔

اثبات النبوت کے ابتدائی صفحات تمہیدی ہیں، جن میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ عہدِ اکبری کی مذہبی بدعنوانیوں کا ذکر ہے۔ اس اندراج سے بدایونی کے بیانات کی تائید ہوتی ہے، لیکن رسالہ کو بغور پڑھیں تو اس عظیم بعد و تفاوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو حضرت مجدد اور بدایونی کی اخلاقی اور ذہنی سطح میں تھا۔ اثبات النبوت ایک اہم مسئلے کا ایک نہایت بلند پایہ تجزیہ ہے۔ اس کا موضوع بحث و مناظرے کا ہے، لیکن اس میں ایک لفظ ایسا نہیں، جو نہایت اوجھے درجے کی علمی ثقاہت و متانت کے خلاف ہو۔ یا جس سے مخالفین کے ساتھ خوش اخلاقی میں ذرہ بھر کمی محسوس ہو۔ ان کا نقطہ نظر بڑی احتیاط اور بڑے انصاف سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ نفسِ مضمون ایسا تھا، جس کے متعلق مصنف کے احساسات شدید تھے، لیکن انہوں نے کہیں اپنے جذبات کو غالب آنے نہیں دیا اور نہایت بلند علمی اور فکری سطح برقرار رکھی ہے۔

رسالے کی تصنیف کے محرکات مقامی اور معاصرانہ تھے، لیکن تمہیدی عبارت کے سوا اس میں فقط انہی امور سے بحث ہے، جو اصولی اور دوامی ہیں۔ اور اگرچہ یہ رسالہ (غالباً) ابو الفضل سے ایک بحث سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ لیکن فی الحقیقت اس میں ایک ایسے سوال (کیا انسانی راہنمائی کے لیے عقل کافی ہے یا نبوت کی بھی ضرورت ہے؟) کا عالمانہ، بلکہ محققانہ جواب ہے، جو صرف اہل اسلام کے لیے ہی نہیں، بلکہ دوسرے مذاہب والوں کے لیے بھی اہمیت رکھتا ہے۔

تمہیدی عبارت کے بعد آپ فرماتے ہیں:۔ (ترجمہ)

”میں نے بعض لوگوں سے مناظرہ کیا جنہوں نے علمِ فلسفہ پڑھا تھا اور کافروں کی کتابوں سے بہرہ یاب ہو کر فضل و فضیلت کے مدعی ہو گئے تھے اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور اصل نبوت کے تحقق اور ایک خاص شخص کے لیے اس کے ثبوت میں خود بھی گمراہ ہوئے

اور یہاں تک کہنے لگے کہ نبوت کا حاصل حکمت اور مصلحت ہے۔ خلق کے ظاہری حالات کی اصلاح ہے اور عوام کو شہوات میں آزاد رہنے کی باہمی نزاع اور اختلاف سے محفوظ رکھنا ہے۔ اور اس کا نجات آخر وہ ہے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق صرف تہذیب اخلاق اور قلبی اعمال کے ان فضائل کی تحصیل سے ہے جنہیں حکماء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

مخالفین کے نقطہ نظر کی توضیح اور ان کے بعض اعتراضات کا جواب دے کر آپ لکھتے ہیں ”میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اور میرے سینے میں جگمگی کہ میں ان کے لیے ایسی تقریر کروں جو ان کے شکوک دور کر دے۔ اور ان کے لیے ایسی بات لکھوں جو ان کے شبہ کو زائل کر دے۔“

اثبات النبوت اسی ارادے کی تکمیل ہے۔ یہ تمام کا تمام رسالہ مطالعہ اور غور و خوض کا مستحق ہے، لیکن اس کے متعلق چند باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ایک تو بلند علمی معیار جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ چونکہ اس رسالے کا مقصد عقل کے دعویداروں کے شبہات و شکوک رفع کرنا تھا اس لیے اپنے نقطہ نظر (یعنی نبوت کی ضرورت اور عقل کی واماندگی) کو مضبوط عقلی دلائل کی مدد سے واضح کیا ہے۔ اور مخالفین کے اعتراضات کو سلسلہ وار گنا گنا کر ان کا نہایت خوش اسلوبی اور وضاحت سے جواب دیا ہے۔ رسالہ کی تیسری خصوصیت اس کا فصیح و بلیغ انداز بیان ہے، جو حضرت مجددؑ کی تمام تحریروں کا زیور ہے اور جس نے انہیں مذہبی مسائل پر اسلامی ہندوستان کا سب سے قادر الکلام اہل قلم بنا دیا تھا۔

ابتدائی حالات کے متعلق دشواریاں | حضرت مجددؑ الف ثانیؑ کے احوال زندگی کے کئی معاصرانہ ماخذ ہیں، لیکن ابتدائی

حالات کے متعلق کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آپ کے حالات و تعلیمات کا مستند معزن تو آپ کے اپنے مکتوبات ہیں، لیکن وہ اس زمانے سے شروع ہوتے ہیں جب آپ حضرت خواجہ باباؒ کی صحبت میں پہنچے۔ ابتدائی پچھتیل سالوں کے لیے

ہمیں زبدۃ المقامات اور حضرات القدس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں تذکرے بے حد کارآمد ہیں۔ لیکن شاید وہ بھی الحاقی عبارتوں سے پوری طرح محفوظ نہیں رہے۔ اس کے علاوہ آغاز ارشاد سے پہلے کے واقعات کے متعلق ان تذکروں میں جو ان واقعات کے وقوع کے کافی بعد لکھے گئے، سو کا امکان رہتا ہے۔

اس سہو کی ایک نمایاں مثال حضرت مجددؑ کے ابتدائی رسائل کے زبانِ مایف کے متعلق نظر آتی ہے۔ حضرات القدس کے (اردو ترجمہ) کی متعلقہ عبارت ہے۔ ”اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں آپ نے عربی و فارسی میں متعدد درساے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ تحریر فرمائے۔ چنانچہ رسالہ تہلیلہ اور رسالہ اثبات نبوت اور رسالہ رد شیعہ انہی رسائل میں سے ہیں۔“ حضرات القدس کا یہ اندراج کہ رسائل مذکورہ بالا ”اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں“ (جس سے آپ سترہ سال کی عمر میں.... فارغ ہو گئے۔“ حضرات القدس) یقیناً صحیح نہیں۔ زبدۃ المقامات میں صرف دو رسائل کے نام لیے گئے ہیں (رسالہ تہلیلہ اور رسالہ رد شیعہ) اور ان کا ذکر درس و تدریس کے دور میں، بلکہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ یہ بیان زیادہ قرین قیاس سے خوش قسمتی سے حل ہی میں اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلہ شائع ہو گئے ہیں۔ (تیسرا رسالہ ان سے پہلے مکتوبات کے ساتھ نو کشور پریس والوں نے شائع کر دیا تھا)۔ اوداب حضرات القدس وغیرہ کے بیان کی صحت کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے نشان دہی کی ہے۔ رسالہ تہلیلہ میں حضرت مجددؑ کے والد ماجد کے ساتھ قدس سرہ لکھا ہے۔ اس لیے اس کی تصنیف مخدوم صاحب کے سال وفات (۱۰۰۷ ہجری) کے بعد ہوئی ہوگی۔ اس میں اثبات النبوت کی تائید میں ایک سلا کا

سے زبدۃ المقامات بجز حضرت مجددؑ کا بہترین تذکرہ ہے، لیکن اس میں بھی ایک دو الجھنیں ہیں مثلاً اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۷ھ ہے، لیکن ایک جگہ شاہ محمد بیچے صاحب (ولادت ۱۰۲۷ھ) کے متعلق لکھا ہے۔ ”امروز کہ سال عمر آں بخوردار بہ پانزدہ رسیدہ“

ذکر ہے۔ اس کے دو سالہ تہلیلہ سے پہلے کا ہوگا۔ اثبات النبوت کے مقدمہ میں ذکر صاحب نے اس رسالے کی تصنیف ۹۹۰ھ کے قریب قرار دی ہے۔ اور زبدۃ المقامات کے اندراج کی بنا پر اس سال کے متعلق فٹ نوٹ دیا ہے کہ اسی عمر میں رد شیعہ وغیرہ رسائل بھی لکھ چکے تھے۔ محرمی ڈاکٹر صاحب نے ایک اور جگہ اثبات النبوت کے ۹۹۵ھ کی تصنیف ہونے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ دونوں بیانات قیاسی ہیں۔ اور رسالہ اثبات النبوت کے سال تصنیف کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ (سولے اس کے کہ اس کی تصنیف رسالہ تہلیلہ سے پہلے ہوئی تھی۔ اور غالباً حضرت مجدد کی سب سے پہلی تصنیف یہی رسالہ تھا)۔

رسالہ رد و افض بھی ابتدائی تصانیف میں سے ہے، لیکن اس میں اس خط کا ذکر ہے، جو علمائے مشہد نے علمائے ماوراء النہر کو لکھا۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر اظہر عباس رضوی نے وضاحت کی ہے۔ یہ خط شاہ عباس صفوی کے دوسرے سال جلوس یعنی ۹۹۶ھ میں لکھا گیا۔ اس لیے حضرت مجدد کا رسالہ بھی اس کے بعد کا ہوگا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ اگرچہ حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کی تاریخی اہمیت بہت ہے۔ ان کے مصنفین کو تلاش واقعات کی بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے بیانات کی عمومی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ابتدائی حالات کی جزئیات کے متعلق ان کے حفظ لفظ کا پابند ہونا یا اسے متعلقہ واقعات کا مکمل بیان سمجھنا خطرے سے خالی نہیں۔

اسی طرح کی الجھنیں حضرت مجدد کے سفروں کے متعلق ہیں۔ زبدۃ المقامات میں آپ کے آگرہ جانے کا تو ذکر نہیں، لیکن ابو الفضل کی مجلس میں آنے جانے اور اس سے مقام نبوت پر ایک بحث اور مخدوم صاحب کے آگرے اگر آپ کو سرہند لیجانے کی تفصیلات درج ہیں۔ زبدۃ المقامات کا بیان آگرے کے متعلق ہے۔ لیکن ابو الفضل تو غالباً ان دنوں فتح پور سیکری میں تھا۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے بہت دور نہیں۔ اس لیے عمومی طور پر آگرے کا نام لیا گیا۔ لیکن زیادہ الجھن

ابو الفیض فیضی کی تفسیر کے متعلق ہے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس دونوں میں حضرت مجدد کی شرکت کا ذکر ہے۔ یہ تفسیر ۱۰۲۰ھ میں لاہور میں ختم ہوئی۔ اکبر اور اس کے ساتھ فیضی وغیرہ ۹۹۲ھ سے لاہور میں تھے۔ ان حالات میں فیضی کی تفسیر کے متعلق حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کے اندراجات قبول کرنے میں بعض الجھنیں ہیں، تاہم غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا ارشاد ہے۔ ”حضرت مجدد الف ثانی قدس... قریب ۲۰-۲۲ سال کی عمر میں آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ وہیں فیضی اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس لیے حضرت علیہ الرحمۃ نے برحسبہ ایک بے نقط عبارت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ تفسیر نظر ثانی کے بعد (بدیونی ص ۳۸۹) ۱۰۲۰ھ میں مکمل ہوئی۔“ تفسیر غیر منقوط کا آگرے میں شروع ہونا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ شاید زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اگرچہ حضرت مجدد آگرہ سے تشریف لے آئے، جس کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ اور وہ کافی دیر سرہند مقیم رہے۔ لیکن اس کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے (علمائے مشہد کے ۹۹۶ھ والے خط کے ہندوستان پہنچنے اور یہاں اس کے مضامین عام ہونے کے بعد) ”مجالس امرا و سلاطین“ میں شیعہ اہل علم سے بحث و مباحثہ کیا۔ فیضی کو تفسیر غیر منقوط میں مدد دی اور رسالہ رد و افض تحریر کیا۔

یہ صحیح ہے کہ محاصرہ تذکرہ نگار اس سفر لاہور کا ذکر نہیں کرتے، لیکن ان سے آپ کے تمام سفروں کا ذکر متوقع نہیں۔ مثلاً حضرت مجدد نے ایک مکتوب (دفتر اول شمار ۳۱۳) میں پرگنہ بنارس کے سفر کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بارے میں تذکرہ نگار بالکل خاموش ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں حضرت باقی باللہ کی وفات کے بعد کسی وقت حضرت مجدد کے سفر لاہور کا ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا بلکہ سوائے واقعہ گوالیار اور لشکر کی نظربندی کے، سرہند میں ہی قیام کی صراحت ہے، لیکن خواجہ خرد کی رباعیات و شرح رباعیات سے بتا چلتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کی خدمت میں تین مرتبہ بمقام سرہند اور ایک مرتبہ لاہور حاضر ہوئے۔ چونکہ خواجہ خرد اپنے والد کی وفات کے وقت دو سال کے تھے

اس لیے ظاہر ہے کہ لاہور کا سفر اس کے بہت بعد ہوا ہوگا اور وہاں حضرت مجدد کا قیام خاصہ طویل ہوگا کہ خواجہ خرد نے نزدیکی مقام سرہند میں ان کا انتظار کرنے کی بجائے لاہور حاضری دی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ نگاروں نے عمومی طور پر اکبر آباد سے دارالحکومت مراد لیا ہو۔ نہ ہی فتح پور سیکری کی وضاحت کی اور نہ ہی یہ خیال کیا کہ اکبر اور اس کے امرا ۹۹۴ھ سے ۹۹۵ھ تک لاہور میں مقیم تھے۔

اگر تلمذ میں یا اس کے جلد بعد کچھ عرصے کے لیے حضرت مجدد کا سفر لاہور تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف تفسیر بے نقط کے متعلق زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کے اندراجات بلکہ رسالہ رقد و افض کی بعض الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال یہ معاملہ قیاسی ہے۔ ممکن ہے۔ نئی شہادت یا مزید غور و خوض کی روشنی میں صورت حالات زیادہ صحت کے ساتھ واضح ہو جائے۔

شادی خانہ آبادی زبدۃ المقامات میں اس امر کی وضاحت ہے کہ جب حضرت مجدد کو اکبر آباد رہتے ایک مدت گزر گئی تو ان کے والد ماجد فرط محبت سے مجبور ہو کر بعد مسافت اور کبرسنی کے باوجود ان کے پاس پہنچے۔ اور حضرت مجدد نے وطن کو مراجعت فرمائی۔ اور بعد میں والد ماجد کی خدمت میں رہے۔

واپسی کے سفر کے متعلق مولانا احسان اللہ گورکھپوری سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی میں لکھتے ہیں:-

حضرت مجدد دعوے تک اکبر آباد میں رہے۔ آپ کے والد مخدوم عبدالاحد آئے اور اپنے ساتھ سرہند واپس لے گئے۔ واپسی پر شیخ سلطان ایک مختصر ہند کی روٹی سے حضرت مجدد کا عقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عقد کی بابت حضرت محمد مسلم سے شیخ سلطان کو جواب میں علم ہوا تھا۔ اس عقد سے حضرت مجدد کی مالی حالت بہت درست ہوئی اور ان کی مالی حالت میں علم ہوا تھا۔ اس عقد سے حضرت مجدد نے اپنے لیے سرہند میں بنوائی۔ (مر)

مولانا احسان اللہ کا بیان روضۃ القیومیہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو بیان واقعات میں محتاط نہیں۔ لیکن چونکہ مصنف خاندانی مجددیہ سے تھا، اس لیے اس کی کتاب خاندانی روایات کا ایک کارآمد ذخیرہ ہے۔ وہ اس شادی کا ذکر کر کے لکھتا ہے:- اس شادی کے بعد حضرت قیوم اول (حضرت مجدد الف ثانی) کے پاس ظاہری مال و دولت بکثرت ہو گیا۔ اپنے والد بزرگوار کی حویلی چھوڑ کر ایک نئی حویلی بنوائی۔ جہاں پر آج کل آنجناب کار و رضہ مبارک اور آنجناب کی اولاد کا محلہ ہے۔ حویلی کے قریب ہی ایک مسجد بنوائی۔ آپ کے دوسرے بھائی پرانی حویلی میں رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی اولاد کا لقب پرانی حویلی والے پڑ گیا۔ (مر ۶۸-۶۹)

حضرت مجدد کی زندگی میں اس شادی کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو آپ کی اہلیہ محترمہ کے درجہ عالی کی بنا پر دوسرے ان کے والد شیخ سلطان کی وجہ سے جو ایک ممتاز عالم، ادیب، اور حاکم علاقہ تھے۔ اکبر سے قریب رہنے کے باوجود اس کی مذہبی پالسی کے سخت مخالفت تھے۔ اور قرین قیاس نہیں کہ ان کے خیالات اور واقعات زندگی کا ذہن اور قابل داماد پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

حضرت مجدد کی شادی کی تاریخ نہیں ملتی۔ لیکن آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صادق کی جو چوبیس برس کی عمر میں وفات پانگئے، تاریخ ولادت سنہ ۹۹۹ھ سے پہلے کسی اولاد کا ذکر نہیں ملتا۔ قرین قیاس ہے کہ شادی اور اکبر آباد سے واپسی کا زمانہ دسویں صدی ہجری کے آخری سال ۹۹۹ھ سے بہت پہلے نہ ہوگا۔

حاجی سلطان تھانیسری روضۃ القیومیہ میں شیخ سلطان کے متعلق عجیب گل افشائیاں ہوتی ہیں۔ ان کے حالات زندگی کو الف لیلة کے قصے بنا دیے گئے ہیں حالانکہ ان بیانات کے پس پشت حقیقت کا ایک عنصر موجود ہے جو خود اتنا دلچسپ ہے کہ اگر تاریخی کتب سے ہی صحیح حالات کو جمع کر دیا جائے تو ایک غیر معمولی شخصیت کا عبرتناک مرقع تیار ہوتا ہے۔

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان کو اکبر کے ہاں بڑا قرب و اقرب حاصل تھا۔

بادشاہ نے ان سے کہا: تم ہمارے لیے قرآن لکھو۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پوچھتے پر کہا کہ آسمان سے جبریل تمھارے لیے قرآن شریف لائے تو میں بھی لکھوں۔ بادشاہ نے شرمندہ ہو کر انھیں اپنے ہاں سے دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور لاہور اور دہلی کے درمیانی علاقے کی حکومت ان کے سپرد کی۔ وہ وہاں پہنچے تو سرکاری لگان علما و فقرا میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ بارہ برس تک یہی کیا۔ بادشاہ کو ایک پیسا نہ بھیجا۔ جب وہ کسی تقریب سے ادھر سے گزرا اور بارہ سالہ خراج کی نسبت پوچھا تو شیخ صاحب نے کہا: تو مُرتد ہو گیا ہے۔ اور مُرتد کا مال اڑانا جائز ہے۔ اس لیے میں نے اسے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ یہ کہہ کر بغل سے ایک پتھر نکال کر بادشاہ کے چہرہ پر ایسا تاک کر مارا کہ پیشانی سے خون بہنے لگا۔ شیخ صاحب کو سولی چڑھایا گیا۔ (ص ۳۶)

حقیقت حال یہ ہے کہ شیخ سلطان جو تھانیس کے رہنے والے تھے اور کتب تاریخ میں حاجی سلطان تھانیسری کے نام سے معروف ہیں۔ ایک عالم فاضل بزرگ تھے۔ (علوم نقلیہ را خوب و رزیدہ) آج وزارت سے مشرف ہوئے۔ مقاربت شاہی میں رہے۔ چار سال تک مہاجھارت کے ترجمے پر جو رزم نامہ کے نام سے تیار ہوا، مامور رہے۔ ابوالفضل اور بدایونی کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی۔ اور بدایونی کے وہ دلی خیر خواہ تھے۔ چنانچہ جب بدایونی مخدوم الملک سے ان کے زمانہ اقتدار میں ملنے گیا تو ابوالفضل اور شیخ سلطان اس کے ساتھ تھے۔ بدایونی کی مخدوم سے روضۃ الاحباب کے متعلق تاثر نگوار بحث شروع ہو گئی تو وہ اشاروں سے بدایونی کو منع کرتے رہے کہ احتیاط کرے اور سمجھ سے کام لے۔ یہ ابتدائی ایام کا واقعہ ہے۔ جب ابوالفضل دربار میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن اسے کوئی منصب نہ ملا تھا۔

شیخ سلطان سے بادشاہ کی ناچاقی اس وقت شروع ہوئی جب تھانیس کے ہندو نے ان کے خلاف گاوکشی کی شکایت کی۔ انھیں بھکڑ جلا وطن کر دیا گیا۔ اتفاقاً خانقاہ اس علاقے کی حکومت پر مامور ہوا۔ وہ اہل علم کا ہوا خواہ تھا۔ شیخ سلطان سے

بڑے التفات سے پیش آیا۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور فتح سندھ کے بعد انھیں اپنے ساتھ واپس لایا۔ شیخ محض طور پر اپنے وطن چلے گئے۔ لیکن خانخاناں نے دکن سے ان کی سفارش کی۔ اور جلا وطنی کے حکم کی تینخ کی درخواست کی۔ یہ سفارش منظور ہوئی۔ شیخ سلطان کا کام بن گیا۔ بادشاہ نے غائبانہ حکم دیا کہ انھیں تھانیس وکرنال کا کروڑی بنا دیا جائے۔ چنانچہ جب بدایونی نے اپنی تاریخ لکھی (جس سے یہ حالات ماخوذ ہیں)۔ اس وقت وہ اس خدمت پر مامور تھے۔

شیخ سلطان کا عتاب شاہی کے بعد تھانیس کا کروڑی ہو جانا حیرت انگیز تھا۔ بدایونی نے بھی ایک عربی شعر درج کر کے (کسی قدر شک کے ساتھ) اس امر کا اظہار کیا ہے کہ بسا اوقات عنایت الہی سے اس طرح کام بن جاتے ہیں کہ عقل ان کے سمجھنے میں حیران رہتی ہے۔ لیکن بالآخر یہی تقرر ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تھانیس ہندوؤں کا ایک مقدس مقام اور ان کی حیثیت کا ایک گڑھ تھا۔ ان لوگوں سے شیخ کی پہلے بھی کشمکش ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ بھکڑ جلا وطن ہوئے۔ یہ کشمکش پھر تازہ ہو گئی۔ اور اس دفعہ ان کے دشمنوں کا وار بڑا کاری تھا۔

اکبر ۱۵۹۸ء کے آخر میں لاہور کے طویل قیام کے بعد جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کوکین شاہی تھانیس میں مقیم ہوا تو لوگوں (مقامی ہندوؤں؟) نے شیخ کے ظلم و ستم اور خلعت آزاری کی شکایت کی اور بادشاہ کو اس کا قائل کر دیا۔ اکبر ان دنوں ان کروڑیوں کے ساتھ جن کے خلاف شکایات ثابت ہوتی تھیں۔ خاص طور پر سختی کر رہا تھا۔ اس نے سزائے موت کا حکم دیا۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۵۹۹ء کو شیخ سلطان کو بھانسی دی گئی۔

۱۵۔ اس سے چند مہینے پہلے جب اکبر کشمیر سے واپس آ رہا تھا تو اورنگ (کنجاہ) کی رعایا نے محمد بیگ کروڑی کے ظلم و ستم کی فریاد کی۔ وہیں اس ستم پیشہ کے گلے پر چھری پھر ولدی تاکہ لالہ حکم عبرت پکڑیں۔ (خلاصۃ التواریخ ص ۵۲۶)

اس سلسلے میں اکبر نامہ میں حسب ذیل اندراج ہے :-

دریں روز شیخ سلطان راز خلق کشیدند۔ درگروہ حمامہ داراں مے زلیست۔
آرزوئے عمل گزاری اور کالیوہ ساخت۔ تھانیر (کہ بنگاہ او بود) بدو سپردند۔
از بدستی دنیا کہیں ہارا تازہ بر ساخت۔ و بہ جان گزالی نیکوای برخاست۔ چون از خدا
را بدین شہر گزار شد۔ و بختے ستم گاری او خاطر نشین گشت۔ بسزائے کردار خود رسید۔

(اکبر نامہ - جلد سوم ص ۷۸۸)

اقبال نامہ جہانگیری میں اس سانچہ کا ذکر بدین الفاظ ہے :-

چوں موبد اقبال بنو اجمی تھانیر رسید۔ خلق انبوہ از بر دے سلطان کردی آنجا
داد خواہ شدند۔ و بعد از تحقیق بطور پیوست کہ دریں ملک قظلم و بیداد ازو بفعل
آمد۔ حکم شد کہ ہماں جا از خلق بر کشند۔ کہ عبرت دیگران شود۔

(اقبال نامہ جہانگیری (نو کشور) جلد دوم ص ۴۵۹)

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان محاصل شاہی کو فقرا و مساکین میں
بانٹ دیتے تھے۔ ممکن ہے۔ اس میں صداقت کا کوئی عنصر ہو۔ شیخ صاحب کی سخاوت
کا تذکرہ نگار بالفراحت ذکر کرتے ہیں۔ حضرات القدس میں انھیں "عالم و فاضل اور پرہیزگار
و سخی بزرگ" (ص ۲۹) کہا گیا ہے لیکن ابو الفضل کے الفاظ "کہن کین ہا را تازہ ساخت"
کو بدایونی کے بیان کی روشنی میں دیکھیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ پُرانے کاؤ کشتی والے
جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ شاید شیخ نے اپنے قدیمی دشمنوں کے خلاف کوئی قدم
اٹھایا ہو۔ جن کے طرفدار ہندوؤں نے موقع مل جانے پر اکٹھے ہو کر بادشاہ سے
شکایت کی۔

واقعہ کی جزئیات پوری طرح واضح نہیں، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ سلطان کا
کرنیک انجام ایسا نہ تھا کہ اس سے ان کے اقربا کو (جن میں ان کی صاحبزادی اور
حضرت مجدد الف ثانی خود تھے) اکبر یا اس کی پالیسی یا ہنود سے شکایت نہ ہوتی اور
حقیقت یہ ہے کہ اس سانچہ نے اکبر کے احکام اور ہندوؤں کے اثر کا مسئلہ ایک

ایسی بھیانک صورت میں پیش کر دیا جس کا پورا اندازہ دار الحکومت میں نہ ہو سکتا تھا۔
شیخ سلطان کا نقطہ نظر دکھانے کے لیے ہم ان کے حالات کو ان کی وفات تک
لے آئے ہیں، لیکن اس سے پہلے انھوں نے بڑی شان کی زندگی بسر کی تھی۔ وہ
برہمنوں ایک اہم علاقے کے کروڑی رہے جو اس زمانے میں بڑے رتبہ اور اقتدار کا
عہدہ تھا۔ علمی اور ادبی حلقوں میں بھی ان کا اپنا مقام تھا۔ اہل دربار سے ان کے
پُرانے مراسم تھے۔ قرین قیاس ہے کہ ان سے قریبی تعلق قائم ہونے سے حضرت
مجدد کا حلقہ اثر بھی وسیع تر ہو گیا ہوگا۔

اس سے بھی اہم معاملہ نقطہ نظر کا ہے۔ معاصرانہ مسائل پر حضرت مجدد کا
جوزاویہ نگاہ شروع سے تھا۔ وہ اثبات النبوت سے واضح ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ
رؤیہ و افق سے کریں تو اندازہ بیان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ اثبات النبوت
کا طرز اظہار عالمانہ بلکہ محققانہ ہے۔ دوسرے رسالے میں بھی علمیت کی کمی نہیں۔
لیکن لمحے میں ایک نئی گرمی اور تیزی ہے۔ "رگ فاروقیم" کی جو ترکیب پہلی مرتبہ اس
رسالے میں استعمال ہوئی ہے وہ اس کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس رگ فاروقیم سے
جیسا کہ ان کے واقعات زندگی گواہ ہیں، شیخ سلطان کو بھی وافر حصہ ملا تھا۔ اور کیا
یہ خیال بے جا ہے کہ ان کے ساتھ ربط و ضبط بڑھنے اور ان کے خیالات و حاصلات
جاننے سے حضرت مجدد کی شخصیت کے اس پہلو کو تقویت پہنچی؟

شیخ سلطان ایک سخی انسان تھے۔ اپنے پسماندگان کے لیے انھوں نے بہت کچھ
نہ چھوڑا۔ (ممکن ہے) جائداد ضبط ہو گئی ہو۔ جیسا کہ معتبور کروڑیوں کے ساتھ اکثر
ہوتا تھا۔ حضرت مجدد کا ایک بالکل ابتدائی عربی خط ہے۔ خواجہ جہاں کے نام۔
اس میں غالباً شیخ کے بیٹوں کا ذکر ہے۔ "بقیہ مضمون یہ ہے کہ شیخ سلطان مرحوم کے
دونوں بیٹوں کے لیے گزارہ و معیشت کی بہت تنگی و ناچاری ہے۔ اس واسطے
آنجناب سے التماس ہے کہ ان کی ہر طرح مدد و اعانت کریں۔ کیونکہ آپ اس
بات کے لائق ہیں۔" (دفتر اول - مکتوب ۲۵)۔

شیخ سلطان کے ایک بھائی تھے، شیخ زکریا۔ (حضرات القدس ص ۲۴) حضرت مجدد کے مکتوبات میں کسی شیخ زکریا کا بار بار ذکر ہے، جو کسی پرگنہ کے کروڑی تھے۔ ان کے حضرت مجدد پر بہت حقوق ہوں گے۔ کیونکہ ایک نہیں، تین مکتوبات ان کی سفارش اور حاجت براری کے لیے لکھے گئے۔ اور شیخ زکریا یہ توقع کرتے تھے کہ حضرت مجدد ان کی خاطر بعد مسافت کے باوجود (شانی) شکر میں جا کر ان کی مخلصی کے لیے کوشش کریں۔ (دفتر اول مکتوب ۱۷) کیا یہ شیخ زکریا، شیخ سلطان مرحوم کے بھائی نہ تھے؟

معلوم ہوتا ہے۔ شیخ زکریا کو عہدہ شیخ فرید کی سفارش سے ملا تھا۔ پہلے سفارشی خط میں انھیں لکھا ہے۔ ”ہیچناں کہ ایشان را نواخته اند۔ تا آخر دستگیری فوائد۔ از گراگان حوادث محفوظ دارند۔“ (دفتر اول مکتوب ۱۳)۔ دوسرے خط میں شیخ فرید کو لکھا ہے کہ نئے دیوان پر بھی یہ ظاہر کر دیا جائے کہ شیخ زکریا آپ کے آدمی ہیں۔ تہ دیوان جدید نیز ظاہر شود کہ ایشان از خادمان آں درگاہ عالی اند۔“ (دفتر اول مکتوب ۱۵) حاجی سلطان تھانیسری کے حالات کی نشان دہی میں بدایونی سے بیش بہا مدد ملتی ہے لیکن اس سے دو ایک الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ خانخاناں نے ”بعد فتح ولایت آسیر و برہان پور“ حاجی صاحب کے متعلق ایک سفارشی عرضداشت بھیجی۔ اس سے عتاب شاہی دور ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے انھیں کروڑی مقرر کیا لیکن اگلی فوجیں ۲۵ رمضان ۱۰۰۸ھ کو برہان پور میں داخل ہوئیں اور اکبر نے قلعہ آسیر ۲۲ رجب ۱۰۰۸ھ میں اس وقت فتح کیا جب حاجی سلطان کو پھانسی دی جا چکی تھی۔

بدایونی کے بیان میں ایک الجھن یہ ہے کہ عام خیال کے مطابق اس نے ۱۰۰۸ھ تک کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ اندازہ دوسری جلد کے معلق جس میں سیاسی حالات اور اکبری احکام کا خلاصہ ہے، صحیح ہے لیکن شاید تیسری جلد کا ایک حصہ بعد میں لکھا گیا۔ اور بہرکیت چونکہ بدایونی ۱۰۰۸ھ تک نہ رہا، لہذا اس نے کتب کے بعد کو اضافے کیے ہوں۔

بدایونی کو اس معاملے میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اسیر اور برہان پور کے قلعوں کا نہیں۔ ”ولایت“ کا ذکر کیا ہے، لیکن فتح سندھ کے بعد پہلی مرتبہ خانخاناں دکن کو ۱۰۰۸ھ میں گیا۔ اور حاجی سلطان کی صاحبزادی کی شادی ۱۰۰۹ھ کے آخر تک ہو چکی ہوگی۔ شاید یہ شادی اس وقت ہوئی، جب حاجی سلطان بھکر سے مخفی طور پر واپس آچکے تھے، لیکن ابھی کروڑی مقرر نہیں ہوئے تھے۔

رسالہ رد و افض [شادی کے بعد کچھ عرصہ حضرت مجدد الف ثانی سرہند میں مقیم رہے۔ جہاں ۱۰۰۸ھ میں آپ کے بڑے صاحبزادے

خواجہ محمد صادق پیدا ہوئے۔ (ان کا سال وفات زبدۃ المقامات میں درج ہے۔ تاریخ ولادت نہیں۔ لیکن چونکہ تاریخ وفات ۹ ربيع الاول ۱۰۰۸ھ ہے، جب آپ کی عمر چوبیس سال سے کسی قدر زیادہ تھی۔ اس لیے تاریخ ولادت ۱۰۰۸ھ کے آخر میں ہوگی۔)

ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ شاید حضرت مجدد کا رسالہ رد و افض شادی کے بعد کی تصنیف اور غالباً سفر لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا۔ جب عبداللہ خاں ازبک نے ۱۰۰۸-۱۰۰۹ھ میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی، کہ ہندوستان میں کئی شیعہ علمائے مشہد کے مضامین دہراتے اور امرا و سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔ حضرت مجدد ان محفلوں میں ان کی تردید کرتے، لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپرد قلم ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:-

بعضہ از طلبہ شیعہ کہ مترددایں حدود ہند۔ بایں مقدمات افتخار و مہاباات منبرند و در مجالس امرا و سلاطین ایں مغالطات شہرت می دادند۔ و ایں تحقیر در ہر مجلس و محکمہ مشافہہ بمقامات محقرہ و منقرہ رد آنہا می کرد۔ و غلطہای صریحہ ایشان را اطلاع

می داد۔ اناحیت اسلام و رنگ فاروقیم بای قدر و الزام کفایت نمی کرد و خوشتر
سینہ بے کینہ تشقی نیافت۔ و بخاطر فائز قرار یافت کہ اخبار مفاسد ایشان تازانے کہ
در قید کما بت نہ آید۔۔۔۔۔ نفع عام نہ بخشد۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطہ نظر ہے جس سے مکتوباتِ امام
ربانی اور مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر
ہیں۔ اور واجب القتل۔ یہ رسالہ اثباتِ نبوت اور رسالہ تہلیلہ کے برعکس جو
عربی زبان میں ہیں فارسی میں لکھا گیا۔ لیکن اپنے نقطہ نظر کی تائید میں کثرتِ روایات
واحادیث دی ہیں جو عربی میں ہیں۔

رسالہ ردِّ واقف مکتوبات کے نو کشورِ ایدلش کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔
لیکن مطبوعہ رسالہ اور اس قلمی نسخہ میں جو خاتقاہ کنڈیاں شریف میں۔۔۔۔۔ قدر فرق ہے
حضرت مجدد الف ثانی کا ایک رسالہ جو انھوں نے خواجہ باقی باللہ
کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا۔ اور اب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ
صاحب کی بدولت پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا۔ رسالہ تہلیلہ ہے۔ میں بائیس صفحے کا
چھوٹی تقطیع کا مختصر رسالہ ہے جس کے ساتھ حافظ رشید احمد صاحب ارشد کا
سلیس، جامع اور دورِ ترجمہ بھی شامل ہے۔

چونکہ اس میں حضرت مجدد نے ”شیخی و والدی“ (مخدوم عبدالاحد) کے ساتھ
”قدس سرہ“ لکھا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے استنباط کیا ہے کہ
یہ رسالہ مخدوم صاحب کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ انھوں نے ”محض اندازے سے
عام اور نفسِ مضمون کی مناسبت سے اس کا تاریخی نام ”معارف لالہ اللہ محمد رسول اللہ“
(سنہ ۱۰۸۰ھ) رکھا ہے۔ مولوی محبوب الہی مرتب رسالہ ”تجددِ مکتبہ“ کے بعد والے استنباط
سے متفق ہیں، لیکن اس خیال سے کہ اس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ان رسائل کے ضمن میں
ہوا ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری (ربیع الآخر سنہ ۱۰۸۰ھ) سے
پہلے لکھے گئے۔ اس لیے انھوں نے اس کا زبان تصنیف سنہ ۱۰۸۰ھ کا آخر یا سنہ ۱۰۸۱ھ کا

آغاز قرار دیا ہے۔

ہم زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کی نسبت یہ رائے درج کر چکے ہیں۔ کہ
ابتدائی آیام کے متعلق ان کے اندراجات کو تخمینہ اور عمومی سمجھنا چاہیے۔ لیکن مولوی صاحب
کا اندازہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ رسالے میں
حضراتِ چشت مثلاً مخدوم عبدالاحد اور شیخ عبدالقدوس (۹۰۰ھ) اور وحدت الوجودی خیال
کے صوفیہ (مثلاً شیخ ابن العربی اور شیخ صدر الدین قزوینی) کی تصانیف سے طویل اقتباسات
ہیں، لیکن بزرگانِ نقشبندیہ میں سے کسی کا ذکر نہیں۔ حضرت خواجہ سے بیعت کے بعد
حضرت مجدد کی ابتدائی تصانیف میں ان کا ذکر اکثر آجاتا ہے۔ وہ بھی نہیں۔ اس لیے
یہ خیال کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری سے پہلے لکھا گیا، مستبعد نہیں۔
رسالہ تہلیلہ میں کلمہ طیبہ کے متعلق مختلف امور سے بحث ہے۔ ابتداً
کی بحث سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق کے
متعلق نحوی علما اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ پھر لفظ اللہ کے
لغات وحدانیت الہی کی دلائل اور کلمہ طیبہ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ اس کے
بعد ایک طویل اندراج ہے جس کا عنوان حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے
”توحید صوفیا“ اور مولوی محبوب الہی صاحب نے ”توحید العوام و توحید الخواص“ دیا ہے۔
پھر ایک مختصر اندراج میں وجودِ باری کے عین ذات ہونے میں فلاسفہ کے دلائل دیے
ہیں۔ اور اس معاملے میں فلاسفہ اور صوفیائے کرام کے اتفاق رائے کا ذکر ہے آخری
حصہ (بلکہ باب) کلمہ طیبہ کے جوڑ و ثانی (یعنی رسالتِ محمدیہ) کے متعلق ہے اس میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، معجزات اور اخلاقِ کریمہ و اوصافِ عظیمہ کا

۱۰ مطبوعہ رسالے میں ”الشیخ العارف عبداللہ القدوس الحنفی“ لکھا ہے۔ اور ان کے فارسی
مکتوبات سے اقتباس دیا ہے۔ چونکہ شیخ عبدالقدوس لنگوہی کے فارسی مکتوبات مشہور ہیں۔ اس لیے
ہمارا خیال ہے کہ شاید ان کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ مکتوبات سے نام میں ذرا تبدیلی ہو گئی۔

ذکر ہے۔

اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلہ ایک ہی صاحب نظر کا عطیہ ہیں۔ ایک ہی دور کے متعلق ہیں۔ رسالہ تہلیلہ کے آخری حصہ کا تو موضوع بھی وہی ہے جو اثبات النبوت کے ایک جزو کا ہے۔ چنانچہ اخلاق نبوی کے متعلق بعض عبارتیں (خفیف اختلافات کے ساتھ) رسالہ تہلیلہ میں وہی ہیں جو اثبات النبوت میں تھیں۔

اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلہ میں کئی چیزیں مشترک ہیں، لیکن اگر ان کا غور سے مطالعہ کریں تو ان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ یہ دونوں رسالے ایک بلند پایہ عالم اور سچے محب اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور دونوں کی سطح بہت بلند ہے۔ لیکن اثبات النبوت میں صوفیانہ رنگ بہت ہلکا ہے۔ اور رسالہ تہلیلہ میں بڑا نمایاں ہے۔ امتیاز کی ایک وجہ تو اختلاف مباحث ہے۔ اور دوسری یہ کہ اثبات النبوت میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف تھا، جو عقل کے ترجمان بنتے تھے۔ اس لیے حوالے بھی زیادہ تر ان مفکرین و علما کے ہیں جنہیں وہ مانتے تھے (مثلاً جالینوس، امام رازی، امام غزالی، معتزلہ میں سے جاحظ اور النظام)۔ رسالہ تہلیلہ عام مسلمانوں کے لیے لکھا گیا۔ اس لیے اس میں انداز بیان مختلف اختیار کیا گیا۔ یہ دونوں اسباب امتیاز تو مسلم ہیں، لیکن دوسرے رسالے میں صوفیانہ عنصر کا اس شدت سے اضافہ ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا ہیولے اس زمانے میں تیار ہوا، جب تکمیل علوم اور درس و تدریس علوم ظاہرہ کے بعد (شاید اثبات النبوت زمان درس و تدریس کی یادگار ہے۔ زبدۃ المقامات کے مطابق ابو الفضل سے نبوت کے متعلق بحث اس زمانے میں ہوئی تھی) آپ کو والد ماجد کی خدمت میں پھر سے زیادہ رہنے کا موقع

۱۔ مثلاً رسول اکرم کے احوال "قبل النبوت و حال الدعوت و بعد اتماہاتہ الفاظ مشترک ہیں، کے ضمن میں اثبات النبوت میں "اخلاق العظیم و احکام الحکیمہ کا ذکر ہے لیکن رسالہ تہلیلہ میں "اخلاق الکریۃ و احکام الحکیمہ" لکھا ہے۔ یہ تغیر صوتی اعتبار سے بھی بہتر ہے اور معنی لحاظ سے بھی زیادہ روحانی سر بلندی کا مظہر ہے۔

ملا اور تصوف کی منتہی نہ تصانیف کا گہرا مطالعہ ہوا۔

رسالہ تہلیلہ میں نہ صرف صوفیائے کبار کی مشہور تصانیف سے طویل اقتباسات ہیں بلکہ صوفیائے کرام اور قطب و اوتاد کے متعلق آپ نے اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے، جو شیخ محی الدین ابن عربی کا تھا۔ متعلقہ عبارت کا حسب ذیل ترجمہ حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے کیا ہے:-

وہ صوفیائے کرام جو خدا پرست، صاحب کشف اور شمع نبوت نور حاصل کرتے ہیں

زمین ان کے سہارے قائم ہے۔ اور انہیں کے فیض و برکات سے اہل زمین پر نزول

رحمت ہوتا ہے۔ انہیں کی وجہ سے لوگوں پر بارش برسانی جاتی ہے۔ اور انہیں

کی بدولت ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ (رسالہ تہلیلہ ص ۲۷)

رسالہ تہلیلہ کی تالیف کے بعد حضرت مجدد نے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔

جس میں شرع کی پابندی ہے۔ اس بیعت کے بعد آپ نے وحدت الشہود کی توضیح

کی۔ اور ابن العربی سے بعض باتوں میں اختلاف کیا۔ لیکن ابتدائی اثرات کو جڑ سے اکھیڑ

دینا آسان نہیں ہوتا۔ ابن العربی نے قطب۔ ابدال۔ اوتاد کا جو باطنی نظام پیش کیا

تھا۔ اور جس کا پر تو رسالہ تہلیلہ کی مندرجہ بالا عبارت میں نظر آتا ہے، اس کا اثر آپ پر

تمام عمر رہا۔ بلکہ آپ نے اس میں اضافہ کر کے (اور قرآن مجید کی ایک آیت کی تائید لکھے

قیومیت کا نظریہ پیش کیا۔ جسے بعد والوں نے بہت وسعت دی۔ اور بے حد غلو کیا۔ یہ

نظریہ فی الحقیقت ابن العربی کے ان اثرات کا حاصل ہے، جن کا بیج مجدد صاحب کی

صحبت اور تعلیم باطنی کے زمانے میں بویا گیا۔

کننہ کا سال، حضرت مجدد

حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت

اس سال ۲ جمادی الآخر کو آپ کے خسر شیخ سلطان کے حسرت ناک انجام کا سانحہ

پیش آیا۔ پچیس ۲۵ روز بعد، یعنی ۲۷ جمادی الآخر کننہ کو (روضۃ القیومیہ ص ۳۳)

آپ کے والد ماجد جو آپ کو بیحد عزیز تھے وفات پا گئے۔ ان دونوں سانحوں کا آپ کو بڑا صدمہ ہوا

ہوگا۔ لیکن الفرح بعد الشدّت بسا اوقات رنج و الم ہی رحمت الہی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اگلے ہی سال خوبی قسمت آپ کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں لے گئی۔ جن کے فیض صحبت سے آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی خدمت میں آپ اواخر ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۹ یحییٰ نومبر ۱۸۸۲ء کے وسط میں پہنچے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ والد کی وفات کے بعد حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں دہلی تھی۔ جب آپ وہاں پہنچے تو مولانا حسن کشمیری کے ایک شاگرد نے جو آپ کے دوستوں اور حضرت خواجہ کے مخلصوں میں سے تھے، آپ سے حضرت خواجہ کے کمالات کا اظہار کر کے ملاقات کی تحریک کی اور آپ ان کے ہمراہ خدمت عالیہ میں پہنچے۔ حضرت خواجہ صاحب کی یہ عادت نہ تھی کہ کسی سے کوئی اپنی خواہش ظاہر فرماتے۔ البتہ آپ سے حضرت خواجہ صاحب نے خلاف عادت خانقاہ شریف میں چند یوم قیام کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ نے ایک ہفتہ قیام کا وعدہ کیا، لیکن رفتہ رفتہ دو ڈھائی مہینے کی نوبت پہنچ گئی اور رجب کا مہینا آگیا۔ لیکن اس سے بہت پہلے آثار تصرف و شمش حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کے نمودار ہو چکے تھے۔ اور آپ پر شوقِ انابت و اخذ طریقہ خواجگان علیہ الرحمۃ نے غلبہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ سے بیعت کے لیے درخواست کی: بحج و عرض کرنے کے بلا استخارہ (خلاف عادت)

۱۔ مباد و مباد (رسائل مجددیہ ص ۶۷) ۲۔ حضرت مجدد نے ایک خط میں ملا حسن کشمیری کا زوردار غفلتوں میں شکریہ ادا کیا ہے (دختر اقل ص ۲۹) ۳۔ مباد و مباد ۴۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ محمد باعیات و شرح رباعیات میں لکھتے ہیں: "حضرت مجددی قبلہ گاہی شیخ احمد دروہی بخدمت حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ رسیدند۔ و در اندک مدت فتحنامہ عظیم رونوہ صفر نمودند۔ اقل نفی و اثبات تعلیم کردند۔ چندان مد گرفت۔ بعد از سه چهارم روز بآستانہ حضرت خواجہ قطب الدین تشریف بردہ بردند۔ آنجا طلبیدند۔ و ذکر اسم ذات تلقین کردند۔ فی الفور اثر عظیم پیدا شد۔"

حضرت خواجہ نے آپ کو خلوت میں طلب کر کے ذکر قلبی تعلیم فرمایا۔ آپ کا دل فوراً ذکر ہو گیا۔ اور آرام و محلاوت ذکر قلبی و التناذ تمام حاصل ہوا۔ یوماً فیوماً ترقیات عالیہ و عروجات متعالیہ ظاہر ہوتے رہے۔ حضرت خواجہ صاحب کی توجہ سے اور اپنی استعداد عالی کی بدولت آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں مقوڑے ہی عرصے میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت حوصلہ اور روحانی استعداد نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنے خطوں میں آپ کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"شیخ احمد نام مرویت از سر ہند کثیر العلم و قوی العمل۔ روزے چند فقیر با او شست و برخواست کرد عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود۔ بآں ماند کہ چو رفت شود کہ عالمہ از روشن گردید۔"

حضرت خواجہ باقی باللہ آپ کا بڑا پاس کرتے۔ آپ سن و سال میں عین ان کے ہم عمر تھے۔ علوم ظاہری میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور تقریر و تحریر میں آپ کو ایک غیر معمولی ملکہ تھا۔ لیکن بالغ نظر مرشد نے آپ کی غلطیاں جتانے سے بھی گریز کیا۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ مثلاً ایک زمانے میں آپ پر حد الوجود کا رنگ غالب تھا۔ ان دنوں آپ نے ایک رباعی لکھی:-

اے درینا کس شریعت ملت آبائی است ملت ما کافری و ملت ترسانی است
کفر و ایمان ہر دو زلف روئے آن نیایی است کفر و ایمان ہر دو اندر راہ مایکائی است
تو مرشد نے فوراً انھیں ٹوکا اور ایک خط میں اس پر سختی سے تنبیہ کی فرماتے ہیں (ترجمہ)
"اور وہ رباعی ملحدانہ جو آپ نے لکھی تھی۔ بہت ہی بے بھی اور کم عقل ہے۔ ایسی رباعی کے کہنے والا ہرگز مقبول نہیں ہو سکتا۔ ادب کو نگاہ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معنی اور غیرت مند ہے۔"

اسی طرح حضرت کشفی واقعات اور مقامات عروج کے اظہار کا مسئلہ ہے۔ ان کے متعلق بھی حضرت خواجہ باقی باللہ کی مسلسل ہدایت تھی کہ ان کے بارے میں اخفا سے کام لیا جائے۔ مثلاً جب حضرت مجدد نے ایک خط (مکتوب ہفتم) میں اپنے مقامات عروج کا ذکر کیا تو حضرت خواجہ نے ایک طویل خط (رقعہ ہفتم) میں ان کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی اور آخر میں لکھا:۔ (ترجمہ)

”... ہمارا کو محفوظ رکھیں یعنی حضرت ختم الخلاف کے ساتھ اس مقامات کی جو خصوصیت ہے وہ ظاہر نہ کریں۔ ایسا نہ ہو۔ لوگ غلطی میں پڑ جائیں اور ان کے عقیدے بگڑ جائیں۔

حضرت خواجہ کے موقوفات میں بھی لکھا ہے:۔ (ترجمہ)

ایک دن میاں شیخ احمد سرہندی کو جو حضور کے جلیل القدر اور ممتاز رفقا میں سے تھے سرہند کی طرف رخصت کر رہے تھے۔ انھیں فرمایا کہ نسبت کو حتی المقدور پوشیدہ رکھنا صبح کی نماز سے لے کر شراق تک چائے نماز پر بیٹھنا لیکن حلقہ نہ کرنا۔ اس کے بعد علوم دینی کا درس دینا۔۔۔ اکثر اوقات تصحیح کتب اور مطالعہ میں مشغول رہنا۔ اگر سخن کا اتفاق ہو تو بطور علما کے کہنا۔ بطور صوفیاء کے نہیں اور اگر احیاناً بطور صوفیہ کچھ کہا جائے تو اجمال اور اغلاق کے ساتھ کہو۔ تاکہ جسے خطاب کرنا منظور ہو۔ وہی سمجھے اور دوسرا اس سے کوئی ایسی چیز جو اس کی لغزش کا باعث ہو۔ اخذ نہ کرے۔“

۱۷ ایک بزرگوار نے ان اقتباسات پر جو ہم نے حضرت خواجہ کے ارشادات سے دیے ہیں اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے:۔ ”اس کے بعد محترم صاحب نے نہیں معلوم کس مقصد سے وہ نصائح بھی درج کر دیے ہیں جو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمائی تھیں۔ اور جو اس سلسلے میں تقویت و ترقی کے لیے خصوصی طور پر کی جاتی ہیں۔“ گزارش ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات درج کرنے سے راقم السطور کا مقصد حقیقت حال کو پیش کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ حضرت خواجہ اور حضرت مجدد کے تعلقات کے متعلق متداول نقطہ نظر حقیقت سے کس قدر بعید ہے۔ اس نقطہ نظر کی ایک واضح مثال احسان اللہ صاحب گورکھپوری کی اس سوانح عمری حضرت مجدد و اہل خانہ میں ملتی ہے۔

[باقی صفحہ پر]

حضرت خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ جس چیز کو قابل اصلاح سمجھتے تھے، اس کی نشان دہی کی، لیکن آپ کے مراتب عالیہ کی دل کھول کر تعریف کی۔ پہلی مرتبہ حضرت مجدد دو ڈھائی مہینے دہلی مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ دو مرتبہ اور مرشد کی زندگی میں دہلی تشریف لائے۔ اب حضرت خواجہ کی عنایات آپ پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ جب آپ دوسری دفعہ دہلی تشریف لائے تو حضرت خواجہ نے نہ صرف خلعت خلافت عطا کر کے اجازت ارشاد عطا فرمائی بلکہ چند منتخب حضرات جن کی تعلیم و تربیت خاص طور پر منظور تھی، انھیں آپ کے سپرد کیا۔ اس وقت آپ کو اپنے کمال و تکمیل میں تردد تھا۔ حضرت خواجہ نے اپنی صفائی باطن سے اس تردد کو معلوم کر کے فرمایا کہ تردد نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے شیخ کے کمال میں تردد لازم آتا ہے۔ چنانچہ آپ سرہند شریف واپس پہنچے۔ اور طالبان راہ ہدایت کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ دہلی کا تیسرا سفر آپ نے حضرت خواجہ کے ایک خط سے متاثر ہو کر کیا۔ مرشد نے بڑی محبت و تپاک کا اظہار کیا۔ بسا مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۰)

جس کے متعلق خود محترم فرماتے ہیں ”حضرت مجدد کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے“ اور جس میں حضرت مجدد کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ بظاہر آپ کے پیروں پر درپردہ مرید تھے“ (مر ۷۹)

۱۸ غالباً دوسرا سفر رمضان سنہ ۱۰۱۱ ہجری (اپریل ۱۸۹۷ء) میں کیا گیا۔ حضرت خواجہ کے موقوفات کا مرتب لکھا ہے کہ اس نے دو تین مجالس (بابت یکم صفر۔ دوم صفر۔ ششم صفر سنہ ۱۰۱۱ء) کے ارشادات بغیر اجازت لکھ لیے تھے۔ لیکن جب انھیں حضرت خواجہ کو سنایا۔ تو انھوں نے منع کر دیا۔ لیکن کوئی آٹھ مہینے کے بعد قسمت نے یاد دہانی کی۔ ”یعنی حضرت شیخ احمد سرہندی جو حضور کے مقررین اور مقبولوں میں سے ہیں، کسی تقریب پر حاضر ہوئے اور دوبارہ اس ضروری کام کے قبول کرنے کی درخواست کی۔ شیخ کی سفارش سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ اس کے بعد ۱۱ رمضان سنہ ۱۰۱۱ء (اپریل ۱۸۹۷ء) کے واقعات درج ہیں۔

آپ کو سر حلقہ بنایا۔ ایک آدھ چھوڑ کر نئے طالبوں کی تعلیم و تربیت آپ کے سپرد کی۔ اور اپنے شیر خوار بیٹوں کو بلا کر اپنے عالی مرتبہ مرید سے توجہ دلائی۔ اور حضرت مجدد کے متعلق مختلف مواقع پر اتنے پرجوش فقرات مدحیہ کہے کہ ”احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے“ (زبدۃ المقامات)۔

لاہور ہجرت | اس ملاقات کے بعد آپ سرسند تشریف لے گئے۔ لیکن چند روز کے قیام کے بعد مرشد کے ایمان کے مطابق لاہور تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ کئی لوگ حلقہ عقیدت میں داخل ہوئے اور علما و فضلاء نے بھی آپ کی بڑی قدر کی، بالخصوص مولانا جمال تلوی جنہیں بدایونی ”اعلم العلماء“ کہتا ہے۔ اور جن سے غالباً آپ کا تعارف فیضی کی تفسیر نویسی کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ آپ کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کے شاگرد حیران، بلکہ محترض ہوتے۔ مولانا جمال نے ہی ان ملاقاتوں کے دوران مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق اپنے شبہات بیان کیے اور اس کے حل کی خواہش ظاہر کی حضرت مجدد نے اس وقت تو مختصراً ان کے کان میں چند کلمات کہے، لیکن پھر اس مسئلے پر تفصیل سے اپنے رسالوں اور مکتوبات میں لکھا۔ اور وحدت الوجود سے بالاحدیت الشہود کا مقام متعین کیا۔

حضرت مجدد کی لاہور پر خاص نگہ التفات تھی۔ اس زمانے میں اس شہر نے جو ابتدائی دور میں قبۃ الاسلام کہلاتا تھا، لیکن منگولوں کی تباہ کاریوں کے بعد، عرصہ تک تک نیم ویران حالت میں رہا، قلعہ اکبری اور دوسری عمارتوں کی تعمیر سے نئی رونق پائی تھی اور اگرہ اور سیکری کے مقابلے میں یہاں اسلامی اثرات زیادہ زور و جہاں پر تھے۔ قلعہ خاں جس نے اپنے زمانہ حکومت میں یہاں تقویت دین اور ترویج علوم اسلامی کی بڑی کوشش کی۔ اس وقت برسرِ اقتدار تھا۔ حضرت مجدد ایک خط میں

لے قلعہ خاں ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۵۱ھ تک حاکم پنجاب تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس عہدے پر مامور

جو خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد لیکن اکبر کی زندگی میں (دریں طور زمانہ) لکھا گیا اسے تحریر فرماتے ہیں۔

”در بلدہ معظمہ لاہور بہ وجود ایشان بسیار سے از احکام شرعیہ دریں طور زمانہ راجع پیدا کردہ است و تقویت دین و ترویج ملت و دلیل بقعہ حاصل گشتہ است و آن بلدہ نزد فقیر ہجو قلب ارشاد است نسبت بہ سائر بلاد ہندوستان۔ خیر و برکت آن بلدہ بہ جمیع بلاد ہندوستان ساریست۔ اگر آنجا ترویج دین است و در ہمہ جا نحوئے از روح متحقق است۔ حق سبحانہ تعالیٰ متوید و ناصر ایشان باد“ (دفتر اول مکتوب ۱۰۵۱ھ)

حضرت مجدد لاہور میں تھے۔ جب ۳ نومبر ۱۰۵۳ھ کو آپ کے مرشد نے وصال فرمایا۔ آپ فوراً دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ سرسند راستے میں تھا، لیکن آپ وہاں نہیں رُکے، بلکہ مکان کی شکل تک نہ دیکھی اور شبانہ روز چل کر دہلی پہنچے۔ اور مرشد کے مزار پر انوار کی زیارت کی۔

خانقاہ باقویہ | دہلی میں بدقسمتی سے آپ کے اپنے پیرو بھائیوں سے بعض اختلافات ہو گئے۔ شاید ان میں سے بعض کی محدود صلاحیتوں کی نسبت آپ نے مرشد کی زندگی میں ہی اظہار خیال کیا تھا۔ دفتر اول کے مکتوب سوم میں حضرت خواجہ باقی باللہ کو سرسند سے لکھتے ہیں:-

و دیگر بعضے از یاران آنجانی (دہلی) بطریق مقررین مناسبت ندارند۔ موافق حال آنها طریق ابرار است۔ فی الجملہ یقینے کہ حاصل کردہ اند۔ ہم غنیمت است بھماں طریق امر باید فرمود۔

ہر کسے را بہر کار سے ساختند

در تفصیل اسامی آنها جرات نمود۔ کہ از ایشان مخفی نخواہد بود۔ زیادہ گستاخی نمود۔

اس عبارت کا مفہوم یقینی نہیں، لیکن حضرت خواجہ کی وفات کے بعد جو اختلافات

ان کے دہلوی مریدوں اور حضرت مجدد میں رونما ہوئے، وہ واضح ہیں۔ ان پر تذکرہ نویسوں نے بہت حاشیے چڑھائے ہیں۔ لیکن اصل معتبر بیان حضرت مجدد کا اپنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خواجہ کے سب سے بڑے گزیدہ خلیفہ وہی تھے انکی شان میں مرشد نے جو تعریفی کلمات کہے اور محترمانہ برتاؤ رکھا۔ اس کا عشر عشر بھی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔ خواجہ خرد ربا عیات و شرح ربا عیات میں لکھتے ہیں: ”مے فرمودند کہ حضرت خواجہ جیو فرمودند کہ بر ما ظاہر شدہ است۔ کہ از شما (حضرت مجدد) سلسلہ ماباقی خواہد ماند“ لیکن حضرت مجدد زیادہ تر سرہند (بالا ہور) میں رہے۔ مرشد کی زندگی میں وہ فقط تین مرتبہ دہلی گئے۔ اس کے علاوہ جب حضرت خواجہ ماوراء النہر گئے تھے تو مریدوں کی دیکھ بھال شیخ الہ داد کے سپرد کر گئے تھے۔ اپنی بیماری کے دوران میں بھی انھوں نے شیخ الہ داد کے ذمے بعض خدمتیں کی تھیں۔ چنانچہ حضرت مجدد لکھتے ہیں:-

اخیری ملاقات کے وقت حضور قدس سرہ نے فقیر کو فرمایا تھا کہ تم تجویز کرو۔ کہ شیخ الہ داد ہماری طرف سے جا کر بعض طالبوں کو مشغولی یعنی ذکر کے لیے کہے۔ اور بعض کے احوال ہم تک پہنچائے۔ کیونکہ حضور میں بلانے اور ذکر بتلانے اور احوال پوچھنے کی طاقت اب ہم میں نہیں رہی۔

فقیر اس بارے میں بھی متردد تھا۔ لیکن ضروری معلوم ہوا تو فقیر نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ (دفتر اول۔ مکتوب ۳۲)

حضرت مجدد فرماتے تھے کہ جو خدمت شیخ الہ داد کو سپرد ہوئی تھی، وہ ”محض الٰہی پروری کی قسم سے ہے۔۔۔ یہ سفارت بھی حضور قدس سرہ کی زندگی تک مخصوص ہوگی۔ لیکن جو لوگ خانقاہ باقویہ میں مقیم تھے، ان کا خیال تھا کہ اس انتظام سے مستنبط ہوتا تھا۔ کہ حضرت خواجہ یہ مقام شیخ الہ داد کو سپرد کر گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف محض شخصی نہ تھا۔ بلکہ نقطہ نظر کا بھی تھا۔ خانقاہ والے حضرت خواجہ کے طریقے کو بغیر کسی کمی بیشی کے جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن حضرت مجدد کی نگاہ بلند تھی۔ وہ اس میں مزید تکمیل و ترقی کے قائل اور اس کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اسی خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں:-

”آپ نے لکھا تھا کہ پیر دستگیر خواجہ باقی باللہ صاحب کی نسبت باقی رہتی ہے

یعنی زیادتی اور نقصان قبول نہیں کرتی۔ میرے غلام! ہر فن کی تکمیل بہتے فکروں کے طے سے ہوتی ہے۔ جو نحو کہ سید یہ نے وضع کیا تھا۔ متاخرین کی فکروں نے اس کو دس گنا زیادہ کر دیا ہے۔ اس کا اصل حالت میں رہنا عین نقصان ہے۔ وہ نسبت جو حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ عبدالحق قدس سرہ کے زمانے میں نہ تھی۔ علیٰ ہذا القیاس

خاص کر ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہ اس نسبت کو کامل کرنے کے دیرپے رہتے تھے۔ اور اس کو (ابھی) تمام و کمال نہیں سمجھتے تھے۔ اگر زندگی وفا کرتی۔ خدا تعالیٰ کے ارادے سے، معلوم نہیں اس نسبت کو کہاں تک بے جا تے اس نسبت کے زیادہ ہونے میں کوشش نہ کرنا مناسب نہیں (دفتر اول۔ مکتوب ۳۳)

حضرت مجدد شیخ الہ داد کو اس اہم کام کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے دہلوی پیر بھائی اپنے خیال پر قائم رہے۔ لیکن حضرت مجدد نے حسب معمول بلند ہمتی سے کام لیا۔ ان اختلافات کو قطع تعلق کا باعث نہ ہونے دیا۔ اسی خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں:- ”سرہند کو اپنا گھر تصور فرمائیں۔ محبت کا حلاقہ اور پیر بھائی ہونے کی نسبت اس قسم کی نہیں ہے کہ ایسی عارضی باتوں سے ٹوٹ جائے“ چنانچہ خواجہ حسام الدین ان کی خط و کتابت آخر تک جاری رہی۔ شیخ تاج الدین سنبھلی سے بھی جو شاید جانشینی کے مسئلے میں پیش پیش تھے۔ آپ کا دل صاف ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ حجاز سے کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئے تو آپ نے بڑا محبت بھرا خط لکھا:- ”آپ نے قدم رنجہ فرمایا ہے تو جلدی تشریف لائیں، کیونکہ مشتاق مدت سے منتظر ہیں۔ اور بیت اللہ کی خبریں سننے کی آرزو رکھتے ہیں“

حضرت مجدد کے اپنے پیر بھائیوں سے جو شخصی اختلافات حضرت خواجہ کی وفات کے بعد پیدا ہو گئے تھے، وہ تو دفع ہو گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ و باقویہ سے کمی بیشی کے متعلق جو اصولی اختلاف تھا، وہ ختم نہ ہوا۔ اور حضرت مجدد اور خواجہ حسام الدین کے درمیان دوستانہ شکایت و تردید کے ایسے خطوط لکھے گئے۔

جن کی تہ میں یہی اصولی مسئلہ تھا۔ مثلاً مکتوبات امام ربانی کے دفتر اول میں بعد کا ایک خط ہے۔ (شمارہ ۲۲۹) جو خواجہ صاحب کے ”شبہات و تردیدات“ کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا۔ حضرت مجدد نے اپنے پیر بھائی کو یقین دلایا کہ میرا طریقہ وہی ہے جو حضرت خواجہ قدس سرہ کا تھا۔ روز مرہ اور شہست و برخواست میں اس طریق کے آداب و لوازم کی پوری رعایت کی جاتی ہے وغیرہ۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ حضرت مجدد کو ان کے پیر بھائیوں کے مولود سننے کی اطلاع موصول ہوئی تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا۔ اور جب خواجہ حسام الدین نے لکھا کہ میر محمد نعمان نے رسالت مآب کو واقعہ میں دیکھا کہ اس مجلس سے خوش ہیں۔ اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے ”مشرع قوی العذب“ کا ذکر کیا تو حضرت مجدد نے ایک زوردار خط میں اس سے اختلاف کیا۔

حضرت مجدد اور خاتقاہ باقویہ والے بعض امور میں پوری طرح ہم خیال نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ اختلافات دیانتدارانہ تھے اور ان کے اظہار میں پورا ادب بلکہ دوستانہ طرز بیان ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے ان اختلافات نے ذاتی تعلقات اور عقیدت و احترام کو متاثر نہ کیا۔ خواجہ حسام الدین نے (دوسرے طالبین کے علاوہ) اپنے بڑے بیٹے کو تکمیل طریقہ کے لیے سرسند بھیجا۔ حضرت خواجہ کے صاحبزادوں کو انھوں نے دو برس کی عمر سے پالا پوسا اور بے انتہا خدمت کی۔ وہ بھی ان سے بڑے وابستہ تھے، لیکن حضرت مجدد سے انھوں نے جس طرح فیض حاصل کیا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ خواجہ کلاں کی صاحبزادی تو حضرت مجدد کے چھوٹے صاحبزادہ، خواجہ محمد یحییٰ سے بیاہی گئیں۔ ان قریبی تعلقات میں حضرت مجدد کی بلند حوصلگی اور فرض شناسی کو بڑا دخل تھا۔ وہ مرشدزادوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح بے قرار تھے، اس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔ خاتقاہ باقویہ سے بھی ان کی دلی وابستگی تھی۔ اور وہ مرشد کی وفات کے بعد عرس میں باقاعدہ شرکت کرتے۔

رسالہ معارف لدنیہ رسالہ مبداء و معاد وغیرہ

سرسند میں حضرت مجدد نے ابتداً ان طالبین کی تعلیم و تربیت سے کی، جنہیں حضرت خواجہ نے آپ کے پاس بھیجا تھا یا جو خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن اس شخصی ارشاد و ہدایت کے علاوہ آپ کو اپنے زور قلم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور آپ نے ان تحریری صلاحیتوں کو بڑی قابلیت سے تہذیب دین اور ترویج سلسلہ کے لیے استعمال کیا۔ اس میدان میں آپ کا اصل شاہکار تو مکتوبات کی تین جلدیں ہیں، جن کا ہم آگے چل کر تفصیلی ذکر کریں گے۔ لیکن آپ نے اس زمانے میں بعض رسائل بھی لکھے جن کا جمل ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم آپ کے تین رسائل کا ذکر کر چکے ہیں، جو آپ نے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھے تھے۔ ان میں سے پہلے دو (اثبات النبوت اور ردہ روافض) معاصرانہ ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے اور ان کا انداز بیان علما سے ظاہر کا ہے۔ تیسرے رسالہ (تہلیلہ) پر صوفیہ کارنگ غالب ہے۔ بعد کے رسائل میں یرنگ اور گہرا ہو گیا ہے بلکہ وہ تمام تر صوفیہ مسائل یا اپنے احوال و مقامات کے متعلق ہیں۔ بعد کے رسائل میں سے شاید معارف لدنیہ پہلے لکھا گیا۔ کیونکہ اس کا ذکر مبداء و معاد میں ہے۔ جس کی تاریخ تکمیل سنہ ۱۰۱۹ھ ہے۔ اس میں زیادہ تر معرفت الہی کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ شریعت و طریقت کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے اور ان نام نہاد صوفیہ کی مذمت کی ہے، جو شریعت کے مخالف باتیں کہتے ہیں۔ ”عجب است از بختہ درویشان تمام ناتمام کہ کشف خیالی خود را اعتبار نمودہ بانکار و مخالفت این شریعت باہر اقدام می نمایند۔ و حال آنکہ موسیٰ علیہ السلام و علیہ السلام بایں کلیمی و قرب اگر زندہ مے بود، خیر از متابعت این شریعت امر دیگر نمی نمود۔“

مبداء و معاد میں حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی باہن سے بعض عبارتیں جمع کی ہیں۔ مختلف صوفیانہ مسائل کا بیان ہے۔ لیکن کئی اندراجات سے حضرت مجدد کی اپنی روحانی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

رسالے کے آخر میں خواجہ محمد صدیق نے اس کی تاریخ تکمیل ۱۹ ستمبر دی ہے لیکن اصل اندراجات اس سے پہلے کے تھے۔ اگرچہ ان میں اصلاح و ترمیم ہوتی رہی۔ ۱۸ ستمبر میں خواجہ محمد صدیق (اقدس خیر الدین حسن مرید مولانا خواجہ باقی نقشبندی اویسی) اثنائے سفر میں مانڈو پنچے اور گلزار ابرار کے مصنف غوثی سے ملے۔ اس وقت (خواجہ محمد صدیق کے پاس) ایک رسالہ تھا جس سے غوثی نے کچھ عبارت نقل کی ہے۔ یہ عبارت مبداء و معاد کی ہے۔ اگرچہ مطبوعہ نسخوں سے قدرے مختلف ہے۔ غوثی نے "معارف لدنیہ" کہ از جملہ مصنفات او (شیخ احمد سرسندی) است "کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کا اقتباس درج کتاب کیا ہے۔

علاوہ ازیں ایک مختصر رسالہ تعلیقات رباعیات خواجہ باقی باللہ میں آپ نے حضرت خواجہ کی رباعیات کی اس شرح پر اضافے کیے جو حضرت خواجہ نے خود ان رباعیات کی وضاحت کے لیے لکھی تھی۔ یہ رباعیات وجود واجب تعالیٰ اور ربط حادث بالقدیم کے دقیق مسئلے سے متعلق تھیں اور حضرت مجدد نے ان کی وضاحت اپنے معارف خاصہ اور حضرت خواجہ کے بعد کے خیالات کی روشنی میں کی ہے۔ یہ رسالہ "رسائل مجددیہ" میں شامل ہے۔

حضرت مجدد کے ایک اور رسالہ تعلیقات عوارف کا نام بھی تذکروں میں آتا ہے لیکن ابھی جلیہ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ رسالہ ارشاد المریدین کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن یہ بھی نہیں چھپا۔ حال میں مکاشفات عینیہ مجددیہ کے تالیفی نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا ہے جسے بدو المقامات کے مصنف اور مکتوبات کے دفتر سوم کے مرتب مولانا یاشم کشمی نے حضرت مجدد کی وفات کے بعد ان کے ایسے مسودات سے ترتیب دیا، جو بعض خلفائے محفوظہ کر لیے تھے۔ متفرق صوفیانہ مسائل اور مکاشفات کا بیان ہے۔ جن میں سے بعض انداجاً پُرانے ہوں گے۔ مثلاً مکاشفۃ کی عبارت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اندراج حضرت خواجہ باقی باللہ کی زندگی میں کیا گیا۔

ارشاد و ہدایت | حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات ۳۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو ہوئی۔ اس کے قریباً دو سال بعد ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو اکبر انتقال کر گیا اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اسے باپ کی طرح جگت گورو بننے کا خبط نہ تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں حضرت مجدد کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا جس کا (بقول بعض تذکرہ نگاروں کے) ان کی اسیری میں بھی دخل تھا۔ جہانگیر کے دربار پر پہلے سال سے شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیل مطلق ہو جانے سے ایرانی چھائے ہوئے تھے اور ان کا اقتدار کسی نہ کسی صورت میں آخر تک قائم رہا۔ ان میں سے کسی شیعہ یا مائل بہ شیعیت تھے۔ شیعوں کی نسبت حضرت مجدد کا جو نقطہ نظر تھا وہ پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان کے خلاف رسالہ رد ورفض لکھا تھا بلکہ "امرا و سلاطین" کی مجلسوں میں بھی انھوں نے شیعہ اہل علم سے بحثیں کیں۔ اور مکتوبات میں بھی کسی جگہ اظہار خیال کیا۔ ایرانی امرا سے روابط پیدا کرنا اور انھیں متاثر کرنا ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے باوجود وہ اصلاح حال کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد بالخصوص انھوں نے بڑی سرگرم کوشش کی کہ آغاز کار ٹھیک طرح سے ہو، اور ان تمام امرا کو جنھیں وہ خواجہ باقی باللہ کے ذریعے سے یا کسی اور وجہ سے جانتے تھے پر زور خط لکھے۔ لیکن اب ان امرا ہی کو وہ اثر و اقتدار پیشہ نہ تھا جو انھیں او آخر عہد اکبری میں حاصل تھا۔ خان اعظم پر خسرو کی وجہ سے اعتماد نہ کیا جاتا۔ اور ایک زمانے میں تو اسے قلعہ گوالیار میں قید کر لیا گیا۔ شیخ فرید کی عظیم خدمات کی وجہ سے جہانگیر ان کا معترف تھا، لیکن اب انھیں مرکز سے دور رکھا گیا۔ اور انھیں وہ اثر و اقتدار حاصل نہ ہوا جو عہد اکبری میں تھا۔

حضرت مجدد کے لیے عہد جہانگیری میں کسی مشکلیں تھیں، لیکن ان برگزیدہ ہستیوں کے لیے مشکلوں کے خاطر میں لانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دربار جہانگیری میں ان کے مخالف امرا برسر اقتدار تھے۔ لیکن اب انھوں نے عوام

سے رشتہ جوڑا اور اپنی روحانی عظمت، علم و فضل، قوت تحریر و تقریر اور انتظامی قابلیت نقشبندیہ سلسلے کو ملک میں بے انتہا وسعت دی۔ ہم خیال امر اکوہ ترویج شریعت کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ جہاں طریقہ اہل سنت سے انحراف دیکھتے (مثلاً جب سامانہ کے ایک خطیب نے خطبہ میں چاروں خلفاء کا نام نہ لیا) تو اصلاح حالت کے لیے متعلقہ افراد کو پُر زور طریقے سے ہدایت کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام ہدایت و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلسلہ نقشبندیہ کی بڑی باقاعدگی سے تنظیم کی۔ ملک کے تمام بڑے بڑے مرکزوں میں ان کے منتخب خلفائے جو آپ کے خیالات کی ترویج کرتے۔ وہ اپنے مریدوں کی جس طرح خبر گیری کیا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ دو معمولی مثالوں سے ہو سکتا ہے۔ ان کے ایک بھگالی خلیفہ تھے 'مولانا حمید الدائم' وہ وطن واپس گئے تو دیر تک ان کی طرف سے اطلاع نہ آئی۔ حضرت مجدد نے پیدائش انہیں محبت بھرے خط لکھے۔ اور جب پھر بھی خاطر خواہ جواب آیا تو اپنے پٹنہ کے خلیفہ شیخ عبدالحی شادمانی کو ان کے پاس بنگال بھیجا تاکہ ان کے احوال سے آگاہی اور جماعت سے ان کا رابطہ قائم رہے۔ یہاں تک مریدوں کی انفرادی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے خواجہ بدرالدین سرہندی کا تفصیلی بیان پڑھنے کے لائق ہے (حضرات القدس ص ۱۲۹)۔ وہ کہتے ہیں: کہ ہر روز کم و بیش دس مرتبہ حضرت میرے احوال باطنی کو دریافت فرماتے تھے: یا خود اندازہ لگاتے۔ اور مسلسل بہتر سے بہتر صورت حال پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔

مرشد کی وفات کے بعد حضرت مجدد زیادہ تر سرہند میں مقیم رہے۔ لیکن ان کے مزار کی زیارت کے لیے جمادی الثانی میں جو حضرت خواجہ کی وفات کا مہینا ہے، دہلی تشریف لاتے اور دو تین مرتبہ آگرے تشریف لے گئے۔

خانگی صدقات اور حضرت مجدد | مارچ ۱۶ء کے آخری ہفتے میں
کی عالی حوصلگی اور تسلیم و رضا | آپ کو پے درپے کئی صدقات کا
سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے میں

طاعون زوروں پر تھی۔ اور آپ کا خاندان اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ تین

چار روز کے اندر آپ کے گھر سے کئی جنازے نکلے۔ جن میں آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق (عمر ۲۴-۲۵ سال) دو کم عمر صاحبزادوں (محمد فرخ اور محمد عیسیٰ) ایک صاحبزادی (ام کلثوم) اور دوسرے افراد خاندان کی میتیں شامل تھیں۔ ان اندوہناک بلکہ ہمت شکن حالات میں آپ نے جو صبر و سکون دکھایا اور جلی و صلی اور تسلیم و رضا کا ثبوت دیا، وہ آپ کی بزرگی اور خدا رسیدگی کی تین دلیل ہے۔

ملا بدرالدین سرہندی نے حضرات القدس میں ان حوادث کی چند کربناک جزئیات محفوظ کر دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحبزادے محمد فرخ اور محمد عیسیٰ بیک وقت بیمار ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ دونوں کو الگ الگ رکھنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ جماعت خانہ کے بھرہ میں صاحبزادہ محمد فرخ کو اور زنانہ میں محمد عیسیٰ کو رکھا گیا۔ پہلے رحلت موخر الذکر کی ہوئی۔ بیمار بھائی کو اطلاع نہ دی گئی، لیکن انہیں خود بخود اس کی خبر ہو گئی اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔ کہ محمد عیسیٰ رحلت میں محمد سے سبق لے گئے۔ شام کو انہوں نے خود انتقال کیا۔ بڑے محمد و مژدہ کا انتقال اور بھی حسرت ناک تھا۔ وہ بڑے عالم اور برگزیدہ حال صوفی تھے۔ مشکل کتب کا دس دیتے تھے۔ مثلاً مطول مع حاشیہ میر۔ شرح عقائد مع حاشیہ خیالی۔ تحریر اقلیدس آپ سے ملا بدرالدین نے پڑھی تھیں۔

آپ اپنے چھوٹے بھائی محمد عیسیٰ کے جنازے کے ہمراہ پیادہ یا مقبرہ مجدد بزرگوار تک گئے۔ واپسی میں طاعون کی گھٹی نمودار ہوئی۔ چنانچہ بیرون مکان حجرہ خانقاہ میں آپ کو لٹا دیا گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کے قیاس سے ہی کلیجہ شق ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ بدقت تمام دو شخصوں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر گئے۔ اور والدہ ماجدہ اور تمام ارباب حقوق سے پوری طرح سے رخصت ہو کر حجرہ مذکور میں واپس آئے۔ اور دوسرے روز رحلت فرمائی۔

صاحبزادہ محمد صادق کی وفات کا جو آپ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کو ٹپے عزیز

تھے۔ اور بڑے عالم فاضل تھے۔ حضرت مجدد کو بڑا صدمہ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔
 ”مفارقت اعز می قدس سرہ از اعظم مصائب است۔ معلوم نیست کہ کسے بمثل ایں
 مصیبت مصاب شدہ باشد۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی تیمارداریوں اور افراتفرہ
 نے آپ کی اپنی صحت پر اثر ڈالا۔ اس زمانے کا ایک خط ہے۔ ”چند روز است۔ کہ
 بلغم و سرفہ زبوں ساختہ است۔ وضعف بدن بہم رسیدہ۔“ لیکن جس ہمت اور صبر و
 رضا سے آپ نے یہ صدمے برداشت کیے۔ اس پر آپ کے وہ مکاتیب گواہ ہیں
 جو آپ نے خطوط تحریریت کے جواب میں لکھے۔ ایسے مکتوبات (دفتر اول کے آخر
 اور دفتر دوم کے شروع میں) کئی ہیں۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں۔
 ”یہ مصیبتیں بظاہر حواست نظر آتی ہیں۔ مگر حقیقت میں ترقیات اور مرہم ہیں۔
 وہ صبر و شکر جو حق تعالیٰ نے اس مصیبت میں اس ضعیف القلب کو کرامت فرمایا
 ہے۔ بڑی اعلیٰ نعمت اور اعظم انعام ہے (دنیا اور آخرت اللہ تعالیٰ ہی کے
 لیے ہے)۔“

اس خط میں ”تسلیم و رضا“ کا ذکر ہے، لیکن متعدد خطوط ایسے ہیں جن سے خیال
 ہوتا ہے کہ معاملہ تسلیم و رضا سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ کئی خطوط میں یہ اظہار
 ہے کہ تسلیم و رضا اچھی چیز ہے۔ لیکن اگر محبوب حقیقی سے سچی محبت ہے تو اس کے
 ہر فعل سے محبت ہونی چاہیے۔ اور بظاہر ناخوشگوار واقعات پر نہ صرف تسلیم و رضا
 بلکہ خوشی اور التذاذ محسوس ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک مکتوب نگار (خواجہ محمد طالب
 بدخشی) سے تلقین صبر اور تسلیم آموزی کی شکایت کی ہے۔ اور لکھا ہے۔

”میرے برادر عزیز! حق تعالیٰ مومنوں کے نزدیک ان کے مالوں۔ جانوں اور
 تمام اشیاء سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ زندہ کرنا اور مارنا اسی کا فعل ہے
 اس میں کسی اور کا دخل نہیں۔ اس لیے اس کا فعل بھی زیادہ عزیز اور محبوب
 ہوگا۔ محبت اپنے محبوب کے فعل سے لذت پاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کو
 صبر کی ترغیب دینی مکروہ اور نامناسب ہے۔ مقام رضا اگرچہ رغبت و سرور

کی خبر دیتا ہے۔ لیکن التذاذ کا مرتبہ امر دیگر ہے۔“

ایسے مکاتیب کئی ہیں جن میں یہ اظہار ہے کہ محبوب کی سختی اور جوڑو جفا اس کی
 مہربانیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ ایک خط شیخ عبدالحق محدث کے نام ہے اور سارے کا
 سارا نقل کرنے کے لائق ہے۔

”میرے مخدوم و مکرم۔ مصائب میں اگرچہ بڑی تکلیف و ایذا برداشت کرنی پڑتی
 ہے، لیکن ان پر بڑی کرامت اور مہربانی کی امید ہے۔ اس جہاں کا بہتر اسباب
 حزن و اندوہ ہے۔ اور اس دسترخوان کی خوشگوار نعمت الم و مصیبت ہے۔
 ان شکر پاروں پر داروں تلخ کا رقیق غلاف چڑھایا ہوا ہے اور اس حیلہ سے
 ابتلا و آزمائش کا راستا کھولا ہے۔ سعادت مند لوگ ان کی شیرینی پر نظر کر کے
 تلخی کو شکر کی طرح چبا جاتے ہیں اور کڑواہٹ کو صفا کے برعکس شیریں معلوم
 کرتے ہیں۔ کیوں شیریں معلوم نہ کریں۔ جبکہ محبوب کے افعال سب شیریں ہوتے ہیں
 علقی اور بیمار شاید ان کو کڑوا معلوم کرے تو کرے، جو ما سوار میں گرفتار ہے۔
 گا۔ ولت مند محبوب کے ایلام و رنج میں اس قدر حلاوت اور لذت پاتے ہیں
 جو اس کے انعام میں آگے متصور نہیں۔ اگرچہ دونوں محبوب کی طرف سے ہیں
 لیکن ایلام میں محب کے نفس کا دخل نہیں ہوتا۔ اور انعام میں اپنے نفس کا خیر
 پر قیام ہوتا ہے۔“

هَيْثَا لَا رِبَابِ التَّعْلِيمِ نَعِيمًا
 وَلِلْعَاشِقِ الْمُسْكِينِ مَا يَتَجَرَّعُ

ترجمہ مبارک منعموں کو اپنی دولت مبارک عاشقوں کو داد و کلفت
 اللَّهُمَّ لَا تَحْرِفْهَا أَجْوَهُمْ وَلَا تَقْتَبِهَا بَعْدَهُمْ (یا اللہ! تو ہم کو لٹا
 اجر سے محروم نہ رکھ۔ اور ان کے بعد ہم کو فتنہ میں نہ ڈال) اس غریب اسلام
 کے زمانے میں آپ کا وجود شریف اہل اسلام کے لیے غنیمت ہے۔ سَلَامُكُمْ
 اللَّهُ تَعَالَى وَابْتَغَاكُمْ (اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت و باقی رکھتے)۔ والسلام۔

شیخ بدیع الدین | خانگی حوادث سے حضرت مجدد نے ارشاد و ہدایت میں ذرا ضعف نہ آنے دیا۔

۱۹۱۹ء میں جب آپ کی مجددانہ مساعی کو کئی سال ہو چکے تھے اور آپ کے مرید اور خلفاء تمام ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی (مثلاً ممالک افغانستان و ترکستان) میں پھیل چکے تھے۔ آپ نے ایک پُر جوش مرید شیخ بدیع الدین کو جو انگلینڈ کے دار الحکومت آگرہ میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ شیخ بدیع الدین میں جوش اور جذبہ زیادہ تھا۔ احتیاط اور توازن کم۔ وہ اس سے پہلے عشق مجازی میں مبتلا ہوئے تھے تو ارکان اسلام کو ہی جواب دے بیٹھے۔ جب اس سے نجات پائی اور سلوک کی طرف توجہ کی تو اپنے فطری ذوق و شوق کی مدد سے بڑی ترقی حاصل کی، لیکن کسی الجھنوں کا سامان بھی کیا۔ آگرہ میں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور بہت سے آدمی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، لیکن مخالفت کا بازار بھی خوب گرم ہوا۔ شیخ بدیع الدین اپنے مرشد کو ایک خط میں اپنے احوال بلند اور اپنے مریدوں کی عقیدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

بھنے از طلبہ از کثرت التذاذ ترک خاں و ماں می کنند۔ اقربا ئے آنها میں فقیرانہ
آنحضرت ہندوستان کا کلیف بوضع سابق می نمایند۔ بھنے مردم اینجا کہ در سلاسل دیگر
شغل کرده اند۔ الحال کہ دریں طریقہ علیہ داخل شدہ خیلے متلذذ اند۔ و بر عمر گزشتہ
متاسف۔ انہی جہت یکے از مشائخ اینجا عایت عداوت گرفته تا بجائے کہ بایں طریقہ
داعیہ آن سخنان بیہودہ می گوید۔ روز سے بھنے از مریدانش را فرستاد۔ تا بہ حضرت خود
بزرگ و حضرت مجددی خواجہ باقی قدس سرہما و سائر اعزہ و شمامہ داد اند۔ (زبدۃ القلہ)
شیخ بدیع الدین نے مرشد کی بھی نافرمانی کی اور ان کے حکم کے خلاف اگرچہ چھوڑ کر
اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ یہ امر حضرت مجدد کو بہت ناگوار گزرا۔ اور جب شیخ ان
ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر شیخ نے
معافی چاہی اور تلافی مافات کیلئے پگڑے جا کر پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے اپنا

کام شروع کیا لیکن اسی زور سے مخالفت ہوئی اور اس ضمن میں حضرت مجدد کو بھی بادشاہ کے دربار میں حاضر اور زندان شاہی میں محبوس ہونا پڑا۔ اس واقعہ کے متعلق حضرت مجدد کی سب سے قدیمی سوانح عمری میں جو اس واقعہ کے دس بارہ سال بعد ان کے صاحبزادوں کے ایما پران کے ایک ممتاز خلیفہ نے لکھی، ذیل کا اندراج ہے:-

شیخ (بدیع الدین) باضطراب متوجہ دار الخلافت شد با امید آنکہ خاطر مبارک کہ غبار یافتہ است، مصفا شود۔ چون رسید۔ اقل آں مقام گرمی با د فیضہا بخلافت رسید۔ لیکن چون آں شہر دارالامارت بود و مجمع عسکریاں ہنگام طلب دور از احوال و ادب۔ آذان گردہ جسے کہ بخند متش رسیدند۔ با آنرا نصائح خشونت آمیز در میل نہاد و احوالات بلند خویش بر زبان آورد۔ بلکہ بعض وقائع و کشف کہ اظہار آنہا ایضا فتنہ سے نمود۔ بگوش منکراں رسانید تا بجائے رسید کہ دلاں شہر بود و نہ توانست بلکہ آں شور و غرہ پر بزرگوار او قدس سرہما عزیز سرہما نمود و سلطان آں وقت کہ بایں طائفہ بے مناسبتی تمام داشت، حضرت ایشان را طلب نمودہ ایذا نمود و مجلس فرمود۔ اگرچہ بعد از ان سلطان انہیں امر زام و دشیمان شد و عذر خواست۔ اما وے را این سوء ادب نامبارک آمد۔ شور و فتنہ اور مملکتش پیدا شد و بر بعضے یار معتبرہ او ایرانیان خلیفہ نمودہ در تصرف خود آوردند و خودش بضعفہا مملکت مبتلا گشت تا بہماں رفت۔ (زبدۃ المقامات)

مکتوب یازدہم کی مخالفت | شیخ بدیع الدین کے طریق کار سے جو شور و شر پیدا ہوا۔ اس کا اثر ان کے

مرشد عالی مقام کو بھی پہنچا اور مکتوبات کے بعض اندراجات پر اعتراض شروع ہوئے۔ جس بیان پر اس زمانے میں زیادہ حرف گیری کی گئی، وہ دفتر اول کے مکتوب یازدہم میں درج ہے اور اس میں حضرت مجدد نے اپنے عروج روحانی کا ذکر کیا ہے۔ زیادہ اعتراض ذیل کی عبارت پر تھا:- (ترجمہ)

”دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقام

ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے۔ تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں۔ اور اس مقام کے اوپر ایک اولہ مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت رقی عظمیٰ رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے۔ اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا۔ اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ظاہر ہوا۔ اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے۔ اور وہ مقام نگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے نگین معلوم کیا۔

شیخ بدیع الدین تک بھی یہ اعتراض پہنچائے گئے اور کہا گیا کہ تمہارا پیر تو اپنے آپ کو صدیق اکبر سے بھی افضل سمجھتا ہے۔ انہوں نے ایک عرض مرشد کی خدمت میں ارسال کر کے عبارت کی توضیح چاہی۔ پچانچہ دفتر اول کا ایک مکتوب (شمارہ ۹۲) اسی خط کے جواب میں ہے۔ اس میں حضرت مجدد دیکھتے ہیں کہ میں نے پہل خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا۔ اور اس سلسلے کا یہ اصول ہے کہ مرید کو جتنے بھی اوقات پیش آئیں۔ صبح ہوں یا سقیم۔ بے تحاشا انہیں اپنے مرشد کے حضور میں عرض کر دینا

چاہیے تاکہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں ان کی تعبیر ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسترین کی اس سے تشفی نہ ہوئی۔ اور آپ کے کسی مریدوں (مثلاً مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام) نے مکتوب یا ردیم کی بنا پر آپ کے طریقہ سے علم کی اختیار کر لی۔ اس پر آپ نے ایک مفصل مکتوب مرزا فتح اللہ کو لکھا، جس میں ظاہر کیا کہ میں قطعاً اپنے تئیں حضرت صدیق اکبر سے افضل نہیں سمجھتا۔

”وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق سے افضل جانے، اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ زندقہ میں ہے یا جاہل۔۔۔ وہ شخص جو حضرت امیر کو حضرت صدیق سے افضل کہے۔ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے؟“

حضرت مجدد دربار جہانگیر میں | حضرت مجدد کی تشریح سے معترضین کی تسلی ہو جانی چاہیے تھی، لیکن یہاں تشریح بہتوں تک پہنچی یا نہ۔ بہر کیف علمائے ظاہرین نے جہانگیر کے حضور میں شکایت کی کہ سرسند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں حضرت صدیق اکبر سے افضل سمجھتا ہے اور ایسے دعوے کرتا ہے جن سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ امرا اور دوسرے مخالفوں نے نمک مرعہ لگائی ہوگی کہ شیخ احمد نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے۔ ہزاروں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کا اثر حکومت کے لیے مضرت ثابت ہو۔ چنانچہ جہانگیر نے حاکم سرسند کی معرفت حضرت مجدد کو بلا بھیجا۔

۱۔ تذکرہ علماء ہند ص ۱۱

اپنی عربی تصنیف سبحة المرحان میں مولانا غلام علی آزاد بگرامی مکتوب یا ردیم کا خلاصہ ذکر لکھتے ہیں کہ بعض علمائے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت مجدد اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مقام صدیق اکبر سے بلند تر ہے۔ پس وہ مناظرہ کے لیے کمر بستہ ہو گئے وغیرہ (ص ۸۸)

جہانگیر نے اس واقعہ کی نسبت تو زک جہانگیری میں کسی قدر تفصیل سے اظہار خیالات کیا ہے۔ بد قسمتی سے اسے اس قدر ہکا بکا کیا تھا کہ اس نے اپنی رائے بڑی بے ادبی سے ظاہر کی ہے۔ حضرت مجدد کی نسبت اس نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ حضرت مجدد کے تمام معتقدوں بلکہ تاریخ کے غیر جانبدار ناظرین کو بھی محبوب معلوم ہوں گے۔ لیکن چونکہ جہانگیر کے بیان کی تاریخی اہمیت بہت ہے اس لیے ہم اس کے وہ الفاظ حذف کر کے جو خاص طور پر قابل اعتراض ہیں، ذیل میں اس کا بیان درج کرتے ہیں جہانگیر چار دہم سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے :-

”مدین ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد... کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ... از انجندہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گزارم بمقام ذی النورین افتاد مقامے دیدم بنایت عالی و خوش بھفا۔ از انجا در گزشتہ بمقام فاروق پیوستہ وار مقام فاروق بمقام صدیق عبود کردم۔ و ہر کدام را تعریفہ در خور آن نوشتہ و از انجا بمقام محبوبیت واصل شدہ، مقامے مشاہدہ افتاد بنایت متودہ ملوک۔ خود را با انواع انوار والوان منعکس یافتہ۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلفاء گذشتہ بجای مرتبت رجوع نمودم۔ و دیگر گستاخی کردہ کہ لڑختن آن طوے دارد و انادوب دور است۔ بنا برین حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہر پیر سیدیم جواب محفل خوانست سامان نمود و باہم بخود و دانش بنایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر درین دیدم کہ روزی چند در زندان بادب مجبوس باشد تا شوریدگی مزاج و اشتغال دماغش قدرے تسکین پذیر و شور و عوام نیز فرو نشیند۔ لاجرم برانی رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در قلعہ گویا مقید دارد۔ (تزک جہانگیری ص ۲۴)

حضرات القدس میں جسے آپ کے خلیفہ مولانا بدر الدین سرہندی نے ترتیب دیا، اس واقعہ کے متعلق ذیل کا اندراج ہے :-

”جبکہ آنجناب قدس سرہ کو اس کلام کے باعث جہانگیر بادشاہ کے پاس گئے۔

بادشاہ نے آپ سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بلند تر ہے۔ آپ نے یہی جواب دیا۔ اور ایک مثال بھی بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ایک اونٹنے آدمی کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے ازراہ نوازش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری امرا کے مقام کو طے کر کے پیشی تک پہنچے گا۔ اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر گھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرا پر پنج ہزاری سے زیادہ ہو جائے۔ اس جواب کو سن کر بادشاہ کا عتاب دور ہو گیا۔

اسی اشار میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دور تھا، بادشاہ سے کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفہ اللہ ہیں۔ آپ کو سجدہ نہیں کیا بلکہ معمولی قواعد باہمی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ اس کلام کے سننے سے خفا ہوا اور گویا میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین شاہ شاہجہاں کہ آنجناب سے علوم کامل رکھتا تھا۔ علمائے مقامی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدہ تحیت سلاطین کے لیے آیا ہے۔ اگر آپ سجدہ کر لیں تو کوئی گزند بادشاہ سے آپ کو نہ پہنچے گا۔ میں ضامن اور ذمہ دار ہوتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ ضعیف حکم رخصت ہے۔ اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں۔ (حضرات القدس دفتر دوم ص ۸۹-۹۰)

حضرت مجدد کی مجبوسی جہانگیر کا ایک ایسا فعل ہے، جس کا کوئی جواز نہیں اور ان کے متعلق جہانگیر (یا اس کے درباری مؤرخ نے) جو بے ادبانہ الفاظ استعمال کیے وہ تو بہر صورت قابل مذمت ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس امر کا اظہار کر دیا جائے کہ حضرت مجدد کو جہانگیر نے اس لیے طلب نہیں کیا تھا کہ اسے حضرت کے

لے یعنی عبور و مرور اور اثبات کے فرق کے متعلق۔

کوئی ذاتی عناد تھا بلکہ اس طلبی کی اگر ایک وجہ ملکی مصلحتیں تھیں تو دوسری وجہ مذہب تھی۔ مکتوبات کے جن اندراجات کی توڑک جہانگیری میں شکایت کی گئی ہے۔ ان پر کئی دوسرے محضر معترض تھے۔ بلکہ خزینۃ الاصفیاء میں تو لکھا ہے کہ علمائے حضرت مجدد کے قتل کا فتوے دے دیا تھا۔ (پس ہمہ علما بنحاطرداری امراسے دربار فتوے بر قتل شیخ نوشندہ خزینہ میں حضرت مجدد کے متعلق جو طویل اندراج ہے، اس کا ایک اہم ماخذ روضۃ السلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن سجنۃ المرجان میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے پاس مکتوب یازدہم کی شکایت علمائے کی تھی (ص ۴۸)۔ اس کے علاوہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف ایک عام شورش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جہانگیر حضرت مجدد کی قید کا ایک مقصد یہ بھی بتاتا ہے کہ ”شورش عوام“ ٹھنڈی پڑ جائے۔ اور زبدۃ المقامات میں بھی لکھا ہے کہ شورش کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ شیخ بدیع الدین کے لیے اکبر آباد میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ بلکہ اس شورش کی

لے شاید مثل بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہ چاہتے تھے کہ مذہبی راہنماؤں کا اثر بہت بڑھ جائے۔ توڑک جہانگیری میں ایک جگہ لکھا ہے ”بمن خبر رسید کہ شیخ ابراہیم بابا افغانی دکان شیخی و مریدی در یکے پر گنہ از پرگنات لاہور ترتیب دادہ چنانچہ طریقہ ادبانش است جمع کثیرے از افغانان و غیرہ برادر آمدہ اندہ فرمودم کہ اورا حاضر آورده بر پر ویر سپارند کہ در قلعہ چار نگاہ دارد۔ تا این ہو گامہ باطل بر ہم خورد“ گلزار ابرار میں بھی سید احمد افغانی کے ذکر میں لکھا ہے کہ جس سال خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی ان دنوں ایک مجلس میں سادات صفوی کے ایران پر قبضہ پانے کا ذکر ہو رہا تھا تو کسی نے کہا کہ اس وقت بھی کئی درویش صورت اشخاص ایسے ہیں جن کے فرمانبردار معتقدین کی تعداد ایک ولایت کی فوج سے کم نہیں اور اس سلسلے میں باجوڑ کے سید احمد افغانی کا نام لیا۔ وہ بلائے گئے۔ آداب ملازمت بجانہ لائے اور تین سال تک گوالیار میں قید رہے۔ وہ بھی وحدت الوجود کے خلاف تھے۔ شاہجہان نے بھی حضرت مجدد کے خلیفہ اعظم شیخ آدم بنوری کو حج پر جانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ (سید احمد افغان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ص ۲۵۲)

انچ پیر بزرگوار تک پہنچی۔

سنت یوسفی

حضرت مجدد تقریباً ایک سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے جب یہ واقعہ پیش آیا تو شیخ بدیع الدین کا ذوق و شوق بالکل مڑہ ہو گیا اور ششہ بودند کہ از وقت ظهور فتنہ نہ ذوق ماندہ است و نہ حال ایکن حضرت مجدد کے ذوق و شوق میں اور اضافہ ہوا۔ انھوں نے دفتر سوم میں کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ محبوب کی جفا اس کی مہربانی سے زیادہ دلاویز ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لحاظ سے واقعہ قید حضرت مجدد کے لیے زیادہ ترقیات اور روحانی اصلاح کا باعث ہوا۔ قید کے فوراً بعد آپ نے صاحبزادگان کو پہلا خط لکھا۔ (دفتر سوم، مکتوب دوم) وہ بھی کامل تسلیم و رضا، فصاحت و بلاغت اور شفقت و محبت کا ایک دلاویز مرقع ہے۔

جہانگیر پندرہویں سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے :-

”دریں ایام شیخ احمد سرہندی را کہ بجهت دکان آرائی د خود فروشی و بعهرفہ گوئی روزے چند در زندان ادب محبوس بود۔ بجنور طلب داشتہ خلاص ساختم خلعت ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ در رفتن و برون مخرار گردانیدم۔ و از دینے انصاف محروم داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایت دکنائے بود“

جہانگیر نے حضرت مجدد کے مرتبہ اور ظرف کا صحیح اندازہ لگایا ہو یا نہ۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ انھوں نے واقعہ قید سے بھی مزید روحانی ترقی کا سامان کیا۔ اس آزمائش میں انھوں نے جس وقار، استقلال اور علو ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہماری روحانی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ تذکرہ نگار تو نہیں لکھتے لیکن پروفیسر محمد فرمان نے ایک مکتوب سے قیاس لگایا ہے کہ محالہ صرف قید و بند کا نہ تھا، بلکہ جامد اور بھی ضبط کی گئی۔ اور انھیں اور ان کے خاندان کو تحویلی و سرا و چاہ و باغ و کتب و اثباتے دیگر سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن اس پر تسلیم و رضا پر ذرہ بھر اثر نہ ہوا۔ صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعید اور محمد معصوم کو لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں۔ ”باید کہ بیچ چیز مزاجم وقت شما نشود۔ و غیر از مضیات حق

جلا و علا مراد مرضی شما نباشد۔ اگر مائے مردم۔ ایں ہمہ اشیائے رفت گہ در حیات با رفتہ باشد۔ بیچ فکر نہ کنند۔۔۔ والدہ خود را تسلی دہند۔

قید خانے میں اس نئی صورتِ حالات کو آپ جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا تفصیلی اظہار میر محمد نعمان کے نام ایک خط میں ہے۔ (ترجمہ)

”پوشیدہ نہ رہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس عنایت نے حق تعالیٰ کے جلال و غضب کی صورت میں تجلی نہ فرمائی اور قید خانے کے قفس میں قید نہ ہوا۔ تب تک ایمان شہودی کے تنگ کوچ سے کلی طور پر نہ نکلا۔ اور ظلال و خیال و مثال کے کپڑوں میں سرگردان رہا۔ ایمان بالغیب کی شاہراہ میں مطلق الحنان ہو کر نہ دوڑا۔ اور حضور سے غیب کے ساتھ اور حق سے علم کے ساتھ اور شہود سے استدلال کے ساتھ کامل طور پر نہ ملا اور ذوقِ کامل اور وجدانِ بالغ کے ساتھ دوسروں کے ہنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہنر نہ معلوم کیا۔ بے تنگی اور بے ناموسی کے خوشگوار شربت اور رسوائی اور خواری کے مزے دار مرتبے نہ چکھے اور خلق کے طعن و ملامت کے جمال سے حزن نہ پایا۔ اور لوگوں کے بلا و جفا کے حسن سے محفوظ نہ ہوا اور کلی طور پر اپنے ارادہ و اختیار کو ترک نہ کیا اور آفاقی اور نفسی تعلقات کے رشتہ کو کامل طور پر نہ توڑا اور تضرع و التجا، انابت و استغفار اور ذلت و انکسار کی حقیقت حاصل نہ ہوئی اور حق تعالیٰ کے استغنا کی رفیع الشان بارگاہ کو جس کے گرد عظمت و کبریا کے پرے سے تھے ہوئے ہیں، مشاہدہ نہ کیا اور اپنے آپ کو بندہ، خوار و زار و ذلیل و بے اعتبار و بے ہنر و بے طاقت اور کامل محتاج اور فقیر معلوم نہ کیا۔“

ہم جہانگیر کا بیان نقل کر چکے ہیں کہ قید خانے سے رہائی کے بعد اس نے حضرت مجدد کو اجازت دی تھی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں آپ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ اس طرح آپ کو سارے لشکر میں بلکہ سارے

لے پروفیسر محمد فرمان کا خیال ہے کہ جہانگیر کا حضرت مجدد کی نسبت یہ لکھنا کہ ”در رفتن و ماندن گردانیدم“ جھوٹ اور دلوپوسی کا اظہار ہے۔ اور اُس نے حضرت مجدد کو آخر وقت تک نظر [باقی اگلے صفحے پر]

مملکت میں جہاں جہاں لشکر جاتا، تلقین و ہدایت کا موقع ملتا۔ اس سے پہلے بھی جب آپ جیل خانے میں محبوس تھے تو آپ نے اپنے رفقاءِ زندان میں سے کئی بُت پرستوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں آپ کو بادشاہ کو تلقین کرنے کا بھی موقع ملتا۔ چنانچہ دفترِ سوم میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے اور ایک اور خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو آپ نے مجلسِ شاہی میں کی تھی۔ لکھتے ہیں (ترجمہ) ”عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں سرسوسستی اور مدہانت دخل نہیں پاتی لہذا حق کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بخت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت دیدار کے اثبات اور حضرت خاتمِ الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدار اور تراویح کی سنت اور تاسخ کے باطل ہونے اور حقوں اور جنونیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سنا رہا۔ اس آئین اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور اقطاب و اوقاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید کوئی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راہ ہوگا۔“

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷۲)

رکھا“ (حیاتِ مجدد ص ۳۵) یہ خیال بے بنیاد نہیں۔ مکتوباتِ امام ربانی کا بغور مطالعہ کریں تو اس کی تائید ہوتی ہے۔ لشکر سے جب حضرت مجدد و جاتے تھے تو رخصت لیکر جاتے تھے ان کا طریقہ انتہائی تسلیم و رضا کا تھا لیکن خواجہ حسام الدین کے نام بھی ان کا خط پڑھیں تو عین بلا اور عین فقر کا جس طرح ذکر ہے اور جو دوسرے پر معنی جملے ہیں (ذکر دوم ص ۲۷) ان سے پروفیسر محمد فرمان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

جہانگیر آپ کی قید خانے سے رہائی کے تین سال بعد اپنی سالگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے :-

”بدستور ہر سال خود را بہ ملا واجناس وزن فرمودہ در وجہ استحقاق مقرر فرمودم۔

از آن جملہ شیخ احمد سرہندی را دوم ہزار روپیہ عنایت شد۔

حضرت مجدد قلعہ گوالیار سے واپسی کے بعد تقریباً تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی خط لکھے جو جلد سوم میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سوانحی واقعات بہت محوڑے ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا حضرت مجدد بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگرہ بھی گئے۔ لیکن تزک جہانگیری کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ ان تین چار سالوں میں جہانگیر کو ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا اور اس کے دل میں غریب کا بڑا جوش تھا۔ عجب نہیں کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کو بھی دخل ہو۔ جہانگیر نیدرہویں سال جلوس کے واقعات میں یعنی جس سال حضرت کو رہائی ملی، علاقہ راجوری (کشمیر) کے بعض مسلمان راجپوتوں کی نسبت لکھتا ہے :-

مزینداران ایں جارا راجامی گفتند۔ سلطان فیروز مسلمان کردہ۔ ومع ذلک خود را راجامی گویانند و ہنوز بدعت ہائے ایام جہالت در میان آنها مستمر است از جملہ جنابو بعض از زنان ہندو باشو ہر خود سے سوزند۔ اینہارا زندہ باشوہر گوری آزند شیندند کہ وہ ہیں ایام دختر سے وہ دوازده سال باشوہر خود کہ ہمسال با بود زندہ بقبر در آورند دیگر لکھتے ہیں کہ بے بضاعت را کہ دختر جو جو می آید خفہ کردہ می کشند۔ با ہنود پیوند خویشی سے گفتند۔ دختر می دہند و می گیرند۔ گرفتن خود خوب۔ اما دادن! خود باندہ فرمان شد کہ بعد ازیں پیراموں ایں امور نہ گردند۔ و ہر کس کہ مرتکب ایں بدعت ہا شود۔

اور سیاست کنند۔ (تزک جہانگیری ص ۳۲۳)

پھر اگلے سال فتح کانگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے :-

لے جہانگیر کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عوام جو الالمکھی کی پرستش کرتے تھے ”قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئین آنهاست۔ گروہ گروہ اہل اسلام مسافت مجید طے نمودہ مذورات می آزند۔ و پرستش ایں سنگ سیاہ می نمایند۔“ (تزک جہانگیری ص ۳۲۴)

”متوجہ سیر قلعہ کانگرہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام کہ در کاب بودہ۔ آنچہ شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ بتوفیق از بھما بانگ نماز و خواندن خطبہ و کشتن گاو و غیرہ کہ از ابتدائے بنا و ایں قلعہ تا حال نشدہ بود۔ ہمہ را در حضور خود حمل آوردیم۔ سجدات شکر ایں مہربیت عظمیٰ کہ ہیچ بادشاہ سے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ، حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا ہنند۔“

(تزک جہانگیری ص ۳۲۶)

یہ امر غیر غلب نہیں کہ دیگر علمائے اسلام جو بادشاہ کے ساتھ تھے ان میں حضرت مجدد بھی ہوں!

جہانگیر کی حکومت میں نور جہاں کے شیعہ بھائی اور وزیر سلطنت آصف کو بڑا دخل تھا اور حضرت مجدد کو ان کا طریق کار ضرور ناگوار ہوتا ہوگا۔ لیکن قیام سلطنت کے دوران میں کئی الجھنوں کے باوجود حضرت مجدد نے اپنی جمعیت خاطر اور روحانی مشاغل میں فرق نہیں آنے دیا۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں :-

”اس طرف کے فقرا کے احوال و اوضاع حمد کے لائق ہیں کہ عین بلا میں عافیت اور عین فقر میں بحیث حاصل ہے۔ وہ فرزند دوست جو ہمراہ ہیں۔ ان کے اوقات بھی جمعیت سے گزر رہے ہیں۔ اور ان کے احوال میں ترقی ہو رہی ہے۔۔۔ الحمد للہ کہ باوجودیکہ ارباب فقر سے بہت میل جول ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہماری میں سے کسی کو ابھی تک فقر کی نوبت نہیں پہنچی اور مطلب نہیں روکا۔“ (دفتر سوم مکتوبات)

لے ہم نے اپنے زعم میں بڑی محنت کی۔ اور مجددی تذکرہ نگاروں کی تائید میں تزک جہانگیری سے جو کچھ مل سکا اسے جمع کیا۔ اور حضرت مجدد کے ثنات کے ثبوت میں پیش کیا۔ لیکن چونکہ ہم نے تزک جہانگیری کی عبارت کے لحاظ سے حضرت مجدد کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت مجدد کی خدا پر پردہ ڈالنا چاہا ہے۔ خیر خبر و علیم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہمیں شکایت نہیں۔ لیکن پروفیسر محمد فرمان نے جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں جہانگیر اور حضرت مجدد کے تعلقات کا نئے سرے سے مطالعہ مناسب ہے۔

شکر کے ساتھ ہی آپ ۱۲۲ھ میں اجمیر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی۔ دیر تک وہاں مراقبہ کیا اور بڑا فیض حاصل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے جی مہمانی ادا کیا۔ طرح طرح کی ضیافتیں کیں اور بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہوا۔ اسی جگہ مزار کے خادموں نے حاضر ہو کر حضرت خواجہ کے مزار کا قبر پوش آپ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے ادب کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اور فرمایا کہ چونکہ یہ لباس حضرت خواجہ سے بہت نزدیک رہا ہے۔ اس لیے اسے میرے کفن کے لیے سنبھال رکھا جائے۔

مکتوبات سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کبھی کبھی رخصت لے کر سرہند تشریف لے جاتے اور مدت رخصت کے اختتام پر واپس تشریف لے آتے۔ خواجہ زادگان میں سے بھی کبھی کبھی کوئی ملشکر میں ساتھ ہوتا۔ ایک زمانہ میں فقط خواجہ محمد ہاشم کشمی ساتھ تھے اور وہ بھی سفر اجمیر کی صعوبتوں سے گھبرا گئے تھے (جلد سوم مکتوب ۸۲)۔

اب آپ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ سفر میں تکلیف ہوتی تھی۔ ضعف جسمانی غالب آ رہا تھا اور سمجھتے تھے کہ رحلت کا وقت قریب آ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ سے اجازت ملی تو آپ سرہند تشریف لے گئے۔ جہاں پہنچ کر آپ نے خلوت اختیار کی۔ ان ایام میں کئی دفعہ آپ اپنی موت کا ذکر کرتے تھے۔ کئی دوستوں کے نام خط میں ”استغفرے چلے“ کا فقرہ لکھا اور بعض کو تو بالصراحت بتایا کہ عمر کا اخیر ہے۔ اس دوران میں آپ پر دمے کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ پھر طبیعت بحال ہو گئی۔ لیکن آپ موت کا اکثر ذکر کرتے رہے۔ اس زمانے میں کثرت سے خیرات دی۔ کسی نے سمجھا کہ دفع بلیات کا صدقہ ہے۔ تو آپ نے ہندی کا یہ مصرع پڑھ کر حقیقت حال واضح کی:

آج ملا واکنت سوں سکھی سب جگ دیواں وار

یعنی آج وصال کا دن ہے۔ اے سکھی۔ میں اس خوشی پر تمام دنیا کو نثار کر دوں۔

تھوڑے ہی عرصے بعد موت کا پیغام آن پہنچا۔ اور آپ ۲۸ صفر ۱۲۳۲ھ ہجری

مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۱۷ء کو انتقال فرما گئے۔

کیا حضرت مجدد اور تین تنہا حضرت مجدد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا؟

ہے کہ حضرت مجدد کا اکبری الحاد کے خاتمہ میں کس قدر حصہ تھا؟

آج سے تیس چالیس سال پہلے سوائے مجدد یہ حضرات کے کوئی اہل علم اس امر کا قائل نہ تھا کہ حضرت نے عہد اکبری کی بددعا ہی کا خاتمہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ روضۃ القیومیہ اور حضرت مجدد کی بعض سوانح میں جو ان کی وفات کے بہت مدت بعد ان کے غالی معتقدوں نے لکھیں۔ اس امر کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن علمی حلقوں میں اس خوش اعتقادی کو اسی قدر اہمیت دی جاتی۔ جس قدر علاء الدین خلجی کے متعلق نظامی حضرات کے اس دعوئے کو، کہ اس کی فتوحات سلطان المشائخ کی مرہون منت تھیں۔ یا مغلوں کے متعلق شطاریوں کے اس بیان کو، کہ خاندان سور پر انھیں فتح حضرت غوث گویاری کی مدد سے ہوئی۔

حضرت مجدد کے متعلق ان کے بعد ہمارے بہترین علماء و صلحا مثلاً شاہ ولی اللہ شیخ نور الحق ابن شیخ عبد الحق محدث اور مرزا جانجاناں مظہر نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں۔ اور یہ خیالات عقیدت مندانہ تھے، لیکن ان میں کسی نے حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار نہیں دیا۔ علمی حلقوں میں یہ دعویٰ سب سے پہلے آج سے تیس سال قبل مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ انھوں نے تذکرہ میں لکھا:-

”نہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جاگیر کے اوائل میں کیا ہندوستانی علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد العت ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کار و بار کا قائل ہوا۔“

(تذکرہ ص ۲۳۸)

پھر فٹ نوٹ میں اس عبارت پر مزید اضافہ کیا :-

معام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان (حضرت مجددؑ) کی تجدید محض رد بدعات
جہاں صوفیہ و تحقیق بعض معارف تصوف و اعلان و اشتہار توحید شہودی میں منحصر
ہے۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت مجددؑ کے کاموں کی تفصیل کے لیے انھوں نے ”متوسط
تقطیع کے ۱۷۳“ صفحوں پر سیرت حضرت مجددؑ لکھی۔ اس کتاب کا کہیں سراغ نہیں
ملا۔ لیکن مولانا نے تذکرہ میں جو ولولہ انگیز مبہم اشارے کیے تھے اور حضرت مجددؑ کے
مقابلے میں جس طرح انھوں نے نام لے کر شیخ عبدالحق محدثؒ کی ”غرض“ اور
حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی ناتمامی کا ذکر کیا۔ اس سے روضۃ القیومیہ اور اس قسم کے
متاخرانہ مجددی تذکروں نگاروں کے اس نظریہ کو بڑی تقویت ملی کہ اکبری دور کی خرابیوں
کو دور کرنے والے حضرت مجددؑ اور ”تہا“ حضرت مجددؑ تھے۔

اس کے بعد کسی مؤرخ نے اس مسئلے پر محققانہ نظر نہیں ڈالی اور چونکہ اقبال
کے فلسفہ اور ہماری روحانی زندگی کے موجودہ رجحانات کی وجہ سے تمام حضرات
جنھوں نے اخلاقی جرات اور جلالی شان دکھائی خاص و عام میں مقبول ہیں۔ اس لیے
مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطہ نظر کی بڑی خوشی سے پیروی ہوئی اور آج عوام الناس ہی
نہیں بلکہ اہل علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع فقط حضرت مجددؑ کو قرار دیتے ہیں۔
لیکن کئی قوی قیاسات اور شواہد ایسے ہیں جن کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ حضرت
مجددؑ کے متعلق یہ دعویٰ محل نظر ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ یا شیخ
عبدالحق محدثؒ یا شیخ نورالحق جو حضرت مجددؑ کے ہم عصر یا قریب الہمد تھے وہ حضرت
مجددؑ کو اکبری الحاد کا قاطع منکر کہتے۔ وہ حضرت سرہندی کی دوسری خوبیوں اور
کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ایک ایسا امر جو اگر امر واقعی ہو تو حضرت سرہندی کی
دوسری سب خوبیوں سے اہم ہوگا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت مجددؑ کے رسالہ رد و انقض کا عربی میں ترجمہ کیا
ہے۔ اس ترجمے کے شروع میں عہد اکبری کے مذہبی رجحانات پر تبصرہ ہے۔ اور حضرت
مجددؑ کے تمام احسانات و کارنامے ایک ایک کر کے تفصیل سے گنائے گئے ہیں۔ اس
بحث میں شاہ صاحب نے رسالہ اثبات النبوت اور ان مکتوبات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر
معتقدین، حضرت مجددؑ کو اکبری الحاد کا قاطع قرار دیتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے ان
چیزوں کی جتنی اہمیت تھی وہ بتا دی ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ اور حضرت مجددؑ کے تمام کارنامے
گنانے کے باوجود کہیں یہ نہیں کہا کہ انھوں نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت مجددؑ کی وفات کے فوراً بعد دو مبسوط تذکرے ان کے
خلفائے لکھے۔ ایک ”زبدۃ المقامات“ ان کے صاحبزادوں کے ایما پر ان کے
خلیفہ اعظم خواجہ محمد عاشق کشمی نے لکھا۔ دوسرا ”حضرات القدس“ مولانا بدر الدین
سرہندی کی تصنیف ہے، جو آپ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ سترہ برس آپ کی
خدمت میں رہے۔ ان دونوں میں حضرت مجددؑ کے اس کارنامے کا کہیں ذکر نہیں۔
اگر حضرت مجددؑ نے واقعی اکبری بد مذہبی کا ازالہ کیا تو کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ یہ
سب بزرگ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ آخر انھیں آج کے معتقدین کی نسبت وفات
کو جاننے کا زیادہ موقع تھا۔

لیکن لطف یہ ہے کہ نہ صرف کوئی ہم عصر یا قریب الہمد مستند عالم حضرت مجددؑ
کے اس تجدیدی کارنامے کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ ان کے زمانے کا سب سے بڑا عالم ان کی
سخت مخالفت کرتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدثؒ کے اکبری بد مذہبی کی نسبت جو خیالات
ہوں گے ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ان کا تقویراً بہت اظہار انھوں نے شیخ فرید
کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ فیضی ان کا بڑا قدردان تھا۔ لیکن وہ اس کے اور اکبر کے
مذہبی خیالات سے برگشتہ ہو کر فتح پور سیکری چھوڑ گئے۔ اب اگر کوئی شخص اس بد مذہبی
کا ازالہ کرتا تو کیا شیخ عبدالحق محدثؒ اس کے سامنے سر تعقید نہ جھکاتے۔ لیکن
واقعہ یہ ہے کہ وہ مکتوبات کے بعض اندراجات کی بنا پر حضرت مجددؑ کے مخالفین میں

پیش پیش تھے اور انھوں نے ایک مستقل رسالہ حضرت مجدد کے بعض بیانات کی تردید میں لکھا۔

جہانگیر اکبر کا جانشین تھا، لیکن اکبر کے مذہبی منصوبوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابوالفضل کلاوہ سخت مخالف تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے جو احکام جاری کیے، ان سے شرع کا احترام ٹپکتا ہے۔ پرتگیز مشنری کہتے ہیں کہ اس نے احترام شرع کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ الحاد کا مخالف ہوگا۔ اب اگر حضرت مجدد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا تو کیا یہ امر عجیب نہیں کہ جہانگیر نہ صرف ان کے کارناموں سے ناواقف ہے اور ان کا خاص احترام نہیں کرتا، بلکہ انکا انھیں قید کر لیتا ہے۔

جہانگیر نے حضرت مجدد کی طلبی اور قید کا واقعہ بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت کی حراست کی ایک وجہ ان کا غرور و تفاخر تھی۔ (یعنی غالباً یہ کہ انھوں نے سجدہ دربار نہ کیا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں چند دن قید میں رکھنے سے ان کے خلاف جو عوام کی شورش تھی وہ ختم جائے (شورش عوام فرو نشیند)۔ عوام کی اس شورش سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاصرین کی رائے حضرت مجدد کے متعلق کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی محاصرہ اور مستند تاریخ یا تذکرہ میں اس امر کا ذکر نہیں کہ حضرت مجدد نے اکبری بد مذہبی کا قلع قمع کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ نظریہ جو تذکرہ سے اخذ کیا جاتا ہے، مستبعد بلکہ ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے لیکن مولانا غالباً ان مکتوبات سے متاثر ہوئے ہیں جن میں حضرت مجدد نے اکبر عہد کو شرع کے استحکام اور مذہب کی استواری کی تلقین کی ہے۔ اس لیے واقعات کو پرکھنے کے لیے ان مکتوبات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

ان مکتوبات کی نسبت ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ اگر ان کی بنا پر یہ تسلیم کیا جائے کہ شیخ فرید خان اعظم اور دوسرے اکبر کو حضرت مجدد کی یاد دہانی اور وعظ و تلقین کی وجہ سے حفاظت مذہب کا خیال پیدا ہوا۔ اور پھر انھوں نے اس امر کے لیے کوششیں

کیں۔ تب بھی بہ نظر انصاف ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وعظ و نصیحت آسان ہوتی ہے اور اس پر عمل پیرائی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس وعظ و نصیحت کی وجہ سے ہیں شیخ فرید اور دوسرے اکبر عہد کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنی چاہیے جنھیں بادشاہ کو قائل کرنے میں جو عملی مشکلات تھیں ان کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مکتوبات کے بغیر ہی مسلمان امراء کو اپنے فرض کا احساس تھا بلکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان مکتوبات کے لکھے جانے سے پہلے ہی اصل مراحل طے ہو گئے تھے اور اکبری الحاد کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

ان مکتوبات میں سب سے زیادہ شیخ فرید کے نام ہیں۔ ہم شیخ فرید کے حالات ذرا تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور ان کی نسبت مجدد الف ثانی کے مرشد خواجہ باقی باللہ اور خود حضرت مجدد کے جو عقیدت مندانہ خیالات تھے، وہ نقل کر چکے ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ساتھ ان کا جو لگائے کا رشتہ تھا۔ وہ بیان ہو چکا۔ اسے دیکھ کر کوئی با انصاف انسان نہیں کہے گا کہ شیخ فرید کو اسلام سے یا طریقہ نقشبندیہ سے دلی لگاؤ نہ تھا۔ یا یہ کہ حضرت مجدد کی یاد دہانی کے بغیر شیخ فرید کو اپنے فرائض کا خیال نہ ہوتا۔

لیکن حضرت مجدد کے مکتوبات سے ہی خود اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہ اس وقت لکھے گئے جب اکبر کے ساتھ اس کی مذہبی بوالفضولیاں ختم ہو چکی

۱۰ حضرت مجدد اس اہم فرق کو خوب سمجھتے تھے۔ خان جہاں کو ایک خط میں شرع میں کی تابعداری اور دشمنان دین کی مخالفت کی تلقین کر کے لکھتے ہیں۔ "یہی خدمت جو اب آپ کر رہے ہیں۔ اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کریں تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سا کام کریں گے۔ جس سے دین منور و معمور ہو جائے گا۔ ہم فقیر اگر سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کریں۔ تب بھی آپ جیسے بہادری کی گردنک نہیں پہنچ سکتے۔" ایسا اظہار خیال کئی خطوط میں ہے۔

تھیں۔ جہانگیر فریبی اُمید میں اکبر کا ہم خیال نہ تھا اور پرتگیز مشنری باکراہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے سے پہلے اس امر کا وعدہ کیا تھا کہ وہ شعائر اسلامی کی پابندی کرے گا۔

یہ سب مرحلے طے ہو گئے ہیں، جہانگیر تخت نشین ہو چکا ہے اور وہ ابتدائی احکام جن میں ایک تعمیر مساجد کے متعلق ہے جاری ہو چکے ہیں۔ اس وقت حضرت مجدد سرہند سے شیخ فریدی کے نام خط لکھتے ہیں:-

”امروز کہ نوید زوال مانع دولت اسلام و بشارت جلوس بادشاہ اسلام بگوشت خاص و عام رسید۔ اہل اسلام بخود لازم دانستند کہ ممد و معاون بادشاہ باشند و بر ترویج شریعت و تقویت ملت دلالت نمایند۔“

اس کے بعد بادشاہوں کو علماء و مشو سے بچانے کی ضرورت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں (ترجمہ) یہ فقیر بے سروسامان بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اسلام کے مددگار گردہ میں داخل کرے (کہ خود را در جہرگہ ممدان اسلام اندازد) اور اس بارے میں کوشش کرے۔ من کثر سواد قوم فہو منہم کے موافق ہو سکتا ہے کہ (آپ) اس فقیر کو ان بزرگوں کی جماعت میں داخل کر لیں۔ فقیر اپنے آپ کو اس بڑھیا کی طرح خیال کرتا ہے جو اپنا تھوڑا سا سوت لے کر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غریب لڑکے میں شامل ہو گئی تھی۔

اس خط کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جرگہ ممدان اسلام پہلے سے موجود تھا اور حضرت مجدد اپنے مقابلے میں دوسرے اہل دل مسلمانوں کے کام کی قدر و قیمت بھی سمجھتے تھے۔

مکاتیب کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان میں بظاہر کوئی ایسا نہیں، جو حضرت مجدد نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا ہو۔ اور تذکرہ نگار بھی حضرت کا آغاز ارشاد نقشبندی سلسلہ سے بیعت کے بعد شروع کرتے ہیں۔ مرشد کی زندگی میں بہر کیف حضرت مجدد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اور

مرشد کی وفات کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ اکبر مر گیا۔ اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں آپ کے پیر بھائیوں سے اختلافات رونما ہوئے۔ اور آپ سرہند میں مقیم ہو گئے۔ اکبر کے طور طریقے یقیناً آپ کو ناپسند تھے۔ اور رسالہ انبات القیوت معاصرانہ خیالات کی اصلاح کے لیے لکھا گیا، لیکن اس ایک رسالہ سے جس کے فقط نا تمام مخطوطے ملتے ہیں اور جو بظاہر کبھی مکمل نہ ہوا۔ اکبری خیالات کا کس طرح قلع قمع ہو سکتا تھا؟

مولانا ابوالکلام آزاد (اور عام مجددی تذکرہ نگاروں) کے بیان کا سب سے قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تمام صورتِ حالات کو ذہن میں رکھنے کی بجائے حضرت خواجہ باقی باللہ کے چند ارشادات سے جو انھوں نے اپنے بلند مرتبہ مرید کی تعریف میں کئے، مرشد کے کام کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں ”اسی طرح میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارفِ کامل خود دہلی میں بچہ اکبری مقیم رہے، لیکن وہ خود کہتے تھے کہ میں چراغ نہیں، چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا۔ چراغ شیخ احمد سرہندی ہیں۔“ حضرت خواجہ کا کوئی بیان بدیہی الفاظ خاص پہلی نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن حضرت کا طریقہ درویشی اور انتہائی مسکنت کا تھا۔ وہ شیخ عبدالحق محدث سے بھی اس طرح برتاؤ کرتے۔ گویا وہ استاد ہیں اور حضرت خواجہ شاگرد۔ حضرت مجدد کے تو وہ خاص طور پر قدردان تھے۔ اور ان کی انھوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ جس سے مجددی تذکرہ نگاروں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غلط نتائج اخذ کر لیے، لیکن صحیح صورتِ حالات جاننے کے لیے فقط حضرت خواجہ کے مدحیہ ارشادات پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد کے ان بیانات کو بھی دیکھنا چاہیے، جو انھوں نے مبداء و معاد میں اور دوسری جگہ مرشد کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھے۔ اور بالخصوص وہ مکاتیب طحوظ خاطر رہنے چاہئیں جو انھوں نے حضرت خواجہ کو لکھے۔ یا مرشد نے بلند پایہ مرید کی اصلاح و ہدایت کے لیے تحریر کیے۔ ان کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان

اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شرعی کا سب سے زیادہ پاس تھا۔ اور اس سلسلے کو ترقی دی بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو تمام اولیاء سے بزرگ تر مانتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجمانیاں ہوتی ہیں تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کر کے انھیں شرع کے مطابق ثابت کیا۔ مشائخ متاخرین بعض خلاف شرع امور کو رو کر رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک قابل عالم، شیخ طریقت تھے جو تاویل و تشریح سے اور مخالف شرع اقوال و احوال سے علیحدگی اختیار کر کے تصوف کو احکام شرعی کی حدود میں لے آئے۔ اس سے تصوف کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوئے۔

آپ نے عقیدہ وحدت الوجود کی نئی توجیہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی منزل میں سرگردان رہے تھے (ملاحظہ ہو دفتر اول مکتوبات) لیکن عالم اور محتجب شرع ہونے کی وجہ سے اس اختلاف سے بھی واقف تھے، جو وحدت الوجود کی بعض ترجمانیوں سے اہل شرع کو تھا۔ چنانچہ آپ نے مکتوبات میں اس گتھی کو سلجھایا۔ آپ کا قول ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتداء سلوک میں

۱۔ لیکن آپ بنیادی طور پر ایک شیخ طریقت تھے۔ آپ کے ہاں "کشف و شہود" کی افراط ہے۔ اور بعض جگہ اپنے طریق کار کو علماء کے طریق کار سے جو "نظر و استدلال" پر مبنی ہے، مختلف بتایا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو دفتر دوم مکتوبات ص ۷۷)

پیش آتا ہے، جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے، جو شرع کے عین مطابق ہے۔

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام رقبہ بدعت تھا۔ نئے فرقوں اور نئے طریقوں سے نہ صرف دین میں رخنے پیدا ہوتے تھے بلکہ اسلامیات ہند کے اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے رقبہ بدعت کی پوری کوشش کی۔ جن نئے فرقوں سے قومی نظام میں خلل کا اندیشہ تھا۔ ان کی ہر طرح مخالفت کی۔ اس زمانے میں صوفیوں کی وجہ سے شیعیت ایران میں عروج پر آئی۔ اور چونکہ ایران سے عہد مغلیہ میں گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی شیعہ اثرات بڑھنے لگے۔ آپ نے انھیں روکنے کے لیے زبان اور قلم سے کام لیا۔ امرا و سلاطین کی محفلوں میں اس کی مخالفت کی۔ شیعہ خیالات کی تردید میں ایک پُر زور رسالہ لکھا۔ جب کہیں شیعہ طریقوں کو فروغ پاتا دیکھتے۔ ذمہ دار حضرات کو ان کے خطرات سے آگاہ کرتے۔ ہمدویت کی بھی آپ نے مخالفت کی اور تصوف میں بھی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

شرع کی ترویج۔ طریقہ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجدد نے جو اہم کام کیا۔ وہ اسلام کا عام احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب ایک طرف اکبر کے "صلح کل" طریقے نے اسلام کو اس حمایت و دین پناہی سے محروم کر دیا تھا، جو اسلامی حکومت کی ابتدا سے اُسے حاصل تھی۔ اور

۲۔ آپ کے رسالہ رقبہ و افق کا جو نسخہ خانقاہ سراجیہ گندیاں شریف میں ہے، اس میں امیر غزنی کی متعدد ابیات بدین مضمون نقل کی ہیں (۱۴) کہ ہندوستان میں اسلام کو رونق اور کھیتی حاصل ہے اور لکھا ہے کہ تمام مسلمان آں اراہل اسلام بر حقیقہ حقیر اہل سنت و جماعت اند۔ و نشانے اراہل بدعت و ضلالت دہل ویاں پیدا نیست۔ لیکن اب شیعوں کی آمد سے یہ فضیلت و کھیتی جاتی رہی ہے۔

اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شرعی کا سب سے زیادہ پاس تھا۔ اور اس سلسلے کو ترقی دی بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو تمام اولیاء سے بزرگ تر مانتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجمانیاں ہوتی ہیں تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کر کے انہیں شرع کے مطابق ثابت کیا۔ مشائخ متاخرین بعض خلاف شرع امور کو رد رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک قابل عالم شیخ طریقت تھے جو تاویل و تشریح سے اور مخالف شرع اقوال و احوال سے علیحدگی اختیار کر کے تصوف کو احکام شرعی کی حدود میں لے آئے۔ اس سے تصوف کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوئے۔

آپ نے عقیدہ وحدت الوجود کی نئی توجہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی منزل میں سرگردان رہے تھے (ملاحظہ ہو دفتر اول مکتوبات) لیکن عالم اور محب شرع ہونے کی وجہ سے اس اختلاف سے بھی واقف تھے جو وحدت الوجود کی بعض ترجمانیوں سے اہل شرع کو تھا۔ چنانچہ آپ نے مکتوبات میں اس گتھی کو سلجھایا۔ آپ کا قول ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتداء سلوک میں

لے لیکن آپ بنیادی طور پر ایک شیخ طریقت تھے۔ آپ کے ہاں "کشف و شہود" کی افراط ہے۔ اور بعض جگہ اپنے طریق کار کو علماء کے طریق کار سے جو نظر استدلال پر مبنی ہے مختلف بتایا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو دفتر دوم مکتوبات ص ۱۲)

پیش آتا ہے جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے جو شرع کے عین مطابق ہے۔

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام رد بدعت تھا۔ نئے فرقوں اور نئے طریقوں سے نہ صرف دین میں رخنے پیدا ہوتے تھے بلکہ اسلامیات ہند کے اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے رد بدعت کی پوری کوشش کی۔ جن نئے فرقوں سے قومی نظام میں خلل کا اندیشہ تھا۔ ان کی ہر طرح مخالفت کی۔ اس زمانے میں صوفیوں کی وجہ سے شیعیت ایران میں عروج پر آئی۔ اور چونکہ ایران سے عہد مغلیہ میں گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی شیعہ اثرات بڑھنے لگے۔ آپ نے انہیں روکنے کے لیے زبان اور قلم سے کام لیا۔ امرا و سلاطین کی محفلوں میں اس کی مخالفت کی۔ شیعہ خیالات کی تردید میں ایک پُر زور رسالہ لکھا۔ جب کہیں شیعہ طریقوں کو فروغ پاتا دیکھتے۔ ذمہ دار حضرات کو ان کے خطرات سے آگاہ کرتے۔ مہدویت کی بھی آپ نے مخالفت کی اور تصوف میں بھی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

شرع کی ترویج۔ طریقہ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجدد نے جو اہم کام کیا۔ وہ اسلام کا عام احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب ایک طرف اکبر کے "صلح کل" طریقے نے اسلام کو اس حمایت و دین پناہی سے محروم کر دیا تھا جو اسلامی حکومت کی ابتداء سے حاصل تھی۔ اور

لے آپ کے رسالہ رد و افض کا جو نسخہ خانقاہ سراجیہ گندیاں شریف میں ہے اس میں امیر شہر کی متعدد ابیات بدین مضمون نقل کی ہیں (۱۲) کہ ہندوستان میں اسلام کو رونق اور کجیستی حاصل ہے اور لکھا ہے کہ تمام مسلمان آں اراہل اسلام بر عقیدہ حق تعالیٰ سنت و جماعت اند۔ و نشانے از اہل بدعت و خلافت دہل و یار پیدا نیست۔ لیکن اب شیعوں کی آمد سے یہ فضیلت و کجیستی جاتی رہی ہے۔

دوسری طرف ہندو اچانیت نے مسلمانوں کے لیے (جیسا کہ ہم تفصیل سے آگے چل کر بتائیں گے) طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ آپ نے شاعر اسلام کے احترام پر زور دیا۔ امر اور اراکین سلطنت کو اس کی تلقین کی۔ خود اپنی زندگی میں اسلامی نقطہ نظر کے احترام کی بڑی جرات مندانہ مثال قائم کی۔ آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اپنی جرات اور احترام دین سے خلاف شرع احکام کی عملی مخالفت کی۔ آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو جرات دلائی جو دبے بیٹھے تھے وہ دلیر ہو گئے۔ حکمران طبقے میں جو اسلام پسند گروہ تھا، اسے تقویت ملی۔ اور جو غیر اسلامی آداب و رسوم دربار شاہی میں عجمی طو کیت کی تقلید میں یا ہندو اثرات کی وجہ سے رائج ہو گئی تھیں، ان کے انارے کا سامان ہوا۔ اور شاعر اسلامی کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا۔

حضرت مجدد نے خود احیاء اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا وسیع نظام قائم کر دیا۔ جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدرا خلفا تھے جو ہندوستان کے کونے کونے میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ان ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا۔ آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلے میں

مجددی تذکرہ نگاروں کا یہ خیال کہ جہانگیر حضرت کامریہ ہو گیا تھا اور ان نے آپ کے حسب الحکم تمام شرعی احکام جاری کرائے قابل قبول ہیں شیخ مجدد کے ان مکتوبات سے جو آخری سالوں میں لکھے گئے، یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ اس زمانے کے حالات سے بھی بالواسطہ متاثر تھے اور شاید سمجھتے تھے کہ ظہور قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ ایک خط میں صاحبزادگان کو لکھتے ہیں۔ ”قیامت قریب ہے اور ظلمتوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ کہاں خیریت اور کہاں نورانیت۔ شاید حضرت ہمدی علیہ الرحمون خلافت ظاہری کی تائید پاکر اس کو رواج دیں گے۔“ (دفتر سوم مکتوب ۱۱) اسی زمانے کا ایک اور خط ہے۔ ”یہی باعث ہے کہ ہزار سال کے بعد از ہیرا غالب آگیا ہے اور سنت اسلام کا نور باندھ دیا گیا ہے۔“ (دفتر سوم مکتوب ۹۶)

اتباع شریعت اور ترویج سنت کا جوش دوسرے سلسلوں سے زیادہ ہے۔

نقشبندیہ (مجددیہ) سلسلہ کے کامیاب طریقہ اشاعت اور اس سلسلے کے مشائخ کبیر کے خلفاء کی کثرت کا ایک مبارک نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے سارے حصوں میں اہل ذوق اس سے منسلک ہو گئے اور ایک روحانی یکسانیت اور تنظیم کے آثار نمایاں ہوئے۔ نظامی سلسلے کی اشاعت کے بعد رشتا داری سلسلے کو چھوڑ کر جس نے قوم کے مرکزی روحانی نظام میں جگہ حاصل نہ کی، یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ سارے ملک میں ایک روحانی نظام نے اقتدار حاصل کر لیا۔ بنگال میں حضرت مجدد الف ثانی کے محبوب خلیفہ شیخ حمید دانشمند بنگالی ارشاد و ہدایت کے بڑے مرکز تھے۔ سندھ میں ان کے پوتے شیخ سیف الدین کے ایک خلیفہ مخدوم ابوالقاسم نے اس طریقے کی اشاعت کی اور ان کی کوششوں کو خدا نے اس طرح مقبولیت دی کہ اب اس علاقے میں یہ سلسلہ اگر سرور دی اور قادری سلسلوں پر غالب نہیں تو ان سے کسی طرح پیچھے بھی نہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے سلسلے اتباع شریعت سے عاری تھے۔ یا ان کی جو خاص خوبیاں تھیں، ان کی روحانی اور اخلاقی سر بلندی کے لیے ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بسا اوقات تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض دوسرے سلسلوں (مثلاً چشتیہ) میں خواہر شرعی کی پابندی پر اتنا زور نہیں، لیکن ان کی مستند کتابیں پڑھیں تو جتنا زور باطنی اصلاح اور اخلاقی پاکیزگی پر ان میں نظر آتا ہے، سلسلہ مجددیہ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ مثلاً اگرچہ فوائد الفواد میں وہ معارف عالیہ اور علمی مسائل نہیں، جو طریقہ مجددیہ کے شاہکاروں میں ہیں، لیکن اخلاقی پاکیزگی اور سر بلندی پر جو جگہ زور دیا گیا ہے (خواہ وہ حضرت بایزید بسطامی کے یہودی دوست کے بیانات کو دہرا کر ہو۔ یا لاہور کی تباہی کو وہاں کے تاجروں کے ضعف دیانت سے متعلق کر کے ہو) مجددیہ سلسلے کی کتابوں میں (اس موثر انداز سے اور اس تکرار کے ساتھ) شاید ہی ملے اور قومی اور انفرادی بلندی کے لیے اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بلکہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق کی اصل تشریح ہے۔ سندھ میں پرانے باثر سلسلے ہی دو تھے۔ چشتیہ سلسلے کو سندھ میں کبھی فروغ نہیں ہوا۔ (مکملہ مقالات الشراصر ۱۸۴)

مخدوم صاحب کو مرشد نے نور الحق کا خطاب دیا تھا، لیکن چونکہ اس سلسلے میں نقشبندی سلسلے کی اصل اشاعت انھوں نے کی اس لیے سندھ میں انھیں حضرت نقشبندی صاحب کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے مخدوم آدم صاحب بھی نقشبندی سلسلے میں منسلک تھے اور مخدوم ابوالقاسم نے سرسبز جانے سے پہلے ان سے کسب فیض بھی کیا، لیکن مخدوم آدم سے سلسلہ بہت چلا نہیں اور مخدوم ابوالقاسم کے پاس تو لوگ ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے۔ اور نقشبندیہ سلسلہ نے اس ملک میں جڑ پکڑ لی۔ آپ عقیدتمندوں میں سورت اور دوسرے علاقوں کے لوگ بھی تھے، لیکن آپ کا اصل کام سندھ میں نقشبندیہ سلسلے کی اشاعت ہے۔ آپ کے ماننے والوں میں "حضرت عماد العلماء الربانی وقدرہ المفسرین والمحدثین مخدوم محمد معین" سندھی ہیں، جنھوں نے شاہ ولی اللہ سے درس حدیث حاصل کیا، بلکہ مکملہ مقالات الشعرا میں مخدوم خلیل تقویٰ نقشبندی لکھتے ہیں کہ جب مخدوم محمد معین نے مخدوم ابوالقاسم کی تعریف میں رسالہ لکھنا چاہا تو انھوں نے اجازت نہ دی۔ مخدوم ابوالقاسم کی وفات ۱۲۶۶ھ میں ہوئی۔

سابق پنجاب اور افغان علاقے میں تو مجددی سلسلہ کو اس سے بھی بڑھ کر فروغ ہوا۔ اس کا زور دار آغاز حضرت مجدد کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، لیکن آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم اور خلیفہ شیخ آدم بنوری نے کام کو بڑی وسعت دی۔ جنوب میں برہان پور مجددیہ نقشبندیہ طریقے کا ایک بڑا مرکز تھا، جس کی سربراہی میر محمد نعمان اور خواجہ ہاشم کشمی جیسے بزرگوں نے کی۔ غرضیکہ تمام ملک میں ایک منظم طریقے سے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ پھیلایا ہوا تھا۔

بواثرات حضرت مجدد الف ثانی کی بدولت اسلامی ہندوستان میں عام ہوئے، انھی کا فیض یہاں کی سرحدوں سے گزر کر باقی عالم اسلام کو پہنچا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے قدیمی خلیفہ تاج الدین سلجھلی نقشبندیہ طریقے کے حجاز پہنچے اور وہاں کثرت سے اس سلسلے کی اشاعت کی، لیکن شیخ تاج الدین کا طریقہ تھا

نقشبندیہ باقویہ۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اور اصل زور تزکیہ نفس اور اصلاح حال پر تھا۔ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں جلالی شان غالب تھی۔ اس کا طریقہ کلہ احیائی تھا۔ اس کی اشاعت کا ایک اہم ذریعہ مکتوبات امام ربانی تھے، جن کا جلد ہی عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اور دوسرا ذریعہ خلفا و مرید۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سید المرحان میں حضرت مجدد کی نسبت لکھتے ہیں: "سلسلہ ان کا ہند سے ماوراء النہر اور روم، شام و عرب تک پہنچا۔ تصنیفات میں ان کی مکتوبات تین جلدوں میں ہیں۔۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ بعض علماء نے ان کے مکتوبات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ میں نے یہ عربی ترجمہ نہیں دیکھا۔" حضرت خواجہ باقی باللہ خود کابل کے رہنے والے تھے اور انھوں نے تعلیم ماوراء النہر میں پائی تھی۔ اس لیے ان کے خلیفہ اعظم کے طریق کار کی افغانستان اور ترکستان میں اشاعت قدرتی تھی۔ چنانچہ ان کے ماننے والے ان علاقوں میں بہت ہیں۔ مثلاً موجودہ افغانستان کے سب سے بڑے روحانی بزرگ حضرت نور المشائخ اسی سلسلے سے متعلق ہیں۔ حجاز اور خلافت عثمانیہ میں اس سلسلے کی اشاعت کو حضرت مجدد کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم کے سفر حج سے بہت تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن خلافت عثمانیہ میں طریقہ مجددیہ کی سب سے وسیع اشاعت انیسویں صدی میں ہوئی۔ جب حضرت خالد کردی نے دہلی میں ایک سال رہ کر شاہ غلام علی قدس سرہ سے یہ طریقہ اخذ کیا۔ اور واپس جا کر عراق، شام، اناطولیہ میں اس کی بڑے زور اور کامیابی سے اشاعت کی حضرت خالد کردی خلافت عثمانیہ کے آخری دور کے بہت بڑے بزرگ تھے اور انھوں نے (اہل شرع کی مدد سے) طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کو سلطنت کا سب سے بااثر صوفی طریقہ بنا دیا۔ خاص طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت کے علاوہ حضرت مجدد کی تعلیمات عام ہونے کا ایک بڑا نتیجہ احیائی اور شرعی رنگ کا غلبہ تھا جو آہستہ آہستہ عالم اسلام میں ظاہر ہوا۔ اس میں متحدہ اثرات کو دخل تھا اور ابھی اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے، لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ احیائی رنگ کی مقبولیت اور وہابی

تحریک کے لیے مختلف اسلامی علاقوں میں زمین کو ہموار کرنے میں شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی تحریک کا بڑا دخل تھا۔

صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمت

مکتہ چینوں کی بھی کمی نہیں اور ان میں بڑے بڑے متقی پرہیزگار اور قابل عزت بزرگ شامل ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہی میں مکتوبات کی وجہ سے علماء نے ان کے خلاف جہانگیر کے پاس شکایت کی تھی اور ان کے معترضوں میں شیخ عبدالحق محدث جیسے فاضل اور دیندار بزرگ تھے، لیکن یہ سلسلہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ ان کے بعد بھی کئی اور بزرگوں نے مکتوبات کے اندراجات اور مجددی بزرگوں کے دعویٰ پر اعتراض کیے ہیں اور حضرت مجدد کے مشہور معتقدوں نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے کئی خطوط ان شبہات کے ازالہ کے لیے لکھے گئے۔ اور شاہ ولی اللہؒ کا ایک اہم خط بھی جو انھوں نے اپنے ایک عزیز الاہتمام خواجہ محامین کی تشقی کے لیے لکھا۔ اسی مسئلے کے متعلق ہے۔

صوفیہ کے اختلاف تو ایک حد تک حضرت سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود

لے مکتوبات کے بعض اندراجات پر عبدالمکیری میں بھی اعتراض ہوئے تھے، بلکہ عالمگیر کی طرف سے بعض ایسے خط حضرت قیوم ثالث وغیرہ کو لکھے گئے جن میں مجددی حضرات جلی بتاتے تھے اور جہاں لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر خلاف شرع ہیں اور تمام علماء نے متفق ہو کر اس بات کا فتوے دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا جائے۔ چنانچہ عبدالمکیری میں علماء کا ایک محضر بھی بلایا گیا جس میں مکتوبات پر بحث ہوئی۔ (روضۃ الشیوہ رکن سوم صفحہ ۷۳-۷۴) معارج الولاۃ میں قاضی شیخ الاسلام کا وہ مراسلہ درج ہے۔ جس میں اورنگ زیب کے حسب الحکم مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ خط جعلی نہ تھے۔ لیکن عالمگیر اس بعد بھی سلسلہ مجددیہ کا بڑا مقلد نظر آتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ نقشبند ثانی کے خطوط سے ظاہر ہے۔

کی وجہ سے ہے، جس کی مدد سے آپ نے ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود کو اسلامی عقائد سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ لیکن علماء کو زیادہ اعتراض ان دعویٰ پر ہے جو آپ کے بعض واقعات اور احوال سے اخذ ہوتے ہیں۔ ہم مکتوب یازدہم کی اس عبارت کو نقل کر چکے ہیں۔ جس کی بنا پر عہد جہانگیری میں شور و غوغا بلند ہوا تھا اور جس کی تشریح و توضیح حضرت سرہندی نے کئی جگہ کی ہے، لیکن معترضین اس عبارت کے علاوہ اور بھی کئی اندراجات کی شکایت کرتے ہیں۔ خواجہ محمد امین نے مکتوبات کی اس عبارت کی توضیح چاہی تھی، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ (استغفر اللہ) رسول اکرمؐ اپنی وفات سے ایک ہزار سال بعد ایک فرد اہمیت (حضرت مجدد) کی وجہ سے مقام خلیلی سے مستجاب ہوئے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

”بلادرعزیز القدر خواجہ محمد امین اگر رحمہ تعالیٰ بشہودہ سوال کردہ بودند کہ حضرت شیخ مجدد قدس اللہ تعالیٰ سرور العزیز در مکتوب خود و چہارم از جلد ثالث و غیر آن نیز تصریح کرد اند۔ بآنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بعد ہزار سال بواسطہ بعض افراد اہمیت مقام خلقت حاصل شد و دعائے اللہ صلی علیہ وسلم کے محکمہ کما صلیت علی ابیہی و مستجاب گشت۔ و بشارہ مفہوم میگردد کہ مراد انان فرد ذات حضرت مجدد است و اس مقدمہ بظاہر مورد اشکالات کثیرہ است۔ انان جملہ آنکہ تو تہذیب فردے از افراد اہمیت در حصول مقام خلقت کہ از اعلیٰ مقامات است مستلزم فضل اور بر ذات حضرت خاتم الانبیاء است علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات۔“

حضرت مجدد نے اس خیال کا اظہار تیسری جلد میں ہی نہیں، بلکہ دوسری جلد کے چھٹے مکتوب میں بھی کیا تھا اور ان کی زندگی میں ہی پڑھنے والوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ ان کے مشہور خلیفہ اور سوانح نگار اعظم کشمی نے اس کی توضیح چاہی تھی اور اسی جلد کے ستاویں مکتوب میں حضرت مجدد نے جواب لکھا تھا۔ آپ نے پوچھا تھا کہ اس عبارت کے کیا معنی ہیں، جو چھٹے مکتوب میں واقع ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ

میری پیدائش سے مقصود یہ ہے کہ ولایت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ولایت ابراہیمی علیہ السلام کے رنگ میں رنگی جائے اور ولایت محمدی کا حسن ملاحمت ولایت ابراہیمی کے جمال صباحت کے ساتھ مل جائے اور اس انصباغ اور امتزاج سے محبوبیت محمدیہ کا مقام درجہ بلند تک پہنچ جائے۔ اپنے دعوے کے جواز میں حضرت مجدد نے کہا تھا: وہ انتفاع واستفادہ جو صاحب دولتوں کو غلاموں اور خادموں کی جنت سے مقیر ہوتا ہے۔ کوئی ممنوع و مخدور نہیں اور نہ ہی اس میں ان کا کسی قسم کا تصور و نقصان ہے بلکہ صاحب دولتوں کا کمال غلاموں اور خادموں کی خدمت ہی میں ہے۔

شاہ ولی اللہ نے زیادہ ملائم اور قابل فہم طریقے سے اس کی تاویل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: غرض شیخ اثبات اصل غلت است آنحضرت راضی اللہ علیہ وسلم در اول امر بغیر توطا و اثبات خود در فیضان غلت بر بنی آدم بآں معنی کہ بتوسط او بعد ہزار سال مردمان بہتر از ازل غلت یافتند۔

اس طرح کے کئی اندراجات حضرت مجدد کی تصانیف اور سوانح میں ملتے ہیں جنہیں بغیر تشریح و تاویل کے قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جن کی نسبت خود انھوں نے کہا: ”مخدوم۔ ہر کہ اس قسم سخناں نوشتہ است۔ منشاء آں سُکر است۔ و بے مزج سُکر دریں باب دست بقلم نہ بردہ۔“

واقعہ یہ ہے کہ صوفیوں کے احوال و مقامات کا عجیب معاملہ ہے۔ یہ بزرگ صبح و شام ان خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔ جن سے عوام کو برائے نام دلچسپی ہوتی ہے وہ فلاں قضا آئی کھاتے ہیں جس سے جان سلامت رہے۔ زیادہ وقت تنہائی و خلوت اور ذکر و فکر میں گزرتا ہے۔ مراقبے اور دوسرے اشغال اتنے سخت ہوتے کہ دل و دماغ پر ایک خاص رنگ غالب آجاتا ہے۔ نفسیات کا اصول ہے کہ جو شخص سر پر سوار ہو وہی عالم خواب یا عالم انجذاب میں نظر آجاتی ہے۔ چنانچہ انھیں بھی جذبہ بے خودی یا واقعات کے عالم میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں کہ عوام جن کی

دنیا ہی ان سے مختلف ہوتی ہے سمجھ نہیں سکتے اور معترض ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے انکار کرنا، جب تک کہ صاحب احوال ہی اس انکار کا مستحق ہو صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تمام محتاط صوفیہ ان احوال کو جو شرع اور عقل کے موافق نہ ہوں اور جن کی مناسبت تاویل نہ ہو سکے، فاسد سمجھتے ہیں۔ مُرشد کو ان احوال کا من و عن بتا نافذی ہے تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ مرید کے دل و دماغ پر کونسا رنگ غالب ہے اور اس کے تحت الشعور کا کیا حال ہے، لیکن اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں // حضرت مجدد بھی اس نکتے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے کئی خطوط میں ان احوال پر بھر دساہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ایک خط (جلد اول شمارہ ۲۰۷) میں فرما حوام الدین کو لکھتے ہیں :-

صوفیوں کی بیہودہ باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے احوال سے کیا بڑھتا ہے ”وہاں“ وجد و حال جب تک شرع کی میزان پر نہ تولیں نیم جیل سے نہیں خریدتے اور کشت اور الہاموں کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں۔ نیم جو کے برابر پسند نہیں کرتے۔“

شیخ حمید بنگالی کے نام ایک خط (جلد اول ۲۲۱) میں تفصیل سے ان غلط فہمیوں کی تشریح و اصلاح کی کوشش کی ہے جو مقامات عروج میں اپنی فضیلت کے متعلق پیدا ہو جاتی ہیں، اس میں اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ میں ”توبہ و استغفار و انابت سے اتجا کرتا تھا اور عاجزی و زاری سے دعا کرتا تھا کہ اس قسم کے کشف ظاہر نہ ہوں اور اہل سنت و جماعت کے عقائد کے خلاف سر مو منکشف نہ ہو۔“ حضرت مجدد اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ اگر احوال اور غیر معمولی نفسیاتی مشاہدات کو اہمیت دی جائے تو چونکہ ہر ایک انسان کے مشاہدات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک اپنی مشاہدات کو حق ماننے لگا اور شرع و سنت کی پیروی کی ضرورت نہ سمجھکا جس سے رُوحانی اور مذہبی معاملات میں بڑی بد نظمی پیدا ہو گئی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کے اپنے مکتوبات میں ہی ملتی ہے (جلد اول شمارہ ۲۷۳) ان کے نامور خلیفہ میر محمد نعمان اور

بعض دوسرے بزرگوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ رسول اکرم مجلس مولود خوانی کے انعقاد سے خوش ہیں۔ چنانچہ وہ انھیں ترک کرنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت مجدد اس باب سے میں مرزا احسان الدین احمد کو لکھتے ہیں:-

”آپ نے لکھا تھا کہ اگر سماع کے منع ہونے کا مبالغہ مولود کے منع ہونے کو بھی شامل ہے جو احتیہ قصیدوں اور غیر معتہ شعروں کے پڑھنے سے مراد ہے تو برابر عزیر میر محمد نعمان اور بعض اس جگہ کے یار جنھوں نے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ اس مجلس مولود خوانی سے بہت خوش ہیں۔ ان پر مولود کا سننا اور ترک کرنا بہت مشکل ہے۔“

میرے مخدوم: اگر واقعات کا کچھ اعتبار ہوتا اور منامات اور خوابوں کا کچھ بھروسہ ہوتا تو مریدوں کو پیروں کی حاجت نہ رہتی۔ اور طریق میں سے کسی ایک طریقے کا لازم پکڑنا عبت معلوم ہوتا کیونکہ ہر ایک مرید اپنے واقعات کے موافق عمل کرتا اور اپنی خوابوں کے مطابق زندگی بسر کر لیتا۔ اس طرح سلسلہ پیری و مریدی ہم پر ہم ہوجاتا اور ہر لوہوس اپنی وضع پر مستقل اور برقرار ہوجاتا۔“

یہ خیال کرنے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ جن احوال و مقامات کا ذکر حضرت مجدد کے مکتوبات میں ہے وہ انھیں پیش نہ آئے تھے، جو شخص ٹھنڈے دل سے ان کی تصانیف اور حالات پر نظر کرے گا، وہ ان کی بزرگی، علم و فضل اور صاف گوئی کا قائل ہوجائے گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان مقامات کو بڑی اہمیت نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی ان کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ ان میں غلطی کا امکان نہ تھا (شیخ عبدالحق محدثؒ نے تو بعض کا شرع اور سلوک کی رد سے انکار کر کے یہاں تک لکھا ہے ”ظاہر آن است کہ شما دعا خوردہ اید“ لیکن اس سے اس مقام میں کمی نہیں ہوتی۔ جو حضرت مجددؒ کو ہماری روحانی، دینی اور سیاسی تاریخ میں حاصل ہے۔ ان کی بزرگی ان کے کاموں میں ان کی تعلیمات میں ان کے کردار میں اور ان کی بلند پایہ تصانیف میں ہے۔ ان

مقامات اور احوال میں نہیں، جن پر وہ خود اعتماد نہ کرتے تھے اور اعتماد نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے عقیدت مندوں نے بالعموم یہ نکتہ نہیں سمجھا۔ ان کی تعلیمات کو ترتیب دے کر پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ ان کے حالات زندگی ہی صحیح طور پر مرتب نہیں ہوئے۔ زیادہ تو قرآن کے مقامات و احوال پر رہی ہے۔ اور خود بھی ما شاء اللہ مجددیوں نے اپنی طرف سے ایسے واقعات کا اشتہار دیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر ان بزرگوں نے پلانے صوفیوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کی ہے تو کیا انھوں نے مبتدیلین اور خوش اعتقادوں کو الجھانے کا اس سے زیادہ سامان تو نہیں پیدا کر دیا!

احوال و مقامات پر بھروسہ رکھنے سے انسان جن خام خیالیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے، جو حضرت مجددؒ کے جانشین خواجہ محمد مصطفیٰ نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے والد کے ایک مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی نسبت لکھا۔ بعض نامکمل اولاد حور سے سالک اپنے خواب اور واقعات پر لگن کر کے اکابر دین کی برابری کرتے ہیں، لیکن برابری کہاں۔ ان سے برابری کی خواہش ایک خیال محال ہے جو محض نادانی اور خام خیالی ہے۔ بہت سے نادان از روئے جہل مرتب اپنے واقعات پر بھروسہ کر کے خیالات فاسدہ میں خود بھی مبتلا ہیں اور اوروں کو گمراہ کر دیا ہے۔ ایسے لوگ گمراہ ہیں۔ انھوں نے ضائع کیا کھویا اور گنوا یا۔ اصل تو درگاہ ابھی شاخ کے خیال تک کو نہیں پہنچے۔ محض خواب میں ہیں۔ ان کی مثال چوہے کی ہی ہے جو بولہ کی گانٹھ پر پسنداری بن بیٹھتا ہے۔

قومیت کا نظریہ جس کے متعلق مکتوبات امام ربانی میں کوئی واضح انداز نہیں نہیں ملا، لیکن جسے حضرت مجددؒ کے بعض عقیدت مندوں نے بڑی تفصیل سے مدقن کیا ہے۔ اسی ذہنیت کا ایک کرشمہ تھا۔ قیوم کون ہوتا ہے۔

معلوم اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماتحت تمام اسماء صفات شیونات اعتبارات اور
اصول ہوں اور تمام گوشہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان۔ وحوش۔ پرندہ
نبات۔ ہر ذی نور۔ پتھر۔ درخت۔ بحر و بر کی ہر شے۔ عرش۔ کرسی۔ لوح۔ قلم۔
ستارہ۔ ثوابت۔ سورج۔ چاند۔ آسمان۔ بروج سب اس کے سامنے ہیں ہوں۔
افلاک و بروج کی حرکت و سکون۔ سمندروں کی لہروں کی حرکت و درختوں کے پتوں کا
ہلنا۔ بارش کے قطروں کا گرنا۔ پھلوں کا پکنا۔ پرندوں کا چونچ پھیلنا۔ دلی رات کا
پیدا ہونا اور گردش کنندہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار۔ سب کچھ اسی کے حکم سے
ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر
حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں۔ جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل
زمین کو رہتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی کوئی دن کوئی ہفتہ کئی مہینہ
کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے۔ غلہ
کی پیدائش۔ نباتات کا اگلنا۔ غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم
کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔

روئے زمین پر جس قدر زاہد، عابد، ابرار اور مترب، تبسیم، ذکر، فکر، تقدیس اور
تزویر میں عبادت گاہوں، بھونپڑوں، گٹیوں، پہاڑ اور دریا کے کنارے، زبان
قلب، شعاع، سرخشی، اخفی اور نفسی سے شاغل اور متکلف ہیں اور حق تعالیٰ
کی راہ میں مشغول ہیں۔ سب اسی کی مرضی سے مشغول ہیں۔ گواہیں اس بات
کا علم نہ ہو۔ اور جب تک ان کی عبادت و قیوم کے ہاں قبول نہ ہو، اللہ تعالیٰ کہاں
قبول نہیں ہوتی۔ (روضۃ القبریہ جلد اول ص ۹۴)

حضرات مجدد ویر چارہ بندگان کی قیومیت کے قائل ہیں۔ قیوم اول حضرت مجدد
الف ثانی۔ قیوم ثانی خواجہ محمد معصوم۔ قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند۔ قیوم رابع خواجہ محمد زبیر
اور ان کے بعد بھی بعض بندگان (مثلاً شاہ ابوسعید) کے حالات میں تفویض قیومیت کا
ذکر ملتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ قیوم کو صفات نبوی سے نہیں منسوب کیا گیا

سے متعین کیا جاتا ہے۔ کوئی آیت کوئی حدیث اس نظر سے کی قطعی تائید میں پیش نہیں کی
جاتی۔ عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی، لیکن کشف اور صوفیانہ احوال کے زور پر یہ دعویٰ
کیا جاتا ہے اور عقیدت مندان لیتے ہیں۔

حالی نے کیا خوب کہا ہے :-

کے غیر گریب کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بٹیا خدا کا تو کافر
کے آگ کو اپنا قبیلہ تو کافر کو اکب میں مانے کر شمر تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں

پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پر دن رات ندیں چھائیں شہیدوں سے جا بجا کئے گئیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے

نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جالے

استدراک

روئے کوثر کی تیسری اشاعت کے بعد مجددی سلسلہ کے دفاتر بزرگوں نے قیومیت
کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، جس سے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب جعفری ہمارے مندرجہ بالا اظہار خیال سے
شدید اختلاف ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :-

”قیومیت، مقامات عروج سے متعلق ہے۔ اور سلسلہ عالمیہ نقشبندیہ جو حضرت خواجہ
باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک لطائف سبعہ، نفی اثبات، تحلیل سلسلی، مراقبہ
احدیت، پھر مراقبات، مشارب اور مراقبہ معیت تک محدود تھا وہ حضرت مجدد رحمۃ
اللہ علیہ کی برکت سے ولایت کبریٰ، مراقبات کمالات نبوت و رسالت و اولیٰ اعظم
مراقبہ حقیقت کعبہ، حقیقت قرآن، حقیقت صلوٰۃ، معبودیت صرف، حقیقت

ابراہیمی حقیقت موسوی حقیقت محمدی حقیقت احمدی محبوب مرقہ اور لاتعلیق کے مقامات تک وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ چیزیں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طفیل میں ان کے وابستگان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اعلان کے متعلق کسی نظریاتی بحث و تمحیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی اس مضمون میں نہیں ہونا چاہیے۔

محرمی ڈاکٹر صاحب کا اپنا انداز خیال تو مندرجہ بالا اندراج سے ظاہر ہے، لیکن شاید ان سطور کے لکھنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ مسئلہ قیومیت پر نظریاتی بحث و تمحیص اتنی غیر ضروری نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ کو زحمت دی۔ جو نہ صرف دہلی کی مشہور تاریخی خانقاہ (خانقاہ شاہ غلام علی) کے سجادہ نشین ہیں۔ بلکہ بھارت کے اہل علم میں بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس مسئلے پر ایک مفصل مدلل اور منصفانہ مضمون لکھا۔ جسے محرمی ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسالے کے ساتھ بطور غمیمہ کے شائع کر دیا۔

مولانا زید صاحب کے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ قیومیت ولایت کا ایک بلند مرتبہ ہے۔ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی۔ اور ضرورت پیدا ہوئی کہ مراتب عالیہ کا علیحدہ علیحدہ ظہور ہو۔ چنانچہ جب بھی جس عہدہ کے ظہور کا وقت آیا وہ عہدہ ظاہر ہوا۔ یعنی قلب، غوث وغیرہ اور قیومیت کا ظہور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہ السامی کی مبارک ذات سے ہوا۔ محرم مضمون نگار نے جن تفصیلی دلائل سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے ان سب کو یہاں دہرانا مشکل ہے، لیکن انھوں نے اس مضمون میں روضۃ القیومیہ اور بالخصوص اس اندراج پر جو ہم اوپر درج کر چکے، سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اسے نقل کرنا غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب کی عمومی صحت کے

لے اب اسے خانقاہ مظفریہ کہتے ہیں لیکن یہ وہی بابرکت مقام ہے جو تاریخ میں خانقاہ شاہ غلام علی یا مرت خانقاہ کے نام سے معروف ہے۔

متعلق وہ لکھتے ہیں:-

”مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب روضۃ القیومیہ کا ذکر کر دیا جائے۔ کیونکہ قیومیت کے سلسلے میں بعض افراد اس کتاب کی عبادت سے متحرک ہو گئے ہیں۔ اور ان کا متحیر ہونا اپنی جگہ صحیح ہے۔ یہ کتاب جناب محمد احسان مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ حضرت خواجہ محمد زبیر کے خلیفہ تھے۔ اور وہ اپنے دادا حضرت خواجہ محمد نقشبند رحمۃ اللہ کے اور وہ اپنے پدر بزرگوار حضرت خواجہ محمد مصوم قدس اللہ سرہم کے۔ ان کو اپنے پیرو مشد سے کامل عقیدت تھی۔ دقائقی علمیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس اللہ سرہ نے ان کو ایک خط لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:- ”آپچہ از اسواہل شہود و شہداء اند کہ ہر ذرہ ظہور ذات اللہ تھا و تقدس معلوم می شود۔ و اس را توحید متعارف دانستہ اند غلط است۔ روضۃ قیومیہ میں بھی ان سے تفرشیں ہوئی ہیں۔ بعض واقعات بھی صرف از وجہ سماع قلبیہ کر دیے ہیں، حالانکہ وہ صحیح نہیں ہیں۔ بنا بریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ قیومیت کے سلسلے میں ان کا مسلک جادہ صواب سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے بعد قیوم کے متعلق روضۃ القیومیہ کی اس عبادت سے جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے، کچھ اقتباس دے کر مولانا زید صاحب فرماتے ہیں:-

محمد احسان صاحب بموجب اس اردو ترجمہ کے جو پیش نظر ہے، نہ حضرت علی قدر کے کلام کو سمجھتے ہیں اور نہ قیوم کے مرتبہ کو۔ انھوں نے اسماء صفات، شہوات، اصول اور تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات کے متعلق لکھ دیا کہ سب اُس کے سایے میں ہوں۔ العباد یا اللہ من هذا القول الفاسد۔ بھلا اسماء و باری تعلق اور اس کی صفات و شہوات کس کے سایہ میں آسکتے ہیں۔ اصل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انبیاء اور ملائکہ کے لیے تجلی صفات اسل ہے۔ باقی افراد کوئی کے لیے تجلی صفات کا ظل اصل ہے۔ بھلا تجلیات صفات یا ظلال تجلیات صفات پر کون حاوی ہو سکتا ہے۔ استغفر اللہ۔ اور لکھا ہے تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات الخ

یہ اللہ کے بندے انسانہ سمجھتے کہ تمام گزشتہ مخلوقات میں صحابہ کرامؓ انبیاء عظامؓ ملکہ
علی مقام اور سوار دو جہاں محبوب کبریا جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ السلام
جیسے انبیاء و المرسلین و جمیع عباد اللہ الصالحین و بارک وسلم بھی شامل ہیں۔ حالانکہ بڑے
سے بڑا ولی بھی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاک پاکی برابری نہیں کر سکتا چہ جائیکہ
انبیاء علیہم السلام (کی)

ہم نے سطور بالا میں لکھا تھا کہ نظریہ قیومیت کے متعلق ہمیں مکتوبات امام ربانی میں
کوئی واضح اندراج نہیں ملا اور کوئی آیت کوئی حدیث اس نظریے کی قطعی تائید میں
پیش نہیں کی جاتی۔ کتاب کی اشاعت کے بعد ہمیں دفتر دوم کے مکتوب ۱۴۱ اور دفتر
سوم کے مکتوب ۱۴۲ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مؤرخ الذکر میں حضرت مجدد کی خلعت
قیومیت خواجہ محمد معصومؒ کو منتقل ہونے کا بیان ہے۔ اور پہلے مکتوب میں دو آیات
قرآنی کی تاویل و تشریح سے قیومیت کا نظریہ مستنبط ہوتا ہے۔ ان دو آیات میں سے زیادہ
متعلقہ وہ مشہور آیت ہے جس کا اردو ترجمہ ہے: ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین
اور پہاڑوں کے پیش کی لیکن انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے
ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ یہ بڑا ہی ظلم اور جاہل ہے۔ اس آیت کی
توضیح کرتے ہوئے حضرت مجدد قیوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

”آں امانت بزعم ایں حقیر قیومیت جمیع اشیاست۔ بر سبیل نیابت کہ مخصوص بہ نقل
افراد انسان است۔ یعنی معاملہ انسان کا مل تا بجائے میرسد کہ او را قیوم جمیع اشیاء کل
خلافت می سازند۔ و ہمد را فاضلہ وجود و بقا و سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او
میرسانند۔ اگر ملک است باو متصل است۔ و اگر انس و جن است باو متشعب است“
(دفتر دوم مکتوب ۱۴۱)

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

— عارفہ کہ بہ منصب قیومیت اشیاء مشرق گشتہ است حکم ذیہ دارد کہ مہمات
مخلوقات را باو مرجع داشتہ اند۔ ہر چند انعامات از سلطان است اما وصول آئینہا

بتوسط وزیر است (ایضاً)

ان اندراجات سے بظاہر ہمارے اس بیان کی کہ نظریہ قیومیت کی تائید میں کوئی آیت
پیش نہیں کی جاتی۔ تغلیط ہوتی ہے (اور یہ صحیح ہے کہ اصل تحریر کے وقت ہماری نظر میں
یہ مکاتیب نہ تھے)۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آیات قرآنی کی اس تاویل و تشریح کو پڑھتے وقت
وہ عربی جملے ذہن نشین رکھنے چاہئیں جو حضرت مجدد نے اس سے پہلے حقیقت حال
کو واضح کرنے کے لیے لکھے۔ ان کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:-

ان دونوں آیتوں کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن ہم تاویل بیان کرتے ہیں
جو ہم بظاہر ہو گئی ہے۔ یا اللہ تو ہماری بھول چوک پر مواخذہ نہ کر۔

۱۔ اردو ترجمہ مکتوبات امام ربانی جلد دوم ص ۱۴۱

کیا اس ابتدائی عبارت سے یہ امر واضح نہیں کہ حضرت مجدد کو اس ترجمانی پر جسے
وہ تاویل کہتے ہیں یقین نہ تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر اس محلے میں
ان سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے تو اس پر ان سے مواخذہ نہ کیا جائے؟

روضۃ القیومیہ کی عبارت پر مولانا زید ابوالحسن صاحب مدظلہ نے جو تبصہ کیا ہے
اس سے ایک حد تک صورت حالات کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن کیلئے تہنہ ہو کہ حضرت
مجدد نے ابتدائی عربی عبارت میں جو وضاحت کی ہے اسے زیادہ اہمیت دی جائے۔
اور یہ خیال کر کے کہ مفسرین میں سے کسی (یا کم از کم سواد اعظم) نے متعلقہ آیت کریمہ کی یہ
تاویل نہیں کی۔ قیومیت کو اموال مشتبہ میں شمار کیا جائے؟ ہماری حقیر رائے میں یہ انداز فکر
حضرت مجدد کی ابتدائی عربی عبارت کے مطابق ہوگا۔ روضۃ القیومیہ میں خواجہ محمد معصومؒ
کو قیوم ثانی قرار دیا ہے۔ اور ان کے ایک مکتوب (دفتر اول ص ۸۴) میں خلعت قیومیت
کے حصول اور اس مرتبہ کے متعلق ایک تفصیلی بیان ہے۔ لیکن ان کے آخری ایام کا
ایک خط ہے (دفتر سوم ص ۱۹۵) جس میں اس قسم کے خطاب پر اظہار ناراضگی فرمایا
ہے۔ شیخ محمد خلیل اللہ کو لکھتے ہیں:-

.... دیگر نوشتہ بودند ”اگرچہ اس حکم ببار یا فنگان جناب قیومیت ہے ادبی است الخ“

فقیر باقی قسم عبارت کہ در بارہ این دو مدار کار نبوسند و امنی نیست۔ (گزشتہ صفحہ)
گزشتہ۔ من بعد نخواہند نوشت۔۔۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں خواجہ محمد مصطفیٰ قیومیت سے اپنی نسبت کے اظہار کو ناپسند کرتے تھے۔ افسوس کہ متاخرین نے یہ طریق کار اختیار نہ کیا۔ بعد میں قیومیت کے نظریے کو جس طرح وسعت دی گئی۔ وہ روضۃ القیومیہ سے ظاہر ہے۔ قدرتی طور پر یہ طریق کار علما کو کھٹکتا ہے۔ قیومیت کے مسئلے پر علما کی (آپ انھیں علمائے ظاہر کہہ لیجیے) جو رائے ہے اس کا اندازہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک جملہ سے ہو سکتا ہے۔ ”معاذ اللہ“۔

وہ رسالہ تجدید و احیاء دین (اشاعت اول) کے ص ۷۷ پر لکھتے ہیں ”حضرت مجدد صاحب کی وفات پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان کے حلقہ کے لوگوں نے ان کو قیوم اول اور ان کے خلفا کو قیوم ثانی کا خطاب عطا کر دیا۔ معاذ اللہ“۔

روضۃ القیومیہ | جناب مولانا زید الرحمن فاروقی صاحب مدظلہ نے اپنے ارشادات میں روضۃ القیومیہ کے مصنف جناب محمد اسلم مجددی کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ انھوں نے ”بعض واقعات بھی صرف از وجہ سماع قلمبند کر دیے ہیں۔ حالانکہ وہ صحیح نہیں۔ بنا بریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔“ جہاں تک اہل نظر خواص کا تعلق ہے ان کا فرمانا بجائے لیکن سطحیت اور جذباتیت کے اس دور میں اہل نظر کتنے ہیں؟ عام طور پر اس کتاب کو قابل اعتنا بھی نہیں سمجھا گیا، بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے تو زبدۃ المقالات اور حضرات القدس جیسے معاصرانہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے کبار کے لکھے ہوئے تذکروں کو چھوڑ کر جمع حالات اور نقطہ نظر میں روضۃ القیومیہ کو چراغ راہ بنایا ہے۔ پروفیسر محمد فرمان صاحب (جنھوں نے حضرت مجدد کے حالات و خیالات کو زیادہ تر مکتوبات کی روشنی میں جمع کیا ہے) روضۃ القیومیہ کی نسبت لکھتے ہیں۔ ”اسی کتاب پر حضرت مجدد الف ثانی کے اکثر

سوانح نگاروں نے انحصار کیا ہے۔۔۔۔۔ نقشبندی حضرات کے ہاں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہے“ (حیات مجدد ص ۲۹۱) بعض بلند پایہ اور اہل علم مجددی بزرگوں کو بھی اس کتاب کا نقطہ نظر اور اس کی روایات جس قدر عزیز ہیں اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے ایک مشہور و معروف فاضل ”علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری“ کی سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی نسبت ”جس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیہ کا ملخص ہے“ لکھتے ہیں۔ ”حضرت مجدد کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجدد کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔“ مولانا احسان اللہ نے اپنی کتاب کے ابواب و اندراجات کی ترتیب جدید طریقہ سے اور مذاق حال کے موافق کی۔ ایک اہم کام یہ کیا کہ مکتوبات امام ربانی کے ”تینوں دفتروں کے ایک ایک مکتوب کا حوالہ اور اس کا عنوان اردو میں دیا ہے۔“ دور رساں (یعنی مبدا و معاد اور معارف لدنیہ) کا بھی کارآمد خلاصہ درج کتاب کیا، لیکن جہاں تک ”حضرت مجدد کے حالات“ کا تعلق ہے، مولانا احسان اللہ کی کتاب روضۃ القیومیہ

اس کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے۔ سب ٹائٹل پر موضوع کتاب کی توضیح ہے۔ ”حضرت شیخ احمد سرہندی ملقب (کذا) بہ قیوم اول و مشہور بہ مجدد الف ثانی کے حالات۔“ لے ملاحظہ ہو تحریر و تقریر (شائع کردہ حکیم محمود الزمان لطیف آباد۔ حیدر آباد) ص ۱۵۹

لے ایضاً۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ پروفیسر (محمد فرمان) صاحب نے (حیات مجدد میں) صرف یہ کیا ہے کہ (مولانا احسان اللہ عباسی کے) انھی عنوانات کو کجا کر دیا ہے۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا احسان اللہ نے فقط عام فہم اندراجات لیے تھے۔ اور اقتباسات کے مطابق عنوانات دے دیے۔ بعض اقتباسات بڑے مختصر ہیں۔ پروفیسر محمد فرمان نے بطور خود مکتوبات کا بڑا فائدہ مطالعہ کیا ہے۔ اور اس مطالعہ میں حضرت مجدد کی تسلیمات اور مذہبی احساسات کے جواہر ہم پہلو نظر آئے۔ انھیں گیارہ بارہ عنوانات کے تحت طویل اقتباسات دے کر ان کی وضاحت کی ہے۔

کی سدا سے بازگشت ہے۔ وہ خود کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں۔ "روضۃ القیومیہ ہر چہ جلد اور مکتوبات کے ہر سہ دفتر دیکھ کر پورے دو ماہ میں میں نے سوانح عمری حضرت مجددؑ کی تیار کر لی" (ص ۱۴) ممکن ہے نظر ثانی کے وقت اور کتابوں سے بھی افادہ کیا ہو لیکن اس میں جو حالات سال بسال درج ہیں، ان کا روضۃ القیومیہ سے موازنہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ مولانا کی کتاب کا سوانحی حصہ مؤخر الذکر کی تلخیص ہے۔ اب اگر ایک مشہور مجددی بزرگ اور نامور اہل علم ایسی تالیف کو حضرت مجددؑ کے حالات کا ایک محققانہ بیان سمجھیں۔ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام الناس میں روضۃ القیومیہ کے قسطے کہانیاں کیسے مقبول ہوں گے۔

چونکہ روضۃ القیومیہ کے اندراجات پر پہلی مرتبہ کڑی تنقید رود کوثر میں ہوئی، اس لیے شاید بجا نہ ہو۔ اگر اقم السطور ایک دو امور کی وضاحت کر دے۔ اس کتاب کے متعلق بڑی دشواری یہ ہے کہ فقط اس کا اردو ترجمہ دستیاب ہوتا ہے۔ اصل کتاب کا ایک قلمی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے لیکن وہاں سے اس کی نقل حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے اس کے متعلق جو کچھ لکھا جاسکتا ہے، وہ اس اردو ترجمہ کے متعلق ہے، جو لاہور سے شائع ہوا۔ اور عام طور پر متداول ہے۔

روضۃ القیومیہ کے اندراجات کثیرہ سے شدید اختلاف کے باوجود یہ اظہار ضروری ہے کہ اگر یہ کتاب احتیاط سے مطالعہ کی جائے۔ اور ان بیانات کو جو مستند تاریخی شواہد یا شرعی اعتراضات کی بنا پر قابل قبول نہیں، نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے بڑے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصنف خاندان مجددیہ سے تھے۔ انھوں نے چار قیومیوں کے حالات دیتے ہوئے، ان کے تمام بیٹوں، بیٹیوں اور خلفاء بلکہ بعض معاصرین کے حالات لکھے ہیں۔ جن کے جاننے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں اور اس طرح سے اس خاندان عالی کا، جس کے متعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے لکھا تھا۔ "سب کے سب شجرہ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں، جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں" (تہذیب)

اس طرح حال بیان کیا ہے کہ اس شجرہ طیبہ کی ٹہنی ٹہنی، بلکہ پتی پتی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک احسان عظیم ہے۔ خدا انھیں اس کی جزا سے خیر دے اور فردگراشتیں درگزر فرمائے۔

مولانا زید الرحمن صاحب نے روضۃ القیومیہ کے غیر صحیح اندراجات کی نسبت تحریر فرمایا ہے کہ وہ بغیر قوی شہادت کے "از وجہ سماع" قلمبند کر دیے گئے۔ عجب نہیں کہ اس میں مؤلف یا ان کے ماخذ کی "تاریخ سازی" کو دخل ہو۔ یہیں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ کتاب مناقب الحضرات کے جواب میں لکھی گئی، جو اس کی تالیف سے چند سال پیشتر شیخ آدم بنوریؒ کے سلسلے کے ایک اہل قلم نے لکھی تھی۔ اس میں حضرت مجددؑ کے اجمالی ذکر کے بعد شیخ آدم بنوریؒ اور ان کے سلسلے کے بعض بزرگوں کے حالات میں اسی قسم کے قسطے بیان کیے ہیں، جو روضۃ القیومیہ میں قیومانِ اربعہ کے متعلق ملتے ہیں۔ مناقب الحضرات کا جو انداز فکر اور "بنیادی نظریہ" ہے، وہ ایک اقتباس سے ظاہر ہو جائے گا۔

بعد از رحلت جہانگیر بادشاہ یک سپردے بر تخت سلطنت نشست۔ محمد خرم شاہ جہاں سپردگیر دے دد دکن بود۔ حضرت خضرؒ نزد حضرت سیدنا و مولانا قدس آد و گفت کہ اس خدمت بر تو مقرر شدہ و حضرت افضل المخلوقات صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم مرانزد تو فرستادہ اند کہ ہرگز اد تجوز کنند پادشاہ باشند۔ ایشان متوجہ شدند مرضی مالک حقیقی جل شانہ و رسول او صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم شاہ جہاں دیدند۔ بحضرت خضرؒ گفتند کہ مرضی چہا نیست۔ وے گفت۔ موقوف بر تجویز تست۔ ایشان شاہ جہاں را مقرر کردند۔ و دہ پاسبانی میبودند۔ ظاہرا هیچ آشنائی باوند نشند۔ (مناقب آدمیہ قلمی ورق ۲۰۲)

"حضرت سیدنا و مولانا قدس سرہ" سے جنھوں نے (مصنف کے بیان کے مطابق) شاہ جہاں کو بادشاہ "مقرر" کیا۔ شیخ احمد بنوریؒ مراد ہیں، جنھیں شاہ جہاں نے سعد اللہ خاں اور ملا عبد الحکیم کے مشورے پر ایک طرح سے ملک بدر کیا اور مکہ معظمہ

روایت کر دیا۔

مناقب المحضرات کے آخر میں اظہارِ احوال کا تفصیلی جواز پیش کیا گیا ہے۔ بالجملہ مصنف کا نقطہ نظر ہے۔ "اظہارِ احوال مناقب و افشاءِ نعم و فضل الہی سکر است و اخفے اوکر"۔ اس عبادت اور بالخصوص آخری بجکے سے اندازہ لگائیے کہ اندازِ خیال حضرت خواجہ باقی باللہ کے نقطہ نظر سے کتنی دور تھا!

مناقب المحضرات جس کا پورا نام ہے مناقب آدمیہ و حضرات احمدیہ نہم محرم ۱۲۵۲ھ کو مکمل ہوئی۔ روضۃ القیومیہ اس کے بارہ سال بعد ۱۲۶۳ھ میں یعنی حملہ نادری کے زمانے میں شروع ہوئی۔ لیکن اس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ دونوں کتابوں کے زمانہ تالیف اور موضوع سے خیال ہوتا ہے کہ شاید روضۃ القیومیہ اکابر سلسلہ آدمیہ کے مقابلے میں بزرگانِ سرہند کے تصرفات نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی۔

روضۃ القیومیہ کے مؤلف خواجہ ابوالفیض کمال الدین محمد احسان کی نسبت حیاتِ مجدد میں پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں۔ "مؤلف کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس خلوص نے غلو کر کے تصوف کی خدمت سے کہیں زیادہ اسے نقصان پہنچا دیا ہے۔" (ص ۲۹۱) ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ لیکن وہ پہلے صوفی تذکرہ نگار نہیں تھے غلو سے نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ فائدہ کم۔ یہ سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث نے بھی حضرت مجدد کی زندگی میں ان کے بعض معتقدین کی غیر مستند حکایات کا ذکر کیا تھا۔ "گفت و گوئے مریدان ایشان کہ در نقل اقوال و ذکر حکایات بے صرف و بے احتیاط"۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث بلوئی)۔ روضۃ القیومیہ نے اس عمل کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کا آغاز نہیں کیا۔

وحدتِ اشہود خواجہ باقی باللہ کی آمد سے پہلے جو صوفی سلسلے ہندوستان میں برسرِ فروغ تھے وہ تمام کے تمام ایران اور ایران کی غلامی سرحدِ عراق کی پیداوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سروردی سلسلہ سرورد سے متعلق ہے جو بغداد سے چند میل کے

فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فردی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی منظر ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ عجیت جو درعباسیہ کو دورِ راموی سے اور بغداد کے شافعی اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین و فقہاء سے منفرد کرتی ہے۔ موجود تھی۔ تینوں میں وہ "صلح کل" کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے کلی پرہیز نہ کیا جاتا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں خداوند کا طریق رائج ہو گیا تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ جس سلسلے کو لے کر ہندوستان آئے وہ ایران نہیں توران کا تحفہ تھا اور مادراء النہر کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلے میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔ سماع کی ممانعت تھی۔ ذکرِ حقی کی تلقین تھی اور فرائض شرعی کو نوافل پر واضح ترجیح تھی۔

نقشبندیہ سلسلہ حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیہ سلسلوں سے ممتاز تھا۔ اول شرع سے بہت قریب تھا لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے سلسلوں سے مختلف نہ تھا۔ جو فرق تھا وہ خواجگانِ بخارا و سمرقند کی آئین پسندی و پسین اور شرعی جوش و خروش کی وجہ سے تھا۔ اور ابھی تک کوئی ایسا صاحبِ فکر پیدا نہ ہوا

۱۔ مرزا غالب نے ایک دفعہ بہادر شاہ کے دربار میں ایک رباعی پڑھی تھی۔

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری

کہتے ہیں وہ مجھ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہو دے صوفی

شیعہ کیونکر ہو مادراء النہری

آخری مصرع پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حالی فرماتے ہیں۔ "جو غصے مسرور کا یہ مطلب ہے کہ مادراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ متعصب شیعہ ہونے میں ضرب المثل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناموسی اور مذہبی سمجھتے ہیں۔" مولانا نے تو فقط ایک پہلو پر تبصرہ کیا ہے لیکن ترکستان کے لوگ ایرانیوں کی نسبت عام طور پر

زیادہ متشدد اور شرع کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

تھا جو نقشبندیوں کو ایک ایسا فلسفہ دے دیتا جو اس معاملے میں بھی انھیں ایک امتیازی رنگ دے کر ان کے خاص رجحانات کے لیے ایک فکری اساس کا کام دیتا۔ یہ کمی حضرت مجدد نے پوری کر دی۔ ان کے ظہور سے پہلے تمام صوفیوں میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا۔ ابن العربی کا فلسفہ وحدت الوجود بیشک اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے۔ بعض انتہا پسند صوفی تو وحدت الوجود میں اتنا غلو کرتے کہ وہ قریب قریب دائرہ اسلام سے باہر آجاتے۔ اور کئی دوسرے فقط اسی حد تک اختیار کرتے جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک ایسا جہاد کا فلسفہ مدون ہوا جو فلسفہ وحدت الوجود کا براہ مقابل ہو سکتا تھا۔ یہ فلسفہ وحدت الشہود و توحید الوجود کے معنوی لحاظ سے وحدت الوجود کی ضد یعنی تنہیہ الوجود کا فلسفہ کہلا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کا مسلک شروع میں وحدت الوجود کا تھا اور گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ان کے دہری جانشین مرزا حسام الدین احمد نے اسے جاری رکھا۔ لیکن حضرت مجدد دیکھتے ہیں کہ آخری ایام میں خواجہ نے یہ مسلک ترک کر دیا تھا "معرفت پناہی" قبلہ گاہی، حضرت خواجہ مقدس اللہ تعالیٰ سرۂ چند گاہ مشرب توحید و جود و دہشت و در رسائل و مکتوبات خود اس را اظہار می فرمودند اما آخر کار حق سبحانہ و تعالیٰ اکیمال غایت خویش ازاں مقام ترقی از زانی فرمودہ بشاہراہ انداختہ از حقیقہ این معرفت خلاصی داد و میال عبدالحق (محدث) کہ از مخلصان ایشانند۔ نقل کردند کہ پیش از مرخص موت بہ یک ہفتہ فرمودند کہ مرا عین الیقین معلوم شد کہ توحید کوچہ ایست تنگ۔ شاہراہ دیگر نیست۔ پیش ازین ہم میدانستم اما اکنون یقین دیگر حاصل گشت۔ و این حقیر نیز کہ چند گاہ در حضرت

لے وحدت الشہود کی کچھ جھلک شیخ علاء الدولہ سمنانی کی تحریروں میں ملتی ہے جو قدیمی خواجگان ترکستان میں بڑے دیدہ و بزرگ تھے۔

لے گلزار ابرار میں خواجہ محمد صدیق بدشتی کا بیان اس واقعہ کے متعلق دیکھیے۔ اور اندازہ لگائیے کہ معتقدین بیان واقعات میں کس طرح بے احتیاطی کرتے ہیں۔

ایشان ایں مشرب توحید داشت و مقدمات کشفیہ در تائید ایں طریق بسیار لائح گشتہ۔ اما عنایت خداوندی جل سلطانہ ازاں مقام گزرا نیدہ، بہ مقامے کہ خواست مشرب گردانیدہ۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اہل مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انھیں توحید عینی اور توحید ظاہری بھی کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک مشہور کتاب تذکرہ غوثیہ میں دونوں کا فرق اس طرح سمجھایا گیا ہے:-

وجود یعنی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لیے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پر تو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر میں ہے ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔ سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَشْيَاءَ وَهُوَ عِنْدَہَا اور اس کثرت اعتباری کا وہ نور اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ اَلْحَقُّ تَحْسُنُ وَتَخْلُقُ مَعْقُول۔

یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے اور وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہور آثار و صفات مختلفہ واحد مطلق کی ذات و صفات کا نقل و عکس ہے جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ نقل عین صاحب نقل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔

مندرجہ بالا تشریح دیکھ کر شاید بعض بزرگ کہیں کہ ان دونوں فلسفوں میں تو کوئی خاص بعد نہیں اور سچ یہ ہے کہ ان مسائل پر فلسفہ اور تصوف کی قبول بھلیاں دیکھ کر بار بار اس ذات حکیم کا فرمان یاد آتا ہے کہ اس ذات اور صفات کے جھگڑوں میں نہ پڑو۔ لیکن فی الواقع یہ دونوں نظریے دو مختلف بلکہ متضاد نفسیاتی رجحانات کے ترجمان ہیں۔ نواب سر احمد مین نظام جنگ بہادر نے اپنی کتاب فلسفہ فقرا میں ان دونوں کے فرق کو ایک نقشہ

کی مدد سے نمایاں کیا ہے :-

وحدت الوجود (ہوا کل)

نظریہ ہمہ دوست یا اندر ہمہ دوست
رجحان تصوف - سکون کی طرف مائل -

میں اور وہ جدا نہیں (وہ دریا
تو میں قطرہ ہوں)

وصل

اعتقاد - میں کون؟ انا الحق (عارف)

وحدت الشہود (ہوا ہادی)

نظریہ ہمہ از دوست

رجحان تصوف - جوش کی طرف مائل -

اس کے ساتھ میں اور میرے

ساتھ وہ ہے -

عشق

اعتقاد - میں کون؟ انا عبدہ (عاشق)

علامہ اقبال نے ایک خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا :-

”حضرت امام ہدائی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن؟ میرے نزدیک مستحق عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے... آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے ستر الوصال کا خطاب دیا تھا تو میرے آپ کو کہا تھا کہ مجھے ستر الفراق کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔“

اقبال نے ستر الفراق کے جس خطاب کی خواہش کی تھی، حضرت مجدد الف ثانی اس سے بھی زیادہ مستحق ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ابن العربی کو ستر الوصال اور حضرت مجدد کو ستر الفراق کہا جائے تو ان کے فلسفوں اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے شیخ ابن العربی کا دوسرے مذہبوں کی نسبت جو طرز عمل ہو گیا، اسے انھوں نے چند عربی اشعار میں بڑی وضاحت سے نظم کیا ہے۔ (ترجمہ)

”آج کے دن سے پچھلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساعتی وہ دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔“

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ اب ایک چراگاہ بن گیا ہے۔

غزالوں کی۔ اور دیر ہے راہبوں کا۔ اور آتش کدہ ہے آتش پرستوں کے لیے اور کعبہ ہے حاجیوں کے لیے اور الواح ہے قورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا۔

میں اب مذہب عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی چاہے مجھے لیجائے میرا دین بھی عشق ہے، میرا ایمان بھی عشق ہے۔“

برخلاف اس کے حضرت مجدد کا دوسرے مذاہب کی نسبت جو خیال تھا، اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ایک ہندو ہر دے رام کو لکھا۔ اور جس میں رام اور رجمان کو ایک سمجھنے کی بڑی خطی سے تردید کی تھی۔

مندرجہ بالا سطور سے حضرت مجدد کے روحانی اسلوب خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ تصوف میں ان کی منفردانہ حیثیت سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا ان میں سے اگر ایک حق پر ہے تو دوسرا ضرور باطل ہوگا۔

یہ دونوں رجحانات مختلف اور متضاد ہیں، لیکن حالات کے مطابق مختلف رجحانات برسر کار آتے ہیں اور جداگانہ حالات میں جداگانہ رجحانات ہی مفید ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی مقولہ ہے :-

“There is a season and time for every purpose under Heaven;”

“A time to love and a time to hate.”

دنیا کی ہر ایک چیز کے لیے کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔

کوئی وقت محبت کرنے کا ہوتا ہے اور کوئی وقت نفرت کا۔

یعنی کسی وقت ستر الوصال کی راہنمائی مفید ہوتی ہے اور کسی وقت ستر الفراق کی یا تصوف کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ کوئی وقت شانِ جمالی کا ہوتا ہے کوئی وقت شانِ جلالی کا۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ نے جو ہمارے سب سے متوازن مزاج اور معاملہ فہم عالم ہوئے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور اسماعیل آفندی کے نام ایک طویل عربی خط میں (جواب مع اردو ترجمہ کے فیصلہ وحدت الوجود والشہود کے نام سے چھپا ہے) شیخ اکبر اور شیخ مجدد کے خیالات کی تطبیق کی۔ شاہ صاحب نے دیکھا ہوگا کہ ایک اصول ہے اخذ و انجذاب کا اور دوسرا فلسفہ ہے تطہیر و تزکیہ کا۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور یکزنگیوں کو دیکھتے ہیں۔ اور دوسروں کی نظر اختلافات پر پڑتی ہے۔ ابن العربی۔ رومی۔ غزالی اور داراشکوہ عیسائی، نو افلاطونی اور ہندو فلسفوں اور طریقوں کو کھنڈ گالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کوئی چیز اچھی ہے اور اخذ کی جاسکتی ہے، لیکن ابن تیمیہ۔ ابن عبد الوہاب۔ مجدد الف ثانی۔ اقبال اور ارتنگ زبیب ان چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ تاکہ جو چیز شرعی معیار پر پوری نہ اترے اسے رد کر دیا جائے۔ اگر پہلا گروہ نہ ہو تو خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے۔ دماغ ایک محدود اور تنگ تاریک دائرے سے باہر نہ نکلے۔ اور خیالات میں وسعت اور لچک نہ رہے۔ اگر دوسرا گروہ اپنا کام بند کر دے تو ہر طب و یا بس، بلکہ طحہ نہ اور مضمر خیالات قبول کر لیے جائیں اور قوم کا نہ صرف شرعی، بلکہ فکری اور روحانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں دونوں اصول کار فرما رہے ہیں۔ وحدت الوجود میں اور حق کو ہر گوشے میں تلاش کرنے والوں نے دوسروں قوموں اور دوسرے طریقوں سے استفادہ کیا۔ اور ان کے قابل اخذ خیالات کو اسلام میں داخل کیا، لیکن جب اس طرح بعض مضمر خیالات اور شعائر بھی رائج ہو گئے اور باہر کے عناصر قومی تحیل پر اس طرح چھا گئے کہ اصل اسلامی احکام نظر سے اوجھل ہونے شروع ہوئے تو ابن تیمیہ۔ ابن عبد الوہاب۔ حضرت مجدد اور اقبال نے اپنا کام شروع کیا اور اسلام کو خیر اسلامی عناصر سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی۔

ظاہری نقطہ نظر سے تو دوسری کوششیں شرع کی پابند اور اسلام کے لیے زیادہ

مفید معلوم ہوتی ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کی روح کے لیے پہلی کوششیں اسی قدر ضروری نہیں؟ اسلام تو وہ مذہب ہے جس نے سابق کے تمام پیغمبروں اور ان کے مذہبوں کو سچا تسلیم کیا ہے اور ان کی نیک اور مفید باتیں اخذ کر لی ہیں۔ کیا یہ امر اسلام کی عین روح کے مطابق نہیں کہ اخذ و انجذاب کا یہ اصول جاری رہے اور جو باتیں اسلام کے بنیادی اصولوں کے متناقض نہیں، ان میں وسیع النظری سے کام لیا جائے اور حقیقت کو ہر گوشے میں تلاش کیا جائے؟

حضرت مجدد اسی زمانے میں پیدا ہوئے، جب ہندو حیثیت اور کبر و اہمیت کی مصلحت کوشیوں سے اسلام کے لیے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اسلامی معاشرے کو بچانے کے لیے ہر الفراق کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ اصول وحدت الوجود کی بالکل نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے 'وحدت الشہود' سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا ہے۔

حضرت مجدد اور شیخ ابن العربی | حضرت مجدد نے بعض جگہ شیخ ابن العربی کی کتابوں کے خلاف ایسی ادیبانہ نشان سے اور ناقابل فراموش الفاظ میں (مارا بہ نص کار است نہ بہ نص۔ مارا فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است) اظہار خیال کیا ہے۔ اور ان کا فلسفہ وحدت الشہود اس طرح فلسفہ وحدت الوجود کے مخالف سمجھا جاتا ہے کہ شیخ کے متعلق حضرت مجدد کے نقطہ نظر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا مفید ہوگا۔

ہم حضرت مجدد کے والد مخدوم عبدالاحد کا ذکر کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ وہ وحدت الوجودی خیالات کے تھے۔ اور حضرت مجدد کا بیان بھی نقل کر چکے ہیں کہ ابن الفقیہ نصف الفقیہم۔ ان کے بھی یہی خیالات ہو گئے۔ اور ایک مدت تک ان پر توحیدی رنگ غالب رہا۔ ۳۱۰ کے بعد ان پر وحدت الشہود منکشف ہوئی۔ اور اصول شیخ ابن عربی سے اپنے اختلاف کا اظہار زوردار طریقے سے کیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کلیتاً شیخ کے منکر تھے۔ زبدۃ المقامات میں خواجہ ہاشم شمس

جو آخری سالوں میں کافی عرصہ ان کے ساتھ رہے، لکھتے ہیں: "... شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ راس بزرگ سے دانستند و نیک یاد سے کردند" (زبدۃ المعانی) فی الحقیقت شیخ کی نسبت ان کا نقطہ نظر بڑا پیچ و پیچ تھا۔ بعض باتوں میں انھیں ان سے اختلاف تھا۔ اور بعض میں اشتراک رائے، لیکن شیخ کی عظمت اور پاکیزگی پر وہ بڑا زور دیتے تھے۔ شیخ کے متعلق حضرت مجدد نے اظہار خیال کئی جگہ کیا ہے۔ آخری آیام کا ایک خط (دفر سوم ۴۹) صاحبزادہ محمد معصوم کے نام ہے۔ اس میں شیخ ابن العربی کی نسبت لکھتے ہیں:-

"دریں عرصہ شیخ ست قدس سرہ کہ گاہے باوے جنگ است و گاہے صلح" آگے چل کر لکھتے ہیں (ترجمہ)

"ہم پسماندوں نے بھی اس بزرگ کی برکات سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے علوم و معارف سے بہت فائدے حاصل کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ لیکن چونکہ بشریت کے مطابق خطا و صواب ایک دوسرے کے ساتھ ملا جلا ہے۔ اور انسان احکام میں کبھی خطا پر ہے۔ اور کبھی صواب پر۔ اس لیے اہل حق کے سوا د اعظم کے احکام کی موافقت کر صواب کا مصداق اور ان کی مخالفت کو خطا کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ اور خواہ کوئی کلام ہو۔"

اسی زمانے کے ایک اور خط میں شیخ کی بعض شیطیات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-
عجب معاملہ ہے۔ کہ شیخ باوجود اس گفتگو اور ان خلاف جواز اور مخالفت شیطیات کے مقبولوں میں سے نظر آتا ہے۔ اور اولیا کے زمرہ میں گنا جاتا ہے... شیخ کو قبول کرنا چاہیے۔ اور ان کی مخالفت باتوں کو قبول نہ کرنا چاہیے (دفر سوم ۵۰)

حضرت مجدد نے وضاحت کی ہے کہ توحید و جود کے متعلق ان کا اپنا نقطہ نظر علم

کا نہ تھا۔

"علماء کا اختلاف مشائخ کے ساتھ مسئلہ توحید وغیرہ امور خلافیہ میں نظر و استدلال

کی وجہ سے ہے۔ اور فقیر کا خلاف ان کے ساتھ ان امور میں کشف و شہود کی راہ سے ہے۔

علماء ان امور کی قیاسیت کے قائل ہیں اور فقیر بشرط عبور ان کے حسن کا (دفر دوم ۴۴) دفر دوم کا پہلا مکتوب سارے کا سارہ شیخ ابن العربی کے خیالات کے متعلق ہے اس ضمن میں شیخ کی بڑی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

پس شیخ برہان متقدمان اس طائفہ آمدہ و مجتمع متاخران ایشان گشتہ۔ محذالک دقائق کثیرہ دریں مسئلہ مخفی ماندہ است و اسرار غامضہ ظہور نیامدہ کہ فقیر باظہار آن توفیق یافتہ است و بہ تحریر آن مبشر گشتہ۔

حضرت مجدد نے شیخ ابن العربی کی بعض باتوں کی تردید کی۔ مثلاً جہاں وہ اپنے آپ کو ختم ولایت محمدیہ بتا کر یہ کہتے ہیں کہ بعض علوم ختم النبوت نے ختم الولاہیت سے اخذ کیے (معاذ اللہ) اور اصولی طور پر بھی وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہر بات کو مخبر صادق کے ارشادات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ "کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ اور خواہ کوئی کلام ہو" (کاش ان کے اپنے پر جویش معتقدان اس اصول کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں)۔ لیکن جیسا کہ (دفر دوم مکتوب اول کی) مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے آپ کو شیخ ابن العربی کے کام کو آگے بڑھانے والا اور اس کی تکمیل کرنے والا سمجھتے تھے۔ صاحبزادہ محمد معصوم کے نام کے مکتوب کے آخر میں، اگرچہ صراحت اسمی نہیں، لیکن مفہوم قریباً یہی ہے۔ توحید و جود کے متعلق جو ان کے اور شیخ کے درمیان سب سے بڑی وجہ اختلاف سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے بالصراحت کہا۔ کہ بشرط عبور "وہ اس کے حسن کے قائل ہیں۔ ان کی توحید شہودی شیخ کی توحید و جود کی ضد نہیں، بلکہ اس سے اگلی منزل ہے۔ اسی طرح ابن العربی کے نظام باطنی کا مسئلہ ہے۔ حضرت مجدد نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اسے تہمتی دی۔ اور طریقہ مجددیہ کا قیوم شیخ ابن العربی کے قطب کی ارتقائی صورت ہے۔

جارحانہ ہندو احمیات | حضرت مجدد کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا غیر مسلموں کے متعلق نقطہ نظر ہے۔ ان سے پہلے ہندوستان میں بزرگان اہل طریقت نے

غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی۔ مسلمان بادشاہوں کا ملکی اور فوجی مصلحتوں کی بنا پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو اور فقہاء اور علماء ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیں، لیکن حضرات صوفیہ نے ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کو (بعض روایات کے مطابق) ایک ہندو را جانے تکلیفیں دیں۔ انھوں نے اس کے حق میں بددعا بھی کی۔ لیکن عام ہندوؤں کے خلاف جوش اور غصے کا اظہار ان کے ارشادات میں نہیں ملتا اور خواجہ بزرگ کے معتقدین میں ہندو بھی شامل تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ آپ کی نسبت سفینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے:-

”و جمع کثرے از کفار بر برکت قدم ایشان مسلمان شدند و جماعت کہ مسلمان نشدند بوند فتوح و دینار بے حد بخدمت ایشان می فرستادند و هنوز کفارے کہ در ان نواحی اند بہ زیارت ایشان می آیند۔ و مبلغا بہ مجاوران روضہ منورہ می گزرا ند۔“
راے بہادر پنڈت ہر بلاس ساروا حضرت خواجہ کی نسبت اپنی انگریزی تصنیف اجمیر میں لکھتے ہیں:-

انھوں نے کبھی کسی کو تنگ کرنے کا مشورہ نہیں دیا اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطہ نظر صلح جوئی اور خیر خواہی کا تھا (ترجمہ)

حضرت خواجہ کے علاوہ جن دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اشاعت اسلام کی ان کے حالات اور ارشادات بھی کسی غصے کے جذبے سے عاری ہیں۔ حضرت مجدد کا نقطہ نظر اس سے بہت مختلف تھا۔ ان کے خطوط میں غیر مسلموں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کثرت سے ہوا ہے اور انھیں ذلیل کرنے کی جا بجا تلقین ہے۔ اس نئے زاویہ نگاہ کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ حضرت مجدد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمان

ایک مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت میں احکام اسلامی جاری کرنے سے عاجز تھے۔ ”در قرون ماضی کفار بر ملا طریق استیلا اجرائے احکام کفر و دارالاسلام می کردند و مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند و اگر می کردند قتل می رسیدند۔ و اولاً و امصیباً، و احتراباً، و آخرتاً! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ محبوب رب العالمین است مصدقین او ذلیل و خوار بودند و منکران او لعزت بودند و معاندان بسخریہ و استهزا بر جرحت ہائے ایشان نمک پاشیدند۔“

حضرت مجدد کے حماس دل پر ان واقعات کا بڑا اثر ہوا اور نہ صرف اکبر کے خلاف، بلکہ غیر مسلموں کے متعلق بھی ان کے دل میں غصے اور انتقام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اگرچہ درباری مورخوں نے جنگوں اور جتنوں کی داستانوں سے حقیقت حال پر پردہ ڈال رکھا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیلات دیں گے۔ اس وقت ہندوؤں میں احیائے مذہب کی تحریک زوروں پر تھی اور اطراف ملک میں اس کے جو مظاہرے ہو رہے تھے، ان سے باخیر مسلمانوں کے دل مجروح ہوتے تھے۔ حضرت کو ان واقعات کا بڑا قلق تھا اور ان کے دل میں انتقام اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاید اس میں نہ صرف اس زمانے کے حالات کو، بلکہ حضرت مجدد کی اپنی حساس اور پرجوش طبیعت (رگ فاروقیم) کو بھی دخل تھا۔ وہ خود ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:-

”ہر کسے را در دل تمنائے امریت از امور۔ و تمنائے ایں فقیر شدت نمودن است، بدشمنان خدا و دشمنان پیغمبر و اہانت رسانیدن بایں بے دولتاں و خوارداشتن ایشان و بیقین میدانند کہ بیچ عملے نزدیک عمل مرتعی تر نیست۔“

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید اس انتہائی نقطہ نظر کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ حضرت مجدد بار بار انھیں خطوں میں، غیر مسلموں کو اپنی مجلس میں جگہ نہ دینے اور اگر آئیں تو ذلیل رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

نہ شاید بقریب پابندیوں کی طرف اشارہ ہے۔

میں اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بھلائی ملاد نہیں۔ بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دُور کرنا چاہیے۔ اور اگر دنیوی غرض ان کے متعلق ہو جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مقرر رکھ کر بعد ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے۔ اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں۔ (ترجمہ)

یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اخیر عمر میں حضرت مجدد کے طرز عمل میں زیادہ ملائمت اگلی جس قسم کے خطوط کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ دفتر اول میں بہت ہیں۔ دفتر دوم میں شاذ و نادر اور دفتر سوم میں بالکل نادر۔ بلکہ دفتر سوم میں ایک خط ایسا ہے (مکتوب ۲۲) جس میں 'المشکون نجس' کی تاویل مشرکوں کے حق میں کی ہے اور ملا مقصود علی تبریزی کو لکھا ہے 'آپ خلی خدا پر رحم کریں۔ اور عام طور پر ان کی نجاست کا حکم نہ دیں۔ اور مسلمانوں کو بھی کفار کے ساتھ ملنے جلنے کے باعث جس سے چارہ نہیں نجس نہ جائیں'۔ اسی طرح ایک اور خط میں انھوں نے چند سوالات کے جواب میں بعض ہنود کے جذبہ 'بلکہ ایک قسم کی محبوبیت' کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بہت سے ہندوؤں کو دیکھا ہے کہ جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ صاحب شریعت علیہ السلام کی متابعت سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس لیے خراب و ابتر ہیں اور جذب کی صورت کے سوا کچھ نصیب نہیں۔

سوال۔ جذب کا حاصل ہونا ایک قسم کی محبوبیت چاہتا ہے۔ پس کفار کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں، جذبہ کا نصیب کس طرح تصور کیا جاتا ہے؟

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ بعض کفار ایک قسم کی محبوبیت رکھتے ہوں جو ان کے جذب کے حاصل کرنے کا باعث ہوئی ہوں۔ [دفتر سوم مکتوب ۱۲۱ - ص ۳۱۷]

اسی طرح جب شیخ فرید کی وفات کے بعد جہانگیر نے فتح کا ٹروہ کے لیے ایک ہندو جرنیل کو مامور کیا تو مجددی تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق حضرت مجدد نے اسے دعا و بشارت سے سرفراز فرمایا۔

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطہ نظر میں جو اختلاف تھا اس کا کچھ اندازہ سکھ راہنماؤں کے متعلق ان کے زاویہ نگاہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں میر کی محاصرہ گرو سے دوستی تھی اور سکھ روایات کے مطابق امرتسر کے مشہور تالاب کا سنگ بنیاد حضرت میاں میر سے رکھوایا گیا۔ لیکن جب گرو ارجن دیو کی (شہزادہ خسرو کی سرپرستی کی وجہ سے) جہانگیر کے ساتھ (اور بعض نجی معاملات کی بنا پر) لاہور کے دیوان چند دلال سے کشمکش ہوئی۔ اور اس کشمکش میں اس کی موت واقع ہوئی تو حضرت مجدد نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا:۔

"دریں وقت کشتن کافرین گو بندہ ال بسیار خوب واقع شد۔ و باعث شکست عظیم بر ہنود مردود گشت۔ بہریت کہ کشتہ باشد و بہر غرض کہ ہلاک کردہ خواری کفار نقد وقت اہل اسلام است۔"

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطہ نظر میں جو فرق تھا اس کی بنیادی وجہ وہی تھی جس کا ہم ذکر کر چکے۔ یعنی ہندو و احیائیت کی تحریک جو بسا اوقات دار السلطنت یا بسے اسلامی شہروں مثلاً لاہور سے دُور (اور بالخصوص ہندوؤں کے مقدس مقامات کے گرد و نواح میں) بڑی خطرناک صورت اختیار کرتی تھی۔ عہد اکبری میں متھرا کے ایک برہمن نے مسجد کی اینٹ پتھر کو ایک مندر کی تعمیر میں جس طرح استعمال کیا۔ اور مسلمان مالک کی مزاحمت پر رسول اکرم کی شان میں گستاخی کی اس کا ہم ذکر کر چکے۔ اس واقعے کا بیان صفحات تاریخ میں اس لیے آجاتا ہے کہ اس برہمن کو سزائے قتل دینے پر اکبر کے دربار میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہندوؤں کی سینہ زوری کے اور بھی کئی واقعات اطراف ملک میں ہو رہے تھے، لیکن درباری مورخین یا تو ان سے باخبر نہ تھے یا انھیں درج کتاب کرنا اپنے مروج بادشاہوں کی شان کے منافی سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد کے مکتوبات میں ان کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ تھانیس میں ایک ایسے واقعہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

کفار ہند نے تماشاً مسجدوں کو گرا کر ویاں اپنے مسجد و مندر تعمیر کر رہے ہیں۔
 چنانچہ تھانیس میں حوض کرکھیت (کور و کشیر) کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ
 کامقبور تھا۔ اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے (دفتر دوم مکتوب ۹۱)
 اسی خط میں وہ آگے چل کر مسلمانوں کی مشکلات کی اور مثالیں دیتے ہیں (جو
 ہندو علاقوں میں دیہی اور کاروباری نظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہونے سے پیدا
 ہوتی تھیں)۔

نیز کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا بجالا رہے ہیں۔ اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے
 جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی
 کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے
 اور نہ بیچے۔ اور ماہ مبارک رمضان میں برہمنان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں۔
 مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی روک نہیں سکتا۔

ہائے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ
 و خراب حال ہو۔

یہ حالت تو شاہی علاقے کے قصبات و دیہات میں تھی۔ جہاں (مثلاً مشرقی
 پنجاب کے پہاڑی علاقے میں) ہندو ریاستیں ابھی قائم تھیں۔ وہاں قریب کی
 مسلمان آبادیوں پر گاہے گاہے حملے اور بڑے مظالم برپا ہوتے۔ حضرت مجدد
 ایک خط میں خواجہ شرف الدین حسین کو لکھتے ہیں:-

تم کو معلوم ہو گا کہ ان ہی دنوں میں دلا لوب کے کفار نے ٹکڑوں کے گرد و نواح میں
 مسلمانوں اور مسلمانوں کے شہروں پر کیا کیا ظلم و ستم کیے ہیں۔ اور کیسی اہانت
 کی ہے۔ (دفتر دوم مکتوب ۶۹)

سرہند کا مقام وقوع ایسا تھا کہ اس کے ایک طرف ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھا نیر
 تھا۔ دوسری طرف گوند وال، جہاں ان دنوں گورو ارجن کا قیام تھا اور سکھ قوم
 کی نئی تنظیم ہو رہی تھی۔ جس میں جیسا کہ تزک جہانگیری سے پتا چلتا ہے، بعض

مسلمان بھی جذب ہو رہے تھے۔ تیسری طرف پُرانا تیرتھ نگر کوٹ تھا۔ یہ سب ہندو
 سکھ احیائیت کے مرکز تھے۔ بیچ میں سرہند تھا۔ اس لیے حضرت مجدد کو ہندوؤں
 کی جادہ خانہ سرگرمیوں سے واقف ہونے کے وہ سامان میسر تھے، جو دارالسلطنت
 میں رہنے والوں (حتیٰ کہ بدایونی) کو بھی حاصل نہ تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خسر (حاجی سلطان تھانیسری) کی زندگی (اور
 موت) میں (تھانیس کے ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے) جو کچھ دیکھا۔ وہ
 ایک الگ درس عبرت تھا۔

حضرت مجدد کے گرد و پیش جب اس طرح کے واقعات پیش آرہے تھے تو چنداں
 جگہ تعجب نہیں کہ غیر مسلموں کی نسبت ان کا زاویہ نگاہ عام صوفیہ سے بالکل
 مختلف تھا۔

حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطہ نظر تھا، اور جو فی الحقیقت
 ہندوؤں کی جادہ خانہ احیاء کی تحریک کے خلاف ردِ عمل تھا، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ
 اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی
 تھیں، ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا اور
 ذبح بقر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجدد کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں اور ان کی
 بڑی خواہش تھی کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے اور ذبح بقر عام طور پر رائج ہو۔
 اس کی کوشش انھوں نے جہانگیری کی تخت نشینی کے فوراً بعد شروع کی۔ کسی سطحوں
 میں اس بات کا افسوس کیا ہے کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے۔
 ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:- "جزیہ از اہل کفر کہ در ہندوستان برطرف شدہ است۔"

۱۔ حضرت مجدد نے ہندو کے لیے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہل کفر کہتے ہیں۔ جزیہ
 کفار سے نہیں لیا جاتا۔ اہل کتاب ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان ہندوستان میں آئے
 اور انھوں نے دیکھا کہ اکثر ہندو بت پرست ہیں، لیکن ان کے طریقے کفار مکہ سے مختلف ہیں۔ اور
 [باقی اگلے صفحے پر]

بواسطہ شرمی مصاحبت اہل کفر است باسلاطین اس دیار۔ ایک اور خط میں ذریعہ بقرہ کی تائید کی گئی ہے۔ ”ذریعہ بقرہ ہندوستان کا عظیم شکارِ اسلام است۔ در ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت۔ فیہاد اگر عیاذ باللہ سبحانہ در وقت افتاد کار بر مسلمانان بسیار مشکل خواہد شد۔“

اختلافات کا حل

حضرت مجدد نے ہندوؤں کی جارحانہ حیثیت کا شرکیہ بہ ترکی جواب دیا۔ وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے۔ دفترِ اول میں ایک خط ایک ہندو ہوسے رام کے نام ہے جس نے حضرت مجدد کے نام دو خطوں میں فقرہ صوفیہ سے محبت کا اظہر کیا تھا اور لکھا تھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ حضرت مجدد کو اس طرز استدلال میں خطرہ نظر آتا تھا۔ انھوں نے ایک پُر زور خط میں مکتوب نگار کے نقطہ نظر کی تردید کی اور لکھا۔ ”رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔“ غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کا انداز بیان عام صوفیہ سے مختلف تھا۔ لیکن ان کا نقطہ نظر محض منعیانہ نہ تھا۔ انھوں نے حالات کے تحت بعض جگہ بڑے سخت الفاظ استعمال کیے، لیکن ہندو مسلم مسئلے کا انھوں نے ایک حل بھی پیش کیا۔ اور شاید کشیدگی کو دور کرنے اور ملک میں ایک خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے سب سے کارآمد طریق کار وہی تھا۔ ان کی نگہ تیز بین نے اندازہ لگالیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الہی کا ملغوبہ بنا کر رام اور رحمان کو ایک کہہ کر انھیں جوڑا نہیں جاسکتا۔ یہ ایک سچی لا حاصل ہے۔ یا خرابیوں کا پیش خیمہ

(بقیہ نوٹ ص ۳۲۳)

ان میں سے کئی اپنے خیال کے مطابق خدا سے واحد کی عبادت کرتے ہیں تو انھوں نے ان سے بھی وہی سلوک کیا جو فقہی کتب میں اہل کتاب ذمیوں کے لیے مخصوص تھا۔ حضرت مجدد ہندو کو کافر کہتے ہیں لیکن وہ قدیم ہندوستان میں پیغمبرِ مبعوث ہونے کے قابل تھے۔

اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ عظیم ہے۔ باہمی امن و امان کی خاطر اور ہندوستان کے خاص حالات کے لیے زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کو گوارا کر سکتے تھے وہ یہ تھی۔ مسلمانانِ بر دین خود باشند و کفار بر کیش خود۔ (آیہ کریمہ) لکھو دینکم و دین بیان این معنی است (مکتوبات) یعنی امتزاج یا اتحاد۔ (Co-existence) نہیں۔ رواداری (Co-existence) اور کیا یہ طریق کار حالات کا واحد قابل عمل ہونے کے علاوہ منصفانہ نہ تھا؟

ہندوؤں کے متعلق حضرت مجدد نے بسا اوقات اظہارِ خیال بڑی تلخی اور غیظ و غضب کیا۔ اور بہر کیف ان کا انداز فکر اور اسلوب اظہار ان صوفیہ سے بالکل مختلف تھا، جنھیں ہندو حیثیت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخ نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ انگریزی عہد میں اختلافات اور بڑھ گئے۔ اور برصغیر کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کرنا پڑا۔ شاید ان ملکوں کے رہنما اور بیرونی خیر خواہ بھی کبھی سر ہند کے اس ”مردِ آخر میں“ کی رائے تسلیم کر لیں کہ ان دونوں کے درمیان امن اور سلامتی کا راستہ اتحاد نہیں بلکہ ہمسایانہ رواداری (Neighbourly Coexistence) ہے۔

مکتوباتِ امام ربانی

ہندوستان میں تصوف کی تھوڑی کتابوں کو وہ قدر و منزلت میسر آئی ہے جو مکتوباتِ امام ربانی کو نصیب ہے۔ حضرت سرہندی کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ اور آج بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں:-

”تصوف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اہم میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔ نمبر اول پر مشتمل ہے جس نے دہریت والحاد سے کھینچ کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی۔ اس اجمال کے بعد ضرورت تفصیل کی تھی۔ یعنی اسلام کے اندر عمائد و اعمال میں مستحق راہ کون سی اختیار کی جائے۔ اس باب میں شمع ہدایت کا کام مکتوبات ہی دیا۔“

مکتوباتِ امام ربانی حضرت مجدد کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔ ان کی تین جلدیں ہیں۔ دفترِ اول۔ جسے درُ المعرفۃ بھی کہتے ہیں۔ ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ یار محمد بدخشی نے ۱۱۶۲ھ میں یعنی محبوس سے تین سال پہلے ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ سب سے مفصل ہے۔ اور اس میں کئی سالوں کے خطوط جمع ہیں۔ پہلے میں خطوط وہ ہیں جو حضرت سرہندی نے اپنے پیرومرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ پھر متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امراء جہانگیری کے نام ہیں جن میں انھیں تلقین کی گئی ہے کہ وہ نئے بادشاہ کے زمانے میں ترویجِ دین کی کوشش کریں۔ باقی خطوط میں سوالوں کے جواب ہیں۔ یا علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ان کے مکتوب یا زہم پر (جس میں انھوں نے اپنے عروج کا ذکر کیا تھا) اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے اس جلد کے آخر میں کئی خطوط اپنے معترضوں کی تسکین کے لیے لکھے گئے ایک چالیس صفحے کا خط اپنے مرشد زادوں کے نام ہے۔ جس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد بیان کیے ہیں۔ دفترِ اول کے آخر میں جواں مرگ صاحبزادہ خواجہ محمد صادق کے وہ تین خطوط درج ہیں جو انھوں نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں ارسال کیے۔ دفترِ دوم جس کا تاریخی نام نور الخلائق ہے ۱۱۹۲ھ میں یعنی واقعہ قید سے ذرا پہلے مرتب ہوا۔ اسے خواجہ عبدالحی نے خواجہ محمد محصوم کے ایما پر جمع کیا۔ اس میں خطوط تھوڑے ہیں۔ فقط ننانوے۔ لیکن ان میں سے بعض بڑے طویل اور مفصل ہیں۔ ایک خط بیس صفحے سے زیادہ خواجہ محمد تقی کے نام ہے۔ جس میں اہل سنت اور شیعوں کے خیالات سے بڑی مدلل بحث کی ہے اور اپنے نقطہ نظر کی توضیح کی ہے۔ ایک پندرہ صفحے کا خط خان جہان کے نام ہے۔ اس میں اسلامی عقائد کو تفصیل سے منضبط کیا ہے۔ چند ایک خط اپنے مرشد زادوں کے متعلق ہیں۔ باقی خطوط میں بیشتر مسائل صوفیہ کی توضیح ہے۔

دفترِ سوم موسوم بہ معرفۃ الحقائق کی ترتیب میر محمد نعمان نے شروع کی۔ لیکن انھوں نے فقط تیس کے قریب مکاتیب جمع کیے تھے۔ باقی کو خواجہ محمد ہاشم کشمی

برہانپوری نے ۱۲۲۲ھ میں یعنی حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر نقل کرنا شروع کیا۔ پہلے اس میں ۱۱۴ خطوط تھے۔ خواجہ محمد ہاشم زبدۃ المقامات میں لکھتے ہیں کہ دفترِ سوم ۱۱۴ مکاتیب پر ختم کر دیا گیا۔ اور دفترِ چہارم شروع ہوا، لیکن ابھی چودہ مکاتیب بکھے گئے تھے کہ حضرت مجدد کا وصال ہو گیا۔ اس لیے ان چودہ مکاتیب کو بھی دفتر میں شامل کر لیا گیا۔ اس حساب سے دفترِ سوم میں ۱۲۸ مکاتیب ہونے چاہئیں۔ لیکن مطبوعہ دفترِ سوم میں ۱۲۴ مکاتیب ہی ملتے ہیں۔ یعنی زبدۃ المقامات کے بیان کے مطابق ۴ مکاتیب مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔ دفترِ سوم کے بیشتر خطوط اس وقت لکھے گئے، جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکر شاہی کے ہمراہ رہتے تھے، کئی ایک خطوط مخدوم زادگان کے نام ہیں۔ ایک خط (۱۰۹) میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو حضرت مجدد نے ایک دفعہ جہانگیر کی مجلس میں کی تھی۔ ایک خط جہانگیر کے نام ہے۔ جس میں دُعا کے اسرار اور علماء و صلحا کی تعریف بیان کی ہے۔ ایک نہایت دلچسپ خط (۴۱) ایک صالحہ عورت کے نام ہے جس میں ان شرطوں کی توضیح کی ہے جن پر عورتوں کی بیعت ہونی چاہیے۔ اور اس میں تمام وہ بدعتیں بالتفصیل گنائی گئی ہیں جن میں ہندوستانی عورتیں خاص طور پر گرفتار ہیں۔ (مثلاً سیتلا اور چیچک کے موقع پر دیوی کی منت ماننا۔ مشائخ کی قبروں پر منت کے جانور ذبح کرنا۔ پیروں کے روزے رکھنا۔ شگون کا اعتبار کرنا۔ جادو کا قائل ہونا) اور جن کی اصلاح کے لیے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے کوشش کی مکتوبات سے ہم نے اس قدر حوالے دیے ہیں کہ اب کسی طویل اقتباس کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تو تمام کے تمام پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے پہلے تصوف اور مذہب اسلام کے مشہور مسائل اور ان کی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی چاہیے۔ تاکہ حضرت مجدد کی قابلیت و استخیالی اور سلیم الطبعی کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو کہ جو صدیوں کی پُرانی گتھیاں تھیں، انھیں شرع اور عقل و سمجھ کے موافق انھوں نے کس طرح سلجھانے کی کوشش کی۔

اس کے علاوہ عبد اکبری اور عبد جہانگیری کے واقعات اور ممتاز شخصیتوں کے مقوڑے بہت واقفیت ہو تو مکتوبات کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

مکتوبات کی مقبولیت کی اگر بڑی وجہ ان کے مضامین کی خوبی، تنوع اور صاحب مکتوبات کی علمیت اور روحانی فصیلت ہے تو اس کے علاوہ حضرت مجدد کے طرز تحریر کو بھی ان کے اثر میں بڑا دخل ہے۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مجدد بڑے بلند پایہ اہل قلم تھے اور خط لکھتے وقت مکتوبات کی انشائی غویں پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ ان کے خطوط میں بیشتر علمی اور دینی مسائل ہیں اور ان کے لیے وہی عالمانہ طرز تحریر اختیار کیا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ معانی مقوڑے سے مقوڑے الفاظ میں ادا ہو جائیں۔ وہ ارباب تصوف کی مروجہ اصطلاحات کثرت سے استعمال کرتے تھے اور جو لوگ ان سے ناواقف ہیں انھیں بعض مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر ثقیل الفاظ مقوڑے ہیں اور بالخصوص ان مکتوبات میں جو عقائد کی توضیح میں یا مبتدیلوں اور نوجوان طالبوں کو لکھے گئے زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے۔ مکتوبات امام ربانی کا ایک اہم جزو معاصرانہ امر کے نام ہے۔ جس میں انھیں شریعت کو سنبھالنے اور اسلام کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان خطوط کا طرز تحریر علمی خطوط سے مختلف ہے۔ عالمانہ اصطلاحیں ان میں بہت کم ہیں۔ الفاظ پر وقار مگر سریع الفہم ہیں، لیکن طرز تحریر میں ایک جوش ہے۔ خطیبانہ اور پرتاثر۔ یہ خطوط دل سے نکلے ہوئے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اس لیے دل پر اثر کرتے ہیں۔

آپ تشریح اور تاثیر کے لیے گاہے گاہے مکاتیب میں کوئی دلچسپ شعریا مصرع بھی درج کر دیتے۔ جس سے انداز کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور تقابل کا بھی خیال کرتے۔ ایک خط میں ملا حسن کشمیری کو لکھتے ہیں :-

”نوشہ بودند کہ شیخ عبد اکبر یعنی گشتہ است کہ حق سبحانہ و تعالیٰ عالم الغیب نیست

بے اختیار رگبار و قیم در حرکت می آید و فرصت تاویل و توجیہ نمی دہد۔ قائل این سخن شیخ کبیر یعنی باشند یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ وآلہ و الصلوٰۃ والسلام در کار است۔ نہ کلام محی الدین عربی و صدر الدین قونی و عبد الرزاق کاشی۔ مابرا برقص کار است۔ نہ برقص۔ مارا فتوحات مدینہ (یعنی احادیث) از فتوحات مکیہ مستغنی ساخته است۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت کا طرز تحریر یا تو علمی ہوتا ہے، علمی مسائل کی توضیح کے لیے یا خطیبانہ۔ جب اپنے جذبات کا اظہار اور دوسروں کو کسی اقدام کی تلقین مقصود ہو۔ لیکن چند ایک خطوط اس تقسیم سے باہر ہیں۔ ان میں سے ایک خط جو انھوں نے صاحبزادوں کو حالت قید میں لکھا اور جس میں پدرانہ محبت نے نہایت ملائم اور شیریں الفاظ کا جامہ پہنا ہے، درج کیے بغیر بھی نہیں مانتا :-

”فرزندان گرامی بہ جمعیت باشند۔ مردم ہمہ وقت محنت سے مارا در نظر میدارند و غلصہ ازین محنت می طلبند۔ نمیدانند کہ در نامرادی و بے اختیاری چه بلا حسن و جمال است و کدام نعمت برابر کن است کہ این کس را بے اختیار از اختیار او بر آزند و با اختیار خود اور از نعمانی و ہند۔ و امور اختیار می اور از نیو تابع آن بے اختیار می او ساخته اور از در او اختیار او بر گیرند۔۔۔ در ایام مجلس گاہے کہ مطالعہ ناکامی و بے اختیاری خود می نمود۔ عجب حظ می گرفت و طرفہ ذوق می یافتم۔ بے ارباب فراغت ذوق ارباب بلا را چه دریا بند و از بلا سے جمال او چه درک نمایند۔ طفلان را حفظ منحصر در شیرینی است و آنکہ از تلخی حظ وافر گرفته است۔ شیرینی را بجز سے نمی خورد و مرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد و اندہ را

تاریخی لحاظ سے اس سے بھی اہم خط وہ ہے، جو صاحبزادگان کے نام واقعہ قید کے بالکل آغاز میں لکھا گیا۔ اس میں ان کے لیے پدرانہ نصیحتیں ہیں۔ عتاب شاہی سے جو صورت حالات پیدا ہو گئی تھی، اس کا اظہار بھی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ظرافت اور حوصلہ اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ ہے۔ ہم اسی ”وصیت نامہ“ پر اس بیان کو ختم کرتے ہیں

فرزند ان عزیز!

ابتلا کا وقت اگرچہ تلخ و بے مزہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر فرصت دین تو غنیمت ہے۔ تم کو اب فرصت مل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بجالا کر اپنے کام میں لگے رہو۔ اور ایک دم بھی فراغت و آرام اپنے لیے پسند نہ کرو۔ اور تین چیزوں میں سے ایک میں ضرور مشغول رہو۔ قرآن شریف کی تلاوت کرو۔ یا لمبی قرأت کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ یا کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی تکرار کرتے رہو۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے سوا تمام جھوٹے خداؤں اور اپنے نفس کی خواہشات کی نفی کرنی چاہیے۔ اور تمام مرادوں اور مقصودوں کو دفع کرنا چاہیے۔ کیونکہ اپنی مراد کا طلب کرنا اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے۔ بلکہ سینہ میں کسی مراد کی گنجائش نہ رہے۔ اور متخیلہ میں بھی کوئی ہوس باقی نہ رہے تاکہ بندگی کی حقیقت حاصل ہو۔ اپنی مراد کو طلب کرنا گویا اپنے مولا کی مراد کو دفع کرنا اور اپنے ملک کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ اس امر میں اپنے مولا کی نفی اور اپنے مولا کے بننے کا اثبات ہے۔ اس امر کی بُرائی ابھی طرح معلوم کر کے اپنی الوہیت کے دعوے کی نفی کرو۔ تاکہ تمام ہوس سے کامل طور پر پاک ہو جاؤ۔ اور طلب کے سوا تمہاری کوئی مراد نہ رہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بلا واسطہ کے زمانہ میں بڑی آسانی سے میسر ہو جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کے سوا ہوا و ہوس سب سکندری ہے۔ گوشہ میں بیٹھ کر اس کام میں مشغول رہو۔ کہ اب فرصت غنیمت ہے۔ فتنہ کے زمانے میں تھوڑے کام کو جہتِ اجر کے عوض قبول کر لیتے ہیں۔ اور فتنہ کے زمانے کے سوا سخت ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہیں۔ اطلاع دینا ضروری ہے۔ شاید ملاقات ہو مانہ ہو۔

یہی نصیحت ہے کہ کوئی مراد ہوس نہ رہے۔ اپنی والدہ کو بھی اس امر پر اطلاع دے دو۔ اور اسے اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دو۔

باقی احوال چونکہ یہ جہاں فانی اور گزرنے والا ہے کیا لکھے جائیں۔ چھوٹوں پر شفقت رکھو۔ اور ان کو پڑھنے کی ترغیب دو۔ اور جہاں تک ہو سکے تمام

اہل حق کو ہماری طرف سے راضی کرو۔ اور ایمان کی سلامتی کی دعا سے متنبہ رہو۔ بار بار یہی لکھا جاتا ہے کہ اس وقت کو یہودہ امور میں صالح نہ کرو۔ اور ذکر الہی کے سوا کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ اب کتابوں کے مطالعہ اور طلبہ کے تکرار کا وقت نہیں ہے۔ اب ذکر کا وقت ہے۔ تمام نفسانی خواہشوں کو جو جھوٹے خدا ہیں لا کے نیچے لا کر سب کی نفی کرو۔ اور کوئی مراد و مقصود سینے میں نہ رہنے دو۔ حتیٰ کہ میری خلاصی بھی جو کہ تمہارے لیے نہایت ضروری ہے۔ تمہاری مراد و مطلوب نہ ہو۔ اور حق تعالیٰ کی تقدیر اور فعل اور ارادہ پر راضی ہو۔ اور کلمہ طیبہ کے اثبات کی جانب میں غیب ہوتیت کے سوا جو تمام معلومات و تخیلات کے دروازہ اور اوپے۔ کچھ نہ رہے۔ حویلی و سرائے و چاہ و باغ اور کتابوں اور دوسری تمام اشیاء کا غم سہل ہے۔ ان میں کوئی چیز تمہارے وقت کی مانع نہ ہو اور حق تعالیٰ کی مرضیت کے سوا تمہاری کوئی مراد و مرضی نہ رہے۔ ہم اگر مرجاتے تو یہ چیزیں بھی چلی جائیں۔ بہتر ہے کہ ہماری زندگی میں چلی جائیں تاکہ کوئی فکر نہ رہے۔ اولیا رہنے ان امور کو اپنے اختیار سے چھوڑا ہے۔ ہم حق تعالیٰ کے اختیار سے ان امور کو چھوڑ دیں۔ اور شکر بجالائیں۔ امید ہے کہ مخلصین نفع لام میں سے ہو جائیں گے۔ جہاں تم بیٹھے ہو۔ اسی کو اپنا وطن خیال کرو۔ چند روزہ زندگی جہاں گزرے۔ یاد حق میں گزر جائے۔ دنیا کا معاملہ آسان ہے۔ اس کو چھوڑ کر آخرت کی طرف متوجہ رہو۔

اپنی والدہ کو تسلی اور آخرت کی ترغیب دو۔ باقی رہی ایک دوسرے کی ملاقات اگر خدا سے تعالیٰ کو منظور ہوا۔ تو ہو کر رہے گی۔ ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہو اور دعا کرو کہ دارالسلام میں سب جمع ہوں۔ اور دنیاوی ملاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔ الحمد للہ علی کل حال۔

مخدوم زادگان کی والدہ محترمہ | حضرت مجدد الف ثانی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ کے دو خوارق تھے۔ ایک تو آپ کے مکاتیب دوسرے آپ کے فرزندان گرامی

ایک سے آپ کی علمیت، دینی جرأت، سلیم الخیالی، حمیت دینی اور سلیقہ تحریر کا پتہ چلتا ہے، جن کا ظہور آپ کے مکتوبات میں ہوا ہے۔ دوسرے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آپ ایک خوش قسمت، شفیق اور فرض شناس باپ تھے جنہوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی کہ وہ مراتب عالیہ کو پہنچے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کڑی آزمائشوں (مثلاً زمانہ طاعون میں تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی کی وفات، عہد جاگیر میں قید اور پھر لشکر میں نظر بندی) کے باوجود آپ کے خاندان کو ایک مثالی خاندان سمجھنا چاہیے۔

آپ کی زوجہ محترمہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور آپ سے انتساب اور آپ کے ذکر سکھ میں شریک رہنے کی وجہ سے ہی ہماری روحانی تاریخ میں انھیں جو تہہ مل جاتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن مکاتیب اور تذکروں میں جو ضمنی اندراجات ملتے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ محترمہ نہ صرف ایک بڑی عابدہ، متدین اور باہمت خاتون تھیں، بلکہ آپ دونوں کے درمیان غیر معمولی محبت اور یگانگت کا رشتہ تھا۔ اور آپ کو ان کا بڑا پاس خاطر ملحوظ تھا۔

حضرت مجددؑ کو جس طرح آپ کا خیال رہتا تھا، اس کا عقوٰد بہت اندازہ اس اہم خط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے قید کے بالکل آغاز میں صاحبزادگان کے نام لکھا۔ (دفتر سوم، مکتوب دوم)۔ اس میں صبر و تسلیم کی پوری دھناحت کر کے اور رضائے الہی کے سامنے اپنی خواہشات کو بالکل مٹا دینے کے بارے میں متعدد دلائل دے کر لکھتے ہیں: "والدہ خود را نیز بدین معنی مطلع سازند و دلالت نمائند کہ خط کے آخر میں پھر انھیں کا ذکر ہے۔ "والدہ خود را تسلی دہند" لیکن شاید اس سے بھی اہم ایک اور واقعہ ہے، جو غیر معمولی یگانگت، محبت اور اعتماد کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب آپ اجیر میں تھے۔ تو حضرت خواجہ اجیری کے خادمان درگاہ نے ان کے مزار کا قبر پوش جو ہر سال اُتاراجاتا ہے، اور کم از کم اس زمانے میں، فقط خواص کے لیے وقف تھا، آپ کو پیش کیا۔ آپ نے ادب سے قبول کیا۔ اور خادم کو دے کر کہا۔ کہ یہ

لباس جو حضرت خواجہ کے اس قدر قریب تھا، ہمارے کفن کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ یہ روایت خواجہ ہاشم کشمی کی ہے، جو سفر اجیر میں ساتھ تھے۔ لیکن آگے چل کر دہی لکھتے ہیں۔ کہ جب آپ کا وقت وصال آن پہنچا تو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا: "باید کہ از مبلغ مہر خود کفن من سازی۔" اس غیر معمولی وصیت کی سوائے اس کے کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کو محترمہ کی انتہائی عقیدت کا احساس تھا، جس کی تائید تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ دوسرے واقعات سے بھی ہوتی ہے، اور اس اعزاز سے اس عقیدت کا احترام اور پوری یگانگت کا اظہار مقصود تھا۔

تذکرہ نگار صاحبزادگان کی والدہ محترمہ کی عبادت اور پرہیزگاری کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ہم حضرات القدس کی بیان کردہ ایک حکایت سے اس راجحہ عصر کے متعلق اس مختصر اندراج کو ختم کرتے ہیں:-

ایک دفعہ آپ زمانہ شباب میں بیمار ہوئے۔ اور اتنا ضعف بڑھا کہ سب لوگ مایوس ہو گئے۔ والدہ حضرت مخدوم زادگان عالی قدر یعنی حضرت کی بی بی صاحبہ جو ایک صالحہ اور عابدہ بی بی تھیں، نیا وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اور کھل کر یہ نزاری و نیاز درگاہ باری جلالت عظمت میں آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کی۔ اس حال میں اس زہراء وقت کو نیند آگئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا آپ سے کہہ رہا ہے کہ اطمینان رکھو۔ ہم کو ان سے بڑی خدمتیں لینی ہیں۔ اور ابھی تو ہزار خدمتوں میں سے ایک بھی نہیں لی گئی۔ خداے پاک حضرت آپ کو صحت کامل عطا فرمائے گا۔ اور مراتب قرب تک پہنچائے گا۔

خواجہ محمد سعید | حضرت مجددؑ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق تھے، جو عین جوانی میں بجا رنہ طاعون وفات پا گئے۔ دوسرے بیٹے خواجہ محمد سعید تھے، جو شبانہ سن (اپریل ۱۸۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ، عقلیہ و نقلیہ کی پوری طرح تحصیل کی اور پھر درس و تدریس شروع کی۔ حضرات القدس میں لکھا ہے۔ "کتب متعلقہ مثل شرح حکمت العین اور عضدی اور بیضاوی کا درس دیا کرتے

تھے۔ اور تصانیف لطیفہ تحریر فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے مشکوٰۃ شریف پر حاشیہ لکھا۔ اور مضعی مذہب کی تائید کی۔ اور ایک حاشیہ متن حاشیہ خیالی پر لکھا۔ ایک رسالہ قشود میں دفع سبابہ کی ممانعت کے بارے میں تحریر فرمایا: "آپ کے مکتوبات حال (۱۹۶۶ء) میں مکتبہ حکیم سیفی لاہور کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں۔ بعض مکاتیب

۱۔ مکتوبات سعیدیہ کے ناشر حکیم ذوالقرنین صاحب نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے: "چیف ایڈمنسٹریٹر صاحب اوقات مغربی پاکستان جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے [مکتوبات سعیدیہ کی] کتابت کے حسن و جمال اور صاحب کلام کے علوم مرتبہ و کمال کو دیکھ کر اس کی طباعت و اشاعت کے لیے محکمہ نے قرض حسنہ دینا منظور فرمایا۔" یہ بیان ذرا وضاحت طلب ہے۔ مکتوبات سعیدیہ کی اشاعت کے لیے مجھے سب سے پہلے جناب مولانا ابوالخلیل حسنا سجادہ نشین خانقاہ کنڈلیاں شریف مدظلہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ بلکہ انھوں نے کمال محبت دینی و معارف پروری اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھی ارسال فرمایا۔ چنانچہ اسی نسخہ کی بنا پر کتاب کی اشاعت کا ارادہ تھا۔ لیکن اس دوران میں سید شبیر بخاری صاحب مشیر تعلیمات و ناظم نشریات محکمہ اوقات حکیم ذوالقرنین حسنا والا نسخہ لائے جس کی کتابت میں واقعی بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی کی اشاعت کا انتظام ہوا۔

(۱) مکتوبات سعیدیہ کی اشاعت کے علاوہ راقم السطور کی نظامت اوقات کے زمانے میں مجددیہ سلسلہ کی جن اصل فارسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ حسب ذیل ہیں: (۲) مکتوبات امام ربانی ہر سہ دفتر (۱) تیسری ایڈیشن (۳) رسائل مجددیہ (۴) مکتوبات خواجہ محمد معصوم (۵) ہر دفتر (۵) زبدۃ المقامات (۶) حضرات القدس (۷) دفتر ثانی مع تذکرہ حضرت خواجہ بابا باللہ از دفتر اولیٰ اور (۸) کلیات حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ [دیوان ہاشم کشمیری کے لیے بھی کوشش جاری ہے] محکمہ اوقات کتاب کی نصف لاگت کے لیے قرض حسنہ دینے کے علاوہ اس کے سونے خریدتا تھا۔ فی الواقع ان کتابوں کی اشاعت ناشرین کی ہمت اور محبت و عقیدت کی مرہون بنت ہے۔ انیسویں کہ اب فارسی کا رواج اس قدر کم ہو گیا ہے کہ ان کتابوں کی عام کامیابی بہت تھوڑی ہے لیکن انھیں کم از کم سب کتب خانوں میں ہونا چاہیے اور سلسلہ کے سجادہ نشین حضرات اور دوسرے محبوں کو بھی باہمت ناشرین کی سرپرستی کرنی چاہیے۔

عربی میں ہیں۔ اور سب ملا کر ایک سو سے زیادہ نہیں (غالباً یہ ایک انتخابی مجموعہ ہے) لیکن ہر چند بقامت کمتر، بقیمت بہتر والا معاملہ ہے۔ معافی کی گہرائی اور عبارت کی شیرینی نے اس مختصر مجموعہ میں عجب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ نو خطوط اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہیں۔ جن میں شاید بعض (مثلاً مکتوب ۸) اس کی شہزادگی کے زمانے کے ہیں ان مکاتیب کا خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب کی تین جلدوں اور عالمگیر نامہ کے ساتھ ملا کر مطالعہ کریں تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر دونوں بھائیوں کا قدروان تھا۔ اور ان دونوں کے درجات عالیہ میں کلام نہیں۔ لیکن شاید حضرت مجدد کا جانشین، ان کے زندہ بیٹوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے، خواجہ محمد سعید کو سمجھا جاتا تھا خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب کی پہلی جلد میں فقط ایک خط "شاہزادہ دین پناہ سلطان محمد اورنگ زیب" کے نام ہے۔ جہاد اصغر و جہاد اکبر کے فضائل میں (مکتوب ۶۲)۔ دوسری جلد میں بھی ایک ہے "درفناے قلب و فناے نفس" (مکتوب ۵) تیسری جلد میں چار اہم مکاتیب اورنگ زیب کے نام ہیں۔ (۱، ۲، ۳، ۴) اور تین خطوط شیخ سیف الدین کے نام ایسے ہیں جو عالمگیر کے متعلق ہیں۔ (۲۲، ۲۳، ۲۴) اس تفاوت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تیسری جلد خواجہ محمد معصوم کے آخری سالوں کے متعلق ہے۔ جب خواجہ محمد سعید وفات پا چکے تھے۔ خواجہ محمد معصوم کا رد بار بار تذکرہ و ہدایت کے تنہا ذمہ دار تھے۔ اور انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو لشکر شاہی میں بھیج رکھا تھا۔

خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے تعلقات میں براہ راست محبت اور لگاؤ تھا۔ شاہجہاں کے آخری ایام میں ۱۶۵۷-۱۶۵۸ء وہ اکٹھے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اور قریباً تین سال ہندوستان سے باہر رہے۔ جب وہ روانہ ہوئے۔ تو داراشکوہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ واپس پہنچے تو عالمگیر تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ دونوں بھائیوں کی، بلکہ خاندان مجددیہ کے تمام سربراہان و افراد کی قدر دانی ہوئی۔ لیکن خواجہ محمد سعید کی صحت اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ وہ سفر حج

میں ہی ایک دفعہ اتنے بیمار ہوئے تھے کہ امید زیت نہ رہی تھی۔ واپسی پر ایک مہینہ اورنگ زیب کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں سخت بیمار ہو گئے۔ بادشاہ نے علاج میں بڑا اہتمام کیا، لیکن طبیعت نہ سنبھلی۔ چنانچہ آپ سرہند کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ سرہند میں مدفون ہوئے۔ آپ کا سالِ وفات ۱۰۶۶ھ بتایا جاتا ہے۔

شیخ محمد معصوم | حضرت مجدد الف ثانی کے دوسرے مشہور خلیفہ آپ کے صاحبزادے، عروۃ الوثقی، قیوم ثانی، شیخ محمد معصوم تھے۔ آپ کی نسبت فرحت الناطقین میں لکھا ہے:-

”مرید و خلیفہ والد بہادر خود، شیخ احمد بود۔ در تربیت مریدان و تعبیر و قائل و حل مشکلات اینان از بزرگان و سائر شیوخ زمان امتیاز داشت و از تصانیف او سربلند مکتوبات است کہ بس اسرار غریبہ و نکات عجیبہ و علوم بدیہ دران اندراج یافت و بنا بر استدلال بادشاہ دین پناہ (عالمگیر) چند بار بدرگاہ عظمت و جاہ رسید با تمام تجلیل و تکریم و انواع توقیر و تعظیم مخصوص گذشتہ بود۔“

آپ کی نسبت مشہور ہے کہ اورنگ عالمگیر آپ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس کا تو کوئی ثبوت ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ البتہ آنحضرتؐ ہے کہ عالمگیر آپ کا اور آپ کے بھائی مول کا قید و لان تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ اپنے بھائی صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ اور اورنگ زیب نے ان کے ارشادات کو قوت اور لوہے بنا۔ عالمگیر نامہ میں آپ کے بڑے بھائی (خانہ الرحمۃ) شیخ محمد سعید (المتوفی سنہ ۱۰۵۹ھ) کی نسبت لکھا ہے:-

”و شیخ محمد سعید و شیخ محمد معصوم پسرانِ شیخ منصور و لقب اسرار خاتون و علوم شیخ احمد ہندی کہ کتب فضائل و کمالات صوفی و صوفی خلق و صدق آن سالک مسلک و حریت و عرفان است“ بالتمام سند اشرافی۔۔۔ مورخہ نواز شکر گردیدند۔“

ایک اور جگہ بھی مؤرخ لکھتا ہے ”و توفی شہداء شیخ محمد سعید خلف شیخ احمد سرہندی“

خلعت و دو ہزار روپیہ۔۔۔ مرحمت شد۔“

شیخ محمد معصوم کی نسبت فرحت الناطقین کا اندراج ہم نقل کر چکے ہیں۔ اسی تذکرہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ شیخ محمد معصوم کے دوسرے بھائی شیخ محمد یحییٰ، شیخ محمد سعید اور مؤخر الذکر کے دو فرزند شیخ سعد الدین اور شیخ عبد الاحد المعروف بر میاں محل کئی بار ”بادشاہ دین پناہ“ کی بارگاہ میں پہنچے اور الطاف شامشہی سے فیض یاب ہوئے۔ اس سے اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عقیدت فقط شیخ محمد معصوم سے نہ تھی، بلکہ حضرت مجدد کے تمام خاندان سے تھی۔

خواجہ محمد معصوم کے کامل کا صحیح طور پر مطالعہ نہیں ہوا۔ مکتوبات کی تین جلدیں مختلف مطبعوں سے منتشر طور پر شائع ہوئیں۔ اور اب غنقا ہیں۔ ان کی محاصرہ لہو انحرولیا بھی ابھی طباعت سے محروم ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر سلسلہ مجددیہ کو بے انتہا وسعت دی۔ ان کے خلفا کابل، پشاور، ننگر پار کے علاقے میں بہت تھے۔ ایک خلیفہ شیخ مراد نے شام میں اقامت اختیار کی۔ وہاں انھیں بڑا عروج ہوا۔ اور ان کی بدولت سلسلہ مجددیہ نقشہ بندیر کو بڑی وسعت ہوئی۔ ہندوستان میں بھی کئی امرا و اکابر آپ کے حلقہ ارادت میں تھے۔ مثلاً نجف اور خاں (جو مراۃ العالم کا مؤلف سمجھا جاتا ہے) کامنگار خاں وغیرہ۔

خواجہ محمد معصوم کا ایک اور مشہور مرید فارسی شاعر ناصر علی سرہندی تھا جس نے آپ کی تعریف میں کئی شعر کہے ہیں:-

چراغ ہفت محفل خواجہ معصوم	منور از فروغ شش ہند تاروم
رود جائے کہ جا آنجانہ گنج	نظر بے کار ماند پانہ گنج
ردائے ماہتابی شرع بردوش	چوں صبح از پاکی باطن قلب پوش

لے آدم الشعراء اردو کی دکنی کے استاد گلشن کے پیرو مشد تھے۔ اور آپ کے عرف لگی پر ہی اس نے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ آپ کا ضخیم دیوان (دیوان وحدت) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

ستون بارگاہِ شرع اسلام بہ افعالِ پمپیر گام بر گام
زہے عزت کہ ربُّ العزت داد کھ بر سر تاجِ قیومیش بہناد
شیخ محمد معصوم کی وفات اورنگ زیب دسویں سال جلوس ۹۷۸ھ (۱۵۷۱ء)
میں ہوئی۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد یحییٰ عرف شاہ جہتھے
وہ ۱۰۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم ظاہری بڑے انہماک سے حاصل کیے
موظا شیخ عبدالحق محدث سے پڑھی۔ ان کی شادی حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے
خواجہ کلاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے آپ کو
مدد معاش کے طور پر بہت کچھ دیا ہوا تھا۔ چنانچہ آج تک سرہند میں ضرب المثل ہے۔
”الملک الملک والملک ایچی“۔ سرہند میں آپ نے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ دینی
علوم میں کئی کتابیں لکھیں۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو وفات پائی۔ اور سرہند میں
مدفون ہوئے۔

خواجہ محمد معصوم کے جانشین خواجہ محمد نقشبند تھے۔ ان کا ذکر ہم عہد عالمگیری کے
ضمن میں درج کریں گے۔

ہم حضرت مجددی تصانیف کے سلسلے میں ان کے رسالہ ردِّ و افض کا ذکر کر چکے
ہیں۔ شیعہوں کی مخالفت حضرت مجددی تعلیمات کا ایک اہم جزو تھی۔ وہ خلفائے اربعہ
کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے
خطبہ عید کے دوران میں خلفائے راشدین کا نام نہ لیا تو آپ نے فوراً اس شہر کے
مشارح و قضا کو خط لکھا کہ خطیب کی اس فروگزاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی۔

”شہید شد کہ خطیب آن مقام در خطبہ عید قربانی ذکر خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ

عنہم ترک کردہ واسامی متبرکہ ایشان را نخواندہ... و نیز شہید کہ اکابر و ابالی آن مقام

دریں باب مباہلہ و زیندہ۔ و بشدت و بغاظت بآن خطیب بے انصاف پیش نیاندہ

وائے نہ یکبارہ بلکہ صد بار وائے!..... چو استماع این خبر وحشت اثر در شورش

آورد و بگ فاروقیم را حرکت داد۔ بچند کلمہ اقدام نمود۔

خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرزِ عمل تھا، جو ان کے والد بزرگوار کا
تھا۔ اور ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اول۔ شمارہ ۶۴) جو کہا جاتا
ہے کہ انھوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا۔ اور جس میں تکفیر و افض اور ان کو
قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیں درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے:-

ابودرداء میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ

ہوں گے جن کو روافض کہیں گے، جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا

کیونکہ یہ مشرک ہوں گے۔

شیخ آدم بنوری | حضرت مجدد کے خلفاء اور فیض یافتگان کا سلسلہ بڑا وسیع

تھا۔ صاحبزادگان شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم کے بعد ان میں سب سے بزرگ میر محمد نعمان

اور خواجہ ہاشم کشمی کو سمجھا جاتا ہے۔ مورخ الذکر زبدۃ المقامات کے مصنف، مکتوبات کے

دفتر سوم کے مرتب اور ایک بڑے خوشگوشاعر تھے۔ ہم نے ارخانِ پاک (انتخابِ چہارم)

میں ان کی کئی نثریں درج کی ہیں۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کے کام کا میدان

برہان پور کا علاقہ تھا، جہاں سلسلہ مجددیہ بلکہ اسلام کی جڑیں بہت گہری تھیں۔

۱۔ جتنی وضعی حدیثیں اس مسئلے پر ہیں، شاید ہی کسی اور مسئلے کے متعلق ہوں۔ واقعہ یہ ہے

کہ بنی امیہ اور بنی عباسیہ کی کشمکش کے دوران میں مخالف فریق ایسی حدیثیں گھر گھر اپنے حقائق کو

ذیل اور بے بنیاد کر کے کی کوشش کرتے تھے۔ سولہویں صدی میں ایران و توران کی کشمکش سے پھر

پُرانی تلخ بحثیں تازہ ہو گئیں۔ ایک طرف اسماعیل صغریٰ شاہ ایران تھا، جس کی ترجمانی علمائے مشہد

وغیرہ نے کی۔ دوسری طرف خیبانی خاں ازبک، جس کو علمائے ماوراء النہر سے مدد ملی تھی حضرت

مجدد اور دوسرے نقشبندیہ بزرگوں کا شیعہ سنی مسئلے پر علمائے ماوراء النہر کا نقطہ نظر تھا۔ لیکن

شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں اس نقطہ نظر میں ملائمت آئی۔ اور علیحدہ تحریک میں

شیعہ سنی زعمائے بل کلام کیا۔ خود بانی پاکستان کا بڑا عظیم اثنا عشری شیعہ تھے۔

حضرت مجدد کے ایک اور خلیفہ جنہیں ان کے بے شمار معتقدین صاحبزادگان سے بھی
بڑھ کر سمجھتے تھے۔ اور جو مختصر تعلیم کے باوجود صفحات تاریخ پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے۔
شیخ آدم بنوری تھے۔ وہ بنور کے دو سرزند سے بیس میل دور ایک بستی ہے (رہنے
والے تھے۔ پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ لیکن ایک واقعہ سے متاثر ہو کر ملازمت
ترک کر دی۔ اور پہلے حاجی خضر خاں افغان اور پھر حضرت مجدد کی خدمت میں حاضر
ہو کر نعمت باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ شروع میں اُقی محض تھے۔ ایک جذبہ بزرگو
کے تحت قرآن مجید حفظ کیا۔ اور علوم ظاہری بھی حاصل کیے۔ پھر ایک عالم کو سیراب
کیا۔ آپ کی شخصیت بڑی قوی الاثر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار
سے زیادہ طلبائے معرفت جمع رہتے تھے۔ جن کو آپ کے لنگر سے کھانا ملتا تھا۔
آپ کے خلفاء کی تعداد ایک سو اور مریدین کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جہاں
آپ جاتے تھے، ہزار ہا پٹھان آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ۱۶۲۲ء میں آپ
لاہور تشریف لے گئے۔ ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ بعض مخالفوں نے
شاہجہان کو خبر پہنچائی کہ شیخ کے پاس اتنی جمعیت ہے کہ اگر وہ چاہے تو حکومت
کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ شاہجہان نے اپنے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں اور ملا عبدالحکیم
سیالکوٹی کو تحقیق حالات کے لیے بھیجا۔ آپ ان سے سرد مہری سے پیش آئے۔
دیر تک ملے نہیں اور جب ملے تو بے رخی سے بات چیت کی۔ انھوں نے واپس
جا کر سارے حالات بادشاہ کو سنائے اور کہا کہ بے شمار افغان شیخ کے ساتھ ہیں۔
ممکن ہے کوئی فتنہ پیش آئے۔ چنانچہ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ شیخ حج کو چلے جائیں۔
شیخ پہلے ہی حج کو جانا چاہتے تھے۔ بڑی خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی اور وہیں
مدینہ منورہ میں قریباً ۲۵ سال کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۶۴۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔
شیخ آدم بنوری توحج کے لیے چلے گئے، لیکن انھوں نے فیض کے بوسہ چٹنے
لگائے تھے، ان کا فیض جاری رہا۔ ان کے خلفاء بے شمار تھے۔ جن میں سے کئی افغان
علاقہ میں تھے۔ (شاید روشنی فرقہ کے زوال کا ایک باعث یہ بھی تھا۔ کہ اب

افغان علاقے میں نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں مثلاً شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد مصوم
کو جن کے اجداد کا روہ یا کابل سے خاندانی تعلق تھا، بڑا قبول حاصل ہوا۔ اور لوگوں
کی توجہ اس طرف پھر گئی۔ آپ کے خلفاء میں سے لاہور کے شیخ سعدی (جن کے کئی
افغان مرید تھے)۔ کوٹاٹ میں حاجی عبداللہ کوٹاٹ اور پشاور میں شیخ نور محمد پشاوری خلف
انور درویشہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک بزرگ حافظ سید عبداللہ آبادی تھے۔
جن کے مرید شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا شیخ عبد الرحیم اور شیخ محمد رضا ہوئے۔ جن سے
خود شاہ صاحب نے فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے انفس العارفین میں شیخ آدم بنوری
اور حافظ صاحب بہت سے واقعات لکھے ہیں اور شیخ کی بڑی تعریف کی ہے۔
شیخ آدم بنوری صاحب تصانیف تھے۔ کلمات معارف میں نقشبندی سلسلہ
کی تعلیمات کو مدون کیا ہے۔ اور بہت سی معرفت کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس سے
پہلے نکات الاسرار میں اسی مضمون پر لکھا تھا۔ مناقب الحضرات میں آپ کے
حالات شیخ محمد امین بدخشی نے بڑے غلے بلکہ تاریخی صحت کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں۔
اہل تشیع کے متعلق حضرات مجددیہ کا جو نقطہ نظر تھا، وہ تو مندرجہ بالا اقتباسات
سے ظاہر ہے، لیکن اس مسئلے پر دوسرے نقشبندیہ حضرات کا بھی یہی نقطہ نظر تھا (نقشبندیہ
سلسلے کو مالوراء النہر کی سرزمین سے خاص تعلق ہے اور شیعہ سنی مناقشات زیادہ تر
نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعے ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں
اس سلسلے کے بانی خواجہ خاوند محمد نقشبندی المعروف بہ حضرت خواجہ ایشاں تھے،
جو شیخ سرہندی کے ہم عصر تھے۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور
سمرقند و کابل ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ کشمیر میں آپ کے سلسلے کو خاں
فروغ ہوا۔ یہاں ان دنوں شیعہ سنی سوال زوروں پر تھا۔ دربار دہلی کی طرف سے
نواب خاں والی کشمیر تھا۔ قضا را شیعوں اور اہل سنت کے درمیان بلوہ ہوا اور
بہت سے کشت و خون کے بعد قاضی ابوالقاسم اور قاضی محمد عارف کی عدالت
میں مقدمہ پیش ہوا۔ انھوں نے اہل تشیع کی سزا دہی میں توقع کیا۔ اس سے

اہل سنت ندامت ہو گئے اور خواجہ خاوند محمود کی سرکردگی میں شہر چھوڑ کر ہفت چنار آگئے۔ ناظم صوبہ انھیں آکر مناکے لئے لیا اور شیعوں کے خلاف کارروائی بھی کی۔ لیکن اس نے ساتھ ساتھ دربار شاہی میں خواجہ کی شکایت بھی۔ چنانچہ دربار میں گئے گئے اور ان کے متعلق فیصلہ ہوا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کشمیر واپس نہ جائیں اس کے بعد وہ مختلف مقامات میں شاہی لشکر کے ساتھ رہے اور بالآخر ۱۶۴۲ء کو بمقام لاہور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے۔

خواجہ خاوند محمود تو شاہی حکم کے بعد کشمیر نہیں گئے، لیکن شیعہ سنی چپکچپ ان کے جانشینوں کے عہد میں جاری رہی۔ ان کے ایک ستجادہ نشین خواجہ کمال اللہ ریہ نقشبندی تھے۔ انھوں نے شیعوں کی مخالفت جاری رکھی اور ان کی کوششوں سے اینٹالی ایک شیعہ کو قتل کی سزا ہوئی۔ اس پر شیعہ برا فروختہ ہو گئے اور ایک آدمی کو آمادہ کیا کہ خواجہ صاحب کو شہید کرے۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۶۴۲ء کی رات کو (یعنی منوہا جانناں کی شہادت سے پندرہ سال پہلے) آپ اپنی خانقاہ میں شہید کر دیے گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد شیعوں، سنیوں میں پھر بلوے ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

علوم دینی کا نیا دور | حضرت مجدد الف ثانی ایک بڑے عالم تھے۔ اور شریعت کی پیروی پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ اپنے صوفیانہ احوال و واقعات کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھتے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ انھوں نے تصوف کو شریعت سے قریب لانے کی مسلسل کوشش کی۔ اور بعض صوفی حلقوں میں جو مطلق العنانی اور آزاد روی وسطی دور میں پھیل گئی تھی۔ اس کی مخالفت کی لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ صوفی پہلے تھے اور عالم (متشرع) بعد میں۔ ان کا شمار فی الحقیقت "علمائے باطن" میں سے ہوتا ہے۔ اب جس بزرگ کا ذکر ہو رہا ہے۔ انھیں بھی تصوف سے بڑی دلچسپی تھی۔ متحدہ بزرگوں سے فیض پایا تھا۔ صوفیہ کا جو تذکرہ انھوں نے اخبار الاخبار کے نام سے لکھا۔ وہ اس زمانے کے ادبی شاہکاروں میں سے ہے۔ لیکن تصوف سے گہرے لگاؤ کے باوجود وہ صوفی کم تھے۔ اور عالم متشرع زیادہ۔ وہ شمالی ہندوستان کے پہلے بڑے عالم تھے۔ جنھوں نے اکبر کی فتح گجرات کے بعد حجاز کے سمندری راستوں کے کھل جانے کا پورا فائدہ اٹھایا۔ حرمین جا کر علم حدیث کی تکمیل کی۔ اور واپس آکر اس علم کی وسیع اشاعت کی۔ علوم اسلامی کے بڑے سرچشمے، یعنی مقامات مقدسہ سے اسلامی ہندوستان کا رشتہ جوڑنا ہی اتنا اہم تھا کہ محض اس کی بدولت انھیں علوم دینی کی تاریخ میں ایک بلند مقام مل جاتا ہے۔ لیکن حجاز میں جس بزرگ سے آپ زیادہ تر وابستہ رہے۔ ان کا موروثی وطن ہندوستان تھا۔ اور انھیں یہاں کی مذہبی مطلق العنانی کے ازالے اور روحانی اصلاح کا خاص خیال رہتا تھا۔ شیخ عبد الوہاب متقی فی الحقیقت شیخ علی متقی کے جانشین تھے۔ جنھوں نے مہدویت کے قلع قمع میں زندگی صرف کر دی۔ شیخ عبد الوہاب نے یہ طریق کار جاری رکھا۔ بلکہ اسے

وسعت دی۔ اور اپنے شاگرد اور مرید کو ان خطرات سے بچایا جو راسخ العقیدگی کو بعض مشہور اور با اثر لیکن آزادہ و صوفیہ مثلاً شیخ ابن العربی۔ شیخ عبدالکریم جیلی۔ شیخ غوث گوالیاری شطاری سے پیش آرہے تھے۔

بالجملہ شیخ عبدالوہاب کے زیر اثر شیخ عبدالحق محدث نے جو راستا اختیار کیا وہ اسی سمت جاتا تھا، جدھر صوفیہ کو حضرت مجدد الف ثانی لیجا رہے تھے۔ لیکن (تصوف) لگاؤ کے باوجود شیخ عبدالحق کی اصل جگہ "علمائے ظاہر" کے ساتھ تھی۔ ان کے عرفان پر ان کی قناعت غالب تھی۔ راسخ العقیدگی کی راہ پر وہ حضرت مجدد سے بہت آگے نکل گئے۔ انھوں نے نہ صرف اکبری بے قاعدگیوں پر تنفر کا اظہار کیا۔ اور فیضی سے علمدگی اختیار کی۔ بلکہ ایک زمانے میں حضرت مجدد کے بعض احوال و مقامات کے خلاف ایک زوردار رسالہ لکھا۔ بعض روایات کے مطابق اس کے بعد شیخ محدث کو حضرت مجدد کی بزرگی کا زیادہ احساس ہوا۔ لیکن جیسا کہ حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ نے اس رسالے کی وضاحت میں لکھا ہے "حضرت شیخ عبدالحق.... سخن بطور علمائے ظاہر فرمودہ اند و کلام حضرت مجدد بطور علمائے باطن است۔ شیخ عبدالحق علمائے ظاہر اور ٹھیکہ راسخ العقیدگی کے ترجمان تھے۔"

خاندانی حالات | شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے آبا و اجداد بھارا کے رہنے والے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور محرز فوجی عہدوں پر مامور ہوئے۔ شیخ کے دادا شیخ سعد اللہ تھے۔ ان کی زیادہ توجہ سلوک اور طریقت کی طرف رہی اور ان کے دو بیٹوں کو بھی یہی ذوق وراثت میں ملا۔

شیخ کے چچا شیخ رزاق اللہ مشتاقی نے علم و ادب میں نام پایا۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ ہندی میں ان کا تخلص راجن تھا اور اس زمانے میں ان کے کئی رسالے (مثلاً بہیمان۔ جوت نرنجن) مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے علوم کا بھی انھوں نے خوب مطالعہ کیا تھا اور علم تاریخ سے بھی

گہری دلچسپی تھی۔ ان کی مشہور تالیف واقعات مشتاقی لودھیوں کے متعلق معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ طریقت میں وہ شطاری سلسلے سے منسلک تھے جو اس زمانے میں مشرقی اور وسطی ہندوستان میں زوروں پر تھا۔ ان کی وفات ۸۱۷ھ میں ہوئی۔

شیخ سیف الدین | شیخ کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری نے باطنی اور روحانی امور پر زیادہ توجہ کی۔ وہ شیخ امان پانی پتی کے مرید اور صاحب استعداد بزرگ تھے۔ صوفیانہ ذوق و شوق اور عشق و محبت اس خاندان میں شیخ عبدالحق کے دادا سے شروع ہوا۔ وہ آزاد صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے۔ راتوں کو جاگتے اور سوز و گداز کے اشعار پڑھتے۔ ایک روز شیخ سیف الدین نے اپنے والد سے پوچھا کہ کبیر جس کے دوہے مشہور ہیں۔ مسلمان تھا یا کافر؟ آپ نے فرمایا موحّد تھا۔ انھوں نے دہرا کے پوچھا کہ کیا موحّد کو اسلام و کفر سے کوئی تعلق نہیں (کہ موحّد مگر غیر کافر و مسلمان است) انھوں نے مال دیا اور کہا کہ یہ نکتہ سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔

شیخ سیف الدین کے مُرشد شیخ امان پانی پتی وحدت الوجودی خیالات کے صوفی اور ابن العربی کے مقلد تھے۔ شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں: "وہ از صوفیہ موحّدہ است از تابعان ابن العربی۔ در علم ایں طائفہ مرتبہ بلند و پایہ ارجمند داشت و در تقریر مسئلہ توحید بیان شافی و تقریر وافی، و سخن توحید را فاش گفتے۔" ان کی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں جن کی شرع تائید نہیں کرتی۔ ان کا مشرب ملا متیہ تھا۔ اور یہ شیخ امان پانی پتی وہی ہیں جن کے ایک مشہور شاگرد شیخ تاج الدین زکریا جودھنی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھیں اکبر کے خیالات بدلنے میں دخل تھا۔ بدایونی ان کی اکبر سے ملاقات کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"تمام شب شطیحات و ترہات اہل تصوف از دہے شنیدند و چوں بہ شرعیات مقید نمود۔ مقدمات وحدت وجود کہ متصوفہ مبطلہ دارند و عاقبت منجر باماعت

والحمد للہ شونہ در میان آوردند

شیخ سیف الدین کو شیخ امان سے بڑی عقیدت تھی۔ جن کا اظہار انھوں نے اشعار میں بھی کیا ہے۔

ہرچہ از من در سخن آید یقیناً
ہست ہم از صحبت اکل مرد دیں
ورنہ چہ دلاست کہ راز درون
از دہن چہل منہ آید برون
من یکم و کیستم و چہستم
از دم عیضے نفسے زلیستم
اوست دیں راہ مرا راہنما
خاک در سخن چہم مرا توتیا

شیخ امان کے خیالات پر اہل شرع اعتراض کریں۔ لیکن ان کی علمی قابلیت میں شبہ نہیں اور مریدوں کی تعلیم و تربیت بھی وہ بڑی سوچ سمجھ سے کرتے تھے۔ شریعت کی مخالفت کے باوجود طریقت کے سلسلوں کے زیر پاہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان سلسلوں کے بزرگ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے اور اپنی تعلیم و تربیت میں اس کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ آج کل ہمیں نفسیات کے عالم بتا رہے ہیں کہ ذہن انسانی میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں افراد کے ذہن تحت الشوریٰ یعنی ان خیالات اور تصورات سے آگاہی ہو جو ان کے ذہن کی گہرائی میں موجزن ہیں۔ اہل تصوف اس اصول پر شروع سے ہی عمل پر اکتھے۔ اور سب اہل نظر شد مرید کو تلقین کرنے سے پہلے اس کے تحت الشوریٰ سے بخوبی واقف ہو جاتے۔ شیخ امان بھی اس اصول کو پوری طرح ملحوظ رکھتے۔ چنانچہ شیخ سیف الدین فرماتے تھے کہ جب میں پہلے پہل شیخ امان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اپنے تصورات اور خیالات کا کچھ حال بیان کرو۔ شیخ سیف الدین نے جواب دیا کہ مجھے تو صوفیانہ احوال ہی کوئی نہیں پیش آتے۔ میرے تصورات اور خیالات کہاں ہوں گے۔ شیخ امان نے کہا کہ یہ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ تمھاری طبیعت مناسبت کا اندازہ لگاؤں۔ اور یہ معلوم کروں کہ تمھارے ذہن کا کیا اسلوب ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہاں سے اب محسوس ہوتا ہے کہ سارا جہان فرش سے لے کر عرش تک

میں نے گھیر رکھا ہے (محاطہ من است۔ ومن برہمہ محطہ) شیخ نے فرمایا کہ تمھارے دل میں توحید کا سمندر موجزن ہے اور اس لیے مسئلہ توحید میں ہی زیادہ تعلیم و تربیت دی۔

شیخ محدث کے سجدار اور خفیق والد نے اپنے ہونہار فرزند پر اپنے خیالات مسلط نہیں کیے لیکن دونوں میں مسئلہ توحید پر اکثر گفتگو ہوتی تھی اور شیخ سیف الدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے۔

شب و روز در خدمت ایشان ورتذکرہ و تذکار و بحث و تکرار میگزشت و بندہ را بہ ہمنائی خود قبول داشتہ محفوظ بودند۔ خصوصاً در تلقین علم توحید و تحقیق مسئلہ وحدت وجود و وجہ کہ موافق علم و شہود است۔ و اگر گاہ بہ مقتضای تقیید مقامات علم کسی و بقصد تحقیق این علوم و ہنر و دہی و غد غم و شبہ در میان آوردہ می شد۔ فرزند را از این نوع شبہات و شکوک دریں مسئلہ بسیار بود۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ پرودہ از رخسار کار کشادہ و جمل یقین روئے نماید۔

ابتدائی تعلیم | شیخ سیف الدین نے اہل علم کی مجلس میں اونچی جگہ حاصل نہیں کی، لیکن انھوں نے اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تدریس پر پوری نظر رکھی اور شیخ کی تربیت بڑے نیک اصولوں پر کی۔ علوم ظاہری سے بھی آپ کو بہرہ وافر دلایا۔ اور بے تعصبی اور انصاف پسندی کی تلقین بھی شروع ہی سے کی۔ چنانچہ آپ اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے۔ "باج کس در بحث علم نزاع نہ کنی و کلفت نرسی"۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی۔ ورنہ دوسرے بار بگو۔ اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ راجحین معلوم است۔ اسی طرح طمع و حرص سے بھی وہ بالکل خالی تھے اور کہا کرتے تھے کہ حرص اور طالب جاہ عالم سے گنہام لیکن متوکل اور متقی کم علم اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق سے انھوں نے کہا کہ چون شاہدہ کدہ می شود کہ علما و فضلا در طلب جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و

لیکن آپ کی بڑی خواہش تھی کہ بڑیا علم و فضل میں شہرہ آفاق ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ اہل دل ہو۔ ملائے خشک و ناموار نباشی۔

شیخ عبدالحق کو شروع ہی سے پڑھنے لکھنے سے بے حد رغبت تھی۔ اخبار الاخبار کے اخیر میں لکھتے ہیں: از ابتدا سے ایام طفولیت ہی دایم کہ بازی چیت و خواب کلام و مصاحبت کیست و آرام چہ و آرائش و سیر کجاست

شب خواب چہ و سکون کلام است

خود خواب بعاشقان حرام است

ہرگز در شوق کسب و کار، طعام بوقت نخوردہ و خواب در محل نبردہ "رات کا زیادہ حصہ پڑھنے میں اور دن کا زیادہ حصہ کتابیں نقل کرنے میں گزرتا۔ والدین ان سے کہتے کہ محلے کے لڑکوں سے جا کر کھیلو۔ تو وہ جواب دیتے کہ آخر کھیلنے سے مقصد دل خوش کرنا ہے۔ میرا دل اس مطالعہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آدھی رات گزر گئی اور والد نے آواز دی کہ سو جاؤ۔ تو میں لیٹ گیا۔ اور جب والد کی آنکھ لگ گئی تو پھر اٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ چند ایک مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ پڑھتے پڑھتے کتاب میں اتنے منہمک ہو گئے کہ چراغ کی لوسے پگڑی کو آگ لگ گئی۔ اور انہیں اس وقت معلوم ہوا جب سر کو گرمی پہنچی۔

چہ دودہائے چراغ کہ در دماغ نرفت کلام بادہ محنت کہ در ایاغ نرفت

کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام چہ خار خار کہ در بستر فراغ نرفت

بحیر تم نعل خود کہ عمر رفت و لے نرگش غم کہ ہرگز بعضی باغ نرفت

شیخ عبدالحق کے علمی انہماک کا یہ عالم تھا تو جائے تعجب نہیں **دربار اکبری** کہ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جہاں تک دہلی میں ممکن تھا

تعمیل تعلیم کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ فتح پور سیکری تشریف لے گئے جو

ان دنوں اکبر کا دار السلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں آپ نے دس و

تدیس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ

برابر جاری رہا۔ اور ایک برگزیدہ اور نڈر بزرگ سے اسی زمانے میں بیعت ہوئی۔ سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا۔ آپ کی علمی قابلیت نے کئی علماء دربار مثلاً فیضی، مرزا نظام الدین بخٹی مصنف طبقات اکبری ملا عبدالحق بدایونی کو مستحضر کیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی اور شاید فیضی ابو الفضل اور اکبر کی خواہش تھی کہ آپ ان کے ہم خیال ہو جائیں۔ آپ زاد المتقین میں اعتماد تعلیم کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔ (ترجمہ)

محبب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے (علم کا) خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہل حقوق

نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا۔ اور میں بادشاہ وقت اور اعرار کے پاس گیا۔

انہوں نے میری طرف بہت توجہ کی۔ میرا تہ بند کیا۔ بلکہ ارادہ کیا کہ میرے ذریعے

اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ضعیف سے اپنی قوت میں اضافہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ

نے مجھے محفوظ رکھا۔

شیخ محدث اور اکبری دربار کے تعلقات کی تفصیل نہیں ملتی، لیکن آنا معلوم ہے کہ فیضی ان کا بڑا مداح بلکہ شیدائی تھا۔ اور شیخ امان پانی پتی کے جس گھر انے سے آپ کے والد نے فیض حاصل کیا تھا۔ اس کے کئی افراد اکبر کی مذہبی بے راہ روی میں اس کے راہنما تھے۔ عجب نہ تھا۔ آپ کا قدم بھی صراط مستقیم سے دور جا پڑتا۔ لیکن عنایت ایزدی اور ایک نیک نفس باپ کی تربیت کا فیض تھا۔ آپ پر اکبری دربار کے اثرات غالب نہ آ سکے۔ آپ نے بیعت کی تو وہ بھی ایک ایسے بزرگ سے جو اس زمانے میں بھی اکبر کے دیوانخانے میں اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے تھے۔ اور جب شعائر اسلامی کی محبت اور بیرونی ماحول میں کشمکش بڑھ گئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک جذبہ کے ماتحت پہلے دہلی آئے اور پھر حجاز کا رخ کیا۔

لے شیخ کے یکایک سفر چ پر (بلا اطلاع) روانہ ہونے پر فیضی نے جل جہنم کر جو خط لکھا اس کا ایک پڑی فقرہ ہے: "خدا نخواستہ باشد حق خدمت و نمک محبت (نمک و محبت) را فراموش نگندند"

شیخ موسیٰ پاک شہید ملتانی | شیخ سیف الدین کا سلسلہ بیعت پانی پت

دیکھیے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو مرید اس بزرگ کا کرایا جو علمی دنیا میں شہرت نہیں رکھتا، لیکن روحانی اور اخلاقی میدان میں دوسروں سے آگے تھا۔ شیخ موسیٰ گیلانی جن کے ”بر امرید“ شیخ محدث علیہ السلام میں معنی والد کی وفات سے پانچ سال پہلے مرید ہوئے، آج کے قادری بزرگ تھے۔ ان کے والد مخدوم شیخ حامد جیلانی نے اپنی زندگی میں انھیں اپنا جانشین منتخب کیا تھا، لیکن بڑے بھائی کو اس سے اختلاف تھا۔ چنانچہ عبد اکبری کے اواخر میں شیخ موسیٰ آج چھوڑ کر دربار میں آگئے۔ یہاں آپ کو پانسو کا منصب ملا۔ اور ایک زمانہ آپ لشکر شاہی میں رہے، لیکن جس جرات کے ساتھ آپ دربار اکبری میں آمد و رفت رکھتے تھے، اس کا بیان بدایونی کی زبان سے سنئے۔

”موجود بادشاہ در عین دیوان خانہ خاص و عام اگر وقت نمازی رسید۔ خود اذان گفتہ

نماز بحضور خلیفہ وقت بر جماعت ہی گزارد۔ ویک کس چیزے نے توانست گفت۔

شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں مرشد کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ شیخ موسیٰ اکبری دور میں احیائے اسلام کے سرگرم ترجمان تھے۔

اگر دیگران قطب اند۔ اقطاب الاقطاب است۔ و اگر ایشان سلاطین، اولیائے المملکین۔

محل الدین کہ درین اسلام زندہ گردانید وقت کفر بمیرانید۔

شیخ موسیٰ گیلانی ایک عرصے تک لشکر شاہی اور دار السلطنت میں اسلام کا بول بالا کرتے رہے۔ اور کئی شہر نشینوں کو اس بادیہ پیمای کی بدولت روحانی تازگی اور

ملہ بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ حصول منصب پہلے آپ مریدان شاہی میں داخل ہو گئے تھے۔ مودنی یام شیخ موسیٰ بعد از زہد و جلالت و شیخت چندان سال ارادت متعارف رسمی بر پادشاہ اور خصوصت سپاہگری یافتہ و تسلیم کوکری کردہ داخل درلے پندہی شدہ۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۹۲)

استقامت نصیب ہوئی۔ بالآخر آپ کسی سلسلے میں ملتان تشریف لے گئے اور ۲۰۰۰ میں وہاں شہادت پائی۔

شیخ موسیٰ گیلانی کے فیض صحبت سے شیخ محدث کی اسلامی حقیقت سفر حرمین کو اور تقویت ہوئی، لیکن فتح پور سیکری کا ماحول ٹھیکہ اسلامی خیالات کی نشوونما کے لیے سازگار نہ تھا۔ اس لیے طبیعت ایک سخت باطنی کشمکش میں گرفتار تھی۔ بالآخر عنایت ایزدی شامل حال ہوئی۔ اکبر کی فتح گجرات (۱۵۵۶ء) نے سمندری سفر کا راستا آسان کر دیا تھا۔ اور شاید آپ شمالی ہندوستان کے پہلے برگزیدہ عالم تھے جو فرضیہ حج کی ادائیگی کے لیے ہی نہیں بلکہ مزید علمی ترقی کی خاطر اس راستے سے حجاز روانہ ہوئے۔

شیخ محدث نے اپنا سفر ایک جذبہ کے تحت بغیر کسی تیاری اور ساز و سامان کے (”بہ طریق جذبہ“ بہ بیچ چیز مقید نشدہ) بلکہ پوری معلومات حاصل کیے بغیر شروع کیا تھا، لیکن اس وقت تک علماء و امرا میں ہر جگہ آپ کے قدردان موجود تھے انھوں نے آپ کی آمد کو اپنی خوش قسمتی خیال کیا اور راستے کی مشکلات باسانی کٹ گئیں۔ گلزار ابرار کا مصنف غوثی لکھتا ہے کہ ۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں آپ گھر سے نکلے۔ پہلے مالوہ پہنچے۔ یہاں کا حاکم اکبر کا رضائی بھائی اور مشہور متدین امیر مرزا عزیز کو کہہ تھا۔ کچھ عرصہ اس کے پاس قیام فرمایا۔ مالوہ کے قدیمی دار الخلافہ مانڈو تشریف لے گئے۔ وہاں غوثی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوا۔ پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے قدیمی دوست مرزا نظام الدین اکبری کے پاس قیام کیا۔ جو ان دنوں مٹوہ گجرات کے بخشی تھے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانا کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ کوئی ایک سال تک رگنا پڑا۔ اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے۔ بلکہ شاید آپ مشہور تذکرۃ الاولیاء اخبار الاخیار کے زیادہ وسیع نقطہ نظر اور زیادہ صحیح معلومات کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہل علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضرورت کے سلسلے میں دار الخلافہ میں آتے تھے، واقف تھے۔ بلکہ آپ نے (حجاز کے علاوہ)

پنجاب - بندھیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا۔ وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں۔ اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اور اطراف ملک کی روحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی۔ احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخبار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان کے فادریہ سلسلہ کے کئی افکار و اشغال بھی حاصل کیے۔ مولانا سلیمان کردی نے ان کے صاحبزادے مولانا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نور الدین اہل آبادی کے استاد تھے، آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی۔

۱۵۸۷ء کا اخیر یا ۱۵۸۸ء کا شروع تھا جب شیخ نے ساحل ہندوستان کو خیر باد کہا۔ زاد سفر مہلتا کرنے اور جہازی اخراجات بہم پہنچانے کی سعادت، بخشی نظام الدین کو نصیب ہوئی۔ حجاز پہنچتے ہی آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس لینا شروع کیا۔ فریضہ حج سے فارغ ہوئے۔ اور پھر شیخ عبد الوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن کا احسان آپ کی علمی اور روحانی زندگی پر سب سے زیادہ ہے۔

شیخ عبد الوہاب متقی، ہم شیخ عبد الحق محدث کے ابتدائی وحدت الوجودی ماحول کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے والد، چچا اور والد کے مرشد شیخ امان پانی پتی کا جو انداز خیال تھا، اگر اس کے زیر اثر وہ اسی رنگ میں رنگے جاتے تو کسی کو تعجب نہ ہوتا، لیکن خوش قسمتی سے حرمین میں انھیں ایک ایسا استاد میسر آیا جو ابن العربی اور اس کے ہم مشرب بزرگوں کے خیالات پر کڑی نظر رکھتا تھا اور جس نے شیخ عبد الحق کے ابتدائی ماحول کی تلافی کر دی۔

شیخ عبد الوہاب متقی شاید (شیخ علی متقی کے علاوہ) پہلے با اثر ہندوستانی عالم میں جنھوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبد الحق محدث اور شیخ محمد طاہر بیٹنی جیسی مستیوں پر اثر ڈالا۔ وہ اور ان کے استاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔

شیخ عبد الوہاب کی ولادت مالوہ کے دار الخلافہ مانڈو میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ ولی اللہ امرائے سلطنت میں سے تھے۔ چند واقعات کی بنا پر انھیں مانڈو چھوڑ کر برہان پور آنا پڑا، لیکن تھوڑا عرصہ بعد وہ اور شیخ عبد الوہاب کی والدہ انتقال کر گئے۔ اور شیخ صغیر سنی میں یتیم ہو گئے۔ ان پر پتا نہیں، ان حوادث کا اثر ہوا یا کوئی اور سبب تھا انھوں نے وطن مالوٹ چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور گجرات، دکن، لکھا اور دوسرے ممالک کی سیر کی۔ جہاں کہیں جاتے، طلب علم اور صحبت اہل اللہ میں منہمک ہو جاتے۔ بلکہ عنفوان شباب میں ہی مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی۔ مؤخر الذکر کے شیخ عبد الوہاب سے مراسم تھے۔ اور انھیں بھی والد نے وصیت کی تھی کہ اگر ہو سکے تو تم شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنا اور شیخ غوث گوالیاری اور اس قسم کے لوگوں سے پیچھے رہنا! آخر کار شیخ عبد الوہاب متقی، شیخ علی متقی کے مرید ہوئے۔ اور بارہ سال تک ان سے فیض حاصل کیا۔

شیخ علی متقی | شیخ علی متقی، جن کا فیض شیخ عبد الحق کو شیخ عبد الوہاب کی وساطت سے پہنچا۔ خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا آبائی وطن جو نپور تھا، لیکن وہ خود مانڈو میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ خاندان کے تھے۔ اس لیے عنفوان شباب امرار واکا بر کے درمیان گزرا۔ لیکن عین عالم شباب میں ایک جنبے کے تحت دنیوی دلچسپیاں ترک کر دیں۔ اور ملتان پہنچ کر شیخ حسام الدین متقی کی خدمت میں راہ سلوک طے کی اور تفسیر بنیادی اور عین العلم کا درس لیا۔ وہاں سے مانڈو اور احمد آباد کے قیام کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔ اور مزید علمی اور روحانی سر بلندی کا سامان کیا۔

آپ کے اساتذہ میں سے شیخ ابو الحسن بکری، شیخ محمد سخاوی اور شیخ ابن حجر مکی جیسے بزرگ تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس و تصنیف میں مشغول ہو گئے اور بڑا درجہ حاصل کیا۔ مٹی کہ آپ کے استاد شیخ ابن حجر سلوک میں آپ کے مرید

میں لکھتے ہیں۔

شیخ محدث جب حجاز سے واپس آئے تو بدایونی نے دہلی میں ان سے ملاقات کی۔ ملاقات سرسری سی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بدایونی اس وقت لشکر کے ہمراہ جاسے تھے۔ بدایونی کو اس کا بڑا افسوس رہا۔ اور لاہور سے شیخ محدث کے نام ایک خط میں لکھا۔ در وقتیکہ ملازمان ایشاں بدلی تشریف آوردند۔ و مخلص خود را ساعتی لطیف مشرف ساختند۔ آن ملاقات بجز تعطش و شوق بتفرد و چن داں چیز ناگفتہ و ناشنیدہ ماند [ص ۲۴۵]

وفیسر صاحب نے اس خط کا ایک اور اقتباس درج کتاب کیا ہے۔ شیخ محدث اور ملا بدایونی کی "محبت و یگانگت" پر زور دیا ہے، لیکن ان کا کہنا یہ اظہار شوق بدایونی نے کیا۔ صحیح نہیں۔ جس خط سے انھوں نے نقل کیا ہے، وہ ملا بدایونی کا نہیں، شیخ محدث کا ہے۔ بدایونی کی حسب ذیل ہے۔

ایامیک [شیخ محدث] از مکہ معظمہ تشریف بدلی آورد و فقیر بحسب لب [طلب] با مضطرب تمام از بداؤں متوجہ اردوئے پادشاهی بودم۔ و خدش را در یافتم و بعد از انکہ بہ لاہور رسیدم، خطے نوشتہ فرستاد۔ آن بخت تین و تہ کار ثبت سے نماید۔

وفیسر نظامی نے اس خط کا جو پہلا اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اور پر نقل کر آئے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ اس خط کا لکھنے والا شخص ہے، جو دہلی میں مقیم ہے۔

دلی کا باقی اندراج غور سے پڑھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ انھوں نے ساتھ ساتھ طنز و تشبیح اور خردہ گیری کے اس زہر میں نہجے ہوئے نشتر چلائے ہیں۔ شیخ محدث کا بلند حدیث کی وجہ سے ہے۔ اور عشق رسول نے انھیں امتیازی

رنگ دے دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے ایک مستقل باب (ہشتم) مدینہ منورہ میں شیخ کی حاضری کے متعلق لکھا ہے۔ (بر عنوان مدینۃ الرسول میں) اس میں لکھتے ہیں۔ "شیخ عبدالحق دہلوی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق تھا۔ دیار حبیب میں جب داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے۔" (ص ۱۱۲)

اس سے پہلے بالوضاحت لکھتے ہیں۔ "۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ عبد الوہاب کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے۔ اور آخر جب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے" (ص ۱۰۸)۔ لیکن بدایونی کہتا ہے۔ کہ شیخ محدث تو مدینہ منورہ جا ہی نہ سکے!

یہی نہیں، بلکہ اُس کا بیان ہے۔ کہ شیخ نے صرف چند روز (تینے چند) مکہ معظمہ میں "شیخ عبد الوہاب ہندی" کے سامنے بیٹھ کر حدیث کی اجازت لی تھی۔ اور یہ شیخ عبد الوہاب ہندی کون تھے؟ شیخ رحمت اللہ محدث کے (جن سے خود بدایونی نے تیمناً حدیث کا سبق لیا تھا اور ان کے دست مبارک سے آب زمزم پیا تھا) "خادم"!

"و [شیخ عبدالحق دہلوی] بحسن سہی مرزا نظام الدین احمد و مظہری او دہاد شمسہ بسفر حجاز رفت و بخت تیخ (؟) بچھے موانع طبعی بدینہ سکینہ علی ساکنہا السلام و التقیات، نتوانست مشرف شد و روزے چند مکہ معظمہ بیش شیخ عبد الوہاب ہندی خادم شیخ رحمت اللہ محدث علیہ الرحمۃ (کہ باہمی نام ازج بازگشتہ باگرہ آمد و حقیر از دست مبارک او آب زمزم نوشیدہ و سبق حدیث تیمناً گرفتہ بود) اجازت حدیث حاصل کردہ، لوطی مالوت رسیدہ"

(منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳-۱۱۴)

اگر بدایونی کا بیان صحیح ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ مدینہ منورہ میں شیخ محدث کی جس حاضری کا پروفیسر خلیق احمد صاحب نے اس ولولے اور وضاحت سے

دہلوی میں لکھتے ہیں:-

شیخ محدث جب حجاز سے واپس آئے تو بدایونی نے دہلی میں ان سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات سرسری سی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بدایونی اس وقت لشکر کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بدایونی کو اس کا بڑا افسوس رہا۔ اور لاہور سے شیخ محدث کے نام ایک خط میں لکھا۔ ”در وقتیکہ ملازمان ایشان بدہلی تشریف آوردند۔ و مخلص خود را ساعتی لطیف مشرف ساختند۔ آن ملاقات بجز تعلقش و شوق بفرود و چنناں چیز ناغمہ و نا شنیدہ ماند“ [ص ۲۴۵/۲۴۶]

پروفیسر صاحب نے اس خط کا ایک اور اقتباس درج کتاب کیا ہے اور شیخ محدث اور ملا بدایونی کی ”محبت و یگانگت“ پر زور دیا ہے، لیکن ان کا یہ خیال کہ یہ اظہار شوق بدایونی نے کیا۔ صحیح نہیں۔ جس خط سے انھوں نے اقتباسات دیے ہیں، وہ ملا بدایونی کا نہیں، شیخ محدث کا ہے۔ بدایونی کی عبارت حسب ذیل ہے:-

در ایامیکہ [شیخ محدث] از مکہ معظمہ تشریف بدہلی آورد و فقیر بحسب مطلب [طلب؟] با مضطراب تمام از بداول متوجہ اردوئے پادشاہی بودم لحظہ و خدش را در یافتم و بعد از انکہ بہ لاہور رسیدم، خطہ نوشتہ فرستاد۔ نقل آن بجمت تمین و تذکرہ ثبت سے نماید....

پروفیسر نظامی نے اس خط کا جو پہلا اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اور جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ اس خط کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے، جو دہلی میں مقیم ہے۔

بدایونی کا باقی اندراج خود سے پرہیز تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ سبھی تعریفوں کے ساتھ ساتھ طنز و تشیع اور خردہ گیری کے اس بادشاہ نے زہر میں بجھے ہوئے نشتر چلائے ہیں۔ شیخ محدث کا بلند مقام علم حدیث کی وجہ سے ہے۔ اور عشق رسول نے انھیں امتیازی

رنگ دے دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے ایک مستقل باب (ہشتم) مدینہ منورہ میں شیخ کی حاضری کے متعلق لکھا ہے۔ (بہ عنوان مدینۃ الرسول میں) اس میں لکھتے ہیں:- ”شیخ عبدالحق دہلوی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق تھا۔ دیار حبیب میں جب داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے۔“ (۱۱۲ ص)

اس سے پہلے بالوضاحت لکھتے ہیں:- ”۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ عبد الوہاب کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے۔ اور آخر جب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے“ (ص ۱۰۸)۔ لیکن بدایونی کہتا ہے۔ کہ شیخ محدث تو مدینہ منورہ جا ہی نہ سکے!

یہی نہیں، بلکہ اُس کا بیان ہے۔ کہ شیخ نے صرف چند روز (تو نے چند) مکہ معظمہ میں ”شیخ عبد الوہاب ہندی“ کے سامنے بیٹھ کر حدیث کی اجازت لی تھی۔ اور یہ شیخ عبد الوہاب ہندی کون تھے؟ شیخ رحمت اللہ محدث کے (جن سے خود بدایونی نے تیمنا حدیث کا سبق لیا تھا اور ان کے دست مبارک سے آب زمزم پیا تھا) ”خادم“!

”و [شیخ عبدالحق دہلوی] بحسن سعی مرزا نظام الدین احمد و مدکاری او و ہائے شمسہ بسفر حجاز رفت و بجمت تیغ (?) بیضے موافق طبعی مدینہ سکینہ علی ساکنہا السلام و التحیات، نتوانست مشرف شد و روزے چند مکہ معظمہ بیش شیخ عبد الوہاب ہندی خادم شیخ رحمت اللہ محدث علیہ الرحمۃ (کہ باجائی) از حج بازگشتہ باگرہ آمد و حقیر از دست مبارک او آب زمزم نوشیدہ و سبق حدیث تیمنا گرفتہ بود (اجازت حدیث حاصل کردہ) بومس کاوت رسیدہ“

(منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳-۱۱۴)

اگر بدایونی کا بیان صحیح ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ مدینہ منورہ میں شیخ محدث کی جس حاضری کا پروفیسر خلیق احمد صاحب نے اس دلولے اور وضاحت سے

ہو گئے اور خرقہ برخلاف حاصل کیا۔ ۱۵۴۶ء میں آپ تھوڑی دیر کے لیے احمد آباد آئے جہاں کے بادشاہوں نے آپ کی بڑی قدر کی، لیکن آپ جلد ہی مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور اپنے شغل میں لگ گئے۔ سلطان روم نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۵۶۶ء میں بمقام مدینہ منورہ نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے معاہدہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی۔ شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے ہندی جوہوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی۔ اور نہ صرف اس مقصد کے لیے حکام وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ ہمدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل بھی لکھے اور ان کے نشانوں کی تفصیلات اور علمائے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے ہندی جوہوری کے دعاوی کی تردید کی۔ یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جوہدویت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔ آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علما کے علاوہ شیخ محمد بن طاہر ٹپنی تھے۔ جنہوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہوئے۔

شیخ عبد الوہاب کو اس طرح کے استاد ملے ہوں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اپنے خیالات کا کیا اسلوب ہوگا۔ شیخ علی کے علاوہ انھوں نے حرمین کے دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور جب شیخ عبد الحق مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت ان کا شمار وہاں کے بہترین علمائے سے ہوتا تھا۔ اور ہندوستانی طلباء کے لیے تو وہ خاص طور پر ایک آبرو رحمت تھے۔

شیخ عبد الحق ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ مکہ دریں زمل بدانش ایشال وہ علوم شرعیہ کتر کے خواہر بود۔ اور باوجودیکہ وہ فقہ حدیث اور لغت میں امام زمانہ تھے کہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی طلب ہمیشہ جاری رکھتے۔ ان کا قول تھا: "علم بمنزلہ غذا"

است کہ ہمیشہ احتیاج باقی است۔ ذکر کو وہ بمنزلہ دوا سمجھتے جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ بزرگان سلف کا قاعدہ تھا کہ وہ اعمال خیر تہذیب اخلاق اور نشر علوم کو باقی سب چیزوں کے مقابلے میں اہمیت دیتے اور ہی سلامتی کا راستہ ہے ایک دفعہ ان کی صحبت میں کسی نے مشائخ کا یہ قول دہرایا کہ طالب کو ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی نیک کاموں میں مشغول ہے وہ فی الحقیقت ذکر ہی کر رہا ہے نہ کہ ازل و ابد تلاوت قرآن ذکر است و دریں علوم دینیہ ذکر است و ہر چیز عمل خیر است ذکر است!! آپ نے شیخ عبد الحق کو بڑی محبت سے تعلیم دی۔ اور علوم شریعت و طریقت میں طاق کر کے اپنا مجاز مطلق و خلیفہ کل بنایا۔ شیخ عبد الحق وطن کے ماحول سے بددل ہو کر حجاز گئے تھے۔ ان کا واپسی کو بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن استاد نے سختی سے ہدایت کی کہ تمھاری بوڑھی والدہ اور تمھارے بچے منتظر ہیں۔ تمھیں واپس جانا چاہیے۔ شیخ نے پھر کہا کہ ابھی تو میرا دل ان مقامات شریفہ میں دیر تک رہنے کو چاہتا ہے پھر بغداد جانے کی خواہش ہے کہ حضرت غوث اعظم کے مزار کی زیارت کروں، لیکن استاد نے منع کیا اور کہا کہ تم بغداد جا کر پھر رگ جاؤ گے۔ اور وطن کی واپسی، جواب تمھارے لیے شرعی فرض ہے اس کی بجائے اسی میں دیر ہوگی۔ شیخ نے اور دلیلیں دیں۔ لیکن استاد نے دلائل عقلی و شرعی سے لا جواب کر دیا۔ اور بالآخر انھیں مجبور ہو کر وطن کا رخ کرنا پڑا۔

شیخ محدث اور بدایونی | شیخ عبد الوہاب متقی کے متعلق متذکرہ بالا حالات شیخ عبد الحق کی اپنی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ملا عبد القادر بدایونی کی تیغ زبان سے کوئی نہیں بچا۔ اس نے علما و فضلا کے ضمن میں ان کے متعلق چار صفحے لکھے ہیں مذکورہ جگہ دو خطوں نے لی ہے۔ ایک فیضی کا شیخ کے نام خط ہے جس سے اقتباسات ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ دوسرا ایک ایسا خط ہے جس کی نسبت منتخب التواریخ حصہ سوم کے انگریز مترجم اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ یہ خط بدایونی نے لاہور سے شیخ محدث کو لکھا۔ پروفیسر صاحب اپنی مشہور کتاب حیات شیخ عبد الحق محدث

ذکر کیا ہے۔ اہل شیخ عبدالوہاب کے فیوض اور علوم مرتبہ کی جو تفصیل انھوں (اور راقم السطور) نے گنتائی ہیں۔ ان کی صحت سے انکار لازم آتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم دونوں کے اندراجات شیخ محدث کے اپنے بیانات پر مبنی ہیں!

اب ایک فرد کی ترویج میں دوسرے فرد، بلکہ ایک مقدس ہستی کے مقابلے میں دوسری مشہور (اور بعض حلقوں میں بے انتہا مقبول) ہستی کے بیان کا مسئلہ ہے۔ ان میں سے کسے ترجیح دی جائے؟ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ اصل حقیقت فقط اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن روایت و درایت کے اصولوں سے شیخ کے بیان کو ترجیح ہوگی۔ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ انھیں حقیقت حال سے زیادہ خبر ہوگی۔ بدایونی کا اندراج سماعی معلومات پر مبنی ہے۔

بدایونی کو دانستہ غلط بیانی کا کمزور قرار دینا ضروری نہیں، لیکن اس کے بیان سے اتنا ظاہر ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے معاملے میں بھی، جنھیں وہ ”مجموعہ کمالات و منبع فضائل“ کہتا تھا۔ اگر اسے خردہ گیری کا موقع ملتا تو قلم کا شہر چلانے سے پہلے وہ تامل اور تصدیق واقعات کو کام میں نہ لاتا سواہ میاں بدایونی! ادواہ!!

تاوک نے تیرے صید نہ چھوڑا نہ لانے میں

ترپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فیضی اور شیخ محدث | شیخ عبدالحی محدث اگست ۱۵۹ھ میں مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پانچ سال سے زیادہ کی غیر حاضری

کے بعد دہلی پہنچے۔ جب وہ دارالسلطنت سے روانہ ہوئے تھے تو فیضی اور ان کے درمیان بڑی میل ملاقات تھی۔ واپسی پر فیضی نے چاہا کہ انھیں پھر اپنے حلقہ احباب میں شریک کرے۔ اور انھیں بلانے کے لیے بڑے پُر جوش، شوق آمیز خط لکھے۔ ”اگر بال و پر سے می داشتیم، ہر روز ہر باہم آں جھرمی ششم و دانہ چین نکلت محبت می شدم۔“

لیکن جو جذبہ روحانی شیخ کو بے قرار کر کے فتح پور سیکری سے باہر لے گیا تھا۔ وہ اب شیخ عبدالوہاب متقی کی صحبت میں اور حدیث نبوی کے مطالعہ سے اور قوی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ شاید انھیں اس تفاوت کا بھی اندازہ نہ تھا، جو فتح پور سیکری والے فیضی اور تفسیر غیر منقوط والے فیضی میں واقع ہو گئی تھی۔ انھوں نے معذرت آمیز خط لکھے۔ لیکن ملاقات کا قدیمی سلسلہ تازہ نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی عقیدت اس سے کم نہ ہوئی۔ اب اس کے خطوں میں وہ شوخی اور بے تکلفی نہ تھی، جس کا اظہار اس نے شیخ کی روانگی جواز پر کیا تھا، لیکن عقیدت و ارادت برقرار تھی۔ ایک خط میں شیخ کو ”ملک الاحبا“ کہا ہے۔ ایک اور خط میں انھیں لکھا ہے۔

”بموجود مطلق قسم کہ ہرگز اس شوق و طلق کہ اس شخص مشتاق را نسبت ایشان است بدگریہ نبودہ و نیست۔“

زمین لے نکل شتم، بمنزلے ز سیدم کہ در دلم نکل شتم، بخاطرم ز سیدی
والحق ای ہمد و مہربانی و دوام ہم نشینی و مہربانی کہ در ایام قرین و غربت از ایشان
و بایشان متحقق بود۔ چو ایں کس چنین کشاکش شوق بے قرار نہ سازد۔“
بالآخر فیضی کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ شیخ اس سے ملنا نہیں چاہتے۔ اس نے ”ملک الاحبا“ کے اس فیصلے پر بھی سر تسلیم خم کیا۔ لیکن عقیدت و ارادت اب بھی کم نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تفسیر سواطح الالہام لکھنے میں مشغول ہوا تو شیخ سے ملنے، انھیں تفسیر دکھانے اور ان سے داد لینے کی خواہش اور بھی بے قرار کرتی۔ کئی خطوط میں اس آرزو کا بے تابانہ اظہار ہے:-

تو اسے کہو تر باہم حرم چہ می دانی

طییدن دل مرغان رشتہ بر پارا

اشتیاق ملاقات گرامی و توجہ بر جمعیت باطن آن روحانی موطن نہایتے ندارد۔ و
دل بیخوش ایشان شاید حال بس کہ محبت روز افزوں است و ہمارہ چشم درازا
و پیغام می باشد۔ آن خود چوں گوید کہ در راہ مقدم شریف دارد۔ کہ خود را تابع

رضاے ایشیاں داشتہ۔ از خود خواہی خود را گزرا نیده است۔ علی الخصوص نسبت
بایشان دایں بار بر خود پسندیدہ و دل اگر بار کشد بار بکارت یارے

خوش باش کہ ناخوشے بھراں کر دیم

بر خود دشوار بر تو آسان کر دیم

چہ نو پسند کہ بر دل چہ می رود و در دل چہ می آید۔

شیخ سے بھی کبھی کبھار خط آجاتا، لیکن وہ ترک محبت الاضداد والاغیار میں
ثابت قدم رہے۔ انھوں نے فیضی کو فتح پور سیکری کی ان محفلوں میں دیکھا تھا جب
اس کی بے راہ روی اور رعزت عروج پر تھی۔ اس زمانے میں ان کی اور فیضی کی کارطی
چھفتی تھی۔ لیکن شیخ نے ان محفلوں میں جو کچھ دیکھا، اس نے ان کا دل اس قدر
کھٹا کر دیا کہ اب وہ سواطع الالہام والے فیضی سے بھی نہیں ملنا چاہتے۔ حالانکہ اس
دوران میں فیضی کے اندلہ خیال میں جو تبدیلی ہوئی۔ اس پر مثنوی تل و من کی نعت یا
تفسیر سواطع الالہام ہی نہیں، شیخ کے نام فیضی کے خطوط بھی گواہی دیتے ہیں۔ شیخ
اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے بلکہ انھوں نے تذکرۃ المصنفین دہلی میں فیضی کی
نسبت لکھا:-

فیضی اگرچہ در فصاحت و بلاغت و متانت و مضانت سخن ممتاز روزگار بود و لیکن
حیف کہ بخت و قور و سہو و دہاویر و ضلالت قدم انکار و ادوار بر ناصیہ احوال
خود کشیدہ۔ زبان اہل دین و ملت جناب نبوت را از بردن نام وے و نام
جماعت شوم وے پاک است۔

ج سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق نے دہلی میں قیام کیا اور اپنے آپ کو
درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی تصنیفی زندگی
سفر حجاز سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اخبار الاخیار کا نقش اول غالباً فتح پور سیکری میں
مکمل ہوا۔ آداب الصالحین جو امام غزالی کی تصنیف احیاء العلوم کے چند ابواب کا
فارسی ترجمہ ہے اور بعض دوسرے رسالے اسی زمانے میں لکھے گئے، لیکن حجاز میں

تکمیل تعلیم اور اپنے طویل سفر حرمین میں متعدد بزرگوں سے تبادلوہ خیال کے بعد اب شیخ
محدث نے سلسلہ تصنیف و تالیف باقاعدگی سے شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ اخیر عمر تک
جاری رہا۔ آپ نے مدینہ منورہ کی تاریخ موسومہ جذب القلوب فی دیار المحبوب سفر
حجاز میں شروع کی تھی، لیکن اس کی تکمیل دہلی پہنچ کر ہوئی۔ ان کے علاوہ آپ نے جو
کتابیں لکھیں، ان کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہے۔ ہم ان میں سے بعض کا
ذکر آئندہ صفحات میں کریں گے۔

شیخ عبدالحق محدث اب ایک مستند عالم تھے، لیکن سلوک و طریقت سے ان کی
دلچسپی کم نہ ہوئی۔ ۹۹ھ میں خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی قدس سرہ دہلی تشریف لائے
تو شیخ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل
کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے اور مخلصانہ تھے۔
طبیعتیں بھی ملتی تھیں۔ ان کے نام آپ کے متعدد خطوط مجموعۃ المکاتیب الراسل
میں موجود ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث اور حضرت مجدد الف ثانی

شیخ عبدالحق محدث کو حضرت خواجہ باقی باللہ
سے بڑی عقیدت تھی، لیکن ان کے نامور مرید
حضرت مجدد الف ثانی سے آپ کو سخت اختلافات
پیدا ہوئے۔ اور ان کے بعض بیانات کی تردید میں آپ نے ایک مستقل رسالہ لکھا۔
ہمارے فاضل دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ پورا رسالہ اپنی کتاب حیات
شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ساتھ شائع کر دیا ہے، لیکن افسوس کہ انھوں نے
شیخ محدث کی چار سو صفحے کی مبسوط سوانح عمری میں نہ ان اختلافات کی، جو انھیں حضرت
مجدد سے تھے۔ نہ ان اسباب کی، جن کی بنا پر بعضوں کے نزدیک یہ اختلافات رفع
ہوئے، وضاحت کی ہے۔ بلکہ یہ لکھ کر کہ یہ اختلاف عارضی تھا اور بہت جلد دور
ہو گیا، ان اختلافات کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش باقی رکھی ہے۔
عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جب شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض

واقعات پر اعتراض کیے۔ اس وقت انھیں مجدد کے علم و مرتبہ کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ان اعتراضات کی توضیح میں شیخ نے جو رسالہ لکھا اس میں وہ حضرت مجدد کو صاف کہتے ہیں کہ جتنی محبت اور یک جہتی مجھے آپ سے ہے، شاید ہی کسی سے ہو۔ ”ظن فقیر شیخ جمیل است۔“ اس مقدار کہ مراد شمسیت محبت و اتحاد است، کم کہے را خواهد بود۔ انھوں نے یہ رسالہ ”نصیحت و خیر خواہی“ کے لیے لکھا اور پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ رسالہ کئی مجلسوں میں مکمل ہوا۔ ہر باب میں نے استخارہ کیا اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ ”شہ نفس“ اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے۔ [حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۴۳]

شیخ محدث کو حضرت مجدد بڑے عزیز تھے اور ان کا طریقہ بھی عزیز تھا۔ لیکن رسول کی محبت سب سے بڑھ کر تھی۔ اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ حضرت مجدد کے بعض دعاوی کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ”زور ایں فقیر شہا ہم عزیزید و ہم طریقہ شما۔“ اما سخناں کہ نسبت بہ حضرت کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میگوند۔ آنہا را تاب ندارد و آنچه نسبت بہ مشائخ گفتمہ اند۔ کہ با وجہ ابرو داشتہ شد۔ اما برداشت ایں کلمات از طاقت حال ایں فقیر بیرونست۔“

اخبار الاخبار کے مجتہد ابی ایدیش کے آخر میں ناشر یا مرتب نے اپنی طرف سے حضرت مجدد کا ذکر بڑھا دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ آخر عمر میں شیخ محدث نے حضرت مجدد کے متعلق اپنے خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ (شیخ مصنف رحمت اللہ تعالیٰ علیہ در آخر عمر ازاں خیالات کہ نسبت بحضرت ایشان داشت رجوع فرمود) اور اس کی تائید میں شیخ محدث کا ذیل کا رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا نقل کیا ہے۔

”دریں ایام منہ سے فقیر بخدمت میں شیخ احمد علیہ السلام از حد متجاوز است و اصلاً پر وہ بشریت و عشاہہ جبلت بمیان نہ ماندہ قطع نظر از رعایت طریقہ و انصاف و حکم عقل کہ با ایں چنین عزیزان و بزرگان بد نباید بود و در باطن بطریق ذوق و وجدان و غلبہ چیز سے افتادہ کہ زبان از تقریریں مال است۔ سبحان اللہ مقلب القلوب و مبذل الاحوال۔ شاید

ظاہر بیناں است بعد از گذشتہ من نمی دانم کہ حال چیست و بچہ منوال است۔“

یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے، لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں یعنی تذکرۃ المتکاملین اور حضرات القدس میں نہیں۔ اس کا سب سے قدیمی بیان جو پہلی نظر سے گزرا ہے، روضۃ القیومیہ میں (دفتر اول ص ۲۱۱) پر ہے، جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد حضرت خواجہ باقی باللہ) کی کلیات کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا درج ہے۔ جس کا مضمون تتمہ اخبار الاخبار والے مندرجہ بالا رقعہ سے ایک حد تک ملتا ہے۔ چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس لیے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رفات کا ہونا مستبعد نہیں (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے۔ اور حقیقت حال پر زیادہ روشنی پڑ سکے)۔ روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ اور تتمہ اخبار الاخبار والے رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے۔ (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ میں یہ رقعہ کسی رجوع کی تائید میں نقل نہیں ہوا۔ بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ محدث ”آنجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانی) کی تجدید اور قومیت کے معترف تھے!“

اس کے بعد ”رجوع“ کی روایت عام ہونی شروع ہوئی۔ اور شیخ عبدالحق محدث کے رقعہ بنام خواجہ حسام الدین کو اس روایت کی تائید میں پیش کیا گیا۔ تتمہ اخبار الاخبار (مجتہد ابی) میں لکھا ہے۔ ”رجوع شیخ مشہور و بر السنہ رفاقت مذکور۔“ مجتہد ابی پرپس سے اخبار الاخبار ۱۳۳۲ھ (یعنی ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر اس روایت کو دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا۔ دورِ حاضر میں شیخ عبدالحق محدث کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک نیا اور کسی قدر مشکل الفہم نقطہ نظر پیش کیا۔ انھوں نے شیخ محدث کے بالبصراۃ

اپنے خیالات یا اپنے رسالے کے مضامین سے ”رجوع“ کا تو غالباً کہیں ذکر نہیں کیا۔ لیکن ”شیخ محدث کی رائے“ کے بدل جانے، ”شکوہ و شبہات رفع“ ہوئے اور غرضی اختلافات دفع ہونے کا ذکر کر کے ”رجوع“ کے نظریے کو تقویت دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے نہ صرف اپنے کتاب کے ضمیمہ کے طور پر وہ رسالہ چھاپ دیا، جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا تھا بلکہ اس رسالے کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے اندراجات پر ”سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔“ یہ مکتوب شیخ مجدد اور شیخ محدث کے تعلقات کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔

شیخ محدث نے مجدد صاحب کے جن جن خیالات پر اعتراض کیا ہے، ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ [حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۲]

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب کی اشاعت اور ان کے شائع کردہ رسالے کے مطالعہ کے بعد ہم نے خیال ظاہر کیا کہ غالباً رجوع کی روایت صحیح نہیں۔ ہمارے اس خیال کی تفصیلی تردید ایک محترم بزرگ نے کی ہے۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ ہے کہ (۱) جو رسالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا ہے۔ وہ ”شیخ محدث کے قلم سے کم اور دوسروں سے زیادہ تعلق رکھتا ہے“ چنانچہ انھوں نے رسالے میں سے کئی بے ربط جملے جمع کیے ہیں (۲) شیخ عبدالحق محدث کا جو خط خواجہ حسام الدین کے نام ہے، اسے پوری اہمیت دینی چاہیے (۳) ”ہمارا خیال ہے کہ ”رجوع“ یا ”صفائی“ ضرور ہو چکی تھی اور ان جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا بھی یہی تھا۔“

محترم بزرگ نے رسالے کے بعض بے ربط اندراجات کے متعلق جو شکاوت کی ہے، وہ بجا ہے۔ پروفیسر نظامی نے یہ رسالہ عبدالمکیری کی تالیف ”معارج الولاۃ“ (مرتبہ ۹۴ء) سے لیا۔ اور بظاہر جو غلط سلط متن ملا، چند حواشی کے ساتھ چھاپ دیا۔ چنانچہ کئی اغلاط کتابت اور بے ربط جملے رہ گئے۔ جن میں سے بعض کی

تصحیح معارج الولاۃ کے دوسرے نسخوں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت بھی پوری طرح تسلی بخش نہ ہوگی۔ رسالے کی اشاعت مناسب طریقے سے بھی ہوگی، جب اسے ثانوی ذریعہ سے نہیں، بلکہ اصل رسالے کے مخطوطوں کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اور یہ ناممکن العمل نہیں۔ اصل رسالہ کا کوئی نہ کوئی نسخہ شیخ محدث کے خاندان سے مل جائے گا۔ (جب سلسلہ ۱۹ء میں شیخ محدث کی سوانح عمری ”مرآۃ الحقائق شائع ہوئی۔ اس وقت جواب بعض کلمات حضرت مجدد دلف ثانی“ کا ایک نسخہ خان بہادر مولوی محمد انوار الحق کے کتب خانہ میں تھا) رام پور لائبریری میں اس رسالے کا ایک مخطوط ہے۔ کراچی میں کرنل عبدالرشید صاحب کے کتب خانے میں بھی ایک نسخہ ہے۔ محترم بزرگ نے رسالے کے متن کی تصحیح پر جو زور دیا ہے، وہ بجا ہے، لیکن جیسا کہ انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے نشان کردہ ”تمام اغلاط“ کاتب کے ذمے ”بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھیں اس کے باوجود بھی خیال ہے۔ کہ کتاب میں اضافے ہیں۔ اس کی انھوں نے وضاحت نہیں کی۔ اور بہر کیف اس کا فیصلہ کتاب کے بہتر مخطوطوں کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنیادی طور پر اور بظاہر متعدد اغلاط کتابت کے باوجود پروفیسر نظامی کا شائع کردہ رسالہ وہی ہے، جو حضرت مجدد کے متعلق شیخ عبدالحق نے لکھا۔ اس کی تصدیق کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ متعدد حضرات مجددیہ (مثلاً حضرت شاہ غلام علی صاحب) نے اس رسالے کا رد لکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں اس کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ پروفیسر نظامی کے شائع کردہ رسالے میں یہ سب عبارتیں موجود ہیں۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ متعدد اغلاط کتابت کے باوجود شائع شدہ رسالہ وہی ہے، جو

پروفیسر نظامی نے جس نسخہ پر انحصار کیا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۲۸۸ء ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دو مخطوطے ہیں جن میں سے ایک (مجموعہ آفذر کا شمارہ 25H) سال تالیف کے سترہ سال بعد (یعنی ۱۳۰۵ء) میں لکھا گیا۔ یہ نسخہ نہایت ہی خوش خط اور پروفیسر نظامی کے نسخے سے زیادہ صحیح ہے۔

محترم بزرگ کے مضمون میں (مرتبہ ۹۰ء) غالباً سہواً نقل ہے۔

شیخ محدث نے لکھا۔ اس میں کسی فقرے ایسے ہیں جن میں حضرت مجددؒ کی تعریف و تصدیق کی گئی ہے (مثلاً "حضرت خواجہ باقی باللہ" اثبات شمس) حضرت مجددؒ (بیلہ میکر دند۔ وکسان واقف اند برآں و بیشتر از ہمہ اس فقیر وغیرہ) محتاج الولاہ کے مولف غلام معین الدین کو حضرت مجددؒ کے مخالفین میں سے سمجھنا چاہیے۔ لیکن بظاہر یہ نظر نہیں آتا۔ کہ اس نے عبارت میں تحریف کی ہو۔

جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تہہ اخبار الاخبار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا۔ یہ رقعہ ہم نقل کر چکے، لیکن اس رسالے سے "رجوع" اخذ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ "صفائی" کا خیال ہو سکتا ہے۔ (اور محترم بزرگ کو بھی اس کا کسی قدر احساس ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "رجوع" یا "صفائی" ضرور ہو چکی تھی)۔ شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا اور مشہر کیا تھا۔ اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعتراف سو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھے۔ اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا۔ شیخ عبدالحق محدث کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا زیادہ تعلق خانقاہ باقویہ دہلی کی اس جماعت سے تھا جن کے حضرت مجدد سے حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ ان کا لگاؤ گستاخوئی کا قوی رشتہ تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسام الدین کے نام حضرت مجددؒ کے مکتوب (دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۱) میں جس "عزیز" (اندرج یافتہ بود کہ عزیز سے بر عبارت مکتوب ہے کہ در اجیر نوشتہ بودی) احتراضہا دارد" کی طرف اشارہ ہے، وہ شیخ محدث تھے۔ خانقاہ باقویہ کے مکیوں سے (جیسا کہ خواجہ حسام الدین کے نام کے متعدد مکتوبات سے واضح ہے) حضرت مجدد کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ اور بہت ممکن ہے کہ شیخ محدث کا رقعہ کسی ابتدائی غلط فہمی یا عدم واقفیت کے دور ہونے کے بعد یا فقط ان کی

عظمت کے زیادہ احساس پر لکھا گیا ہو۔ یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مندرجہ بالا رقعہ شیخ محدث کے رسالے کی تحریر اور رفع اختلاف کے بعد لکھا گیا ہو۔ مجلس کی یہ ہے کہ جیسا کہ فاضل محترم نے لکھا ہے۔ "مجتبائی ایڈیشن والے خط میں حضرت مجددؒ کے نام کے ساتھ "سلمہ اللہ تعالیٰ" کا دعائیہ فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ صفائی یا رجوع ان کی زندگی ہی میں (یعنی ۱۲۱ء سے پہلے) ہو چکا تھا۔ رسالے کی تاریخ تحریر معلوم نہیں، لیکن اس کے اندراجات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ دفتر سوم کے مکتوب شماره ۱۲۱ کے بعد لکھا گیا۔ کیونکہ اس مکتوب کی عبارتیں رسالے میں درج ہیں۔ یہ امر قریب قریب یقینی ہے۔ کہ مکتوب ۱۲۱ اجیر سے سرمد کو آخری واپسی کے بعد لکھا گیا۔ (۱) یہ مکتوب خواجہ حسام الدین کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا۔ جس میں ایک ابتدائی مکتوب (۱۲۱) کا اس طرح ذکر ہے۔ "مکتوب ہے کہ در اجیر نوشتہ بودی" کہ خیال ہوتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کے مکتوب الیہ (یعنی حضرت مجددؒ) اس وقت اجیر میں نہ تھے۔ (۲) مکتوب ۱۲۱ سے پہلا خط یعنی مکتوب ۱۲۰ "اختیار کردن عزلت" کے متعلق ہے۔ اور محاصرہ تذکرے گواہ ہیں کہ آپ نے اجیر سے واپسی کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور اس کے بعد "مدت قلیل" (حضرات القدس ص ۱۷۷) میں رحلت فرمائی۔ بالعموم یہ مدت چھ ماہ کی بیان ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خواجہ ہاشم کشمی کی دکن کو روانگی کے قریب سات ماہ بعد آپ کا انتقال ہوا۔ اس لیے سرمد کا آخری قیام آٹھ نو مہینے کا ہوگا (۳) مکتوب ۱۲۱ بالکل آخری مکاتیب میں سے ہے دفتر سوم میں جو مکتوبات کی آخری جلد ہے، فقط تین مکاتیب اس کے بعد ہیں۔ مندرجہ بالا وجوہ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مکتوب ۱۲۱ حضرت مجددؒ کے آخری سال میں تحریر ہوا۔ یہ مکتوب دہلی پہنچا۔ اس کے بعد شیخ عبدالحق محدث نے کافی غور و تمق کے بعد اور کئی مجلسوں میں اپنا رسالہ لکھا۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ اس کے چند مہینے بعد ہی انھوں نے حضرت مجددؒ کے بیانات جن کی نسبت وہ سالہا سال ("سالہا است") سے غیر مطمئن تھے، کے متعلق اپنا نقطہ نظر ترک کر دیا۔

اور اس رسالے کے مضامین سے جسے انھوں نے ہر بار استخارہ کر کے اور دعائیں مانگ کر لکھا تھا، رجوع کر لیا؟

فاضل محترم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان (حضرت مجدد اور شیخ محدث) جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا یہی تھا کہ ”رجوع“ یا ”صفائی“ ہو جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں بزرگوں کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں کسی معاملے پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ نواب صدیق حسن تو اس اختلاف میں تقلید اور رقبہ بدعت کا پر تو دیکھتے ہیں۔ لیکن وجہ اختلاف کی طرف شاہ غلام علی قدس سرہ نے اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ شیخ محدث نے اعتراضات بطریق علمائے ظاہر کیے تھے۔ حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہل باطن کے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف رائے ناممکن نہ تھا۔

ابھی تک ”رجوع“ کے مسئلے پر جو کچھ مواد ہمیں ملا ہے اس کے مطالعہ سے ہمارے شبہات رفع نہیں ہوئے۔ اس کی چند وجوہات اوپر درج ہو چکیں۔ ایک اہم وجہ یہ ہے کہ سلسلہ مجددیہ کے بزرگ جس طریقے سے اس روایت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ استنادی حوالوں میں کافی چھان بین یا غور و خوض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مثلاً حال ہی میں ایک بزرگ نے انوار احمدیہ کے ایک اندراج کا ذکر کیا ہے جس میں مناقب العارفین کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالحق کی ترویج حسن افغانی کی شراعت کا شاخسانہ تھا۔ جب شیخ پر حقیقت ظاہر ہوئی تو انھوں نے حضرت مجدد سے معذرت کی۔ انھوں نے متعلقہ عبارت نقل نہیں کی لیکن حسن افغانی کے کتبوبات میں ترمیم و تحریف کا قصہ بہت مشہور ہے۔ جو اہر مجددیہ میں بھی مناقب العارفین کے حوالے سے یہ واقعہ درج ہے۔ اگرچہ وہاں حضرت مجدد سے معذرت کا ذکر نہیں۔ خواجہ حسام الدین کے نام اخبار الاخبار والے رقم لکھے جانے کا بیان ہے، لیکن یہ امر بھی ملحوظ خاطر

لے ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۴

رکھنا ضروری ہے کہ حسن خاں افغانی کی ترمیم و تحریف کا واقعہ اگر صحیح بھی ہو تب بھی اس سے شیخ محدث کے خیالات کی تبدیلی قرین قیاس نہیں کہو کہ انھیں مکاتیب کی جن عبارتوں پر اعتراض تھا ان سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ اور وہ سبوعہ مکاتیب کے تمام نسخوں میں موجود ہیں!

اخبار الاخبار (مجتبائی) والے رقم کی نسبت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجدد سے جتنی ارادت کا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ کھتہ وقت ظاہر کر چکے تھے، لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی۔ اس خط میں بھی ”میاں احمد سرہندی“ کو مجدد نہیں کہا گیا۔ اور بہر کیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو۔ تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے شیخ عبدالحق جیسا عاشق رسول ”رجوع“ کرے۔

ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے۔ اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا۔ بلکہ جس مقصد سے انھوں نے یہ رسالہ لکھا تھا، اسی کی تکمیل کے لیے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوة لکھی۔ اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے ایک معاصر میر عبد الاول ان کی نسبت لکھتے ہیں:-

”بہت حفظ امن و عافیت و دفع مرض فتنہ اشتغال بہ علوم حدیث واجب دید

و ضرر سموم حوادث را بایں تریاق فاروق مندق گردانید۔“

میر عبد الاول نے بڑے پتے کی بات کہہ دی ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنے زمانے کے فتنوں کا تریاق علم حدیث کی ترویج میں دیکھا۔ اور اسی میں مشغول رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں مہدویت، قیومیت اور عقلیت کے طرفداروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں۔ شیخ نے ان سب کا علاج ہی سونپا کہ نبوت کی عظمت و حقیقت کو نمایاں کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جیسا کہ میر عبد الاول نے کہا ہے، علوم حدیث کی اشاعت کی، بلکہ ان کی علمی زندگی کا

اصل محور رسالت مآب کی ذات بابرکات تھی۔ آپ نے نہ صرف حدیث نبوی کا درس دیا اور اس علم میں متعدد کتابیں لکھیں، بلکہ رسول کریم کی سیرت اور حقیقت نبوت پر بڑی تقطیع کی بارہ چودہ سو صفحے کی کتاب مدارج النبوت لکھی۔ انھوں نے تاریخ مدینہ کے متعلق ایک عربی کتاب کا جو ترجمہ کیا اس کا عنوان جذب القلوب فی دیار المحبوب ہی اس عاشق رسول کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔

شیخ عبدالحق محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق جو رسالہ لکھا اس کا مقصد بھی ان خیالات کی تردید تھا، جو مجددیت اور نبوت کی شرکت کے متعلق ظاہر کیے گئے تھے۔ مدارج النبوت کے مقصد تحریر کی نسبت شیخ لکھتے ہیں:-
”چوں از فساد زمان انحراف در مزاج وقت بعض درویشان مغرور این روزگار را یافتہ
..... تنگی حوصلہ را در اک پایہ ارفع و مقام اقدس محمدی کہ یکس را بدرک و دریافت
آن را نیست نشاختہ۔ و تقصیر سے در ادائے حق نمودہ و از جادہ دین و سراط مستقیم
بر افتادہ بودند۔ لازم حق مسلمانی آن نمود۔ کہ احوال و صفات قدسیہ... نگارش نماید
و این بے خبران را از حقیقت حال آگاہ گرداند۔“

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب میں یہ عبارت درج کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:- ”مدارج النبوت کی تصنیف سے شیخ کا مقصد یہ تھا کہ عہد اکبر کے فتنوں کا سد باب کیا جائے لیکن چنانچہ کہ درویشان مغرور اس روزگار سے وہ اکبر اور اس کے درباری کیوں مراد لیتے ہیں جو مدارج النبوت کی تالیف سے بہت پہلے ختم ہو چکے تھے۔ اور بہر کیف سبھی بھی درویش نہ تھے اور اس کے واضح مفہوم کو محض درویشوں پر کیوں منطبق نہیں کرتے؟

مدارج النبوت میں ایک اور جگہ ہے:-

بعض کو راہ بیان کہ شہود حق را از وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مفارق میدانند
و بر ہر خندہ سے واقف نمی شوند۔ ایں معنی در رسالہ جدا آورده، بعضے از مدعا ہارا

مشرع ترازیں گفتہ ایم۔“

چونکہ شیخ محدث نے مندرجہ بالا عبارت میں رسالے کا نام نہیں لیا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ غلط فہمی کی گنجائش رہتی ہے، لیکن چونکہ شیخ محدث نے رسالے کا موضوع بیان کر دیا ہے۔ اس لیے عبارت کا مفہوم محدود ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک محترم بزرگ کا خیال ہے کہ اس میں حضرت شیخ (عبدالحق محدث) کے رسالہ فقر محمدی کی طرف اشارہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسالہ فقر محمدی شیخ محدث کی تصنیف نہیں۔ یہ رسالہ عرب کے ایک عالم صوفی شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی الحزنی نے عرب میں تصنیف کیا۔ خواجہ باقی باللہ کے استفسار پر شیخ محدث نے ”بطریق اختصار“ اس کا ترجمہ کیا۔ ”تاپیدا گرد۔ کہ مقصود چیست۔ بے زیادت چیز ہے براں۔“ اب قارئین ہی غور فرمائیں۔ کہ ایک دوسرے عالم کی تصنیف کے اس شخص کو حضرت شیخ عبدالحق کا ”رسالہ“ کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اور اس سے وہ رسالہ کیسے ملا دیا جاسکتا ہے جس کی نسبت شیخ محدث (جو انتخاب الفاظ میں اتنے محتاط اور باریک ہیں جتنے مدارج النبوت میں فرماتے ہیں۔ ”ایں معنی در رسالہ جدا آورده، بعضے از مدعا ہارا مشرع ترازیں گفتہ ایم“ یعنی جو ان کی اپنی تصنیف ہے!

رسالہ فقر محمدی کا یہ شخص حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام شیخ محدث کے پانچویں خط کی صورت میں اخبار الاخبار (مجتبائی) کے حاشیہ پر ملتا ہے۔ محترم بزرگ نے بھی اس میں سے تفصیلی اقتباسات دیے ہیں۔ رسالت مآب کو اپنا شیخ طریقت سمجھنے اور طریقت محمدی کے قواعد و اشغال کا بیان ہے۔ لیکن اگر آپ کو ”شہود حق“ اور وساطت نبوی کو ”مفارق“ سمجھنے والوں کے متعلق ”مشرع تر“ اظہار خیال مطلوب ہے تو وہ یہاں نہیں ملتا۔ اس مسئلے پر واضح اور مفصل اظہار خیال شیخ عبدالحق محدث کے اس رسالے میں ہے جس کا نام ان کی قدیمی سوانح عمری مرآۃ الحقائق میں جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ دیا ہے۔ اور جسے اب پروفیسر

خلیق احمد نظامی نے حیات شیخ عبدالحق محدث کے آخر میں شائع کیا ہے۔

جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، کیا یہ رسالہ وہی تو نہیں جو حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا گیا اور جس میں توسط نبوی کی ضرورت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے؟ موجودہ اشاعت میں توضیح حال کے لیے ہم نے دو پیرا گراف بڑھا دیے ہیں اس سے پہلے مدارج النبوت کا اندراج نقل کرنے کے بعد فقط خط کشیدہ عبارت بھی تھی۔ اور اہل علم سے سوال کیا تھا کہ جس رسالے کا منقولہ اندراج میں ذکر ہے کیا وہ وہی رسالہ تو نہیں جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا؟

ہماری اس دوسری عبارت پر ایک بزرگ نے بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے۔ ”حضرت مجددؒ پر فاضل محترم نے افترا اور بہتان باندھا ہے۔ کہ انھوں نے شہودِ حق کے لیے اس (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی) وساطت کو مفارق سمجھا ہے“ دوسری جگہ اسی طرح کا اظہار کرتے ”ظلم اور سیدہ زوری“ اور ”افترا پر داری“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (آپ ان الفاظ کی شدت پر نہ جاسیے۔ یہ ہمارا اور بزرگ محترم کا معاملہ ہے۔ ہم نے انھیں نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس چیز نے ہمیں مجبور کیا۔ کہ حقیقت کو وضاحت سے بیان کریں)۔

آپ مندرجہ بالا خط کشیدہ عبارت پر غور فرمائیں۔ ہم نے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا کہ ہمارے نزدیک حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ نے شہودِ حق کے لیے وساطتِ نبوی کو مفارق سمجھا ہے۔ سوال صرف شیخ محدث کے بیان کا ہے۔ ہم نے اشتراکِ مضمون کی بنا پر فقط اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ وہی رسالہ ہو جو شیخ محدث نے حضرت مجددؒ کے متعلق لکھا۔ اس چیز کو اس طرح پیش کرنا کہ جس بات کا شیخ محدث نے اظہار کیا۔ وہ ہمارا خیال ہے شاید محبتِ بیان سے کسی قدر دور ہے!

اب اصل سوال کو لیجیے اور اس امر پر غور کیجیے کہ شیخ عبدالحق محدث کے کن بیانات کی بنا پر یہ خیال ہوا۔ کہ شاید مدارج النبوت میں اسی رسالے کی طرف اشارہ ہے جو

حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کی نسبت لکھا گیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجمیر سے حضرت مجددؒ نے ایک مکتوب (دفتر دوم۔ شماره ۵۵) لکھا، جو شیخ عبدالحق کے تریدی رسالے کا محرک ہوا۔ اس مکتوب کی چند سطریں (امرتسری ایڈیشن کے مطابق) درج ذیل ہیں:-

سلسلہ ارادت میں ہے توسط بہ اللہ متصل است تعالیٰ

ویدر من نائب مناب ید اللہ است۔

ارادت میں ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بوساطت کثیرہ است.....

وارادت میں ہے اللہ قبول وساطت نمی نماید۔ چنانکہ گزشتہ۔

پس میں ہم مرید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ہم پیرو پس رواہ۔

بر خلائ این دولت ہر چند طفیلی ام، اما ناخواندہ نیامدہ ام

و ہر چند تابع ام، اما از اصالت بے بہرہ و نیم

و ہر چند اہتم، اما شریک دولتم، نہ شرکتہ کہ ازاں دعوئے ہمیری خیزد، کہ آن کفر است بلکہ

شرکت خادم است بالخدمہ.....

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث کیا تھا۔ جب اس مکتوب پر ”شہود و غوغا“ ہوا (دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۱)۔ اور شیخ حسام الدین نے حضرت مجددؒ کے نام شبہات اور اعتراضات ارسال کیے تو حضرت مجددؒ نے ایک مفصل خط لکھا۔ (شمارہ ۱۲۱)۔ اس کے آخر میں رسول اللہ کی مدح و ثنا لکھی۔ اور ان کے توسط و توسل کی ضرورت پر زور دیا۔ شیخ عبدالحق محدث نے تو صحیحی مکتوب کے اس حصے پر بڑی خوشی ظاہر کی (”جان با سیلاب و دل را شاداب می گرداندا“) لیکن پہلے خط (شمارہ ۸۷) اور بعد کے مکتوب کے ابتدائی حصے پر انھیں اعتراض ہوا۔

۱۵ امرتسری ایڈیشن میں اس طرح ہے۔ شیخ عبدالحق محدث نے اس مکتوب کی جو نقل اپنے رسالے میں دی ہے اس میں بھی جملہ صلی جہ و ہم ہمو (ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۵)

توضیح مکتوب میں حضرت مجدد نے محمدی مشرب سالک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔
 "مخدوم و مقل فیوض مرسلات راتوسط و حیلوت خیر البشر علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام
 تازمانے است۔ کہ حقیقت آل سالک کہ محمدی المشرب است۔ بحقیقت محمدی
 منطبق نگشتہ است۔ و بآں متحد نشدہ و چون کمال متابعت بلکہ بعض فضل در مقامات
 عروج ایں حقیقت را بآں حقیقت اتحادے حاصل شد توسط برخاست۔ شیخ محمد
 شکایتاً لکھتے ہیں۔ "در عبارت ایشان اکثر متابعت بہ ذکر فضل الہی مقررست۔"
 حضرت مجدد نے لکھا تھا کہ یہ شرکت خادم و مخدوم کی ہے۔ شیخ محدث کو اس پر بھی
 اعتراض تھا۔ جہاں تک تبعیت کا تعلق ہے، انھوں نے لکھا کہ یہ مقولہ تو بالکل مجددیہ فرقہ
 کے بیان کے مطابق ہے۔ "می گفتند کہ ہر کمالی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 داشت۔ در سید محمد (جو چوہدری) نیز بود۔ فرق (این) است کہ آنجا بہ اصالت بود۔
 و ایں جا بہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہجرا و شدہ۔ و ایں بعینہ مقول ایشان (مجدد)
 است۔" جہاں تک خادمی و مخدومی کا تعلق ہے، شیخ محدث نے لکھا۔ "فرقہ و تفصیل
 باعتبار خادمی و مخدومی و اصالت و فرعتہ نیز باطل است و عاقل۔" ایک اور جگہ کہتے ہیں۔
 "ایں سخن خادمے و مخدومے در کلام ایشان بسیار واقع شدہ۔ در اجتماع کمالات ہر اسمی
 و محمدی نیز گفتہ اند۔ و ایں را گریز گاہ ساختہ اند۔ آفا فائدہ ندارد۔" لیکن رسالے میں زیادہ
 بحث خدا تک پہنچنے کے لیے وساطت نبوی کی ضرورت پر ہے۔ (شاہ غلام علی صاحب)
 نے جو رسالہ شیخ کی تردید میں لکھا۔ اس میں کہتے ہیں "معظم اعتراضات حضرت شیخ رفیع توسط
 است۔ و دریں باب اطاعت کلام بسیار فرمودہ" (۲۶)۔ متحدہ صفحوں پر "توسط۔"
 "عدم توسط۔" "وساطت۔" "وسائط۔" کا ذکر آتا ہے۔ ان سب کے حوالے دینا
 غیر ضروری ہے۔ لیکن "شہود حق" اور "وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کی
 مفارقت کے متعلق رسالے کا مضمون ایک انداز سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ شیخ
 محدث حضرت مجدد کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:-

"شما عالم و فاضل و ماہر و دانشمند و مخدوم میدانیم۔ بلکہ طرف و کاشف ہم گوئیم۔

اتان را از کجا معلوم کنم کہ شما بسیر مرادی بمرتبہ رسیدہ اند کہ در ساط حضرت سید المرسلین
 و سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در میان شما و خداے عزوجل نمازہ است؟ (۳۳)
 کیا "شہود حق" اور "وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کی مفارقت کے متعلق
 اس سے زیادہ واضح کوئی چیز ہو سکتی ہے؟

یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مجدد کے متعلق شیخ محدث کا خیال صحیح نہ تھا۔ اسی طرح
 مدارج النبوت میں جس رسالے کا ذکر ہے، اس کے متعلق شاید قوی دلائل سے یہ
 ثابت کیا جاسکے کہ اس کے متعلق ہم نے جس امکان کا ذکر کیا تھا، وہ قابل قبول نہیں۔
 لیکن شیخ محدث نے اس رسالے میں جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شامل کتاب
 کیا ہے، "شہود حق" اور "وساطت" سید المرسلین کی مفارقت کا جس طرح ذکر کیا ہے،
 کیا اس کو دیکھتے ہوئے اس امکان کا ذکر کرنا (بلکہ اس امکان کے متعلق محض ایک
 سوال اٹھانا) کہ مدارج النبوت کی خط کشیدہ عبارت میں جس رسالے کا ذکر ہے، کیا یہ
 وہی رسالہ تو نہیں جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا، شاید اتنا بے بنیاد نہیں
 کہ اس سوال پوچھنے والے کی دیانت پر شبہ ہو۔ اور "افترا" اور "ہتان" کے الفاظ
 استعمال کیے جائیں۔

ہمیں رسالے سے "رجوع" کے متعلق شبہ ہے۔ اور اگر مدارج النبوت کی مندرجہ
 عبارت میں واقعی اس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ شیخ محدث اپنی سخن

لے مرجع کی روایت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روایت صرف مجددی حلقوں میں مشہور
 ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں میں ملتی ہے؟ شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کے
 فاضلین میں بیسیوں صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق
 متار اہل قلم تھے۔ ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ان فاضلین کے ایک
 بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مبرور سوانحوی مرآۃ الحقائق کے نظم سے شائع کی۔ اس میں شیخ کی تصنیفات میں
 رسالے کا انداز با وضاحت ہے۔ جواب بعض کلمات حضرت مجدد دہلوی ثانی (۱۲۸۰-۱۳۰۰) کی ہیں۔ لیکن تبھی کا
 کہیں ذکر نہیں۔

دوسری تحریروں میں ان خیالات کی طرف اشارہ کرتے رہے جنہیں وہ رسالے میں ظاہر کر چکے تھے، لیکن ”رجوع“ کی روایت سے انکار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدا نخواستہ ہمیں رسالے کے اندراجات سے اتفاق ہے یا ہمیں حضرت مجددؑ کی عظمت و بزرگی کا پورا اعتراف نہیں۔ حاشا وکلا۔ ایک عرصے تک تو ہم حیران تھے کہ تو ضیحی مکتوب (۱۲۱) کے بعد شیخ محدث کو یہ رسالہ کھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ پہلے خط (۱۲۱) سے ان کی پریشانی تو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن جب حضرت مجددؑ نے تو ضیحی مکتوب میں لکھ دیا کہ ان کے یہ اور اس قسم کے دوسرے بیانات کا کس سے تعلق ہے۔ اور دوسرے مشائخ کبار مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مصنف عوارف المعارف کی مثالیں دیں تو معاملہ کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مکتوب کو جو حضرت مجددؑ کی قابلیت، قوت استدلال اور سلیقہ تحریر کا شاہکار ہے، حرف آخر سمجھ لینا چاہیے تھا، لیکن شیخ محدث نے اسے حرف آخر نہیں سمجھا اس کی وجہ سوچ سوچ کر اور مزید مطالعہ سے ہی سمجھ میں آئی کہ اس مکتوب میں بھی ایک فقرہ ایسا تھا، جو انہیں قبول نہ تھا۔ اور جس سے ان کے خیال میں وساطت نبویؐ کی اہمیت میں ضعف آتا تھا۔ یہ فقرہ تھا۔ ”چوں بکائی متابعت بلکہ محض فضل در مقامات عروج این حقیقت (یعنی حقیقت اک سالک کہ محمدی المشرّب است) را با آن حقیقت (حقیقت محمدی) اتحاد سے حاصل شد، توسط بمقاست“ یہ صحیح ہے کہ حضرت مجددؑ نے سالک کے اس اتحاد کو ”شُرکتِ خادم با محمدؐ“ کہا تھا۔ لیکن شیخ محدث اس توضیح کو قبول نہ کرتے تھے۔ ”باطل است و حاطل“ اور اسے ”گریز گاہ“ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سکر اور محو کے متعلق حضرت مجددؑ نے جو کچھ تو ضیحی مکتوب کے متعلق لکھا، شیخ محدث اسے بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت مجددؑ نے اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کیا تھا۔ چند متعلقہ فقرات حسب ذیل ہیں:-

”ہر کہ محو وارد گمان نکند کہ سکر ہمہ اونیست کہ آن عین تصور است۔ محو خالص نصیب محلام است۔ ہر کہ محو را ترجیح دادہ است، مرادش غلبہ محو است نہ محو صرف“

شیخ نے بھی اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا۔ ان کی رائے کا ما حاصل تھا۔ ”و در حقیقت سکر و محو ضدان اند، کہ جمع نمی شوند۔ بہر کیف شیخ خود ارباب محو میں سے تھے۔ اور انھوں نے حضرت مجددؑ کے بیانات پر تبصرہ بطور ایک اہل محو کے ہی کیا ہے۔

شیخ محدث سلوک کی منزلوں سے واقف تھے۔ بر کوچک کے ادب کا بہترین تذکرہ اخبار الاخبار انھی نے لکھا۔ زاد المتعین میں حضرت خواجہ بانی بائد کی صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”مدتے مشق نسبت خواجگان کردہ طریقہ ذکر و مراقبہ رابطہ و حضور و یادداشت حاصل نموده۔ رسالے میں بھی انھوں نے کئی جگہ اہل معرفت کا انداز اختیار کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اہل شرع سے تھے۔ اور احتیاط کے باوجود کبھی کبھی متشدد نقطہ نظر بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے رسالے کو حضرت مجددؑ کے بیانات پر ”علمائے ظاہر“ کا محاکمہ کھنا چاہیے۔ شاہ غلام علیؒ نے ان کے جواب میں جو رسالہ لکھا۔ اس کے عنوان میں انھوں نے (یا مرتب نے) شیخ محدثؑ کا ذکر ملا عبدالحق کہہ کر کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات ان کی مولویت ان کے عرفان پر غالب آجاتی۔ ان کے رسالے کی اہمیت اس بات میں ہے۔ کہ یہ ایک بلند احوال شیخ کے بیانات پر ایک ممتاز عالم شرع کا تبصرہ ہے۔ اس سے ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن حضرت مجددؑ کا مقام اتنا بلند ہے۔ اور ان کے احسانات اتنے عظیم ہیں کہ شیخ محدث کے اختلاف کی وجہ سے یا ان کے بعض بیانات کو قابل تاویل سمجھ لینے سے بھی ان کے مرتبہ میں فرق نہیں آتا۔ انھیں شیخ کی تائید (یا بدایونی کی ہمنوائی) کی ضرورت نہیں۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب !

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے رسالے کے اندراجات کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر ”سجیدگی سے غور کی ضرورت ہے۔“ اس تجویز پر عمل تو اس وقت ہو سکتا ہے جب جب رسالے کا صحیح ایڈیشن موجود ہو اور رسالے کے جواب میں حضرات مجددیہ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہوا۔ اور اس وقت بھی طالب حق

تصنیفی زندگی میں بھی انھیں دخل تھا۔ مثلاً فتوح الغیب کی شرح انھی کے اصرار پر لکھی گئی۔ شرح مشکوٰۃ کی تالیف میں بھی ان کی تشویق و ترغیب کو دخل تھا۔ طرز تحریر کی نسبت بھی وہ مشورے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شرح مشکوٰۃ کی نسبت انھوں نے لکھا کہ اس میں جا بجا اشعار درج ہونے چاہئیں تاکہ انداز بیان دلچسپ اور مؤثر ہو۔ فرمودندہ ترجمہ گاہے بہ تقریب بعضے ان کلمات قوم نیز در آوردہ باشند۔ چنانچہ ملاحضین در تفسیر خود می کنند۔ و فرمودند یگانہ بیتے مناسب مقام ہم می نوشته باشند۔

شاید ادبی مشوروں سے بھی اہم چیز روحانی راہنمائی اور دستگیری تھی۔ شیخ عبدالحق محدث کا ابتدائی ماحول صوفیانہ تھا۔ اور انھیں اس راستے سے گہری دلچسپی تھی۔ مثلاً ان کے عزیز دوست اور مرئی نظام الدین بخشی ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ "امروز در دہلی است.... و در لباس صوفیہ می گزرا ند" لیکن انھوں نے مشغلہ علما کا اختیار کیا ہوا تھا۔ انھوں نے ان دونوں میں تطبیق و ہم آہنگی کا راستہ نکالا لیکن بسا اوقات اس کوشش میں شدید باطنی کشمکش اور انتہائی روحانی سر بلندی سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص حضرت مجدد کے دعاوی تو ان کے لیے بڑے خلیجان کا باعث ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد وہ جس بزرگ سے اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لیے رجوع کرتے وہ شاہ ابوالمعالی تھے۔ شاہ صاحب کے نام ان کے کئی خط ہیں جو ان تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ دلچسپ ایک خط اپنے فرزند ولید شیخ نور الحق کے نام ہے۔ "طلب الخوہ فی قصۃ السفر لاہور" جس میں بتایا ہے کہ کس طرح شاہ ابوالمعالی ان کی تصانیف کی تعریف کر کے ان کا دل بڑھاتے۔ اور ساتھ ساتھ جلالی شان بھی دکھاتے۔ "آفتا سے ایں سرتو انیم کرد۔ و میگویند کہ اگر اظہار کردی و افشا نمودی۔ تر از سواے مرد و زن سازیم" بسا اوقات وہ شیخ عبدالحق محدث کی نقل و حرکت پر بھی گرمی پائندیاں لگاتے۔ ان سے ملاقات کے لیے شیخ لاہور آنا چاہتے تو روک دیتے۔ یہاں آتے تو جلد دہلی واپس جانے پر اصرار کرتے۔

دہلی در فراق شما زبان حال می نالد۔ بروید بروید" قیام دہلی میں بھی ایک زمانے میں ان کا حکم تھا۔ از زاویہ انزوایا سے بیرون نہ نہد۔ و از درویش و تواکر و خویش و بریکانہ و مردہ و زندہ، هیچ کس نہ نہ بند۔ اصل میں شاہ ابوالمعالی چاہتے تھے کہ شیخ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا علمی کام کریں۔ شیخ ان سب ارشادات کی بخوشی تعمیل کرتے اور جب کسی باطنی الجھن کا سامنا ہوتا تو اس کے حل کے لیے لاہور لکھتے۔ لاہور جاتے تو وہاں سے پہلے کوہی نہ چاہتا (گرفتاری مابہ ایں شہر لاہور کہ وطن گزاشتہ اینجامی با شمیم سبب آن اینست کہ اینجا کسے ہست کہ گرفتار اویم) شیخ کی شاہ صاحب سے عقیدت کا باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں انھی کو اپنا مولس و غمخوار سمجھتے تھے۔ ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:-

اظهار ایں اگر چہ بے ادبی است۔ اما چہ کند کہ طاقت طاق است۔ کجا و دریکہ گویدہ

فریاد دل غمزدہ را اگر نکتی گوشش

پس پیش کہ از دست تو فریاد توں کرد

شاہ ابوالمعالی نے ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی۔

غالباً قادیہ سلسلے کے بزرگوں سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں شیخ عبدالحق محدث کے داراشکوہ سے جو اسی سلسلے میں مرید تھا، تعلقات استوار ہو گئے۔ داراشکوہ کی فرمائش پر شیخ نے زبدۃ الآثار کا فارسی ترجمہ کیا۔ سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے شیخ اور جہانگیر کے تعلقات کے متعلق ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی اور تذکرے میں نہیں ملتیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس زمانے میں جہانگیر کشمیر میں تھا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے متعلق بادشاہ کے "سخنان غیر واقع" سے کان بھرے۔ بادشاہ نے دونوں کو کشمیر بلوا بھیجا۔ شیخ نور الحق کو حکم ہوا کہ کابل چلے جائیں۔ شیخ محدث کی عمر اس وقت پچیس برس سے زیادہ تھی۔ سخت پریشانی کی حالت میں لاہور پہنچے۔ حضرت میان میر لاہوری نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس عمر میں وطن اور اولاد سے جدا ہونا بڑا تکلیف دہ ہے، لیکن شیخ ابھی کشمیر

پہنچے تھے کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور وہ شیخ نور الحق کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔

جہانگیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبدالحق کا ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر داراشکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال ہے کہ شاید شیخ سے باز پرس میں جہانگیر کی شیعہ بیگم نور جہاں کی شکایتوں کو دخل ہو۔ لیکن شیعہ متنی مسئلے پر شیخ عبدالحق محدث کی دہائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مورخ خانی خاں ان کی نسبت لکھتا ہے: ”صد کتاب از علوم عقلی و نقلی تالیف فرمودہ بخصوص شرح مشکوٰۃ و تالیف مدینہ کہ دہاں ذکر حضرت آئمہ طاہرین و ظلم و تعدی مخالفین باظهار کمال حسن عقیدت نمودہ... گویند بعد مراجعت از کتبہ اللہ اکثر بزرگان صداقت بیان اس سخن جامی بود کہ تا بہر بیت اللہ رفتہ ملتے معین گشتہ صرف اوقات برائے تحقیقات احادیث نمودم نہ انستم کہ بیشتر احادیث مشہور وضعی است۔“ شیعہ متنی اختلافات پر شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومت وقت سے چپقلش قرن قیاس نہیں۔ اگر داراشکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہانگیر کے خلاف شاہ جہان نے جو بغاوت کی تھی اس میں دوسرے راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی طرح آپ اور شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ شریک ہوں۔ بہر کیف شاہ جہان کی محنت نشینی نے یہ الجھن ختم کر دی اور عہد شاہ جہانی میں آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا۔

شیخ عبدالحق کی عمر عزیز میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی۔ اکبر اور جہانگیر دو بادشاہوں کا پورا عہد حکومت آپ نے دیکھا۔ اور شاہ جہان کے سولہویں سال جلوس میں انتقال فرمایا۔ آپ کی وفات ۲۸-۲۹ جون ۱۶۲۶ء کی درمیانی رات کو پچھرانوے سال دو مہینے کی عمر میں ہوئی۔ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب ’سوفن شمس کے کنارے ایک پرفضا نیابت گاہ میں دفن ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے شیخ محدث کی صحت میں اخیر عمر تک فرق نہیں آیا۔ چنانچہ جس وقت آپ کی عمر نوے برس کے قریب تھی۔ اس زمانے کی نسبت شاہ جہاں کا دوبارہ

مورخ لکھتا ہے۔ ”با آنکہ حقوق و زندگیش بہ تسعین پیوستہ۔ از سلامت قوی بانواع طاقا و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسان آیام شباب می پردازد۔“

مورخین اس پر متفق ہیں کہ اگرچہ فن حدیث کے فاضل شیخ عبدالحق محدث سے پہلے بھی

شیخ محدث کی علمی خدمات

ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن اس علم کو پہلی دفعہ آپ ہی نے عام کیا۔ تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے ”علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از و شیوع یافتہ۔“ میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر اکرام میں نقل کرتے ہیں:-

”بشر علوم سیم علم شریف حدیث پر داخترہ نیچے کہ در دیار عجم احدیے را از علماء متبعین و متاخرین دست نداده است۔ ممتاز و مجتہد گزیدہ۔ و در فنون علمیہ خاصہ فن حدیث کتب معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علماء از ان اعتنا بکن و زبیدہ دستور العمل خود دارند۔“

مولنا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں علم حدیث کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- ”مولنا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی۔ اور ان کے درس و تصنیف ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں عام کیا۔“

شیخ محدث نے نہ صرف درس و تدریس کے ذریعے علم حدیث کی اشاعت کی۔ بلکہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، جن کا علمی پایہ اب تک مسلم ہے۔ عربی میں ان کی مشہور کتاب اشاعت ہے جو مشکوٰۃ کی شرح ہے اور جسے چھ سال کی محنت کے بعد انھوں نے ۱۰۱۶ھ میں مکمل کیا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علم حدیث پر تبصرہ کیا ہے۔ اور طویل اقتباسات کے کر فقہ حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حدیث کے

۱۔ شیخ عبدالحق نے حدیث کی اتنی اشاعت کی، لیکن ان کا طریق کار اس قدر معتدلانہ تھا کہ بعض اہل حدیث حضرت کو ان کی فقہ حنفی کی پاسداری کھٹکتی ہے۔ مثلاً نواب صدیق حسن خاں ان کی نسبت لکھتے (باقی اگلے صفحے پر)

اسناد اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، لیکن شاید ان کتابوں سے بھی زیادہ مفید کتاب اشعۃ اللمعات تھی جو فارسی میں مشکوٰۃ کی شرح ہے اور لمعات سے زیادہ مفصل ہے۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے لمعات کے ساتھ سنہ ۱۱۱۱ھ میں کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل میں دیر لگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: ”حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دورِ علم و تعلیم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان صاحبزادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح بخاری کا“

حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدینۃ النبیؐ کی تاریخ پر (جسے سیرت کا کملہ کہنا چاہیے) مبذول کی۔ مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ حدودِ یہ تحریک۔ بعض ”درویشانِ مغرور“ کے دعاوی اور مقام اقدس محمدیؐ کے عدم ادراک۔ نظریۃ النفی۔ دربارِ اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلے میں نبوت سے کم نگھی۔ رسول اکرمؐ کے صحیح واقعات زندگی سے عام ناواقفیت۔ ان تمام اسباب کی بنا پر عوامِ جاہلہ محمدی سے دور جا رہے تھے۔ اس کا سدباب ہو جائے۔ چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبویؐ مدارج النبوت کے عنوان سے کوئی بارہ سو صفحات میں ترتیب دی، جو اب بھی مقبول ہے اور اصل فارسی اور اردو ترجمہ (منہاج النبوت) متعدد بار شائع ہو چکے ہیں

جذب القلوب فی دیار المحبوب مدینۃ النبیؐ کی تاریخ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ تاریخ مدینہ منورہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور اصل فارسی بھی کئی مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۸۲)

ہیں۔ ”فقیر حنفی و علامہ دین حنفی است“ و اما محدث مشہور است۔ ”و دستگاہش در فقہ بیشتر از جہالت در علوم سنت سنیه است و لهذا جانب داری اہل الرائے جانب گرفتہ۔ معہذا جابا حمایت سنت صحیحہ نیز نمودہ طالب علم را باید کہ در تصانیف دے ”خذ ما صفا و دح ما کدر“ پیش نظر وارد۔“

بھی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث کی دوسری دلچسپی قادریہ سلسلے کے بانی حضرت غوث اعظم عبد القادر جیلانیؒ سے تھی۔ آپ نے ان کی تصانیف کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا۔ فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ غوث اعظم کی سوانح عمری اخبار الاخیار کے شروع میں تبرکاً درج کی۔ اور آخر عمر میں دارالاشکوہ کی فرمائش پر (جو آپ کی طرح قادریہ سلسلے سے منسلک تھا) حضرت کی قدیمی اور مستند سوانح عمری بحبت الاسرار کا خلاصہ زبدۃ الآثار کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کا اردو ترجمہ محل الابصار کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آپ کی ایک دلچسپ تصنیف زاد المتقین الی طریق الیقین ہے۔ جس میں ان شیوخ و اساتذہ کے حالات لکھے ہیں جن سے آپ نے سفر حجاز میں فیض حاصل کیا۔ فرس التواریف میں اپنی تصانیف کی مفصل فہرست دی ہے۔ شروع میں مصنفین دہلی کا تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ ایک دلچسپ رسالہ نورانیہ سلطانہ ہے جس میں جہانگیر کے لیے آئین سلطنت اور قواعد حکمرانی کو ترتیب دیا ہے۔

شاید آپ کی سب سے زیادہ کامیاب تالیف اخبار الاخیار ہے۔ جس میں آپ نے ہندوستان کے اولیاء اور بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں شروع میں

لے اس کتاب اور شیخ محدث کے متعلق جہانگیر کی رائے دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ وہ چودھویں سال جلوس (آغاز مارچ ۱۶۱۱ء) کے واقعات میں لکھتا ہے ”شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل و ارباب سعادت است۔ دریں آمدن دولت ملازمت دریافت۔ کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند (اخبار الاخیار) بہ نظر در آمد۔ خلیکے رحمت کشیدہ مدت ہاست کہ در گوشہ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر برد۔ مرد گرامی است۔ جہانگیر نے شیخ محدث کو ایک گاؤں بطور جاگیر پیش کیا اور بہ اصرار اسے لینے پر آمادہ کیا۔“

بزرگ حضرت غوث شاہ عظیمؒ کے حالات دیے ہیں۔ جن کے سلسلہ قادریہ میں آپ تے
 کسی بزرگوں سے بیعت کی تھی۔ پھر اولیاء کے تین طبقے ترتیب دیے ہیں۔ پہلے میں
 خواجہ بزرگ اجمیریؒ اور ان کے معاصرین اور مریدین کے حالات ہیں۔ دوسرے میں
 بابا فریدؒ اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور مریدوں کے اور تیسرے طبقے میں حضرت
 چراغ دہلیؒ سے لے کر اپنے زمانے تک کے مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں
 اپنے بزرگوں کا تذکرہ اور ۱۵۸۸ء تک کے اپنے بعض حالات درج کیے ہیں۔ ہندوستان
 کی مذہبی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ تذکرہ نہایت اہم ہے۔ ایک
 اپنے حتی الوسع مستند واقعات لکھے ہیں۔ دوسرے طرزِ ادا پاکیزہ اور بلیغ و مؤثر ہے۔
 غیر ضروری جزئیات سے پرہیز کیا ہے، لیکن کام کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ غیر معروف
 سلسلوں اور دورِ افتادہ بزرگوں کے مستند حالات تلاش کرنے میں خاص محنت کی ہے۔
 اور بعد میں آنے والوں کو زیرِ بارِ احسان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کی تکمیل
 میں آپ کو برسوں محنت کرنی پڑی۔ پہلے تلاشِ حالات میں اور پھر ترتیبِ مضامین
 اور اصلاحِ عبارت میں۔ شروع میں کوئی پندرہ ہزار سطریں تھیں۔ پھر بارہ ہزار اور
 آخری ترتیب میں آپ کے ایجاز و اختصار کی بدولت نو ہزار رہ گئیں۔ یہ کتاب
 آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے، لیکن برسوں کی تہذیب و اصلاح کی بدولت اس کا
 مرتبہ بہت بلند ہو گیا اور اب اسی کو آپ کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

آپ کی ایک اور قابل ذکر تاریخی تصنیف تاریخِ حقی یا ذکرِ طوک ہے۔ جس میں
 سلطان محمد غوری سے ابر کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب غالباً قیام
 فتح پور سیکری میں شروع ہوئی اور سچ سے واپسی کے تین چار سال بعد (سنہ ۸۰۰ھ)
 میں مکمل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں بھی اضافے ہوئے رہے۔ اس کتاب میں اکبر کے خلاف
 کوئی خاص چیز نہیں، بلکہ آخری باب میں اس ارادے کا اظہار ہے کہ بادشاہ کی فتوحات
 اور قواعد و ضوابط کو کسی اور وقت لکھیں گے۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ معلوم ہوتا
 ہے کہ یہ کتاب کسی فرمایش کی تکمیل میں لکھی گئی، اپنی خوشی سے نہیں۔ اور کئی جگہ

شیخ نے دنیا داروں کی تاریخ لکھنے پر معذرت آمیز شعر لکھے ہیں مثلاً
 حقی ز پے قصہ و افسانہ شدی چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
 درویشی، تر از ذکر شاہاں چہ غرض مفتون سخن گشتی و دیوانہ شدی

اور ۵

حقی تو ز تاریخ و حکایات گوئے در راہ تتبع روایات مپوئے
 در زاویہ فقر نشستی کارے جز ذکر خدا، نفی و اثبات مجوئے
 شیخ عبدالحق کی کل تصانیف کی تعداد سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس شمار
 میں وہ اڑسٹھ رسائل بھی ہیں جو المکاتیب والرسائل کے عنوان سے ایک جلد میں
 جمع ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور حقی نخلص کرتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام جس
 میں غزلیات، قصائد، قطعات و رباعیات اور مغنویاں غرض تمام اصنافِ سخن
 شامل تھیں۔ ”حسن الاشعار“ کے نام سے مرتب ہوا۔ غالباً یہی مختصر مجموعہ وہ دیوان
 تھا، جو گزشتہ صدی کے آخر یا اس صدی کے شروع میں نواب علی حسن خاں مولف
 صبح گلشن نے دیکھا تھا۔ لیکن صبح گلشن میں جو اشعار منتخب ہوئے ہیں۔ وہ بیشتر
 رسمی، عاشقانہ قسم کے ہیں اور غالباً قیام فتح پور سیکری میں لکھے گئے۔ مثلاً
 شوخ چابک سوار من نگرید فتنہ روزگار من نگرید
 کوہ کن کوہ کند و من جاں را کار او نیز و کار من نگرید
 اے خوش اندم کہ باریقیل گفت حقی، خاکسار من نگرید

چوں من میرم چہ حاصل گریبت آرام جاں باشد

من از حسرت بمیرم، اور بکام دیگران باشد

بہر خور بچہ آں مہ می کند، از جامِ مرو حقی

کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصود امتحان باشد

بر رخ زلف پر شکن بینید سنبُل اُفتادہ بر سمن بینید
در گرفت از رخ بگل آتش آتش اُفتادہ در چمن بینید
تن او در برون پیرا ہن بچو جاں در درون تن بینید
نثر کی بعض تصانیف میں بھی شعر درج ہیں۔ مثلاً :-
حقّی از گوشہ دہلی نہ شہم پابیوں خود گرفتیم کہ ملک بجز اتم داند

حقاً بیان شوق بیاباں نمی رسد کوتاہ ساز قصہ دور و دراز را

خاندان حقی | شیخ محدث کی اولاد معنوی بہت تھی، لیکن اولاد ظاہری میں بھی وہ خوش نصیب تھے۔ ان کے فرزند اکبر مولانا نور الحق عہد شاہجہانی میں محرز عہدوں (مثلاً قضاۃ اکبر آباد) پر ممتاز رہے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کی سب سے مشہور تالیف شرح صحیح بخاری ہے جو چھ جلدوں میں مکمل ہوئی اور نگ زریب سے منسوب کی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے نواب مرتضیٰ خاں کے ایما پر ہندوستان کی تاریخ، زبدۃ التواریخ کے نام سے لکھی کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا ترجمہ شدہ نسخہ ہے، لیکن اس میں عہد اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں۔ والد کی وفات کے بعد آپ سرکاری عہدوں سے علیحدہ ہو گئے۔ اور خاندانی مدرسے میں درس حدیث اور ارشاد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ وفات نوے برس کی عمر میں ۹۶۳ھ میں ہوئی۔
آپ کے تفصیلی حالات نہیں ملتے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ آپ سے کس نے علم حدیث اخذ کیا۔ لیکن آپ کے شاگردوں میں "قطب المحدثین" مولانا سید مبارک حسین واسطی بگرامی (متوفی ۱۲۸۷ھ) کا نام لیا جاتا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کا فیض دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

فرحت الناظرین میں آپ کی نسبت لکھا ہے :-

"فاضل محدث و عالم متبحر بود۔ خلیفہ و جانشین پدر خود، عبدالحق دہلوی ہست

رحمۃ اللہ علیہ۔ و شیخ مذکور نسبت و ارادت بہ سلسلہ قادریہ سادۃ التبیہ (شاذلیہ) داشت
و در برسی جزو بر صحیح بخاری شرحے وافی داشت و مفصلات و مشکلات احادیث را
حل ساخته و در تقویت مذہب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ جہد بلیغ نموده و احادیث
مخالف ایں مذہب را تا ویلات نجستہ فرمودہ و بر عہندی و شرح مطالب و شرح ہدایہ
و حکمت و دیگر کتب متداولہ حواشی دارد و در نظم و نثر و حید زماں بود۔ ایں رباعی از دست

از شیوہ ہمدان ایں دوہِ خلاف گویم رمزی اگر نگیری بگزاف

چوں شیشہ ساعت اندر پرستہ ہم ولہا ہمہ پرنیاد و روا ہمہ صلا

باد بہ لازمیت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بعناایت بادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود :-

آپ کا تخلص مشرقی تھا۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے :-

"مشرقی تخلص شیخ نور الحق دہلوی بود۔ در بحر تحفۃ العراقین مثنوی دارد و در وانش

قریب پنج ہزار بیت است۔ از دست :-

با آنکہ مشرقی ہمد تن دیدہ چوں گل است

باہج کس، چوں چشم جاب آشنا بود

علمائے عصر

شیخ عبدالحق کارمانہ علم و فضل میں بڑا خوش قسمت تھا۔ اس وقت کھمبایت اور سورت کی بند گلیوں میں رونق پر تھیں اور حکومت دہلی کے تابع، سجاد کا سمندری راستہ پہلی مرتبہ شمالی ہندوستان والوں کے لیے کھلا تھا۔ جن لوگوں کی قسمت میں تھا انھوں نے وہاں ہر علوم دینی حاصل کیے اور وہیں آگے ہندوستان کو سیراب کیا۔ شیخ عبدالحق اس قافلے کے میر کاہن تھے۔ لیکن دوسرے علاقوں کے علما کا میلہ بھی بلند تھا۔

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی | ہندوستان میں اس وقت اسلامی علوم کے چھڑنے پر مرکز تھے۔ ایک دہلی، دوسرے پنجاب تیسرے پورب لہجی جو پور، الہ آباد اور لکھنؤ کا علاقہ، چوتھے گجرات۔ پانچویں سندھ اور چھٹے برہما پور۔ پہلی میں خود شیخ عبدالحق علمی مجلس کے صدر نشین تھے۔ پنجاب میں ان دنوں حاکم سے ناراضگی کی بنا پر کشمیر سے ایک بزرگ ترک مکان کے سیالکوٹ آئے تھے۔ جنھوں نے پنجاب کی علمی شہرت کو ایک مرتبہ پھر فروغ دیا۔ یہ بزرگ ملاکمال الدین کشمیری (متوفی ۱۰۸۰ھ) تھے۔ جن کے تلامذہ میں نواب سجاد اللہ خاں، وزیر اعظم ہندوستان

۱۰۸۰ھ مولانا آزاد گلبرائی نے عظیم آباد کو بھی اسی علاقے میں گنا ہے اور پورب کی بجا طور پر بڑی تعریف کی ہے۔ پورب کے قصبے شہروں کے برابر ہیں۔ کینہ کمان میں عمارات عالی اور شرفیوں و نجیبوں و مشائخ و عالموں مختلف اقوام و انواع اقسام کے پیشہ وروں کے مکانات اور مسجدیں و مدرسے و پرستش گاہیں موجود ہیں۔ اور مسجدیں وہاں کی جمعہ اور جماعت کی نمازوں سے آباد۔ اگر ان کو شہر کہا جائے تو بجا ہے۔ (مظہر کوثر ترجمہ سیر الملک) ۱۰۸۰ھ برہما پور کی علمی تاریخ سے عام بے خبری ہے۔ لیکن سندھادی بورد نے وہاں کے سندھی ادیبان کے جو حالات تراش کیے ہیں۔ ان سے بھی اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان کا علمی فیض علامہ عبدالحکیم نے جاری رکھا انھیں عہد شاہجہانی میں بڑا فروغ ملا۔ اور مرتبہ بادشاہ نے انھیں سونے چاندی سے نوازا اور ان کے حذن کے مطابق چھ پیراں لکھ نقد افہام دیا۔ آپ ایک زمانے میں اکبر آباد کے سرکاری مدرسہ میں جسے گبر نے جلدی کیا تھا، مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور یہاں مشہور شاعر قسری کے ساتھ ایک ہی وقت میں فرائض درس و تدریس سر انجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف کی میں ایک سالہ در تہمینہ ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ نے اسے دربار شاہجہان میں بلایا بی کے وقت پیش کیا۔ باقی تصانیف خرمیں اور حاشیہ ہیں۔ جنھیں آپ نے اپنے تلامذہ اور دوسرے اہل علم کی سہولت کے لیے مرتب کیا۔ مثلاً تفسیر رضیادی۔ حاشیہ شرح عقائد نقضانی، حاشیہ شرح تسمیہ۔ مکملہ حاشیہ عبد الغفور اور حاشیہ خیالی، جس کی نسبت ذیل کا شعر مشہور ہے۔

خیالات خیالی بس عظیم است

برائے حل او عبدالحکیم است

حافظ عبد الرحمن امرتسری اپنے سفر نامہ میں ملا عبدالحکیم کی نسبت لکھتے ہیں۔

سراق، شام اور استنبول کی متحدہ درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخل

درس دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندوستان سے باہر ملا اسلامیہ میں علمی حیثیت سے

جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی مصنف حاصل نہیں کر سکا۔

ملا عبدالحکیم کی وفات ۱۰۸۰ھ میں ہوئی۔ مزار سیالکوٹ کے باہر شہر بان درویش ہے۔

ملا محمود جوہر پوری | بلاد مشرقی کے علما نے معقولات میں امتیاز حاصل کیا اور اس

کی ابتدا بھی اس زمانے میں ہو گئی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث کے ایک ہم عصر ملا محمود

فاروقی جوہر پوری تھے جنھوں نے معقولات میں نام پایا اور علم حکمت میں ایک کتاب

شمس باز غر تصنیف کی۔ جواب بھی مدرس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ

علم بلاغت میں ایک کتاب فرائد فی شرح الفوائد بھی ان سے یادگار ہے، جو معانی و

بیان کی مشہور کتاب فوائد غیاثیہ کی شرح ہے۔ آپ نے ۱۰۷۰ھ میں زیادہ عمر پائی بغیر وفات پائی۔ ان کی نسبت تذکرہ علماء ہند کے مؤلف لکھتے ہیں۔ "اگر بوجدیش سرزمین جو نپور بمز بوم شیراز تھا خرمے جست بودے"۔

شیخ محمد بن طاہر بٹنی گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر بٹنی (وفات ۱۰۷۸ھ) اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (۱۰۵۹ھ) نے پائی۔ شیخ محمد بن طاہر صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ مبلغ اور قاطع بدعت بھی تھے اور انھوں نے رد بدعت کی کوششوں میں شہادت پائی۔ وہ گجرات کے قدیم دار الخلافہ بٹن کے باشندے تھے۔ کتب متداولہ سے فارغ ہونے کے بعد حرمین پہنچے۔ وہاں کے علماء کے بارے میں قوتوں فیض حاصل کیا۔ اور علم حدیث میں متعدد بزرگوں سے سند لی۔ زیادہ عقیدت انھیں شیخ علی متقی سے تھی جن کے وہ مرید بھی ہو گئے تھے۔ حجاز سے واپسی کے بعد وہ درس تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ مرشد کی ہدایات کے مطابق وہ طلبہ کی ضرورت کے لیے ساتھ ساتھ سیاہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ درس میں مشغول ہوتے اُس وقت بھی یہ فخل ساتھ ساتھ جاری رہتا۔ ان کی تصانیف کئی ہیں جس سے مشہور مجمع البحار ہے۔ جسے صحاح ستہ کی شرح سمجھنا چاہیے۔ ایک رسالہ تصحیح سالار الجبال میں ہے۔ دو کتابیں موضوع حدیثوں کے متعلق ہیں۔ تذکرۃ الموضوعات در بیان احادیث موضوعہ اور قانون الموضوعات فی فکر الضعفا۔

وہ قوم کے لوہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اپنی قوم سے تمام بدعتیں دور کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے بری نہ ہو جائے گی میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔ وہ اپنی کوششوں میں مشغول تھے کہ

۱۔ بھروسوں کے دفرے میں ضعیف جماعت (خدا)۔ اہل سنت والجماعت (جماعت کلال) شیخ محمد طاہر دہلوی
وسید محمد جعفر و جید آباد و عالم بزرگ بودند۔ بشارت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بر دو فرق لازم بود کہ
... و جماعت محمد از صوبہ گجرات برآمد و در صوبہ مالوہ مقری شد۔ (احکام النبلا از نواب صدیقی سن ۱)

اکبر نے گجرات فتح کر لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے دوسرے علماء کے ساتھ وہ بھی پیش ہوئے۔ بادشاہ نے برہنہ سر پہنے کی وجہ دریافت کی اور جب انھوں نے حقیقت حال بیان کی تو اکبر نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور میں اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ چنانچہ خان اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہوا اور چونکہ وہ راسخ العقیدہ تھے اسی نے اپنے ایام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خان خانان گورنر ہوا جس کے عہد حکومت میں شیعہ لوہے پھر دلیر ہو گئے شیخ نے اپنا عمامہ پھر سر سے اتارا اور اگرے کا رخ کیا۔ تاکہ خود بادشاہ کے حضور میں عرض حال کریں۔ شیخ وجیہ الدین نے طریقے سے منع کیا، لیکن شیخ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ (شیخ وجیہ الدین علوی ہر چند بہ طریق کناہیہ منع کرد و فرمود عالم منظر اسماء جمالی و جلالی است حفظ آثار و احکام ہر اسم صراطی است مستقیم سودمند نیفتاد) وہ ابھی راستے میں ہی تھے کہ اجین کے قریب چند مخالف پیچھے سے آپہنچے اور انھیں شہید کر دیا۔ ان کے ساتھی ان کی لاش کو پٹن واپس لے گئے اور بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا۔

شیخ وجیہ الدین احمد آبادی شیخ وجیہ الدین پیدا تو مشرقی گجرات کے قدیمی شہر چانپانیر میں ہوئے، لیکن ان کے علم و فضل کا دریا احمد آباد میں بہتا رہا۔ انھوں نے کئی سال درس دیا اور ایک عالم کو سیراب کیا اور متعدد درسی کتب پر حاشیے اور شرحیں لکھیں۔ ان کی وفات ۱۰۵۹ھ میں ہوئی اور اپنے مد سے کے وسط میں دفن ہیں۔ ان کے مزار کا چھپر کھٹ نواب مرعشی خاں نے تیار کروایا جس پر سیپ کا نہایت اعلیٰ درجے کا کام ہوا ہے۔

تذکروں میں آپ کا نام اکثر شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے واقعہ کفر کی وجہ سے آجاتا ہے جن کی بعض تصنیفات کی بنا پر شیخ علی متقی نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ فتویٰ آپ کے پاس بھیجا۔ لیکن آپ نے نہ صرف

اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی۔ اور اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مخرج بیان کیا ہے۔ آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سکرم میں جو کہہ جاتے ہیں۔ وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتا۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب اور دیگر شیعہ پر لوگوں نے جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب دیا ہے۔۔۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ کو اہل قبلہ کو کافرنہ کہو۔

شاہ وجیہ الدین ایک جید عالم تھے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی درسی کتاب چھوٹی یا بڑی ہوگی جس کی انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو لیکن لوگ انھیں ایک ولی مانتے تھے۔ مغلایق رابریوسہ از الانقاس متبرکہ اوفیض سے رسید۔ وحی سبحانہ اسم الشافی را ظاہر و اور امظہر ساختہ بود۔ تا ہر روز جیسے لاتعداد لکھنوی از ہمالیہ و محنت زندگان بہ ملازمت او آمدہ التماس دعا می نمودند و اثر آن نزدیکی یافتند۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ موٹا کپڑا پہنتے اور عام لوگوں کی طرح رہتے جو کچھ آتا وہ دوسروں پر خرچ کرتے۔ امیروں کے گھر پر بطور خود کبھی نہ جاتے۔ ایک دو دفعہ حکام وقت کی طلب پر بہ مجبوری واکراہ جانا پڑا۔ ورنہ گھر اور مسجد کے احاطہ سے باہر قدم نہ نکالتے۔

مولانا سید صبغت اللہ بروجی شطاری | شیخ وجیہ الدین خود شطاریہ سلسلے میں ہو گئے اور ان کے ایک شاگرد اور مرید سید صبغت اللہ بروجی نے اس سلسلے کو حجاز میں عام کیا۔ سید صبغت اللہ بروجی (بھڑوچ) کے رہنے والے تھے جو اب محورت اور بڑودہ کے درمیان ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ آپ کی احمد نگر اور بیجاپور کے بادشاہوں نے بڑی قدر کی۔ لیکن بالآخر آپ نے مدینہ منورہ کے

قریب جبل احمد پر سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک خالقاہ تعمیر کی اور تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب جو اہر خمسہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس پر آپ کے شاگرد شیخ احمد ثناوی نے حاشیہ لکھا۔ جن لوگوں نے سلسلہ شطاریہ میں آپ سے بیعت کر کے اسے حجاز میں پھیلایا۔ ان میں شیخ احمد ثناوی کے علاوہ مدینہ منورہ کے سید میر اور سید اسعد لکھی بھی تھے۔ آپ نے عربی میں مسائل تصوف پر کسی کتاب تصنیف نہیں کی۔ گلزار ابرار اور مراد الاسرار میں لکھا ہے کہ آپ کی شہرت سن کہ سلطان روم نے آپ کو بلایا لیکن آپ نہیں گئے۔ وفات مدینہ منورہ میں سن ۱۱۷۰ میں ہوئی۔ ایک عرصہ تک مزار زیارت گاہ خاص و عام بنا رہا۔

مندرجہ بالا حالات سحیحۃ المرجان میں میر غلام علی آزاد نے لسان الزمان (از احمد علی) کے حوالے سے لکھے ہیں۔ یاد آیام میں مولانا عبدالحی لکھتے ہیں۔ "شیخ احمد بن عبد القدوس ثناوی، البکر بن تھو النسفی، محمد بن عمر بن محمد الحضرمی اور شیخ عبدالمعظم المکی جیسے نامور ان کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے جو بلا دردم تک پہنچا۔ اور علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے سوا ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جو علماء عرب کی فرمائش سے لکھی ہیں۔ محمد بن فضل الشافعی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں ان کا مضبوط ترجمہ (تذکرہ) لکھا ہے اور شیخ نجم الدین غزالی نے لطف الثمر و قطف الثمر میں ان کی بڑی مدح و ثنا کی ہے۔۔۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔"

شاہ وجیہ الدین کے ایک اور نامور شاگرد جن کا
شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری | شہرہ دور دور تک پہنچا، اور جو اس عہد کے ایک بڑے علمی مرکز برہانپور کے نمائندہ تھے۔ شیخ محمد برہانپوری تھے۔ ان کے والد شاہ فضل اللہ برہانپوری (وفات ۱۱۵۹ھ) اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم تھے۔ بلکہ نائب رسول اللہ کہلاتے تھے۔ شاہجہان کہا کرتا تھا کہ اگرچہ کئی بزرگوں کی

خدمت میں حاضر ہوا ہوں، لیکن کامل شیخ فقط دو دیکھے ہیں۔ میاں میر لاہوری اور شیخ المشائخ فضل اللہ۔ شاہ صاحب کا وطن جو پور تھا، لیکن برہانپور میں مقیم ہو گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فقط تفسیر اور حدیث کا درس دیتے تھے۔ اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی راہنمائی اور تزکیہ نفس کا اہتمام کرتے۔

شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آبادی ۱۱۵۵ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ پھر حجاز چلے گئے۔ شیخ علی متقی کی صحبت پائی۔ پھر احمد آباد واپس آئے۔ شاہ وحید الدین سے تکمیل تعلیم کی۔ پھر شیخ ابوالاحمد جعفر کے پاس جو آپ کے والد کے مرید تھے۔ امیر (مالوہ) پنپے اور بالآخر برہانپور میں توطن اختیار کر کے مدرسہ اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ سچے عاشق رسول تھے۔ بالآخر آپ نے درس و تدریس چھوڑ کر یاد خدا اور خلق کی روعانی رہنمائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا لیکن تصنیف و تالیف کی دنیا میں بھی آپ کا نام بلند ہے۔ آپ کا اصل شاہکار التحفۃ المرسلۃ الی النبی ہے۔ لیکن اور کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً التحفۃ المرسلۃ کی شرح آپ نے الحقیقت الموافق الضریح کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی ایک نقل بنگال اشیا لک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ آپ نے ۱۱۶۲ھ میں وفات پائی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مخلص و محمد خلیفہ (مکتوبات امام ربانی جلد ثالث کے مؤلف و زبدۃ الفقہاء کے مصنف) خواجہ محمد ہاشم کشمیری ثم برہانپوری نے تاریخ لکھی ہے۔

منظر اسمائے سیمی مصطفیٰ اکبر از نامش زباں چوں گل شگفت
سینہ اش شوق آمد آخرا ز جہاں بس کہ لازم عشق دروے می نہفت
ابن فضل اللہ بود و ہا قفے سال و قش ابن فضل اللہ گفت

غرض جس نے گلزار ابرار اس زمانے میں تصنیف کی، جب آپ ابھی حیات تھے، لکھتا ہے کہ آپ خاندیش کے بادشاہ محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی کے عہد حکومت (۱۱۵۵ھ) میں گجرات سے خاندیش تشریف لائے۔ برہانپور میں مسجد اور خانقاہ تعمیر

کی۔ حدیث، تفسیر اور دوسرے دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اہل دل تھے، لیکن سماع اور سرود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچے عاشق رسول تھے۔ ہر سال حجاز کے موسم میں دیوانہ وار وطن سے نکلتے اور سمندر کے کنارے پہنچ جاتے۔ اگر قسمت یادری کرتی تو جہاز پر سوار ہو کر حرمین شریفین میں پہنچتے اور روضہ نبوی کی زیارت دل کو تسکین دیتے۔ اس طرح آپ نے حجاز کے کئی سفر کیے۔ وطن میں بھی محبت رسول میں مست رہتے۔ سال بھر میں اگر کوئی کوڑی پیسہ بچاتے تو اس لیے کہ سفر حجاز کا سامان ہو جائے۔ یاربیع الاول میں مجلس میلاد پورے اہتمام سے ہو۔ برہانپور کے پہلے بارہ روز مجلس میلاد قائم ہوتی۔ ہر رات ذاکرین احادیث نبوی اور فحشیں آواز سوزناک سے پڑھتے۔ اور آپ اپنا سارا اندوختہ مجلس میں تبرکات، حلوسے اور عطریات تقسیم کرنے اور ذاکرین کی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اگر کچھ زیادہ ہوتا تو حرمین کے فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے۔

بارگاہ الہی میں آپ کی محبت نبوی مقبول ہوئی۔ اور آپ کی التحفۃ المرسلۃ الی النبی نے بڑی شہرت پائی۔ اس کی کم از کم تین شرحیں لکھی گئیں۔ اور انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملا یابی زبان کے ایک اہل علم نے نور الدین رانیزی (رانذیری) نے اس کا ترجمہ ملا یابی میں کیا۔ رانیزی ہندی النسل تھا۔ لیکن جزائر شرقی میں بس گیا تھا اور اس نے کثرت سے ملا یابی زبان میں کتابیں لکھیں۔ اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ لیکن اس کی کتابوں کا زمانہ تصنیف ۱۱۶۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔

اس وقت سمارٹا میں وحدت الوجود کے اندونیشیا میں شطاری سلسلہ متعلق اسی طرح بحثیں ہو رہی تھیں۔

۱۱۵۵ھ غلبہ اٹھنے کی ریح الحمیر فی طریقۃ الصوفیہ کا ذکر مولانا عبدالحی نے یاد آیام میں کیا ہے۔ اس میں تاریخ وفات ۱۱۶۵ھ یعنی ۱۱۵۵ھ لکھی ہے۔

جس طرح ہندوستان میں بلکہ مدینہ منورہ کے راستے یہاں کی بحثیں وہاں منتقل ہو رہی تھیں۔ سمارا کے قدیمی اہل قلم (مثلاً حمزہ) وحدت الوجود کے مسئلے میں ابن العربی اور عبدالکریم جلی کے قائل تھے۔ نور الدین راندیری اس نقطہ نظر کے سخت مخالف تھے، لیکن ایک اور مقامی عالم عبدالرؤف جو سولہ سال حجاز میں مقیم رہے اور شطاری سلسلے میں منسلک ہو گئے تھے، مولانا وجہ الدین کی طرح بین بین پے تھے۔ ان کے استاد دو ہندوستانی تھے۔ مولانا احمد قشاشی (وفات ۱۲۶۶ھ) اور ان کے جانشین ملا ابراہیم القرانی (وفات ۱۲۹۶ھ) مؤرخ الذکر نے عبدالرؤف کو شطاری سلسلے میں مرید کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے جزائر شرقی میں یہ سلسلہ جاری کیا۔ اور جلد ہی جاوا میں کثرت سے لوگ اس سلسلے میں شامل ہوئے۔

مندرجہ بالا معلومات ہمیں ہالینڈ کے مستشرقین سے دستیاب ہوئیں شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب الانتباه فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جو اہل حق کی اجازت اپنے استاد شیخ ابوطاہر کردی سے حاصل کی تھی جن کے والد نے یہ اجازت شیخ احمد شادوی کے خلیفہ شیخ احمد قشاشی سے حاصل کی تھی۔ شاہ صاحب نے سفر حج کے سلسلے میں قیام لاہور کے دوران میں طریقہ شطاریہ میں حاجی شیخ محمد سعید لاہوری سے بھی دعائے سیفی اور اعمال جو اہل حق سے کی اجازت لی تھی۔ لیکن ان کی تصنیف سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ شیخ احمد قشاشی جن کے فیض یافتگان اندونیشیا میں تھے، شیخ صیغت اللہ بروجی کے مرید المرید تھے۔ اور ان سے شیخ ابراہیم کردی نے شطاریہ طریقہ اخذ کیا۔ یہ شیخ ابراہیم شاہ ولی اللہ کے محبوب استاد شیخ ابوطاہر الکردی المدنی کے والد اور مرشد تھے۔ اور شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے استاد سے یہ طریقہ اخذ کیا۔

اس زمانے کا ایک اور علمی مرکز زیریں سندھ کا دار الخلافہ **علمائے سندھ** ٹھٹھہ تھا۔ مغربی پنجاب اور سندھ کی ثقافتی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان۔ آچہ۔ منصورہ اور دیبل کے لہ شطاری بزرگوں کی نسبت ان کی عربی تصنیف سمط الحبیہ دائرہ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔

قدیمی اثرات اور ایران سے قرب کی وجہ سے اس علاقے میں علوم اسلامی اور عربی کا ادب کا بہت بلند معیار تھا۔ اور ٹھٹھہ، بھکر، سیوستان، درہیلہ (نزد سیوستان) میں علم و ادب کے بڑے مرکز تھے۔ جب خاندان تغلق کے زوال کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہو گئی اور سندھ خود مختار ہو گیا۔ اس وقت بھی علم و فضل کی سرپرستی جاری رہی اور اس علاقے میں بڑے اہل علم پیدا ہوئے۔ مغلہ حکومت میں بھی کئی سندھی علماء نے نام پایا۔ متعدد سندھی علماء (مثلاً سید نظام الدین ٹھٹھوی اور مولانا محمد ابوالخیر ٹھٹھوی) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں مدد دی۔ قاضی ابراہیم ٹھٹھوی عہد شاہجہانی میں دار الخلافہ کا مفتی اور قاضی عساکر تھا۔ ملا محمد دماغی ٹھٹھوی شاہجہان کے ایام شاہزادگی میں اس کا پیش امام تھا۔ ٹھٹھہ کے قدیمی سربراہ و بزرگوں میں مخدوم میراں ٹھٹھوی (وفات ۱۵۴۲ھ) مخدوم مشو ٹھٹھوی جو علم حدیث کے استاد تھے۔ اور شرح ازجینی، شرح گیلانی اور دوسرے رسائل کے مصنف (وفات ۱۵۴۳ھ) شیخ الاسلام میرک محمد سبزواری ٹھٹھوی (۱۵۵۵ھ) اور میرک محمد ٹھٹھوی مولف فتاویٰ توراتی (۱۵۶۲ھ) تھے۔ علم پرور سندھیوں نے وفات کے بعد ان میں سے اکثر کو دہلی کے قبرستان میں جگہ دی ایک اور قابل ذکر ٹھٹھوی عالم قاضی محمود علامہ عباسی تھے جو مرزا عیسے ترخان اور مرزا جانی (معاصر اکبر) کے ہم عصر تھے اور متعدد کتب پر حواشی کے علاوہ ایک تذکرۃ الاولیاء کے مؤلف ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری | عہد جمہانگیری میں مشہور شیعہ عالم قاضی نور اللہ شوستری کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے متعلق نجوم السما فی تراجم العلماء میں جو علماء شیعہ کی مستند تاریخ ہے ذیل کا اندراج ہے:- (ترجمہ)

”اور ان کی شہادت کا قصہ جو صاحب تذکرہ نے بعض ثقات سے نقل کیا ہے اس طرح ہے کہ سید صاحب مذکور ہمیشہ مخالفین کے درمیان تقیہ کرتے تھے۔ اور اپنے مذہب کو ان سے مخفی رکھتے تھے۔ انھیں اہل سنت کے مذاہب لبر کے

فقہی مسائل پر مدظلہ حاصل تھا۔ اس لیے اکبر بادشاہ اور عام لوگ انھیں سنی المذہب سمجھتے۔ اور جب اکبر بادشاہ کو ان کے علم و فضل اور لیاقت سے آگہی ہوئی تو انھیں قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ جناب سید نے فرمایا کہ میں ایک شرط پر اس خدمت کو قبول کرتا ہوں کہ مذاہب اربعہ یعنی شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی طریقوں میں سے جس کے موافق میری رائے اور اجتہاد ہوگا۔ اسی کے مطابق مقدمات میں فتویٰ دوں گا۔ اور چونکہ غور و نظر اور استدلال کی قوت حاصل ہے۔ اس لیے تمام مسائل و احکام میں ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں ہوں۔ لیکن اپنے اجتہاد میں (اہل سنت) چار فقہی مذاہب کا پابند نہیں جاتا۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ قاضی علیہ الرحمۃ نے تمام مسائل قضا و احکام میں امامیہ مذہب کے مطابق فتوے دینا شروع کیا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو جناب قاضی ثابت فرما دیتے کہ میرا یہ فتوے اہل سنت کے چار فقہی مذاہب میں سے فلاں کے مطابق ہے۔ چنانچہ ان کے بعض فتوے مذہب شافعی، بعض حنفی، بعض مالکی اور بعض حنبلی مذہب کے مطابق ہوتے۔ قاضی تقیہ کی اس حالت میں شیعہ احکام کو جاری کرتے اور خفیہ طور پر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔

جب اکبر بادشاہ نے وفات پائی اور جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا تو قاضی بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے۔ حتیٰ کہ علماء مخالفین میں سے بعض کو تپا چل گیا کہ وہ شیعہ المذہب ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ قاضی (نور شاہ) کا مذہب شیعہ ہے۔ اپنے فتوؤں میں کسی ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں۔ اور ہر مسئلے کا فتویٰ اس فقہی مذہب کے مطابق دیتا ہے، جو اس معاملے میں مذہب امامیہ کے مطابق ہو۔ بادشاہ نے اس شکایت پر توجہ نہ دی اور کہا اس سے ان کا شیعہ مذہب ثابت نہیں ہوتا، بلکہ شروع ہی سے انھوں نے شرط کر لی تھی کہ مذاہب اربعہ میں سے جس کا تقاضا ان کی رائے ہوگی، اس کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا۔

اب علماء مخالفین اس گھات میں بیٹھے کہ کسی طرح قاضی کی شیعیت ثابت کر کے ان کے قتل کا حکم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو قاضی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کر کے قاضی کی تصانیف حاصل کرے۔ وہ شخص قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیعیت کا مدعی ہوا اور قاضی کی شاگردی اختیار کی۔ جب وقت گزرنے پر اسے جناب قاضی کا اعتبار حاصل ہو گیا اور اسے کتاب مجالس المؤمنین کے متعلق اطلاع ملی تو نہایت کوشش اور التجا سے اس نے وہ کتاب قاضی صاحب مستعار لی۔ اور گھر لے جا کر اس کی ایک نقل تیار کر کے اسے علماء مذکور تک پہنچایا۔ علماء نے اس کتاب کو قاضی نور اللہ کی شیعیت کے ثبوت میں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اور کہا کہ اس رافضی نے ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں اور سزا کا مستحق ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا سزا چاہیے۔ تو علماء نے کہا کہ اتنی تعداد میں درہ خاں دار لگانے چاہئیں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ان لوگوں نے بہ عجلت تمام جناب پر یہ ظلم شروع کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت اگر وہ میں ہوئی اور ان کا مزار بھی اسی جگہ ہے اور وہاں اس کی زیارت سے لوگ سعادت اندوز ہوتے ہیں۔ (ترجمہ از نجوم السما ص ۱۵-۱۶)

نجوم السما جس سے ہم نے یہ اندراج نقل کیا ہے۔ شیعہ علماء کی سب سے مستند تاریخ ہے اور معاصرانہ حالات کے لیے پورے اعتماد کے لائق ہے۔ لیکن یہ روایت کہ قاضی صاحب کو عہد اکبری میں سنی سمجھا جاتا تھا، صحیح نہیں۔ جاننے والے ان کے عقیدے سے بے خبر نہ تھے۔ لیکن ایک تو اکبر کے سامنے شیعہ سنی اختلافات کی کوئی

لہ لیکن یہ صحیح ہے کہ آپ مجالس المؤمنین کو مخالفوں اور نااہلوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتاب میں جا بجا تقیہ کو شیعہ مذہب کی تردید کے لیے مقرر کیا ہے اور آخر کتاب میں صاف لکھا ہے کہ حکومت صفویہ کی اور اس دولت رفاہیوں کی پشت پناہی نے تقیہ سے پیوند اور قدم قلم کے "سند" دور کر دیے ہیں، لیکن کتاب کے اختتام تک حالت بدل چکی تھی۔ خاتمہ میں اوقات جلال کا ذکر ہے اور [باقی اگلے صفحے پر]

اہمیت نہ تھی۔ دوسرے قاضی صاحب کی علمیت، منصف مزاجی اور مستعدی اعلیٰ درجے کی تھی کہ مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ بدایونی جس نے بعض شیعہ علماء کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گندگی اچھالی ہے کہ تہذیب و متانت کو بھی نظر انداز کر دیا، قاضی صاحب کا بڑا انداز تھا۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ قاضی صاحب شیعہ مذہب کے تھے، ان کی نسبت لکھتا ہے:-

قاضی نور اللہ شوتری اگرچہ شیعہ مذہب است۔ اما بسیار بہ صفت نصفت عدالت و نیک نفسی و حیاء تقویٰ و عفاف و احسان اشرف موصوف است و بہ علم و حلم و جودت فہم و جدت طبع و صفائے قریح و ذکا مشہور است۔ صاحب تصنیف لائقہ است توجیح بر تفسیر مہمل شیخ فیضی نوشتہ کہ از حیز تعریف و توصیف بیرون است۔ و طبع نظم و اشعار و نقیض می گوید۔ بوسیلہ حکیم ابوالفتح بملازمت شاہی پیوست۔ در زمانیکہ مکتوب منصور بہ لاہور رسید و شیخ معین قاضی لاہور را در وقت ملازمت از ضعف پیری و فتور قوی سقطہ در دربار واقع شدہ۔ رحم بر ضعف او آوردہ فرمودند کہ شیخ از کار بان بنابر ان قاضی نور اللہ بآں عہدہ منسوب گردید۔

الحق کہ مفتیان مامی و محتسبان بد نفس لاہور کہ بحکم الملکوت سبق می دہند۔ خوش بہ ضبط در آوردہ و راہ رشوت را بر ایشان بستر۔ و در پوست پستہ گنجائیدہ۔ چنانچہ فوق آن متصور نیست و می توان گفت کہ قائل بایں بیت او را منظور داشتہ و گفتہ:-

قوی آگس کہ نکر دی بہ ہمہ عمر قبول

در قضا بیک ز کس غیر شہادت ز گواہ

قاضی نور اللہ صاحب شوتری ۱۲۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے بزرگوں سے

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۷۷)

بالخصوص لکھا ہے۔ ”دیگر آگے اس کتاب را از مخالفان و سائر نا اہلن مستور دارند کہ مبادا از اخبار احوال بلا و شیعمہ و طوائف ایشان اطلاع یافتہ، با حاد ایں فرقہ و محکمہ کہ در دیار اغیار واقع شوند از ایسے سرائند یا تعرض بہ مزاحبت اسلاف ایشان نمایند۔“

اور پھر مشہد میں تعلیم پائی ۱۲۸۵ء میں ہندوستان آئے اور تریسٹھ برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ جہانگیر کو سب سے زیادہ طیش اس بات پر آیا کہ قاضی صاحب نے حضرت خواجہ ابھیریؒ کی نسبت (جن کے اکبر اور جہانگیر بڑے معتقد تھے) درشت الفاظ کہے۔ اور ان سے ایک رسالہ بھی منسوب کیا گیا، جس میں شیخ سلیم چشتی کی نسبت (جن کے نام پر بادشاہ کا نام سلیم رکھا گیا تھا) قرم ساق پد رنگ نا تحقیق لکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو تازہ اردو سوانح عمری موسومہ صحیفہ نور مولفہ سید صغیر حسین زیدی)۔

قاضی صاحب کی شہادت ۱۲۸۵ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ اس کے ڈیڑھ پونے دو سو سال بعد جب شمالی ہندوستان میں شیعیت کو فروغ ہوا تو ۱۲۸۵ء میں ان کی قبر پر ایک روضہ تعمیر ہوا۔ جس کے گرد ایک خوشنما باغ بھی لگایا گیا۔ یہ باغ تو اب ویران ہو گیا ہے، لیکن مزار کی زیارت کے لیے اب بھی معتقد آتے ہیں اور حضرات شیعہ قاضی صاحب کو شہید ثالث کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کی متعدد تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ ان میں مجالس المؤمنین اور احقاق الحق چھپ چکی ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب میں حکمت اشاعرہ کا اچھا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ لیکن آپ کا اصل شاہکار مجالس المؤمنین ہے۔ یہ کتاب شیعہ زعماء کا ایک مبسوط تبصرہ ہے۔ اور شیعہ مذہب کی تاریخ میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں ان امنگوں اور وصلوں کا پر جوش اظہار ہے جو شیعہ صنفی حکومت کے قیام سے جزیلہ شیعوں میں پیدا ہوئے۔ تصنیف کتاب کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی کہ صنفی حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے اب تقیہ کی ضرورت نہیں رہی اور یہ ملاحان میں آنا چاہیے۔ شد آنکہ اہل نظر بر کنارہ سے فتنہ ہزار گونہ سخن در زبان و لب خاموش بہ صوت چنگ گوئیم بس حکایت کہ نہ منتحق آں دیگ سینہ می زد جوش

سات سال بعد وہیں علوم باطن حاصل کیے اور ریاضات شاقہ اختیار کیں اسلام شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں یہ صورت پیش آئی۔ چنانچہ اب پھر سمندر کے راستے مکہ معظمہ چلے گئے۔ چند سال وہاں بسر کیے۔ عہد اکبری میں پھر ہندوستان آئے اور سرہند میں اقامت اختیار کی۔ اس دوران میں اکتب کے مزید مطالعہ اور تحقیق کے بعد امد و ریت سے توبہ کی۔ علماء کا طریقہ اختیار کیا اور متاہل ہو گئے۔ انھوں نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ جن میں نوادر افغانی اور مرآۃ الصفا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

شیخ احمد سون قدس سرہ | ایک اور قابل ذکر بزرگ ہستی سید احمد سون کی تھی، جس کے حالات زندگی میں حضرت مجدد الف ثانی سے اس طرح تطابق ہے کہ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ شاید معتقدوں نے بعض حالات کو واقعات مجددیہ سے مستعار لیا ہے۔ لیکن گلزار ابرار اور مخزن افغانی کے مصنف دونوں سید احمد سون کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے اور دونوں نے ان کے حالات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں جن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

شیخ احمد سون کے والد شیخ محمد بن الیاس سون غرغشتی تھے جو بھجواڑ (علاقہ پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ والد کی وفات پر ۹۳۵ھ میں شیخ احمد سجادہ نشین ہوئے۔ انھوں نے تعلیم اپنے والد اور شیخ الہ داد لاہوری سے حاصل کی تھی۔ جب جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی تو اگرچہ یہ بغاوت جلد فرو کر دی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پنجاب میں خاصی ہچل پیدا ہو گئی۔ ایک تو تاج مغلیہ کا "اقبال اکبری" سے محروم ہو جانا ہی معمولی بات نہ تھا، دوسرے جانشینی کے جھگڑے۔ باپ بیٹے کی کشمکش۔ چنانچہ محفل شاہی میں بھی سیاسی انقلابات پر تبصرے ہو کر تے تھے۔ گلزار ابرار کے مطابق "اس فتنہ انگیز سال میں ہر ایک تقریب سے شہنشاہ کی محفل میں باوجود کمال ارزانی کے اس قسم کی گفتگو کاٹخ بڑھ گیا تھا" ایک روز ایک ندیم نے سادات صفویہ کا ذکر کیا، جنھوں نے

ابتدا تو مشائخ اور مذہبی سرگرمیوں کے طور پر کی تھی، لیکن بالآخر تخت ایران پر قابض ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک اور شخص بول اٹھا کہ اس زمانے میں بھی چند ویش صورت اشخاص ایسے ہیں جن کے حلقہ گوش معتقدین ایک ولایت کی فوج سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے بزرگ ترین سید احمد افغان ہیں جو بھجواڑ کے اطراف میں رہنے والے افغانوں کی شورش کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور تمام جماعت میں سے کوئی ان کے فرمان سے سرتابی نہیں کرتا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں دربار میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں بلائے گئے، لیکن دربار میں حاضر ہونے پر انھوں نے سجدہ دربار کرنے سے انکار کر دیا۔ گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار میں تو اتنا ہی لکھا ہے کہ "آپ شاہی حضور میں پہنچے تو ملازمت شاہی کے آداب بجا نہیں لائے۔" لیکن مخزن افغانی میں مراحات ہے۔

دور دروز ملاقات سجدہ تکریم و تحريم کہ در سلسلہ پیغمبر متعافت است۔ بجا نیاوردہ۔
بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دیوانہ کو چند روز قلعہ گوالیار کے اوبستان میں محفوظ رکھو۔
تھے کہ حسن سلوک کے گلوبند میں اپنی گردن دنیا گوارا کرے۔ (اذکار ابرار)
شیخ احمد سون مین سال تک گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ نہایت کشادہ پیشانی سے یہ وقت عبادت الہی میں گزارا اور بڑے مراتب علی حاصل کیے۔ اتفاق سے ۱۰۱۱ھ میں خان جہاں لودھی (پیر خاں ابن دولت خاں لودھی) کو صوبہ خاندیش دکن کی حکومت سپرد ہوئی۔ جب دکن کو جاتے ہوئے وہ گوالیار پہنچا (اور شیخ احمد کے حالات سے آگاہ ہوا) تو اس نے حضور شاہی میں عرضی بھیجی کہ شیخ کو اس مہم میں میرے ہمراہ کر دیا جائے۔ جہانگیر نے خان جہاں کے پاس خاطر سے یہ التماس قبول کر لی چنانچہ شیخ احمد سون خان جہاں کے ساتھ دو سال دکن میں رہے۔ مخزن افغانی میں لکھا ہے کہ لڑائی کے وقت ان کی بڑی کوشش ہوتی کہ سبکے پیش پیش رہیں۔ جو بڑی قید کے وقت ان کے پاؤں میں تھیں انھیں تمام عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھتے۔ رات کو انھیں اپنے سر پر رکھ کر سواتے اور فرماتے کہ یہ بڑیاں میرے لیے

مرشد راہ حقیقت ہیں اور میں نے ان سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں۔

جب خان جہاں خاندیش سے آگرہ واپس جانے لگا۔ تو آپ بھی ساتھ تھے اور تین نومبر ۱۱۱۱ھ کو جب آپ اٹنا سے سفر میں مانڈو پہنچے تو گلزار ابرار کے مصنف غوثی مندوی نے آپ سے ملاقات کی۔ اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان صوفیانہ رموز پر باتیں ہوئیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کی طرح شیخ احمد سون بھی تصوف میں شیخ علاء الدین سمنانی کے بخیال تھے جنہوں نے شیخ ابن العربی پر اعتراضات کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں لودھی کو بھی صوفیانہ مسائل سے دلچسپی تھی۔ ایک روز وہ شیخ احمد کی خدمت میں شیخ علاء الدین سمنانی کی کتاب چل مجلس لے کر پہنچا۔ جس میں شیخ ابن العربی کا ایک متشابہ قول درج تھا۔ خان جہاں نے اس کی تشریح چاہی۔ شیخ نے اس مقصد کے لیے مسیح القلوب کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں ابن العربی کے بیان کی اس طرح تاویل و تعبیر کی کہ وہ شریعت اور عقل سمجھ کے قریب آجائے۔ اس مسئلے پر غوثی کے مرشد شیخ عیسیٰ سندھی بڑا پوری سے آپ کی بحث بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ غوثی نے اس کا خلاصہ آپ کی زبان سے سن کر گلزار ابرار میں درج کیا ہے۔ بالآخر آپ اپنے رخصت لے کر اپنے وطن مالوت تشریف لے گئے۔

مخزن افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو سید احمد سون کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک روز آپ کے والد کو خواب میں حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ تمہارا بیٹا شیخ احمد میرے فرزندوں میں داخل ہے۔ اسے سید احمد کہنا۔ شیخ احمد ہرگز نہ کہنا۔ چنانچہ اس کے بعد ان کا لقب سید احمد ہوا۔

مخزن افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں جذبہ کی حالت میں رہتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مست و خراماں جنگلی میں چلے جاتے اور کئی کئی روز جنگل میں گھومتے رہتے اور جنگلی جانوروں کی آواز سے رقص و جذبہ کی حالت میں آجاتے۔ آپ کی درگاہ کے افغان خادم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھر مکان پر لے آتے، لیکن

آپ کے مکان کے متعلق مخزن کا بیان ملاحظہ ہو۔ محلات ایشاں بہ خٹل محل بادشاہ بود کہ تمام در و دیوار و سقف را مخمل و زربفت پوشیدہ بود۔ و تخت ہلے دیوار از چوب صندل بود و چوکیہ از صندل۔ و از چوب اگر دریاں مکان نصب کردہ بودند و از پچپاے کلیمہاے نفیس دریاں بساط ہمیشہ موجود و طیار می بودند و خوشبوے غیر مکرر کہ لائق حال بادشاہاں باشد دریاں جا خراج می شد۔ غالباً آپ کے خلاف دربار شاہی میں جو شکائتیں ہوئیں، ان کا ایک باعث آپ کے ڈیرے کا یہ شاہانہ ٹھاٹھ تھا۔ جسے آپ کے معتقدوں نے قائم کر رکھا تھا۔

آپ کی نسبت اویسی تھی۔ کسی خاص خانوادے سے منسلک نہ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اولیاء کے عام تذکروں میں آپ کے حالات بہت تھوڑے ہیں۔ طبقات شاہجہانی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۱۲۶ھ یعنی ۱۷۱۶ء لکھی ہے۔ مخزن افغانی سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی وفات اسی برس سے زیادہ کی عمر میں ہوئی۔ اور بجوارہ کے قریب اپنے گاؤں میں دفن ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

معلوم ہوتا ہے کہ شاہانہ تزک و احتشام برقرار رکھنے کا طریقہ اس زمانے کے مشائخ میں عام تھا۔ مثلاً مخزن افغانی میں ایک اور افغان بزرگ شیخ متقی کاشی کا ذکر ہے جو اب قصبہ کٹھالہ (نزد گجرات) صوبہ پنجاب میں آرام فرما ہیں۔ وہ خود تو بیشتر روزہ سے رہتے اور راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتے، لیکن باورچی خانہ ہمیشہ گرم اور لنگر ہمیشہ جاری رہتا۔ جہاں ایک سے دس ہزار مہمان امیر اور غریب خواتین اور امرار جوگی اور ملنگ کھانا کھاتے تھے۔ و مہمان خانہ ایشاں بہ نے سے مکلف بود۔ کہ محفل ایں دنیا ہرگز بایں لطافت و ظرافت آراستہ و پیراستہ نمی باشد۔ سقف و جدار و ستون باہمہ موافق یک دیگر بطرز درخش بہ مخمل و مشجر و زرگرمہ بودند و فرش آل کلیمہ و قالین ہا و لایتی قیمتی۔ و ذوق چھپاے اعلیٰ گراں بہا و سایہ بان ہلے بادشاہانہ کشیدہ۔ تکلیف ہلے بسیار بالطافت و نظافت و لینگہاے نقرہ و جامہ خواہا

ظریف برآں گسترہ و تخت پوش با و صندلی با سے اعلیٰ خاتم بند محاذی آں نہادہ کہ چشم فلک ندیدہ و گوش سموات نشنیدہ ہمیشہ شب و مہیا بود۔

قصور کے افغان مشائخ | افغان مشائخ کے جس مرکز کے متعلق سب سے زیادہ معلومات ملتی ہیں، وہ ضلع لاہور کا شہر قصور ہے۔

اس کے متعلق فارسی میں ایک مستقل کتاب شیخ عبد القادر خوشکی نے اخبار الاولیا من لسان الاصغیا کے نام سے لکھی۔ جس میں عام افغان مشائخ اور ان کے نسب نسب کے متعلق بھی طویل اندراجات ہیں، لیکن کتاب کا جزو غالب خوشکی افغانوں اور مشائخ قصور کے متعلق ہے۔ اس کتاب کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے اور پنجاب کے بعض علمی ذخیروں میں بھی اس کی نقل ملتی ہیں۔

ان مشائخ کے مورث اعلیٰ پیر کبار شیخ و تو تھے، جو پشت میں جا کر قدیم بزرگ خواجہ مود و جیتی کے مرید ہوئے۔ ان کی وفات ۱۵۵۷ء میں ہوئی۔ قصور میں اس سلسلے کے پہلے بزرگ شیخ حاجی اویس و تیزی تھے، جنہوں نے ۱۵۹۶ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے مورث اعلیٰ پیر کبار سے اویسی طریقہ سے فیض حاصل کیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔ اکبر کے ہم عصر تھے۔ انہی کے زمانے میں اخوند سعید شوریانی اور شیخ رحمت شوریانی تھے، جو ان کی طرح پیر کبار کی روحانیت سے فیض یاب ہوئے۔ انہوں نے بالترتیب ۱۶۰۹ء اور ۱۶۱۹ء میں وفات پائی۔ اور قصور میں دفن ہوئے۔ دونوں صاحب باطن بزرگ تھے۔

اس سلسلے کے سب سے نامور بزرگ مولانا شیخ احمد شوریانی قصوری تھے، وہ بھی حضرت پیر کبار کی اولاد میں سے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کی کبیل لاہور میں شیخ اسحاق ابن حضرت شاہ کا کو جیتی لاہوری سے کی، جو عہد اکبری میں ملک بگڑیدہ ترین علماء میں سے تھے (ملاحظہ ہو بدایونی کی منتخب التواریخ) شیخ احمد اپنے قبیلہ میں پہلے بزرگ تھے، جنہوں نے کمالات باطنی کے ساتھ علم ظاہری کو جمع کیا۔

زہد و ریاضت میں بھی وہ بے نظیر تھے۔ اور علم و فضل میں بھی ان کا دور دورہ شہرہ تھا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبد الحق محدث اور شیخ عیسیٰ سندھی برہانپوری کے ہم عصر تھے۔ اور تینوں حضرات ان کا بڑا احترام کرتے تھے بلکہ مشہور صوفی بزرگ اور فاضل شیخ عبد اللطیف برہانپوری تو کہا کرتے تھے کہ اپنی عمر میں علماء ظاہر و باطن میں دوری کامل بزرگ دیکھے ہیں۔ ایک شیخ عبد الوہاب مرصعی (۹) دوسرے شیخ احمد شوریانی۔ قصور کے نواح سے اگر کوئی شخص اخذ فیض کے لیے شیخ عبد اللطیف کے پاس برہانپور پہنچتا تو وہ اسے واپس بھیج دیتے۔ کہ قصور میں فیض کا ایسا چشمہ جاری ہے۔ تم وہاں سے اخذ فیض کیوں نہیں کرتے۔ شیخ احمد بڑے فاضل تھے اور ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم میں گزرتا۔ لیکن وہ تصنیف کتب کے حق میں نہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب پہلوں کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہوں تو میں تصنیف و تالیف میں کیوں وقت ضائع کروں۔ ان کی فقط ایک کتاب (سوالات احمدی) کا نام ملتا ہے جو ایک خاص مقصد یعنی ”رد ملاحدہ و زنادقہ“ کے لیے تصنیف کی گئی۔ اور اس مقصد میں بڑی کامیاب ”اکسیر اعظم“ بتائی جاتی ہے۔ شیخ احمد کی وفات ۱۶۲۱ء میں ہوئی۔

اسی خاندان کے ایک اور بزرگ شیخ حاجی گلن شوریانی قصوری تھے۔ ان کی زندگی میں عجیب انقلابات آئے۔ وہ حضرت پیر کبار کی اولاد سے تھے۔ زہد و تقویٰ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ سات حج کیے۔ زہد و اتقا کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت چہرے پر غلب رکھتے۔ تاکہ نظر کسی محرم پر نہ پڑ جائے۔ لیکن طبیعت کو اطمینان نہ تھا۔ کسی اولیاء کبار کی خدمت میں پہنچے۔ لیکن انشراح قلب میسر نہ ہوا۔ جب ساتویں مرتبہ حج کو گئے اور رو رو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی دعا کی تو اشارہ ہوا کہ تمھاری مشکلات کا حل شیخ عیسیٰ مشوانی سے ہوگا۔ چنانچہ واپسی پر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا طریقہ ملا متیہ تھا۔ اکثر شراب کے نشے میں پھر رہتے تھے۔ حاجی گلن نے یہ حال دیکھا تو واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ لیکن شیخ نے بلایا کہ اتنے بزرگوں کے پاس پہنچے ہو

اور تمھارا کام نہیں بنا۔ تمھاری مشکل میں حل کر سکتا ہوں۔ حاجی نے تسلیم ختم کیا۔
اور اب یہ حال ہوا۔

بہ مئے سجادہ رنگیں گن گرت پیرمغاں گوید

کہ سالک بے خبر بود ذراہ در رسم منزلہا

پیر کی صحبت میں انھوں نے بھی علامتی طریقہ اختیار کیا۔ زہد و تقویٰ اور پابندی شریعہ کو سلام کہا۔ چار ابرو کا صفایا کیا اور لباس میں فقط ستر عورت پر اکتفا کی۔ ہر وقت آگ روشن رکھتے۔ اگر کوئی چیز لاتا تو اسے بھی آگ میں ڈال دیتے۔ ان کی وفات ۱۲۲۷ء میں ہوئی۔

قصور کے ایک اور بزرگ شیخ بایزید تک زنی تھے جنھوں نے حضرت پیر کیار کے خلیفہ شیخ تک کی روحانیت سے فیض حاصل کیا۔ وہ اپنے بھائیوں سے کسی بات پر خفا ہو کر خورجہ چلے گئے۔ اور وہاں مرجع خلافت ہوئے۔ ان کی وفات ۱۲۲۶ء میں ہوئی۔ ان کے علاوہ شیخ الہ داد و تونزی اور شیخ پھوگی افغان بھی قصور کے افغان مشائخ میں سے تھے۔ ان کی وفات بالترتیب ۱۲۳۹ء اور ۱۲۵۹ء میں ہوئی۔

خوشگی شوربانی مشائخ سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معرفت حقیقت اور اشاعت علم و فضل کے علاوہ انھوں ادبی خدمات بھی کیں اور ان میں جاہ و جلال والے حضرات بھی ہوئے۔ جن میں مبارز الدولہ پیر ابراہیم خاں خوشگی قصویٰ خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اخوند بابا درویش پشاور کی قدس سرہ

افغانوں کی مذہبی تاریخ میں سب سے اہم اور دلچسپ باب حضرت پیر بابا ان ہستیوں کا تذکرہ ہے۔ جنھوں نے افغان علاقے میں ارشاد و ہدایت اور صحیح اسلامی تعلیم کو وسعت دی۔ ان میں حضرت سید علی غواص المعروف

حضرت پیر بابا کو بلحاظ قدامت اور بزرگی خاص مرتبہ حاصل ہے۔ وہ مساوات برادری میں سے تھے۔ جائے پیدائش قندس۔ ان کے دادا اہل باطن میں سے تھے، لیکن والد نے ہمالیوں کے لشکر میں منصب لے لیا تھا۔ وہ والد کے ساتھ ہندوستان آئے۔ لیکن ان پر فقیری رنگ غالب رہا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے پانی پت، اجمیر وغیرہ کا سفر کیا۔ خرقہ خلافت انھیں طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے شیخ سید سالار سے ملا۔ اور مرشد نے ہدایت کی کہ کوہستان کو اپنے کام کا مرکز بناؤ۔ ان کے دو گلیانی محنتوں نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ افغان علاقہ میں مقیم ہوں۔

اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی، اس کا بیان اخوند درویش نے حضرت پیر بابا کی زبانی بڑے دردناک طریقے سے بیان کیا ہے۔

”یعنی اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل، ہر وقت دین کی طلب و تلاش کرنے والے اور خدا طلب پایا۔ جوان بڑھوں سے زیادہ دین میں استوار، عورتیں مردوں سے زیادہ دین پر مضبوط، بچے بچپن ہی میں دین طلب کرنے والے اور تلاش کرنے والے اور ان کے ملازم بھی شریعت پر عامل پاتا ہوں۔ ان میں قبولیت حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر اس علاقے کے لوگوں میں نہ درس تھا نہ مدرسہ۔ نہ علم تھا اور نہ ہی علماء، اقیاء اس لیے شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور ایسے پیروں نے جو کہ مشائخ بھی نہیں رکھتے تھے ان لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راستے پر ڈال دیا۔“ (ترجمہ)

آپ نے اس علاقے میں قیام اور اس صورت حال کی اصلاح کا تہیہ کیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو بڑا قبول حاصل ہوا۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور بے شریع پیر کے متعلق اطلاع پاتے۔ جا کر اس سے بحث مباحثہ کرتے۔ چنانچہ تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے کئی مدعیان مذہب کے نام ہیں۔ آپ کے سب سے اہم معرکے فرقہ روشنیہ کے راہنما پیر روشن سے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مساعی کو بڑی کامیابی دی۔

چنانچہ حضرت پیر بابا نے بڑے ذوق و شوق سے افغان علاقے میں صحیح اسلام کی اشاعت شروع کی۔ ایک خلق کثیر آپ سے فیض یاب ہوئی۔ اور سب بڑھ کر یہ کہ اخوند درویشہ اور ان کے صاحبزادے شیخ عبدالکریم ان کے مرید ہوئے۔ انھوں نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں سید علی خواص کی بڑی تعریف کی ہے اور محدثین کے خلاف ان کی کوششوں کو بڑا سراہا ہے۔ پیر بابا کی وفات ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۳ء) میں ہوئی۔ مزار مبارک بونیر اور سوات کی سرحد پر ایک نہایت پرفضا مقام میں ہے۔ اور یوسف زئی علاقے کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

اخوند بابا درویشہ پشاور کی قدس | حضرت پیر بابا کے سب سے نامور مرید مولانا اخوند درویشہ پشاور کی قدس سرہ تھے۔ دیورئی نے نے جو پشتو ادبیات کا بڑا ماہر تھا، اس رائے کی تائید کی ہے کہ افغانوں میں سب سے مشہور عالم اور سب سے محترم بزرگ وہی ہیں۔ افغان علاقے میں وہ اخوند بابا یا اخوند بابا کے عرف سے مشہور ہیں۔ وہ علوم ظاہر اور کمالات باطنی کے جامع تھے خزانہ الاصفیاء میں لکھا ہے: "جمالی ولایت خود را در پردہ تدریس و تعلیم و ملائی پوشیدہ می داشت" ان کے مزار پر تو عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے کمالات باطنی اور تصرفات معنوی کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن تاریخ میں ان کا بلند مرتبہ ان کے علمی کارناموں کی بدولت ہے۔ ان کا سب سے بڑا کام فرقہ و تشفیہ کے خیالات کی کامیاب مخالفت ہے جو اگر نہ کی جاتی تو افغانوں، بالخصوص ان کے مشرقی قبائل میں ایک خود ساختہ قسم کا مذہبی نظام ہمیشہ کے لیے مسلط ہو جاتا اور یہ غیر قوم جواب مذہبی حمت میں سب آگے اور اسلام کی پشت پناہ ہے۔ عامۃ المسلمین کی جماعت سے کٹ جاتی۔ اخوند درویشہ ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں اور ان کے مریدوں نے نہ صرف علوم اسلامی کو عام کرنے کے لیے پشتو میں قابل اعتماد کتابیں لکھیں بلکہ روشنی طریقت کی مباحثہ و مناظرہ سے بھی پوری طرح مخالفت کی۔ اخوند درویشہ نے بایزید کا نام جسے اس کے معتقد پیر دشمن کہتے تھے، پیر تاریک رکھا۔ اور اس کے معتقدوں سے بجا جاکے منظرے

کیے۔ خزانہ الاصفیاء میں اخوند کی نسبت لکھا ہے:-

"دردخ زنادقہ و ملاحظہ در نفس بسیاری کو شید و ہر جا کہ ملحدے یا رافضی تھیں

نزد اور سیدے و باوند اگرہ کر دے و اور ملزم ساختے :-

اخوند درویشہ صاحب کے بزرگ علاقہ ننگر ہار (موجودہ جلال آباد مشرقی افغانستان) میں مقیم تھے۔ جب ان کے دادا متعلوں اور یوسف زئیوں کی کشمکش میں شہید ہو گئے تو یہ خاندان مہندوں کے علاقے میں منتقل ہو گیا جہاں اخوند صاحب کی پرورش ہوئی۔ انھیں شروع سے زہد و ریاضت کا شوق تھا۔ لیکن آپ نے علوم ظاہری کو بھی پورے انہماک سے حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا مصر احمد اور مولانا جمال الدین ہندوستانی کا نام لیا جاتا ہے۔ مولانا ذکر کے پاس آپ سات برس رہے۔ لیکن آپ کی طبیعت کو تسکین حضرت پیر بابا کی خدمت میں پہنچنے کے بعد ہوئی۔

"دفع زنادقہ و ملاحظہ" کا سبق آپ نے اپنے مرشد سے حاصل کیا تھا۔ جب میاں بایزید نے ہشت نگر میں اقامت اختیار کی تو اس کے خیالات کی اصلاح کے لیے حضرت پیر بابا وہاں پہنچے۔ اخوند درویشہ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پھر اخوند صاحب علحدہ بھی جانے لگے اور بحث و مباحثہ کرتے۔ وہ مخزن الاسلام میں لکھتے ہیں:-

چوں حضرت پیر دستگیر این فقیر شمع المشرق والادب سبب المثلت سید علی

ترندی در میانان افغانان یوسف زئی در موضع بونیر بودہ از بایزید خبر یافتد دفع

دعوئے اور بر خود فرض دید۔ پس این فقیر ہم ہمراہ بر فتم اور ادعائے خجل و شرم سازم کہ

سخن گفتن و دم زدن در حضور نقانست۔ تا لقب اور پیر تاریک کروم و ہذا بکرات و مرآت

گاہے با حضرت پیر و فیلد گاہی دگاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و این ملحد را خجل سازم۔

لیکن اخوند درویشہ کو پوری کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ایک تو علاقے میں صحیح اسلامی حکومت نہ تھی کہ رفع شر کا انتظام ہوتا۔ دوسرے علوم اسلامی کی اس علاقے میں انتہائی کمی تھی۔ اخوند صاحب لکھتے ہیں کہ اگر ناواقف افغانوں میں سے ایک کو

سے تذکرہ علماء و مشائخ سرحد (از مولانا محمد امیر شاہ قادری پشاور) ص ۲۹

منع کرتا تو دوسرا میاں بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اخوند صاحب نے اندازہ لگایا کہ مسئلے کا اصل حل علوم اسلامی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کثرت سے پشتو اور فارسی میں کتابیں مرتب کیں۔ اپنی پشتو تصانیف کی نسبت اخوند صاحب لکھتے ہیں:-

افغانان چوں در طلب مولیٰ محبت تمام دارند و دین را جوایاں اند اما بہ سبب نادانی و جاہلی کہ از علوم دینی محروم اند۔ حق را از باطل نمی دانند۔۔۔ پس این فقیری خواہد کہ متن عقائد بلفظ افغانی بیارد۔ تا ہر کہ آن را دریابد۔ و باوردار دہرگز گمراہ نگردد۔

اس سلسلے میں آپ کی سب سے مشہور پشتو تالیف مخزن الاسلام ہے جس میں عقائد و عبادات کے اہم مسائل مشہور عربی و فارسی کتب سے اخذ کر کے درج کیے ہیں اور اس امر پر زور دیا ہے کہ جو کوئی سنت نبوی پر نہ چلے۔ اور علم تفسیر و حدیث و فقہ سے آگاہ نہ ہو اُسے پیرو پیشوا ہرگز نہ بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویش صاحب کا اپنا لکھا ہوا اور احکام شریعت کا تمام تذکرہ ان کے اپنے قلم سے ہے، لیکن ان کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم نے بھی دو باب حقائق و معارف کے متعلق شامل کتاب کیے ہیں۔ اخوند درویش صاحب نے بھی اس امر کا قوی احساس تھا کہ میاں بایزید کی بے راہ روی طریقت کی غلط ترجمانی اور شریعت پر طریقت کی ترجیح سے پیدا ہوئی ("دریں ایام ہر کہ از افغانان در بلائے در آمدہ است۔ از پیری و مریدی در آمدہ است") اس لیے انھوں نے مرقہ پیری مریدی اور طرق تصوف کی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔ مخزن الاسلام میں بھی یہ کوشش مسلسل نظر آتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی سب سے جامع اور مشہور کتاب ارشاد الطالبین فارسی میں لکھی گئی۔ اس کے شروع میں یہ عاشق اسلام اپنے درد دل کا اظہار یوں کرتا ہے:-

"ابا بعد یکے از مریدان مکتبہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین و ارباب علوم انبیاء و المرسلین شیخ علی ترمذی یعنی اصف عباد اللہ الباری بھی گوید کہ۔۔۔ چون انواع اہل الحاد تغلب نمودہ اند۔ پس۔۔۔ معتقدان و معتمدان مذہب سنت و جماعت

بل عالمان و عاتلان مشرب شریعت را غریب انرا دیدم۔۔۔ از شدت تعصب دینی روز بروز در سوز و گداز در آمدم۔ اما از روی تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرق امت بہ ہفتاد و سہ گروہ چرمی باشد؛ جز ہر شیخ و مفت مردودہ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم نیز کہ تمامی افعال و اقوال و احوال شیوخ این ایام را مخالف قرآن و حدیث و مخالف روایا آئمہ و مخالف حالات شیوخ سلف دیدم۔

اخوند درویش کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصل باعث یہ شیوخ و مفت مردودہ، مبتدعہ یعنی مشلخ و اکابر کے دعوے اور بدعتی طور طریقے تھے۔ اور ان کا علاج قرآن و حدیث اور آئمہ و شیوخ سلف کی پیروی تھا، جس پر سب اتفاق کر سکتے تھے۔ اخوند صاحب نے روحانی مطلق العنانی کی سخت مخالفت کی۔ ان کی تصانیف میں یہ شعر جو میاں بایزید پر بظاہر صادق آتا ہے بار بار درج ہوا ہے۔

خیالات نادان خلوت گزین ہم بر زند عاقبت کفر و دین
افغان عوام کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے اخوند صاحب نے وسیع علم پر زور دیا۔ خود اس کے لیے بڑی جدوجہد کی اور علم کی قدر و قیمت منوانے کی بڑی کوشش کی۔ انھوں نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی، جو علم کو "حجابِ ابر" کہتے تھے۔ اور کہا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نبی کریم کیوں ربِّ ذی جلال کا نعرہ لگاتے۔

مخزن الاسلام اور ارشاد الطالبین کئی بار چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اخوند بابا کی اور کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً ملقین المریدین، تذکرۃ الابرار و الاشرار و مرتبہ چھپی ہے۔ اخوند درویش شاعر بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ان کے پشتو اشعار آجاتے ہیں۔ اور میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں صبر کی فضیلت پر ان کی ایک پشتو مثنوی درج کی ہے۔

اخوند درویش ایک زبردست اہل قلم تھے۔ لیکن ان کا اصل مرتبہ ایک مصلح اور مجدد کا ہے۔ انھوں نے صرف میاں بایزید کی روحانی مطلق العنانی ہی کا اپنی حیثیت اسلامی اور مٹھوس علمی خدمات سے مقابلہ نہیں کیا، بلکہ اسلام کے بنیادی

عقائد کے خلاف انھیں جہاں کہیں بھی کوئی چیز ملتی وہ اس کی مخالفت کرتے اخبار الاولیاء میں روشنیہ فرقہ کے علاوہ ایک اور گروہ کا ذکر ہے جس کی آپ نے مخالفت کی۔ افسوس کہ اخبار الاولیاء کی جو نقل ہماری نظر سے گزری۔ اس میں اس گروہ کا نام ٹھیک طرح سے پڑھا نہیں جاتا۔ غالباً "قذایان" ہے اور ان اسماعیلیوں کے متعلق ہے جو نواح چترال میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اخبار الاولیاء میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس گروہ کے سردار نے آپ کو مسموم تر بوڑ کھلا دیا جس سے آپ کی وفات واقع ہوئی۔

لیکن شاید حضرت اخوند درویش کے اصلاحی جوش کا اس سے بھی زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے پیرو مشد کو جن کا آپ کو آنا احترام تھا، غیر شرعی باتوں پر روکا۔ شیخ علی ترمذی چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ حضرت اخوند صاحب نے اس پر اعتراض کیا۔ شیخ علی نے فرمایا کہ میں کبھی کبھی سماع اس لیے سنتا ہوں کہ اس حالت میں مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاس خاطر سے میں اسے ترک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس کے بعد شیخ علی نے پھر سماع نہیں کیا۔ حضرت اخوند درویش کو احکام شرعی کا بڑا خیال رہتا تھا، لیکن وہ اہل حال درویش بھی تھے۔ اور بسا اوقات اپنی دھن میں ایسے مستغرق ہوتے کہ تن بدن کی ہوش نہ رہتی۔ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک روز ایک عورت سر پر تیل کا بھرا ہوا ٹمکا لیے جا رہی تھی۔ مولانا کو پیاس لگی تھی۔ عورت سے کہنے لگے کہ بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ اس عورت نے حیا اور ادب کے مارے کچھ نہ کہا اور ٹمکا اخوند صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

۱۔ خوشی افغانوں اور نواح قصور کے دوسرے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن ایک طویل باب (جو زیادہ تر مخزن افغانی سے ماخوذ ہے) افغان مشائخ کے متعلق ہے۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

انھوں نے اپنی دھن میں پینا شروع کیا اور ٹمکا خالی کر دیا۔ تب جا کر احساس ہوا۔ اور مزہ نہیں سے پتا چلا کہ پانی نہ تھا۔ تیل تھا!

اخوند صاحب سماع کے خلاف تھے، لیکن چشتیہ سلسلے میں منسلک تھے اور اس سلسلے سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے پہلے (خوشی بزرگوں کے علاوہ) افغانوں میں چشتی تھوڑے تھے۔ زیادہ افغان اہل طریقت کا سلسلہ شیخ بہاء الدین زکریا سروردی سے جا کر ملتا تھا۔ حضرت اخوند درویش اور ان کے مرشد سے افغان علاقے میں چشتیہ سلسلے کو فروغ ہوا اور انھوں نے تلقین المریدین میں بالتفصیل سروردیہ سلسلے پر چشتیہ سلسلے کی فوقیت بیان کی ہے۔

اخوند درویش نے ۱۲۳۸ھ (مطابق ۱۸۲۳ء) میں عہد شاہجہانی میں وفات پائی مزار شریف پشاور میں موضع ہزار خانی کے قریب ہے اور مرجع خلافت ہے۔

اخوند درویش کے والد ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ ادبیات سرحد میں ان کا نام انوں گدا لکھا ہے، لیکن اخوند صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم تو علمی اور باطنی مراتب میں اپنے دادا سے بہت بڑھ گئے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں محقق افغانستان کا خطاب دیا گیا ہے اور مخزن الاسلام کے جواب انھوں نے لکھے ہیں ان سے آپ کا فوق و فوق اور بروہانی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے ظاہری اور باطنی تعلیم پائی۔ پھر ان کی طرح میر سید علی خواص سے خلافت حاصل کی۔ والد کی طرح وہ جامع شریعت و حقیقت تھے۔ اور انھیں کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمہ کا لقب اختیار کیا ہے اور بسا اوقات وہ اسی لقب سے یاد کیے جاتے۔

اخوند کریمہ کی وفات ۱۲۶۱-۶۲ھ (مطابق ۱۸۴۱-۴۲ء) میں ہوئی اور یوسف زئی علاقے میں مدفون ہوئے (خزینۃ الاصفیا)

اخوند درویش اور اخوند کریمہ سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ ان میں ایک برگزیدہ بزرگ شیخ پنج پشاور سی تھے۔ وہ اہل حال درویش تھے۔ لیکن اخوند درویش کے اسلوب خیال کے دوسرے بزرگوں کی طرح لوگوں کو حصول علم کی بڑی ترغیب دیتے۔

ان کے متقدم مدید تھے۔ مولانا جالاک میانہ و شیخ شاہ شاہماں پوری و شیخ علی وغیرہ۔ دہرکہ بہ صحبت او پرست۔ فضیلت از علوم دینی یافت۔ ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار بھی کہتے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے۔ ان کی وفات ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں ہوئی۔ مزار شریف پشاور میں ہے۔

اخوند درویش نے علم و فضل اور معارف و حقائق کی جو شعبیں روشن کیں انھوں نے نام نہاد روشنہ فرقہ کی کہر اور تاریکی کو دور کر دیا۔ افغانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلی۔ اور سرحد میں حقیقی طریقے کی اشاعت سے افغانوں کا روحانی رشتہ باقی قوم سے استوار ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی (جو خود ہلاکابلی تھے) کے خلفا بالخصوص شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد معصوم کے متعدد افغان خلفا تھے، جنھوں نے افغان علاقے میں شریعت کو فروغ دیا۔ شیخ آدم بنوری خود افغان تھے۔ ان کے ایک مشہور خلیفہ شیخ سعدی لاہوری تھے۔ ان کے معتقدین میں سرحد کے کئی مشائخ کبار تھے۔ مثلاً حضرت میاں محمد عیسیٰ صاحب چکنی اور حضرت یحییٰ المصطفیٰ حضرت جی۔ روشنہ فرقہ کے خلاف ان بزرگوں کی کوششیں جس طرح کامیاب ہوئیں۔ اس کا اندازہ مرزا خاں انصاری کے واقعات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے، جو روشنہ فرقہ کے بانی میاں بایزید (پیر روشن یا پیر و خاں) کا پوتا اور پشتو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ ایک زمانے میں وہ کہتا تھا کہ میرے اشعار کی شیرینی پیر و خاں کی برکت سے ہے، لیکن (بقول ریلوئی) ایک زمانہ آیا کہ اس نے روشنہ طریقے کو نظر انداز کر دیا اور ہر اس بات سے تو بہ کی جو اس نے شرع کے خلاف کی تھی یا کہی تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعد کے پشتو نامور شعرا (مثلاً رحمان بابا یا خوشحال خاں خشک) کے کلام میں روشنہ طریقے سے حقیقت کا کوئی سراغ نہیں ملتا بلکہ خوشحال خاں خشک نے تو پیر و خاں اور اس کی کتاب خیر البیان کی مذمت کی۔

اخوند صاحب کی تحریک کا دوسرا فائدہ ادبی تھا۔ انھوں نے اور ان کے مریدوں نے پشتو زبان میں علوم اسلامی کے متعلق کتابیں لکھیں۔ پشتو نظم میں دینی علوم کی اشاعت کی اور پشتو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ادبیات سرحد کے مصنف اخوند درویش اور پیر روشن کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”پیر و خاں کے ساتھ ان کی شدید مخالفت تھی۔ تحریری مناظرے رہتے اور جذبہ مسابقت میں دونوں طرف سے تصنیف و تالیف کی تخلیق ہوئی۔ اس سے اگرچہ مذہبی طور پر اس عہد میں دو بڑے گروہ ظہور میں آکر متصادم ہوئے اور ایک دوسرے کو کافر بتاتے رہے، لیکن اس حقیقت پر پشتو ادب میں تصنیف و تالیف کا ایک گراں قدر مجموعہ چھوڑا، جس نے پشتو کا دامن بھر دیا۔ اور آج پیر و خاں اور اخوند درویش بابا مسیح پشتو ادب کے دو بڑے رکن سمجھے جاتے ہیں۔“

(ادبیات سرحد ص ۱۵۳)

عہدِ شاہجہانی قادر یہ سلسلے کا فروغ

شاہجہاں | حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ستارہ پہلی تہذیب
عہدِ جاگیر میں چمکا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے عہدِ جاگیر کی
کے مذہبی حالات اس زمانے کی مشہور شخصیتوں اور خود بادشاہ کے خیالات کا ذکر کیا ہے
جب جاگیر نے وفات پائی تو شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ ردِ عمل جو
اکبری طریق کار کے خلاف جاگیر کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا تھا اور بھی قوی ہو گیا اور
اسلام اور شعائرِ اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جاگیر کے زمانے میں عام لوگوں
کے لیے درباری سجدہ برقرار تھا۔ شاہجہاں نے اسے موقوف کر دیا۔ وہ شرع کے
مطابق مقدمات فیصل کرنا اور علماء و فضلا کا بھی بڑا قدر دان تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔
بلکہ اگر درباری موزوں کے پرچوش اندراجات پر اعتماد کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ
شاہجہاں کو نہ صرف نیک پابندِ شریعت مسلمانوں بلکہ مجددِ دین ملت میں سے شمار کرنا
چاہیے! بادشاہ نامہ میں لکھا ہے:-

سنتِ سننِ الہی برلں جاری است کہ ہر گاہ کارِ دین رو بہ اندر اس نبرد و شہار
اسلام رخ بہ انطاس۔ بتائید ایزدی یکے از بندگان سعادت اند و مذہبے کار آمد تا
بہ آبیاری مساعی جمیلہ گرد و فتور از راحت اسلام فرو نشاند و بدستگیری دین پروری
و دیانت داری اساس شریعت را مشید گردانند و چوں مسابہ اسلام رو بہ اندام
نہادہ بود و مبنائی شریعت رخ بہ انطاس۔ از بد کار ساز این بادشاہ اسلام نواز کفر
گداز را از نگ آرا سے اقبال گردانید۔ بنیاد اسلام را چنان محکم و مرموص ساخت
کہ تا روز نشور گرد و فتور بر دامن دوام نہ نشیند۔

اکبر اور جاگیر کے مقابلے میں شاہجہاں کو امورِ اسلامی کا زیادہ خیال تھا، لیکن اس
میر نہ سمجھنا چاہیے کہ تمام ملک سے مذہبی بے قاعدگیاں دور ہو گئی تھیں۔ ہم جاگیر کی
نسبت لکھ چکے ہیں کہ اس نے راجپوتوں (کشمیر) کے مسلمان راجپوتوں کی خلافِ اسلام
رہنیں بند کرنی چاہیں لیکن عہدِ شاہجہانی کے واقعات پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ شاہی
احکام کے باوجود یہ بھی بے قاعدگیاں برقرار تھیں۔ بادشاہ نامہ میں ۱۶۳۲ء کے
واقعات میں لکھا ہے:- (ترجمہ)

”اسی دوران میں خدمتِ شاہی میں عرض ہوا کہ علاقہ بھنبہ کے مسلمان اپنی جہات
کی بنا پر ہندو کو بیٹیاں دیتے اور ان سے بیٹیاں لیتے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو ہندو
لڑکی مسلمان سسرال میں مرے وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے
گھر فوت ہو وہ جلادی جائے۔ دربارِ شاہی سے حکم ہوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان
عورت ہو۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو عورت سے اس کا نکاح دوسری بار پڑھا جائے
ورنہ مسلمان عورت کو اس سے جدا کیا جائے۔ چنانچہ جو کوزمیندار جس سے یہ فعل سرزد
اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوا اور راجا دوتندر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔
جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ
نے عرض کیا کہ وہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتیں گھروں میں ڈال رکھی ہیں۔
(خزانہ و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور ان میں سے بعض نے تو مسجدوں پر قبضہ
کر رکھا ہے۔ اس پر شیخ محمد گجراتی کو جو علومِ دینی سے واقف تھا اور نو مسلموں کا دارِ غم
مقرر ہوا تھا، حکم ملا کہ ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالے۔
اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علحدہ علحدہ کرے۔ چنانچہ شیخ نے ستر مسلمان
عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا۔ اور جہاں جہاں مسجدوں پر ہندوؤں نے بجا
تصرف کر لیا تھا۔ تحقیق کے بعد انھیں واکزار کر دیا اور غیر مسلموں سے جو مانہ لینے کے
بعد مسجدوں کو بحال کیا۔“

۱۔ علاقہ آزاد کشمیر میں ہے۔ اور گجرات سے بہت دور نہیں۔

لیکن مذہبی بے قاعدگیاں صرف غیر مسلموں کے متعلق نہ تھیں۔ ملک کے دور دراز حصوں میں مسلمانوں میں بھی عجیب و غریب اعتقادات رواج پا رہے تھے۔ خانی خاں ۱۶۲۹ء کے ضمن میں لکھتا ہے :- (ترجمہ)

”صوبہ کابل کی خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ افغان آئین شرعی کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے بلکہ ایک گائے یا بیل کو ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی صنیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقد و نکاح کے تعلقات ازدواجی شروع کر دیتے ہیں۔ طلاق کے لیے وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ دے دیتے ہیں اور اسے گھر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق ترکے میں داخل ہیں اور میت کے وارث کو حق ہوتا ہے خواہ وہ ان سے نکاح کرے یا کسی کے پاس ہمسریا فروخت کر دے۔ جو بد نصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے اسے یہ لوگ شکارِ حلال سمجھتے ہیں اور اسے بچ کر آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثہ میں سے بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور رابزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔“

اس پر حکم ہوا کہ احکام تورہ و شریعت کے مطابق ان لوگوں کو زبردستی توبہ کی جائے چنانچہ بڑی تاکید کے بعد جس میں کسی دفعہ فساد و بلوے کی نوبت آئی۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں، لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں اور خانی خاں ۵ سال کے بعد لکھتا ہے :- اب بھی ان بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں۔“

خانی خاں نے تو یہ اندراج آج سے تقریباً دو ہائی تین سو سال پہلے لکھا تھا، لیکن عجب نہیں کہ اب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے تو شاید ان بدعتوں کے آثار صرف اسی قوم میں نہیں، بلکہ اسلامی ہندوستان کے بعض اور حصوں میں بھی نظر آجائیں۔ ان ظاہری خرابیوں کے علاوہ ایک گہری بیماری توحید و جود کی کے ذریعے

او پارہی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے عہدِ جاگیر میں لکھا تھا :-
”اکثر اناے اس وقت بعضے بہ تقلید و بعضے مجرد علم و بعضے دیگر بہ علم مترج بہ ذوق و بعضے بہ الحلا و زندہ دست بدامن این توحید و جود و زودہ اند و ہمہ را از حق مے دانند و گردنہاے خود را از رقبہ دشمنی بہ حیلہ مے کشائند و مہنات در احکام شرعیہ مے نمایند و بایں معاملہ خوش وقت و خورسند اند و اتیان ادا امر شرعیہ اگر اعتراف دارند۔ طفیلے میدانند۔ مقصود اصلی و راستے شریعت خیال مے کنند۔
عاشا و کلا نمود باشد سبحانہ من ہذا الاعتقاد السوء“

حضرت مجدد نے جس روحانی بد نظمی کا ذکر کیا تھا وہ عہدِ شاہجہانی میں بڑھ گئی اور جس کے ظہر آئندہ صفحات میں دیکھیں گے نہ صرف مشائخ کے حلقے بلکہ اہل علم کی مجلسیں شاہراہوں کے دربار وحدت الوجود کی صداؤں سے گونج اٹھے۔

حضرت شیخ میاں میر قادری | حضرت شیخ عبدالحق محدث نے ابتدائے سلوک میں آج کے ایک قادری بزرگ سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن تقویٰ و پرہیزگاری اور شریعت کی کشش نے انھیں آہستہ آہستہ ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا جس میں اتباع شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور طبقات شاہجہانی کا مصنف لکھتا ہے کہ انھوں نے خواب میں خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا اشارہ پا کر حضرت خواجہ باقی باللہ سے نقش بند یہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔

جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے، اس کا اثر عہدِ جاگیر میں دور دور پہنچا اور حضرت مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت نے اس زمانے میں نقش بند یہ سلسلے کو بے حد مقبول بنا دیا۔ لیکن ان کی زندگی میں ہی لاہور کے قریب میں ایک ایسا شیخ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا جس کے اثر سے پھر ایک بار قادریہ سلسلہ چمک اٹھا۔ یہ بزرگ شیخ میاں میر تھے، جنھوں نے قادریہ سلسلے کے ہندوستانی مرکز آج سے نہیں بلکہ اس طریقے کی ایک اور شاخ سے فیض حاصل کیا اور جن کو نہ صرف عوام الناس میں

بلکہ علمی اور دینی حلقوں میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ان کے سامنے دوسروں کے چراغ مضمحل ہو گئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد مصوم کے ہم عصر تھے لیکن عہد شاہجہانی کی عام ملکی تاریخیں دیکھیں تو حضرت میر گیسو کے متعلق طویل اندراجات ملیں گے اور خواجہ محمد مصوم کی نسبت کہیں ایک آدھ سطر بلکہ اس زمانے کی بعض مشہور تاریخیں (مثلاً عمل صالح - بادشاہ نامہ - منتخب اللباب) تو خواجہ صاحب کے ذکر سے یکسر عاری ہیں اور اس کی وجہ یہی خیال میں آتی ہے کہ خاص خاص حلقوں سے قطع نظر جو رنگ عہد شاہجہانی میں مقبول تھا وہ قادی تھا۔ نقشبندی نہ تھا اور اس زمانے کے سب سے بااثر شیخ حضرت میاں میر ہی تھے۔

حضرت شیخ میاں میر بالا پیر قدس سرہ کا اصل نام میر محمد تھا۔ وہ سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے جس میں علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کے تھے کہ شفقت پوری سے محروم ہو گئے لیکن علوم دینی آپ نے اچھی طرح حاصل کیے اور آپ کی والدہ ماجدہ نے خود آپ کو سلسلہ قادریہ میں تعلیم دی۔ اس کے بعد علاقہ دنیا سے منہ موڑ کر آپ شیخ حضرت سیوستانی کے مرید ہو گئے جو سہوان کے باہر ایک پہاڑ پر قیام فرماتے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں ریاضت و عبادت اور تلقین و ہدایت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو قافی الشریعہ تھے ہیں اور شرع کی ترویج پر اس قدر زور نہیں دیتے۔ جس قدر عبادت و ریاضت پر آپ عبادت الہی میں اس طرح منہمک رہتے تھے کہ زاویہ خمول سے باہر نہ نکلتے اور چالیس سال تک اہل لاہور کو تپا بھی نہ ہوا کہ اس پائے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے ایسا وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ عمل صالح میں لکھا ہے: "و اکثر عبارات فقرات کی شیخ الموحیدین ابن عربی بخاطر اشتداد صفحہ صفحہ شرح فصوص الحکم حضرت مولوی جاتی رائے بے خواندہ"۔ آپ نے تمام عمر شاوی نہیں کی۔

آپ کی وفات ۱۰۲۵ھ میں ہوئی۔ مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک

گاؤں میں ہے جو اس مزار کی بنا پر میاں میر کہلاتا ہے۔ داراشکوہ جس نے آپ کے آپ کے ممتاز خلفائے تفصیلی حالات سکینۃ الاولیاء میں لکھے ہیں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے مزار کے لیے مسالہ جمع کیا۔ لیکن تعمیر کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضا و قدر نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ مزار کچھ عرصہ نامکمل رہا۔ پھر چند سال بعد اور رنگ زیب خود مزار پر آیا اور اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب ایک شکستہ بارہ دری ہے جس میں داراشکوہ کی رفیق حیات نادرہ کی قبر ہے۔

حضرت میاں میر کو اپنے زمانے میں بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ جہانگیر ان کی نسبت تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:-

"چوں بزمِ رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویش است ہندی الاصل غایت قاضی و مریض و مبارک نفس صاحب حال در گوشہ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی و از دنیا مستغنی شستہ است۔ بنا بریں خاطر حق طلب بے ملاقات ایشان قرار نگیرد و بدین ایشان رغبت افزد۔ چوں یہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشان نوشتہ: شوق باطن را ظہر را ختم و آن عزیز باوجود کبر و ضعف بدینہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آورد و بدت ممدتہا با ایشان شستہ صحبت مستونی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد غایت غنیمت و عزیزا و جہاں نیازمند از خود برآمد با ایشان صحبت داشت و بسا سخنان بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستہ نیاز سے بگذرانم۔ چوں پایہ ہمت ایشان را ازاں عالی تر یافتم۔ خاطر باطن را این مطلب رخصت نہاد۔ پوست آہو سفید بخت جلسے نماز با ایشان گذرانیدم۔"

اس کے بعد حضرت لاہور واپس چلے گئے۔ لیکن جہانگیر نے ان سے خط و کتابت جاری رکھی اور اس کے دو خط سکینۃ الاولیاء میں نقل ہوئے ہیں۔ شاہجہان بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ وہ دو دفعہ حضرت سے ملا۔ بادشاہ نامہ میں ایک ملاقات کی نسبت لکھا ہے۔ (۲۸ دسمبر ۱۶۳۲ء)

خدیو خدا آگاہ، بکاشانہ رفیع، آشیانہ پیشوا سے ارباب صفوت و صفائے اصحاب
معرفت و تقی۔ قدوہ حق شناسان صافی ضمیر میاں میر کہ پیشتر نیز بقدم سعادت لفظ
مہبط انوار گشتہ بود تشریف فرمود و بگذارش بساد قائل حقائق و خواص معارف
باعث انشراح صدور و انبساط قلب آن زاویہ نشین تجرد گزین گشتند۔
معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہاں آپ کا بڑا قائل ہو گیا تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے۔
حضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحو شیفہ صحبت آن مقتدا ہے اصحاب عرفان
شدند کہ مزید سے برآں متصور نباشد۔ چنانچہ بار بار اطوار محمودہ و احوال ستودہ ایشک
ستودہ می فرمودند کہ از مشائخ متصوفہ این کشور میاں میر را کامل تر یافتہ۔ و
از ایشان گزشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔

داراشکوہ کا بیان ہے کہ میں سال کی عمر میں میں میں طرح بیمار ہوا کہ اطباء میرے علاج
سے عاجز آگئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے گھر گیا اور کہا کہ یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔
معالج اس کا علاج نہیں کر سکے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجیے۔ حضرت نے پانی کا ایک پتالہ
منگوا یا اور اس پر دم کر کے داراشکوہ کو پینے کے لیے دیا۔ داراشکوہ کہتا ہے کہ اسی ہفتے
مجھے صحت ہو گئی اور میری بیماری بالکل جاتی رہی۔

داراشکوہ نے حضرت میاں میر اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی (جو حضرت مجدد کے
مُرید تھے) ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر اور
مجدد یہ طریقہ کے بزرگوں میں اختلاف نمودار ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے وقت بادشاہ بھی
موجود تھا اور حضرت میاں میر اسے خدا تک پہنچنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ اس ضمن میں
انھوں نے کہا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جگلوں میں بھیج
دیتے ہیں تاکہ وہ تنہائی میں یاد الہی کرے۔ اس پر ملا عبدالحکیم نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو
نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔ حضرت میاں میر نے اس کا مناسب جواب دیا۔
لیکن اس اعتراض اور جواب سے بھی خیال ہوتا ہے کہ شرع کی غیر مکمل پابندی کی نسبت
جو اعتراض مجددیوں کو قادریوں پر تھے اور جنھوں نے آگے چل کر داراشکوہ اور عالمگیر

کی مخالفت کو چمکا دیا وہ حضرت میاں میر کے زمانے میں ہی رونما ہو رہے تھے۔

ملاشاہ قادری

داراشکوہ حضرت میاں میر پر فریبتہ تھا اور انھوں نے اس کے
روحانی ذوق و شوق کو ترقی دی، لیکن جس وقت داراشکوہ نے
بیعت کا ارادہ کیا (۱۶۳۹ء) اس وقت حضرت میاں میر وفات پا چکے تھے اور اس نے
بیعت اُن سے نہیں بلکہ اُن کے خلیفہ شاہ محمد المعروف ملاشاہ قادری سے کی جو علاقہ
بدخشاں کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، لیکن ابتدا سے شباب میں ہی کشمیر آگئے اور
وہاں سے لاہور آکر حضرت میاں میر کے مُرید ہوئے۔ چونکہ لاہور کی گرمی آپ کے لئے لڑنا
جسم کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے آپ مُرشد کی اجازت سے موسم گرما میں
کشمیر تشریف لے جاتے، جہاں داراشکوہ اور جہاں آرنے آپ کے لیے دامن کوہ
ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ اور موسم سرما میں (جب تک مُرشد زندہ رہے) لاہور
آجاتے۔ مذکورہ نگار آپ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ حیرانی ہوتی
ہے۔ داراشکوہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ شروع میں آپ نے
سات سال تک عشاء کی نماز کے بعد سے صبح تک جس نفس سے ذکر بھی کیا ہے۔
ایک اور جگہ کہتا ہے۔ (ترجمہ) آپ کی ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اب
(۱۵۵۲ء) تک تیس سال سے کچھ اور آپ نے ایک لفظ اور ایک لمحہ بھی نہیں
نہیں کی۔

ان غیر معمولی ریاضتوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں بڑی کشش اور بات میں
بڑی تاثیر پیدا ہو گئی تھی۔ جن دنوں آپ کشمیر میں تھے وہاں شیعہ سنی اختلافات دُور
پر تھے۔ آپ برسر مجلس چاروں خلفاء کی تعریف کرتے۔ مخالفین بحث و مناظرہ کے لیے
آتے، لیکن آپ اس خوش اسلوبی سے پیش آتے اور آپ کی بات میں اتنی تاثیر تھی
کہ وہ قائل ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ کئی ہزار مخالفت آپ کی وجہ سے اہل سنت ہو گئے۔
تصوف میں آپ کا طریقہ وحدت الوجود کا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم مشرب لوگوں
سے ملنے سے آپ کو احتراز نہ تھا اور بسا اوقات ان پر نیک اثر ڈالتے۔ چنانچہ ایک

کاستھ کی نسبت جو ولی رام کے نام سے مشہور ہوا کہتے ہیں کہ وہ پہلے مغلہ حکومت کے تابع ایک برہمن اقتدار امیر تھا۔ داراشکوہ اور ملاشاہ کے فیض صحبت سے عشق الہی دامگیر ہوا اور سب جاہ و مال ترک کر کے شیخ ملاشاہ کے ہاتھ پر مرید ہوا۔ بدست مذہب میں اس کی نسبت لکھتا ہے۔ در کشمیر خدمت ملاشاہ بخشی رسیدہ کامیاب شناخت گشت و بمقتضائے الصوفی لاندہب نہ بقید ایچ دین و آئین باز نہ بستہ۔ بابت بیت خانہ آشناست و از مسجد بریگانہ نیست۔ اسی کتاب میں ولی رام کے بعض شعر درج ہیں۔

مانہ آن خودیم، آن توایم
بے نشانی تو مان نشان توایم
ایں نشانہا نشان فاست تواند
منظر جلوہ صفات تواند
پاکی از فکر و از قیاس ما
اے تو پیدا دریں لباس ما
منظر ذات تو ہمہ اشیا
بے تو و ما توئی، و خود تو و ما
ذات تو در صفات تو پیدا
ما ہمہ بیچ، ہرچہ ہست توئی
اے منزہ ز فہم و وہم دوئی
ما ہمہ موج بحر ذات توایم
منظر مجمل صفات توایم

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں ملاشاہ کے کلام سے جو انتخاب دیا ہے اس میں بھی وہی وحدت الوجودی رنگ جھلکتا ہے جو ولی رام کے اشعار میں ہے۔ ملاشاہ کی ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

حرف دیوانگی است در دل ما
چہ زندہ سر و گر از یں گل ما
وز تماشا نش فرضہا ہمہ رفت
چہیت پر سیدن از نوافل ما
روئے او در مقابل مرأت
روئے ما بود در مقابل ما
در رہ عشق آنکہ مارا گشت
غیر ما کس نبود قاتل ما
وصل داد این خبر کہ غیر کے
نیست موصول ما و واصل ما
از سر اتحاد این برخاست
میل ما دوست دوست ما
ما کہ جز حق نہ ایم از عرفاں
پس چہ پرسی ز حق و باطل ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

برویم بسر نزو و لا بد را
رفیقیم تمام رہ بود و شد را
شد تا مطلب مقابل آئینہ دل
دیدیم در آئینہ جمال خود را
ایک اور رباعی ہے۔

آزاکہ بجاست بر سرایاں جنگ
ادمین وزیر ایمان من اور اصدنگ
مومن نشود تا کہ برابر نشود
بابانگ نماز، بانگ ناقوس فرنگ

آخری شعر میں ملاشاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اسی پر داراشکوہ نے عمل کیا اور دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانتیوں کی کتابوں میں حقیقت کی اس طرح تلاش کی کہ گویا وہ اس کے اپنے طریقے کی کتابیں ہیں اور اسلامی تصوف اور ویدانت میں ہم آہنگی ثابت کی۔

بعض دفعہ تو ملاشاہ کی وارستہ گوئی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اعتراض کی زبانیں بے محال کھل جاتیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک شعر لکھا (نقل کفر کفر نباشد)۔

پنجرہ در پنجرہ خدا دارم
من چہ پر وائے مسطخر دارم

اس پر علمائے کشمیر نے ملاشاہ کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے کر شاہجہاں سے استدعا کی کہ وہ اس کے خلاف حد شرعی جاری کیے۔ شاہجہاں نے علماء سے اتفاق کیا اور کشمیر کے گورنر ظفر خاں کے نام فرمان لکھا جاچکا تھا مگر داراشکوہ نے سفارش کی کہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور کسی اور بزرگ مثلاً حضرت میاں میر سے استصواب کیا جائے۔ بادشاہ نے یہ بات قبول کر لی اور حضرت میاں میر سے ملاشاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت میاں میر نے فرمایا کہ احوال کے تابع ملاشاہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جن سے پرہیز واجب ہے، لیکن اُسے ان کی بنا پر قتل کرنا نامناسب اور ناموزوں ہوگا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ملاشاہ کے خلاف قدم نہ اٹھایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں کشمیر آیا تو اس نے ملاشاہ کو بلوایا۔

اور دیر تک اس سے صوفیانہ مسائل کی نسبت گفتگو رہی۔ بادشاہ نامہ میں بحکم جمادی الثانی سن ۱۰۵۰ھ روز سہ شنبہ کے بیان میں لکھا ہے :-

”تاریخ مذکورہ خواص مجتہد توحید ملا شاہ بدخشی کہ میں خلیفہ مصباح سیل ہدایت مصباح ابواب ولایت میاں میر قادری است و در نزہت گاہ کشمیر برسم انزوا بسر ہے بر ذہب طلب بادشاہ در ویش نواز بشف حضور محفل فیض منزل کہ وسیلہ دریافت مآرب دینی و ذریعہ ادراک مطالب معنوی است رسید و بسا نکات بلند دران صحبت فیض منقبت گذارش یافت۔ بادشاہ حق آئہ باقسام لطافت مہربانی آن ایزد پرست را مبسط ساخته مرخص گردانید۔“

اسی سال داراشکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا ملا شاہ کے حلقہ بیعت میں آئے۔ ملا شاہ اپنے شاہی مربی کے ذوق و شوق سے بڑے خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ عزیز قادریہ سلسلہ کو فروغ دے گا۔

کچھ عرصہ بعد حالات نے پٹا لکھایا اور داراشکوہ کو شکست دے کر سن ۱۰۵۸ء میں تخت شاہی پر اورنگ زیب متمکن ہوا۔ اب علمائے پھر ملا شاہ کے خلاف آواز اٹھائی چنانچہ دارالخلافہ سے ملا شاہ کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا، لیکن ملا شاہ ان دنوں کمزور اور بیمار تھا۔ اس لیے کشمیر کے گورنر نے لکھا کہ اس وقت شیخ سفر کے ناقابل ہے۔ بحالی صحت پر حاضر ہوگا۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا اور اس دوران میں ملا شاہ کے مندرجہ ذیل اشعار جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھے تھے اورنگ زیب پہنچے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں :-

صحن دل من چوں گل خورشید شکفت کا مد حق و غمبار باطل رفت
تاریخ جلوس شاہ حق اگر را ظل الحق گفت الحق اس را حق گفت

اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا اور فقط یہی لکھا کہ ملا شاہ بجائے کشمیر کے لاہور میں قیام کرے۔ چنانچہ سن ۱۰۶۰ء کے موسم سرما میں شیخ نے نقل مکان کیا اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اب اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی کچھ اس وجہ سے اور کچھ

نئے حالات کی بنا پر اس نے گوشہ نشینی اختیار کی اور آمد و رفت کا دروازہ خلعت پہلے بند کر دیا۔ فقط چند مخلص معتقد اور مرید گاہے گاہے ملتے اور شیخ ان کے ساتھ اپنے فعلانی تجربات کا بیان کرتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے حاشیہ نشینوں کو شاہی معتقدوں کے خواب ابھی نہ بھولے تھے۔ ایک دفعہ اس کے ایک دوست کابل خاں نے کہا۔ قدیم زمانے میں اورنگ زیب تصوف کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں مثنوی مولانا روم پڑھا کرتا تھا تو وہ بعض بند سُن کر آنسو بہا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ لاہور آئے گا تو آپ سے ملنے کی خواہش کرے گا۔ لیکن شیخ نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ اورنگ زیب کی اور میری ملاقات کبھی نہ ہوگی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ عارضہ بخار میں مبتلا ہوا اور اگرچہ اس وقت صحت ہو گئی، لیکن چند روز بعد مرض کا پھر حملہ ہوا اور سن ۱۰۶۱ء میں ۱۰ اکتوبر کو شیخ نے انتقال کیا۔

اس زمانے کی ایک دلچسپ ہستی سرد ہے جسے اوائل عبدالملکیری میں **سرد سرد** سزاے موت دی گئی۔ مذہبی تاریخ کا ایک دلچسپ موضوع ہونے کے علاوہ وہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بھی ایک باعزت جگہ کا مستحق ہے۔ اس کی رباعیات بڑی پُر لطف ہیں اور جب اُس کے با اثر اور پُر خلوص اشعار کا متاخرین کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جو محنی آفرینی اور نازک خیالی کی بھول بھلیاں میں گرفتار تھے تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ اسے سختی اور ناصر علی سرسندی کی ادبی شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کا مختصر مجموعہ کلام اس زمانے کے دوسرے شعرا کے کلام سے زیادہ شیریں اور صحیح شاعرانہ نقطہ نظر سے زیادہ با وقعت ہے۔

سرد کے حالات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد نے بھی نگارستان فارس میں چند صفحے اس کے لیے وقف رکھے ہیں۔ دونوں نے تذکرہ نگاروں کی کم فوسی کی شکایت کی ہے۔ شمس العلماء آزاد لکھتے ہیں۔ ”نام اس کا کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتا۔“ مولانا آزاد بھی کہتے ہیں۔ ”خانلانی نام کا پتا

نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ بعض تذکرہ نویس میں سرمد کے حالات سعید لائے سرمد کے عنوان سے درج ہیں قیاس کرتے ہیں کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دبستان مذاہب کا اندراج ہر دو مصنفین کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کتاب کا مصنف سرمد کا محاصرہ اور عزیز دوست تھا اور دونوں آزاد خیالوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو شہزادہ داراشکوہ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ دبستان میں سرمد کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج ہیں۔

دبستان میں لکھا ہے کہ سرمد اصل میں یہودی تھا اور یہودیوں کے اس محرز طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جنہیں ربی کہتے ہیں۔ یہودی عقائد اور تورات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا اور ایران کے مشہور فضلاء مثلاً ملا صدرا اور میرزا ابوالقاسم اندرکی کی خدمت میں حاضر ہو کر حکمت و فلسفہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد تجارت کی غرض سے ہندوستان کو روانہ ہوا۔ سندھ کے مشہور مقام ٹھٹھہ میں پہنچا تھا کہ وہاں ابھے چند نام ایک ہندو بچے کو دیکھا اور مال و متاع کے ساتھ سب حکمت و فلسفہ بلکہ عقل و تمیز کھو بیٹھا اور ترک لباس کر کے سنیا سیدوں کی طرح محشوق کے در پر دھونی رانی۔ جب ابھے چند کے والد نے دیکھا کہ سرمد کی محبت پاک اور خیالات جسمانی سے منزہ ہے تو اس نے سرمد اور اپنے بیٹے کے تعلقات میں روٹے نہ اٹکائے۔ ابھے چند نے سرمد سے تورات اور انجیل اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں اور فارسی شعر گوئی بھی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ شعر جو اس زمانے کے رومنائی رجحانات کا آئینہ ہے۔ اسی کا ہے۔

ہم مطیع فرقا نم ہم کشیش و رہبانم
ربی یہودانم کافر مسلم نام

۱۔ عام طور پر محسن فانی دبستان مذاہب کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آثار الامراء کے مطابق یہ کتاب ذوالفقار خاں اردستانی کی تصنیف ہے۔ (مقالات شبلی)

اس کے بعد کے واقعات دبستان میں تسلسل سے درج نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سرمد نے کچھ عرصہ حیدر آباد دکن میں بھی گزارا اور دبستان کے مصنف سے اس کی پہلی ملاقات ۱۷۴۶ء میں وہیں ہوئی۔

جس وقت دبستان مذاہب لکھی گئی۔ سرمد بقید حیات تھا۔ اور سرمد کے آخری ایام کے حالات اس کتاب میں نہیں ملتے، لیکن مصنف نے سرمد کے کئی اشعار اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ رباعی

سرمد کہ زجام عشق مستش کردند خواندند سرفرازش و پشتش کردند
مے خواست خدا پرستی و شکاری مستش کردند و بت پرستش کردند
نعت رسول میں کہا ہے۔ رباعی

اے از بدخ تو شکستہ خاطر گل سرخ باطن ہمہ بخون دل و ظاہر گل سرخ
زاں دیر بر آمدی زیوسف کہ بدخ اقل گل زرد آمد و آخر گل سرخ

در کعبہ و بیتخانہ سنگ شد و چو آب شد یکجا حجر الاسود یکجا بت ہندو شد
ابھے چند نے جس کی وجہ سے سرمد نے ترک لباس کیا تھا۔ سرمد کی رفاقت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ حیدر آباد میں موجود تھا۔ چنانچہ جب دبستان کے مصنف نے اپنی کتاب کے لیے یہودی عقائد کی تفصیل چاہی تو ابھے چند نے تورات کے ایک باب (کتاب پیدائش Genesis) کے ابتدائی حصے کا فارسی میں ترجمہ کیا جو سرمد کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد درج کتاب ہوا۔

اس کے بعد سرمد شاہجہاں آباد آیا۔ یہاں داراشکوہ کو تصوف سے دلچسپی اور دیوانہ مزاج لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ سرمد نے اس کی صاحبزادی اختیار کی اور بالآخر یہی صحبت اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس زمانے میں شاہجہاں تخت دہلی پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کی ولایت کا شہرہ سن کر اس نے عنایت خاں آشنا کو بھیجا کہ سرمد سے ملے اور اس کی کشف و کرامات کا حال معلوم کرے۔ عنایت خاں نے وہاں برہنگی کے سوا

کچھ نہ دیکھا اور واپس آکر یہ شعر پڑھا۔

برستہ دربر بہتہ کرامت تحت بہت

کشفہ کظہ است از کشفہ کرم بہت

۱۶۵۸ء میں عالمگیر اورنگ زیبین ہوا اور مسابقت علی کو شرع کے قواعد پر ترتیب دینا شروع کیا۔ اس کے نزدیک سرمد کی برہنگی خلاف شرع اور لائق تعزیر تھی چنانچہ اس نے ملا عبد القوی کو بھیجا کہ سرمد کو کپڑے پہننے کی تاکید کرے۔ ملا نے سرمد کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ تم برہنہ و عریاں کیوں رہتے ہو۔ سرمد بتائیں اس وقت کس امر میں تھا۔ پکار اٹھا۔ کیا کروں شیطان قوی بہت اور ساتھ ہی رباعی پڑھی۔

خوش بالاسے کردہ چنیں بہت مرا چشمے برود جام بردہ از دست مرا

اور در بغل من است و من در طلبش دزدے عجبے برستہ کردہ است مرا

ملا علی کو شیطان قوی است کا فقرہ خاص طور پر کروا معلوم ہوا کہ ملکین فقط برہنگی و جبر قتل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے سرمد کی فرد جرم میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ قتل کا ایک بہانہ ذیل کی رباعی تھی جس کے متعلق کہا گیا کہ اس سے مزاج کا انکار ثابت ہوتا ہے یہاں

آں کس کہ سر حقیقتش باور شد خود ہیں تر از سپہر سپن اور شد

ملا گوید کہ بر فلک شد احمد سرمد گوید خاک بر احمد شد

معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی محتاط طبیعت نے اسے بھی کافی نہ سمجھا اور ملا سے کہا کہ سرمد سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ اسے معلوم تھا کہ سرمد کی عادت ہے کہ جب وہ کلمہ طیبہ پڑھتا ہے تو لالہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ جب علماء نے سرمد سے کلمہ طیبہ پڑھنے کے لیے کہا تو اس نے لالہ سے زیادہ نہ پڑھا کہ کلمہ دفعی ہے اس پر علماء نے اعتراض شروع کیا تو سرمد نے کہا کہ ابھی تک کئی فی میں مستغرق ہیں۔ مرتبہ اتنا کہ

لے دبستان مذہب میں لکھا ہے کہ سرمد کہتا تھا کہ یہودی خبیث ہیں برہنگی عیب نہیں لکھتے حضرت اشعیا بھی باغیر عمر میں برہنہ رہتے تھے۔

تہیں پہنچا۔ جب پہنچا گا تو لالہ اندر بھی کہوں گا۔ علماء نے فتوے دیا کہ فقط لالہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد تو سیکرے تو ٹھیک ورنہ واجب القتل۔ سرمد نے تو بہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے روز سرمد کو قتل کے لیے جامع مسجد کے سامنے لے گئے۔ کہتے ہیں کہ قتل کے وقت سرمد بڑا ہشاش بشاش تھا۔ جلد سامنے آیا تو اسے مسکرا کر کہا۔ "فداسے تو شوم" بیابا کہ یہ ہر صورت سے کہے آئی۔ من ترا خوب سے شناسم" یہ کہا اور ذیل کا شعر پڑھ کر ٹوار کے نیچے گر دیں لکھ دیں۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ شودیم

دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

لالہ الامرا میں سرمد کے اسباب قتل کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب دارالاشکوہ کی مصاحبت تھی۔ ورنہ سرمد جیسے برہنہ مجذوب اور آزادانہ گفتگو کرنے والے ہر گز کچھ میں پھرتے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس قصہ کا ایک اور تذکرہ نگار لکھتا ہے۔

گویند کہ ابو لالا اشکوہ نیز سرمد داشت و اکثر اوقات نیز بمقام عالمگیر مشغوف بود۔ لہذا

بقتل رسید۔ حاشا! عظم بحیثیتہ حال۔

مریٹا ابوالکلام آزاد بھی اسی خیال کی تائید کے کہتے ہیں۔

"ایشیا میں ہمیشہ سے پاکستان مذہب کی طرف راہ ہے اور ہزاروں خوزینوں پر چل

اسیاب سے ہوتی ہیں۔ انھیں مذہب کی چادر اٹھا کر چھپایا گیا ہے۔

سرخوش اپنے تئیں کہ میں لکھتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرمندی اور خواجہ عبداللہ سید علی جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعر خوانی کر رہے تھے کہ سرمد آیا جس نے دیکھ کر مسکرا کر لالہ سے یہ شعر پڑھا۔

عمریت کہ افسانہ منصور کٹن شد

من از سر تو جلوہ دہم دار و رس را

چنانچہ اس کے جلدی بعد قتل ہوا!!

سرمہ کی کئی پُر لطف رباعیات مختلف تذکروں میں ملتی ہیں۔

رباعی

سرمہ غم عشق بواہوس رانہ دہند سوزِ دل پروانہ گس رانہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکستار ایں دولت سرمہ ہمہ کس رانہ دہند

رباعی

سرمہ گلہ اختصار سے باید کرد یک کار ازیں دو کار سے باید کرد
یا تن برضائے یار سے باید داد یا قطع نظر زیار سے باید کرد

رباعی

سرمہ تو حدیث کعبہ و دریر مکن در کوہِ پر شک چو گمراں سیر مکن
رو را ہروی ز شیطان آموز یک قبلہ گزین و سجدہ غیر مکن

دبستان مذاہب | دبستان مذاہب جس پر ہم نے سرمہ والے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے کی ایک محرکہ الآراء تصنیف ہے۔ اس

مصنف کے بہت کم حالات معلوم ہیں یقین سے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون تھا۔ کب پیدا ہوا اور کب اس دار فانی سے چل بسا، لیکن اس کی تصنیف سے اس کے خیالات اور رجحان طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مذہبی معاملات میں صلح کل اور آزاد خیال تھا اور اسے دوسروں کے عقائد و اطوار جاننے کا غیر معمولی اشتیاق تھا۔

اس نے دبستان مذاہب میں ایشیا کے تمام مشہور مذاہب کے خیالات اور عقائد جمع کیے ہیں، لیکن بیرونی کی طرح کوشش کی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جس کی مذہب متعلقہ کے ماننے والے خود تصدیق نہ کریں۔ نصف کے قریب کتاب پارسى مذہب عقائد اور مختلف پارسی فرقوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ قریباً ایک چوتھائی کتاب میں مختلف ہندو فرقوں کے حالات ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ باب نانک پنچھیوں یعنی سکھوں کے حالات کے متعلق ہے۔ کتاب کا مصنف گوروہر گوبند کے جاننے والوں میں سے تھا۔ اس لیے اس نے ذاتی واقفیت کی بنا پر ایسے واقعات درج کیے ہیں جو

معاشرانہ تواریخی کتب میں غنما ہیں اور جن سے سکھوں کی ابتدائی تنظیمی کوششوں پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

ایک باب میں ایسے متفرق فرقوں کے حالات درج ہیں جن کا نہ ہندو مذہب اور نہ اسلام سے کوئی خاص تعلق تھا اور جن کے عقائد دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ عوام بالخصوص خوش اعتقاد اور صوفی نما عوام کے خیالات میں اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ عبرت آموز باب ہیراگیوں کے متعلق ہے۔ دبستان میں لکھا ہے کہ ان میں مسلمان بھی داخل تھے اور وہ شنفو کی پرستش کرتے تھے۔ "از ہندو مسلم وغیرہم ہر کس خواہد یکیش ایشاں در آید۔ مانع نشوند۔ در پندیریند و گویند مسلمانان نیز بشن رائے پرستند۔ چہ بسم اللہ ایں معنی وارہ یعنی بشن و بسم، بشن را گویند۔ جو مسلمان ہیراگیوں میں شامل ہوئے تھے وہ محض جاہل عوام الناس نہ تھے۔" جمعے کثیر از مسلمانان یکیش ایشاں در رفتہ اند۔ مانند مرزا صالح و مرزا حیدر کہ از نجائے مسلمانند و ہیراگی شدند۔"

کتاب کے رُبع آخر میں اختصار سے عیسائی، یہودی، بودھ مذاہب اور مختلف مسلمان فرقوں (مثلاً سنی، شیعہ، صادقہ، پیروانِ مسیلمہ کذاب) و احادیث۔ روشنیہ۔ (پیروانِ دین الہی) کے خیالات درج کیے ہیں۔ دینی الہی کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں وہ زیادہ تر بدالوئی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے درمیان ایک مباحثہ درج کیا ہے جو خیالی ہے اور مصنف کے اپنے دماغ کی تخلیق اس مباحثے کے دوران میں شیعہ، سنی، یہودی، نصرانی، اور ہندو عقائد پر بہت کڑے اعتراضات ہوتے ہیں اور سب مذاہب متداول کے ترجمان لا جواب ہو جاتے ہیں۔ اور حکیم فلسفی جو حضرت عقل علیہ السلام کا معتقد ہے۔ سب پر غالب آجاتا ہے۔ اس بحث کے خیال ہوتا ہے کہ مصنف کسی مذہب کے وابستہ نہ تھا اور ایک آزاد خیال صوفی تھا۔ ایک مستقل باب میں اس نے ارشادات قرآنی اور اہم احادیث کی تاویل کر کے انھیں عقائد حکما کے مطابق ثابت کیا ہے۔

آخری باب میں چند ایسے بزرگوں کے حالات ہیں جن سے مصنف کی ملاقات

ہوئی تھی۔ سب سے پہلے داراشکوہ کے مرشد حضرت ملاشاہ بخشی کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں داراشکوہ کو حضرت محی الدین محمدؒ خداوندِ مکان و کمین و صاحبِ زبان و زمین کا خطاب دیا ہے۔ جہاں آرا بیگم کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حضرت ملاشاہ کی غائبانہ مرید تھی۔ و دیگر مریم روزگار۔ فاطمہ زہرا و اعصارِ عفت عنصر۔ عصمت پیکر۔ جہاں آرا بیگم نسبت ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبِ بقران ثانی امیر المسلمین شاہ جہاں بادشاہ غازی غائبانہ بقران حضرت ملاشاہ بحضور دل و دلوک آوردہ و کامیاب شناخت تمام گشت۔ اپنی نسبت ایک جگہ لکھا ہے۔ بریں فقیر از برکت شیخ خود غوث الافاق استاد اہل اللہ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ (ملاشاہ) سلمہ اللہ و البقاء ہجو آفتاب روشن گشت۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی ملاشاہ کا مرید تھا اور آزاد خیال صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو داراشکوہ اور اس کے مرشد ملاشاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

شیخ محب اللہ آبادی | اب تک ہم نے اس باب میں جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ باقاعدہ قادریہ سلسلے سے وابستہ تھے لیکن ان سے باہر بھی کئی بزرگ تھے جو شاید اس سلسلے میں منسلک نہ تھے، لیکن جن کے خیالات میں ملاشاہ اور داراشکوہ کی آزاد خیالی اور وسعتِ مشرب کی جھلک ملتی ہے۔ ان میں سے ایک خاص رنگ اور شان کے بزرگ شیخ محب اللہ آبادی تھے جو علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے اور جن کی نسبت مذکورہ علماء ہند میں یہاں تک لکھا ہے کہ تحقیقات و تدقیقات در علم تصوف بدرجہ اجتہاد رسیدہ بلکہ مے رسد کہ شیخ محی الدین ابن العربی را شیخ اکبر و دے را شیخ کبیر گویند۔ داراشکوہ آپ کا بڑا مداح تھا۔ بلکہ وہ ایک خط میں آپ کو لکھا ہے کہ اللہ آباد کی گورنری سے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ سے ربط ضبط ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ داراشکوہ نے آپ سے اُس مسئلے پر استفسار کیا جو عہدِ اکبری سے ہندوستان میں اسلامی سیاسیات کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ یعنی آیا حکومت کو

تمام رعایا کا مساوی خیال رکھنا چاہیے یا مومن اور کافر میں تمیز کرنی چاہیے۔ اس کا سب سے جواب لکھا اس سے آپ کے طبعی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ وہی جواب تھا جس سے ابوالفضل کے رفعت اور اکبر کے فرامین پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں فرماتے ہیں۔

حق آنست کہ اندیشہ رفاهیت خلق دامن گیر خاطر و کام باشد چہ مومن و چہ کافر خلق خدا پیدائش خداست و سید این مقام کہ صاحب آن مقام بہر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند۔ رسول خداست صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانکہ بیان یافتہ در فتوحات و واردات در قرآن و ما اؤسلفناک الا رحمۃ اللعالمین بر سبیل عمومست۔ مثل سبیلنا لہم غائباً افاضہ رحمت بہ ہر کسے بحسب مرتبہ آن باشد۔

آپ کی تصانیف زیادہ تر علم تصوف میں یا خواص کے عقائد کے تعلق ہیں۔ شرح فصوص (عربی) شرح فصوص (فارسی) مخالط عامہ۔ سرالخواص۔ عبادت الخواص طرق الخواص۔ عبادت اشخاص الخواص۔ رسالہ وجود مطلق۔ ان کے علاوہ انھوں نے رسالہ تسویہ کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس پر عہدِ عالمگیری میں ایک بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے وحی کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو سرسید کے ہم خیالوں کو تو عجیب معلوم نہ ہوں، لیکن عام اسلامی اعتقاد کے ضرور برخلاف ہیں۔ اس پر علمائے اعتراض کیا اور عہدِ عالمگیری میں جب مصنف کی وفات ہو چکی تھی۔ بادشاہ سے استدعا کی کہ اس رسالے کی تمام نقلیں جلادی جائیں اور جو لوگ اس کے قائل ہوں ان پر حد شرعی نافذ کی جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ ممالک محروسہ کے تمام درویش حاضر کیے جائیں کہ دو دیشبان قلم و پاؤں شار اور محکمہ سلطانی احضار نمایند اور رسالے کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر پہلا حکم تو منسوخ ہوا لیکن رسالے کی جو نقلیں دستیاب ہوئیں انھیں تلف کر دیا گیا۔

شیخ محب اللہ آبادی کی وفات ۱۰۴۸ھ میں ہوئی۔ ان کے تلامذہ و خلفاء میں قاضی گھاسی کا نام زیادہ مشہور ہے جن سے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے مرشد اعلیٰ

ملا قطب الدین شہید سہاوی نے فیض حاصل کیا جسے ان کے بیٹوں نے تمام ہندوستان میں غام کیا۔

شہزادہ داراشکوہ قادری | عہد شاہجہانی میں آزاد خیال صوفیوں کا جو جھگڑا ہو گیا تھا، اس میں بعض بڑی دلچسپ ہستیاں شامل تھیں، لیکن ان میں جو کشش ایک مورخ کے لیے داراشکوہ میں ہے، کسی اور میں نہیں۔ اور وہ صرف اس لیے نہیں کہ دارا بادشاہ وقت کا بیٹا تھا اور اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس کا علمی مرتبہ خاصہ بلند تھا۔ اور اس کی تصانیف میں جو وضاحت اور باقاعدگی ہے، وہ عام صوفیانہ ادب کی بھول بھلیاں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

داراشکوہ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ایک مدت تک شاہجہان کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی رہیں اور اسے اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی چنانچہ اس نے خواجہ معین الدین اجمیری کی مدد گاہ عالمیہ پر حاضر ہو کر دعا کی اور نذر دنیا زمانی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۳ مارچ ۱۶۵۸ء کو داراشکوہ بمقام اجمیر پیدا ہوا۔

جو اولاد بڑی خواہش کے بعد حاصل ہو، اس سے خاص لگاؤ ہو جاتا ہے کچھ اس وجہ سے اور شاید کچھ اس لیے کہ بڑے بیٹے کو واضح ترجیح دینے سے تختِ تاج کی وراثت بغیر کسی خانہ جنگی کے طے پاسکے۔ شاہجہان "مہین پور خلافت" کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا تھا۔ اُسے "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس کے مراتب و مناصب بھی اپنے بھائیوں سے بدرجہا بلند تھے اور شاہجہان اسے دروازہ صوبوں میں بھیجنے کی بجائے زیادہ تر اپنے پاس دار الخلافہ میں ہی رکھتا۔

شاہجہان کی یہ کورانہ محبت داراشکوہ کو دنیوی لحاظ سے بہت جنگی بڑی کیونکہ ایک تو اس لادبیار سے وہ زیادہ خود سر اور ضدی ہو گیا اور دوسرے اس کی نظم و نسق کا وہ سلیقہ حاصل نہ ہوا جو اورنگ زیب نے گجرات، دکن اور دوسرے علاقوں کی سربراہی میں حاصل کیا۔ لیکن علمی اور روحانی دلچسپیوں کے لیے اسے دار الخلافہ میں بہت وقت

مٹا رہا۔ اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

اس کی روحانی نشوونما کی بسم اللہ شاید اس دن ہوئی۔ جب ۲۵ فروری ۱۶۵۴ء کو شاہجہان اسے لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے التجا کی کہ وہ اس کی صحت کے لیے دعا کریں۔ اس وقت دارا کی عمر انیس سال کی تھی اور اگرچہ اس کے عقائد اور تاثرات کا اس وقت کوئی ذکر نہیں ملتا، لیکن قرین قیاس ہے کہ صحت پا جانے کے جسے وہ حضرت کی کرامات پر محمول کرتا ہے، اس کی عقیدت اہل اللہ سے ضرور بڑھ گئی ہوگی۔ اس کے دس مہینے بعد جب ۱۶۵۴ء کو شاہجہان حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تو داراشکوہ اس کے ہمراہ تھا اور اس وقت دارا کی عقیدت مندی کی یہ حالت تھی کہ وہ حضرت کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں حضرت کا قیام تھا، برہنہ پا گیا۔ اور جو لوگ وہ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔ انھیں اٹھا کر کھاتا رہا۔ اس کے بعد جب بادشاہ چلا گیا تو داراشکوہ تنہا شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ بھی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور اس کے حق میں دعا کی۔

اس کے اگلے سال حضرت میاں میر کی تو وفات ہو گئی، لیکن جو چنگاری دارا کے دل میں جا لگی تھی، وہ برابر سلگتی رہی۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد انھوں نے غائبانہ طور پر مجھے مشاہدہ اور مراقبہ سکھایا اور ان کی وجہ سے مجھے لیثۃ القدر کی زیارت ہوئی۔

داراشکوہ کی پہلی تالیف سفینۃ الاولیاء ہے۔ جسے خاتمہ کتاب کے مطابق اس نے ۲۱ جنوری ۱۶۵۹ء کو یعنی پچیس سال کی عمر میں ختم کیا۔ غالباً اس تاریخ کے بعد بھی کتاب میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ کیونکہ حضرت میاں میر کے ذکر میں وہ یہاں کہتا ہے: "چوں پیش ازین رسالہ مسنی بہ سکینۃ الاولیاء در احوال و اوضاع آنحضرت پیرو مریدان ایشان مفصل نوشتہ بود۔ دریں کتاب ہمیں قدر اکفائتمود" سفینۃ الاولیاء میں دنیائے اسلام کے ۴۱۱ بزرگانِ دین کے مختصر حالات ہیں۔ یہ تذکرہ نفحات الانس اور دوسرے قدیمی تذکروں سے ماخوذ ہے اور عام طور پر اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں، لیکن کہیں کہیں داراشکوہ نے اپنے

تاثرات بھی درج کیے ہیں اور وہ دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں دارا نے اپنے آپ کو حنفی قادری لکھا ہے اور صوفی سلسلوں کا ذکر کرتے ہوئے قادر یہ سلسلے کو پہلی جگہ دی ہے، لیکن یہ کتاب صحیح اسلامی وسیع اقلیتی کے ساتھ لکھی گئی ہے اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ قلت صفحات کی بنا پر مولف نے بہت تھوڑے ہندوستانی مشائخ کا ذکر کیا ہے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی (حضرت احمد کابلی و سرہندی قدس سرہ) کا ذکر اہتمام سے کیا ہے اور ان کے مخالف ان کی نسبت جو الزام لگاتے تھے۔ ان کی بالتفصیل تردید کی ہے۔

جس سال سفینۃ الاولیاء ختم ہوئی۔ اسی سال ۱۲۱۱ھ کو دارا شکوہ نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے تین سال بعد سکینۃ الاولیاء لکھی۔ جس میں حضرت میاں میر۔ ملا شاہ بدخشی اور حضرت میاں میر کے دوسرے خلفائے حالات ہیں۔ اس دوران میں دارا شکوہ نے شاعری شروع کر دی تھی اور قادری تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ جب اس نے ۱۲۲۶ھ میں ایک مختصر صوفیانہ رسالہ حق نما کے نام سے لکھا تو اس کے خاتمے میں کہا ہے

ایں رسالہ حق نما باشد تمام در ہزار و پنچ و شش شد تمام
ہست از قادر مدائن از قادری آنچہ ما گفتیم فافہم والسلام
معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے دارا کے بعض اقوال پر اعتراض شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ دارا نے ان کا جواب دینے کے لیے اور اس امر کی تائید میں کہ جو الفاظ حالت جذب میں کہے جائیں وہ قابل گرفت نہیں ہوتے۔ رسول کریم اور اصحاب کرام کے بعض صحیح اور موضوع اقوال اور اپنے زمانے اور پہلے کے مشہور مشائخ کے ایسے فقرے جو حالت جذب میں کہے گئے تھے نشاط یا حسنات العارفین (۱۰۶۲ھ) میں جمع کیے اس میں وہ حمد و نعت کے بعد لکھتا ہے :-

بے غم و اندوہ محمد دارا شکوہ کہ اب ہجری کا ایک ہزار باسٹھ اور فقیر کی پیدائش کا اڑتیسواں سال ہے۔ دل بالکل اہل سلوک اور طریقت کی کتابوں سے پھر گیا تھا اور

سوائے محض توحید کے کچھ اور منظور نہ تھا اور وجد اور ذوق کی رو سے اکثر کلمات بلند حقائق و معارف نکلتے تھے اور پست فطرت کم ہمت والے زاہد خشک بے علاوہ کوتاہ بینی سے طعن اور تکفیر اور انکار کے درپے رہتے تھے۔ اس واسطے اس فقیر کے دل میں آیا کہ جو کچھ بڑے بڑے موجدوں اور عارفوں سے کہ جو کچھ اس وقت کی مخلوقات سے سب سے بہتر ہیں اور محاطات میں راست باز ہیں اور ان سے سخن بلند صادر ہوتے ہیں، جن کو تشابہات اور مشطیات کہتے ہیں اور اس قوم کے رسالوں اور کتابوں میں متفرق موجود ہیں۔ یا وہ باتیں جو آج کل کے شخصوں سے خود سنیں ہیں۔ جمع کرے تاکہ حجت قاطعہ ہو۔ ان لوگوں پر اور دلیل بندہ ہوا ان شخصوں پر جو عیسائی نفس دجال اور مرنے والے صفت فرعون اور محمدی مشرب البہل ہیں۔ [ترجمہ]

اس دوران میں دارا کے روحانی تجسس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک اس کی تلاش و تحقیق مسلمان صوفیہ تک محدود تھی، لیکن ملا شاہ اور دوسرے مسلمان مشائخ جن کا طریقہ دارا نے اختیار کیا تھا، ان کے وحدت الوجودی مشرب اور ہندو ویدانت میں کوئی بعد نہ تھا اور فلسفہ وحدت الوجود سے وحدت ادیان کے تصور تک پہنچنے میں کوئی ناقابل عبور مشکل نہ تھی۔ چنانچہ دارا نے دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانت میں چھان بین شروع کی، جس کا پہلا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں ۱۶۵۴-۱۶۵۵ء میں نمودار ہوا اس میں وہ لکھتا ہے :-

”میکوید فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ کہ بعد از دیانت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بای عطیہ عظمیٰ دلائل شد کہ درک کہ نہ مشرب موجد ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید۔ با بعضی از کلامان ایشان کہ بہ نہایت رعنایت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند مکرر صحبت ہادشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلافات لفظی دریافت و شناخت تفاوتی نہ دیدہ۔ ازیں بہت سخنان فریقین را بہم تطبیق دادہ و بعضی سخنان کہ طالبین حق را دانستن ناگزیر بود و مورد است فراہم آوردہ۔“

چونکہ یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کا نام مجمع البحرین رکھا گیا۔ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں عناصر جو اس صفات الہی، نبوت، ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کیے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ حمد عالمگیری میں غالباً اسی رسالے کی تالیف پر ”کفر و اسلام را برادر توام خواندہ“ دارا کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا، لیکن دارا کے علاوہ دوسرے کئی صوفیوں نے وقتاً فوقتاً تصوف اور یوگ کی ہم آہنگی کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اب دارا نے ویدانتیوں اور ”ہندو موحدین“ کے خیالات کو زیادہ محنت سے فارسی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ ”کاملہ دارا اشکوہ و بابالال“ کے نام سے دارا اشکوہ کے میفرشتی چندربھان نے مرتب کیا جس میں دارا کے سوالات اور بابالال کے جوابات جمع ہیں۔ پھر ۹۶ھ میں دارا کے ایما پر جوگ بشت کا آسان فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس میں شری رام چندرجی کے گورو بشت کے ارشادات جمع ہیں۔ ان دونوں سے بھی اہم کتاب ستر اکبر ہے۔ جس میں دارا اشکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کے قریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ دارا اشکوہ نے بھاگوت گیتا کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

اس زمانے میں دارا اشکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کی اس جماعت کا سرگروہ ہو گیا تھا جو تصوف اور ویدانت میں دونوں قوموں کے لیے ایک مشترک روحانی مطلع نظر تلاش کر رہی تھی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ مغلہ حکومت کے تابع یہ سلسلہ وسیع ہو گیا۔ ادھر اکبر کے عہد حکومت میں بھاگوت گیتا اور سنسکرت کی کئی دوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور اہل فکر سے ربط و منبط کے زیادہ مواقع پیش آئے۔ ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ویدانتی دیکھنے لگے کہ مثنوی مولانا روم اور اسلامی تصوف کی

کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہیں جنہیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے کہ ہندوؤں میں فقط بُت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب کرنے والے لوگ نہیں، بلکہ کئی پاکیزہ خیال بے حرص اور بے دیا تارکان دنیا بھی ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں اکبر کی مذہبی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو گیا تھا، لیکن اس روحانی مفاہمت کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ جہانگیر نے کئی موقعوں پر اسلامی نقطہ نظر کی جرأت و استقلال سے پیروی کی، لیکن وہ بھی ہندو یوگیوں کا معتقد تھا۔ اور گسائیں جدو پ سے اس کی ملاقاتوں کا حالی تزک جہانگیری میں کئی جگہ درج ہے۔

شاہجہاں جہانگیر کی طرح ہندو سنیا سیدوں کا قائل نہ تھا، لیکن اس کے عہد حکومت میں یہ رجحانات ختم نہ ہوئے اور اس کے آخری ایام میں تو دارا کی شرکت سے انھیں بڑی تقویت ملی۔ مسلمانوں میں اس روحانی مفاہمت کے ترجمان خود دارا اشکوہ۔ ملا شاہ۔ سرمد۔ دبستان مذاہب کا مصنف اور دوسرے کئی آزاد خیال تھے جو دارا اشکوہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی مسلمان تھے جو ہندو سادھوؤں کی روحانیت متاثر ہوتے تھے۔ دبستان میں مشہور فارسی شاعر ملا شیدا کی رائے ایک گیانی کی نسبت درج ہے :-

ملا شیدائے ہندی کہ از شعراے نامدار و فصحاے عصر بود نوبتے بار اتم بخانہ گیانی زین
رفت و بایشان صحبت داشت۔ مریدان او دید۔ و وضع اہل خانہ را مشاہدہ نمودہ بہ شگفتی
خروماندہ گفت۔ تمام عمر من در خدمت وارتکاز گزشت۔ چشم من چینی آزاد سے ندید۔
و گو شمع چیرے از انساں وارسہ نشنود۔

ہندوؤں میں بھی اس روحانی آمیزش کو ترقی دینے والے کئی تھے۔ ایک چندبھان برہمن تھا جو دارا اشکوہ کا مثنوی اور فارسی میں پہلا صاحب دیوان ہندو شاعر تھا۔ اس کا لک دارا اشکوہ کی وفات کے بعد اس کے دفعتاً سے کارنے میں طرح اپنے تئیں اور رنگ زیب سے وابستہ کرنا چاہا۔ وہ تاریخ کا ایک جبرتناک باب ہے۔ ہم ملا شاہ کی وہ رباعی نقل کر چکے ہیں جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھی۔ برہمن نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ امیر ترک (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ شعر کئی تذکروں میں نقل ہوا ہے۔

مراد ہے است بکفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

عمل صالح میں جو عہد شاہجہانی کی مستند تاریخ ہے، اس کی نسبت لکھا ہے ہر چند بصورت ہندو است، لیکن دم در اسلام سے زندہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایک محققانہ مضمون میں اس کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں :-

دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن فارسی و اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا

ہے عشق کی کیفیات، محبت کی صورتیں، تصوف کی منزلیں، وحدت الوجود کے مراحل

براہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح باقی (مسلمان؟) شعرا

کے کلام میں۔

اسی زمانے کا ایک اور ہندو شاعر تھا۔ بھوپتدائے نام، بیہم تخلص، بیراگی لقب، شاعری میں خوشگو کا شاگرد اور طریقت میں شیخ الشیوخ محمد صادق اور نارائن بیراگی کا مرید تھا۔ اس کی نسبت سید عبداللہ لکھتے ہیں: "بیہم کی وفات ۱۲۱۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ بیہم نے ملا شاہ اور داراشکوہ کے زمانے کی کچھ جھلک ضرور پائی ہوگی۔ داراشکوہ کا ماحول کچھ اس قدر صوفیانہ اور فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہندو منشیوں سے یہ امر ثابت ہے کہ انھوں نے ترک دنیا کو احساں وجود اور علت زندگی کی مصیبت کے ختم کرنے کا واحد ذریعہ سمجھا۔ غشی چندر بھان برہمن نے داراشکوہ کی وفات کے بعد عزت گزینی اختیار کر لی۔ غشی ولی رام ولی نے بھی یہی راستا اختیار کیا اور کلفت حیات کو ترک آرزو سے منایا۔ اگرچہ بیہم بیراگی کا

[بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ]

اورنگ زیب کا ملازم رہا اور اس نے اورنگ زیب کی تعریف میں بعض بڑے بڑے اور اشعار لکھے مثلاً :-

شایا عالم مطیع فرمان تو باد لبریز اداسے شکر احسان تو باد

چوں ذات تو خلق را نگہبان باد ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

داراشکوہ کے دربار سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا تاہم نارائن چند کی محبت میں وہ بھی از خود رفته ہو گیا اور پھر اس نگرہ کی راہ لی، جہاں داراشکوہ کا مقام تھا۔ نارائن بیراگی اور شیخ محمد صادق کے دو گونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی میں جا بجا ان دورنگی موجوں کا سراغ ملتا ہے، جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آئے گا۔ اس زمانے میں ملا شاہ (المتوفی ۱۰۲۰ھ) بہت بڑے صوفی اور عالم تھے۔ یہ میاں شاہ میر لاہوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی بیہم میں مصنف نے خود حضرت ملا شاہ کا ذکر کیا ہے :-

وہ چہ خوش فرمود ملا شاہ ما شاہ ما آن عارف آگاہ ما

سین انساں گر نبوے دریاں اول و آخر نہ بود سے غیراں

بیہم کی مثنوی کی نسبت سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں: "مثنوی بیہم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولوی رومی بیہم بیراگی کے روحانی استاد تھے۔" مثنوی بیہم مولانا سے روم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب، خیالات کی نوعیت، تصوف کے ساتھ فلسفہ کی جھلک سب باتیں اس حقیقت نفس الامری کو عالم آشکارا کر رہی ہیں کہ اگرچہ ہم نے ملا شاہ، نارائن بیراگی اور شیخ صادق قدس سرہ کی تصانیف اور فیوض صحبت کا اثر بیہم پر ثابت کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیہم کا اصلی سرچشمہ رفیع اور سب سے بڑا منبع عرفان رومی تھا۔ اپنے دعوے کو طویل اقتباسات سے استوار کرنے کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں: "مثنوی بیہم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے اس میں ویدانت اور اسلامی تصوف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان ہر دو روحانی سلسلوں کے اتصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً تصویر استخراق، بے ثباتی عالم، دنیا کا ایک وہم اور افسانہ ہونا، وحد الوجود وغیرہ مسائل اسلامی اور ہندو تصوف میں مشترک ہیں۔"

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے مضمون میں مثنوی بیہم کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل

بحث کی ہے اور اس سے طویل اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ہم ان میں سے فقط دو اندازاً نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین دیکھ سکیں کہ اس روحانی تحریک کے دوران میں اسلامی خیالات اور زبان و بیان کس طرح ایک ہندو کے دل و دماغ کو رنگ رہے تھے۔ بتیم ایک جگہ ہر کے متعلق کہتا ہے:-

دہر اسم اعظم اللہ ہست جلوه الزار مرد ماہ ہست
عارفان و عاقلان و عالماں ساجد دہر اند جملہ بے گماں
جامع اسمائے حق اسم اللہ پس چہ می پرسی زمین لے داخواہ
نغمہ ام در گوش کن لے مردارہ لاقب الدہر بر خواں رمز شاہ
خود انالہ ہست بگفتا در کلام پس چہ می پرسی زمین لے تمام
من جو غیر از حق ندیدم در جہاں پس چہ خوانم دہر را لے نور جہاں
ایک اور جگہ شیخ شبلیؒ اور جنیدؒ کے درمیان ایک مکالمہ نظم کیا ہے۔ شبلی پوچھتے ہیں
اصل علوم کیا ہے؟ جنیدؒ جواب دیتے ہیں:-

ذات اللہ ہست اصل ہر علوم نیست صرف و نحو و نے طب و نجوم
اصل جملہ علمہا ذات خداست کہ فروغش روشن این رن و سماست
گفت دیگر چہیت گفتا غیر ازین

نیست چیزے در زماں و در زمین

ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی آمیزش کی یہ کوششیں صرف فارسی زبان میں ہی فروغ نہ پا رہی تھیں بلکہ دواشکوہ کے ہندو دوستوں نے سنسکرت میں بھی انہیں منتقل کیا۔ چنانچہ مجمع البحرین کا سمودر سنگم کے نام سے اسی زمانے میں ترجمہ ہوا اور کئی دوسری صوفیانہ کتب بھی اس زبان میں منتقل ہوئیں۔

علمی نقطہ نظر سے دہر اور اس کے ہم خیال ہندو اور مسلمان صوفیہ کی کوششیں بڑی دلچسپ تھیں اور جو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پورا اسلامی مذہب سہی، لیکن کم از کم اس کے بنیادی اصول ہی دوسرے مذہبوں میں اخذ ہو جائیں اور ان کی اسلام سے

بھڑک دور ہو۔ وہ بھی ان کوششوں کو پسند کرتے ہوں گے، لیکن شخصی حکومتوں میں جو غلامانہ ذہنیت عوام میں داخل ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ ان کوششوں کے حق میں جو بادشاہ یا کسی وراثت تاج و تخت کے زیر سایہ شروع ہوں، بڑا برا ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہ یا شہزادہ کی ہر حدت کی تعریف کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ انہیں اپنی بوجھبوجھوں کا احساس نہیں رہتا۔ خوشامدی درباریوں کے زیر اثر اکبر جن قباحتوں کا مرتکب ہوا تھا، ان کا ذکر ہم کہ چکے ہیں۔ دارا اکبر سے کہیں زیادہ با علم تھا اور اس کے ہاتھ میں اختیار بھی کم تھا۔ اس لیے وہ ان انتہائی حماقتوں کا مرتکب نہیں ہوا جو بدایونی اکبر سے منسوب کرتا ہے، لیکن وہ بھی سادہ لوح اور زود الاعتقاد تھا اور کشفی واقعات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا۔ اپنی علمی اور روحانی کوششوں میں وہ گاہ گاہ جن عجیب و غریب نتائج پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اُس نظریے سے ہو سکتا ہے جس کے مطابق کلام مجید اپنشدوں سے ماخوذ ہے!!

داراشکوہ کی تصنیفات میں تلاش و تفتیش کے باوجود کوئی ایسا اندراج نظر نہیں آتا، جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے، لیکن ایسے بیانات کئی ہیں جن کے نمونے آزاد صوفیائے کبار کی تصانیف میں ہی مل سکتے ہیں اور جن کا اظہار ایک تاج و تخت کے طالب مسلمان کے لیے ضرور خلاف مصلحت ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں حضرت شاہ ولیا کو لکھتا ہے: "الحمد للہ! الحمد للہ! کہ از برکت صحبت ایں طائفہ شریفہ کرمہ معظمہ از دل ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفر حقیقی رونمود و معنی ایں رباعی عارف نامی مولنا عبدالرحمن جانی ظاہر گشت:-

در دیدہ عیاں تو بودہ من غافل در سینہ نہاں تو بودہ من غافل
از جملہ جہاں نشاں تو بودہ من غافل خود جملہ جہاں تو بودہ من غافل
انہوں قد کفر حقیقی دانستم۔ ز تار پوش و بُت پرست بلکہ خود پرست و دیر نشین گشتم۔
مسلمان گردانستے کہ بُت چہیت بدانستے کہ دیں در بُت پرستی ہست
دروہ ہر جہتے جانیت پنہاں بزیر کھر ایک نیست پنہاں

اس کے اشعار میں بھی آزاد خیالی اور وحدت الوجودی مسلک صاف طور پر جھلکتا ہے۔

ہر خم و پیچے کہ شد از تاب زلف یار شد
دم شد تسبیح شد زنجیر شد ز تار شد

رباعی

مردم شد م تا کہ بقراں گشتم عارف شد م و ز خویش عریاں گشتم
پیدا کردی مرا و لیکن من ہم پیدا کردم ترا و قریاں گشتم

ابیات

تا دوست رسیدیم چو از خویش بریدیم از خویش گذشتن چو مبارک سفرے بود

سلطنت سہل است خود را آتش فزین قطره تا دریا تو اند شد چرا گوہر شود
دارا کی کوششوں کو اس وجہ سے بھی ضعف پہنچا کہ وہ حضرت اجمیریؒ حضرت
سلطان المشائخ اور قدیمی صوفیہ کے زمانے میں شروع نہ ہوئیں بلکہ ان کا آغاز اُس وقت
ہوا جب تصوف کی شرح کے مطابق تطبیق ہو رہی تھی۔ ہم نے حضرت سلطان المشائخ
کی وفات کے ضمن میں کہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی دہلی میں صوفیہ کا عہد زریں ختم ہو گیا۔
اس کے بعد تصوف کو شرع کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ عہد مغلیہ میں جو جو علوم
اسلامی کو فروغ ہوا یہ تحریک زور پکڑ گئی اور شیخ عبدالوہاب متقیؒ شیخ عبدالحی محمدؒ
حضرت مجدد الف ثانیؒ جس طرح تصوف کو تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی عناصر سے
پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کا تذکرہ ان صفحات میں ہو چکا ہے حضرت
مجددؒ نے جس طرح ہر دے رام نامی ایک ہندو کو رام اور رحیم کے ایک کہنے پر
دھتکار دیا تھا۔ اس کا بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب کے
احیا کی تحریک آثار اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ صورتیں اختیار کر رہی
تھیں ان کے سامنے داراشکوہ کی اتحاد پرور کوششیں کامیاب نہ ہو سکتی تھیں۔

ان سب اثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان علما اور اہل فکر کی ایک با اثر جماعت تصوف
میں کوئی غیر اسلامی عنصر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ داراشکوہ کی مساعی ان رجحانات کی
صریح مخالف تھیں۔ اس لیے ان کا متشرع اور محتاط مسلمانوں کی نظروں میں
نا پسند ہونا لا بد تھا۔

داراشکوہ کو شخصی اور اتفاقی واقعات سے بھی نقصان پہنچا۔ وہ تاج و تخت کا
دعویدار تھا۔ مراد۔ شجاع۔ اورنگ زیب اس کے حریف تھے اور وہ سب چاہتے
تھے کہ دارا کو عیوب اور نقائص کا مجموعہ ثابت کریں۔ اورنگ زیب کو تو دارا سے اصولی
اختلافات تھے، لیکن اب مراد جیسے رنگیلے انسان جو ہر وقت شراب میں ہرشار
رہتے تھے، دارا پر مذہبی الزام لگانے لگے اور اپنے خطوط میں اُس کی نسبت
”ملحد“۔ ”بے دین“۔ ”دشمن دین متین“ کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔

داراشکوہ کے ہم خیال تو اسے ”محی الدین و ملت“ کہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو
اس کی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں سے صحبت ضرور نا پسند ہوگی۔ بھائیوں کی مخالفت
کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان امرا اور علما بھی دارا کو ملحد سمجھنے لگے اور انھیں یہ
ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوا تو اکبری سی مذہبی بے قاعدگیاں ہندوستان
میں پھر عام ہو جائیں گی۔

داراشکوہ بعض علما کے ساتھ اپنے اختلافات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے: ”در ہندوستان
وحدت نشان انگلوے توحید بسیار است و علمائے ظاہری و باطنی طائفہ قدیم ہند را از وحدت انکارے
و ہر موجدان گفتارے نیست۔ بلکہ پایہ اعتبار است۔ برخلاف جہلا سے ایں وقت کہ خود را علما قرار
دادہ اند و دہے قتل و آزار و انکار خدا شناساں و موجدان افتادہ۔ جمیع کتاب توحید را کہ
از فرقان مجید و احادیث صحیحہ نبوی صریح ظاہر است رد سے نمایند و را ہزنان راہ خدا بند۔“

(سیر اکبر دیباچہ)

عہدِ عالمگیری

فقہ اور شریعت کا عروج

عالمگیر | اورنگ زیب شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ داراشکوہ اور شجاع دونوں عمر میں اس سے بڑے تھے، لیکن قابلیت اور کیرکڑ کی پختگی میں ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ وہ محنتی، دُراندیش اور منتظمانہ نقطہ نظر سے بڑا قابل تھا۔ اس نے ملک کے دُور دراز حصوں میں صوبیداری کر کے انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا اور اس دور میں بطور ایک باتدبیر حریز اور بہادر سپاہی کے نام پیدا کیا تھا۔ اس کے لیے شہزادگی پھولوں کی سیج نہ تھی اور اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کے لیے اسے شروع سے ہی بوڑھے سیاستدانوں کی سب چالیں سیکھنی پڑیں۔ وہ طبیعت کا بڑا ٹھنڈا اور محتاط تھا، غرور کے وقت اپنے جذبات کو خوب قابو میں رکھتا اور ایسی سب تدبیریں تیزی سے سوچ لیتا جو اسے حصول مقصد میں کام آسکتی تھیں۔

شاہجہان جب اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا تو اسے بھی عالمگیر کے عزم و ہزم اور اس کی دماغی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا۔ اس کی اپنے بیٹوں کی نسبت جو رائے تھی، اسے اورنگ زیب نے ایک خط میں نقل کیا ہے۔

”مارا بعضے اوقات بہ خاطر راہ سے باید کہ ہمیں پور (دارا) عدوئے نیکو کاران واقع شدہ و مراد بخش بکار تشریب دل بسگی دارد۔ محمد شجاع بزرگ شیر شمی و صفی ندارد۔ مگر عزم و شعور اورنگ زیب احققارے کند کہ محتمل این امر خطیرے تواند شد اما رکاکت نقص عظیم در فروع انسانی اوست۔“

شاہجہان اورنگ زیب کے ”عزم و شعور“ سے خوب واقف تھا، لیکن اپنی حکومت

آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا۔ شاہجہان کے اس زمانے کے خطوط و احکام پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ نہ صرف اورنگ زیب کی نسبت اس کا رویہ بد پرانہ شفقت و محبت سے عاری تھا، بلکہ بعض اوقات تو اس کا طرزِ عمل کیسے معاندانہ ہو جاتا۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر اورنگ زیب سے باز پرس کی ہے۔ اس کے لائق فخر کارناموں کی کوئی تعریف نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ان کو تشویش میں جو اورنگ زیب مغلہ حکومت کی توسیع کے لیے (مثلاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں) باپ کے زیرِ فرمان شروع کرتا ہے۔ روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور اُسے دُمرول کی نظر میں ذلیل کیا جاتا ہے۔

شاید شاہجہان چاہتا تھا کہ اس کے بعد داراشکوہ بغیر کسی کشمکش کے وارث تخت و تاج ہو جائے اور اس لیے وہ اس کے سب قوی حریف کو دبا کے رکھنا چاہتا تھا یا ممکن ہے کہ وہ سمجھتا ہو کہ اورنگ زیب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظر رکھنے کی عادت (رکاکت) اور خشک، فقیہانہ طبیعت مستقبل کے لیے ایک خطرہ ہے اور اس وجہ سے وہ بار بار ایسی باتوں پر اُلجھتا ہو جو آج ہمیں بے ضرر نظر آتی ہیں۔

شاہجہان اور اورنگ زیب کے جو اختلافات تھے وہ تو پھر جزوی اور ضمنی تھے، لیکن اورنگ زیب اور داراشکوہ کی مخالفت بنیادی تھی۔ ایک تو وہ دونوں تخت و تاج کے دعویدار تھے۔ جس کا مغلہ خاندان کی قاموس میں یہ مطلب ہے کہ اگرچہ وہ دونوں بھائی بھائی تھے، لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیالے سے تھے اور پھر ان کے درمیان فقط ذاتی مقاصد و خواہشات ہی کی دیوار حائل نہ تھی، بلکہ ان کے خیالات ان کے عقائد ان کے طور طریقوں اور ان کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب دونوں مذہب میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ داراشکوہ آزاد خیال صوفیوں کا پیرو تھا اور اورنگ زیب متشدد بلکہ متشدد علما کا۔ دارا کی وسعتِ مشرب کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ہندو موحدین کی مجلس میں اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتا، جس طرح مسلمان صوفیہ کی محفل میں۔ اور اورنگ زیب کا

یہ حال تھا کہ اس کے نزدیک شیعہ مسلمان بھی زندیق تھے۔

عالمگیر اور دارا دو مختلف زاویہ ہا سے نگاہ کے ترجمان تھے اور جس طرح قابل اور جواں ہمت طرفداروں کی مدد سے بالآخر ایک عقیدے اور طریقے کی فتح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مغلوں کے عہد میں ہوا۔ اس سے کوئی انسی سال پہلے دین الہی اور شرع کے جھگڑوں میں اکبر اور محمد حکیم مرزا کا مقابلہ ہوا، لیکن حکیم مرزا کی اکبر کے مقابلے میں کوئی ہستی نہ تھی۔ چنانچہ اکبر کامیاب رہا اور اس کی کامیابی سے اہل شرع کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اب شریعت اور طریقت کا مقابلہ تھا۔ اور ان کے نمائندے عالمگیر اور دارا شکوہ تھے۔ لیکن عالمگیر دارا کی یہ نسبت کہیں زیادہ باتدبیر اور بہادر تھا۔ چنانچہ وہی کامیاب ہوا اور طریقت کا طرفدار ناکام رہا۔ روضۃ القیومیہ میں تو اورنگ زیب کی وجہ خواجہ محمد مصوم کی دعا لکھی ہے، لیکن مورخین کو اس سے بھی زیادہ واضح وجہ نظر آئیں گے۔ ایک تو اورنگ زیب نے تدبیر سے کام لیا اور دارا کے خلاف باقی سب بھائیوں کو اکٹھا کر لیا۔ دوسرے بہادری میں دارا، اورنگ زیب کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بہادری اور بے خونی کا پہلا ثبوت چودہ برس کی عمر میں دیا تھا۔ جب وہ ایک مست ہاتھی کے سامنے کھلے میدان میں ٹٹ گیا۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ ۱۶۲۶ء کو پیش آیا۔ جب بلخ کی مہم پر اورنگ زیب عبدالعزیز بلخی کے خلاف محرکہ آرا تھا۔ دونوں لشکر آپس میں ٹر رہے تھے کہ نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ ”در عین گرمی ہنگامہ پیکار وقت نمازِ ظہر در رسید۔ و آنحضرت با وجود التماس و امتناع بندہ ہائے ظاہر ہیں از مرکوبِ خاص فرود آمدہ صف آرائے جماعت شدہ فرضِ وقت و وفل را۔۔۔ (اب) کمال حضور و اطمینان ادا کردند“ عبدالعزیز خاں پر اورنگ زیب کی اس

ملہ بعد میں یہ رنگ ہلکا ہو گیا۔ لیکن شروع میں جو اورنگ زیب کا حال تھا اس کا اندازہ ایک خط سے ہوتا ہے جو اس نے ایام شہزادگی میں شاہجہان کو لکھا اور جس میں دلی گو گندہ کی نسبت کہا ہے۔ ”مرفض و مست اصحاب کبار کہ محض کفر و زندقہ است در قلم و خویش شائع گردانیدہ۔“

جرات کا اتنا اثر پڑا کہ اس نے کہا۔ ”باچنیں کسے در اُفتادن بر اُفتادن است۔ اور اورنگ زیب سے صلح کا خواستگار ہوا!

اورنگ زیب اور دارا کی قابلیت اور بہادری کا بہترین امتحان جنگِ تخت نشینی کے دوران میں ہوا۔ سموگر ٹھکے میدان میں دونوں فوجیں لڑ رہی تھیں۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوتا شروع ہوا تو دارا ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو بیٹھا۔ فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اور تتر بتر ہو گئی۔ اورنگ زیب کو بھی کچھو کے مقام پر یہی صورت پیش آئی۔ وہ ایک ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے خلاف لڑ رہا تھا کہ ایک مست جگلی ہاتھی نے اس کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ جاتا تو ساری فوج تتر بتر ہو جاتی، لیکن اورنگ زیب کی جرات اور قوتِ حوصلہ کام آئی۔ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہونا تو ایک طرف، اُس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوادیں کہ کہیں گھبرا کے بھاگنا نہ شروع کر دے!

دارا اور اورنگ زیب کے اوصاف میں جب یہ تین فرق تھا تو ظاہر ہے کہ کامیاب کون ہوتا۔ چنانچہ سنتِ الہی کے مطابق زیادہ قابل آدمی کامیاب رہا اور اورنگ زیب تختِ دہلی کا مالک بنا۔

اصلاحاتِ عالمگیری

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے زمانے کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ ”لیکن نہ اکبر کا بیٹا اور نہ اس کا پوتا شاہجہاں بدچلنی اور بدخلاں کے اس طوفان کا مقابلہ کر سکا جو الحاد و تشنگ کی تین نسلوں کے درمیان بڑھتا چلا آتا تھا۔ اکبر کے ایک بیٹے نے اپنے آپ کو شراب پی پی کے ہلاک کر دیا تھا۔ اور جب اس کی شراب بند کی گئی تو بندوق کی نالی میں چوری سے شراب منگوا لیا کرتا تھا۔ دہلی کا وہ محلہ جسے شیطان پورہ کہتے ہیں، اکبر کے زمانے کی یادگار ہے۔ بدچلنی ے سیلاب کے ساتھ توہم پرستی بھی آگئی تھی۔ جادو گروں، رمالوں اور کرامت کے دعوے داروں سے دار الخلافہ بھرا پڑا تھا۔ مغل دربار کا ایک فرانسیسی طبیب

لکھتا ہے یہاں دو پیسے لے کر ایک آدمی کی قسمت بتائی جاتی ہے اور اس جگہ ایک کونے میں ایک پرتگیز نجومی دوسروں کے ساتھ دری پر بیٹھا رمل و نجوم کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہے اور اپنی انجیل کی تصویروں کو نجوم کے برج بنا کر اور اپنا قطب نما استعمال کر کے اپنا اُتو سیدھا کرتا ہے۔ بد اخلاقی تو ہم پرستی اور الحاد کی یہ دنیا تھی۔ جس میں نوجوان، زاہد خشک اور نگ زیب نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کا قلع تہ کرنے میں صرف کر دیں۔ تخت نشین ہونے کے بعد ہی اُس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جو ابند کر دیا۔ بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرنے کے لیے محتسب مقرر کیے۔ ۱۶۶۴ء میں اس نے ”ستی“ کی ممانعت کی اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔ اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا، لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوا تھا، اسے ترک کر دیا۔ اور شاہجہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ پڑا ہوا تھا، اسے ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اسی ٹیکس معاف کیے۔ وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا تھا اور عدل و انصاف کا محکمہ علما کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے معلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اُس نے تمام ملک کے قابل علما کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کھاتا۔ اُس نے ۱۱ فروری ۱۶۵۷ء کو

بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وقات پائی اور اورنگ آباد سے بارہ کل کے فاصلے پر روضہ خلد آباد میں دفن ہوا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں، مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔ حسب وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی اور اس کی قبر پر کوئی عالیشان عمارت نہیں۔

ارباب ظاہر | اورنگ زیب کی زندگی ایک لحاظ سے اتباع و ترویج شریعت کی ایک نہایت روشن مثال ہے، لیکن جہاں اس کے عہد حکومت میں اتباع شریعت کی کوششیں بد اخلاقی، شراب خوری، جوئے اور بد چلنی وغیرہ کی بیگنی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہاں بعض ارباب شریعت کی تنگ نظری کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اہل ظاہر کی ایک اہم خصوصیت پر اپنے شاہکار تذکرہ میں تبصرہ کیا ہے۔

”افسوس جو بیانات مروجہ عقائد کے غرور باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا، کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عمل صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دار و مدار چند مروجہ عقائد پر لا رہا گیا۔ ساری ساری سچائی اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ ظالم شخص کے عقائد کیسے ہیں۔ یعنی چند مروجہ بیانات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے؟ اس کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں انفاق و مال کا کیا حال ہے؟ تقویٰ و طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندہ کسے ساتھ اس کا کیا سلوک ہے؟ اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھر پور معاملات میں کیا حال ہے۔ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ۔ رفیق بھائی۔ وفادار شوہر اور رحیم و عفو سارہمسایہ ہے یا ایک بے رحم وجود۔ بے حس پتھر اور موزی و مہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کو دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر چند

اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے تو ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی
روئے زمین پر کوئی نہیں ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے اعمالِ حسنہ پر عقائد کو ترجیح دینے اور جزوی اختلافات کیلئے
تکفیر و تذلیل کرنے کی جس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ آج کے ظاہرینوں کی خصوصیت
نہیں، بلکہ اہل ظاہر کا پُرانا شیوہ ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود
ہیں اور چونکہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اہل شرع کو زیادہ اختیارات حاصل تھے
اس لیے اس زمانے میں ایسے واقعات بھی زیادہ ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی لیکچروں میں ایک جگہ کہا ہے کہ فقہ اسلامی آخری
ایام میں اسلام کے بہترین دماغوں کے ہاتھ میں نہیں رہی۔ اور اگر ہندوستان کے بعض
قاضیوں اور مفتیوں کے حالات پڑھے جائیں تو اس خیال کی تائید ہوگی۔ ہندوستان
میں جو قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام ہوئے ہیں اور جن کے احکام کو صاحبِ ایمان و
خوش عقیدہ بادشاہوں نے اس طرح نافذ کیا ہے کہ گویا بہشت و دوزخ کی کنجی ہی
ان بزرگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حالات دیکھیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ان بزرگوں
کی زندگیوں کو کس طرح مسلمانوں کے لیے نمونہ سمجھا جائے۔

اورنگ زیب کے قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے جن سے متعلق
منوچی لکھتا ہے: ”اورنگ زیب نے ایک دن کہا کہ ہندوستان میں صرف دو آدمی ہیں جو
شراب نوشی سے بالکل متبرا ہیں۔ ایک میں اور ایک قاضی عبدالوہاب، لیکن عبدالوہاب
کے متعلق وہ دھوکے میں تھا۔ کیونکہ میں (منوچی) اُسے خود ہر روز شراب بھیجا کرتا تھا۔“
ہمارے خیال میں یہ قصہ جسے زمانہ محال کے اکثر مؤرخین نے صحیح تسلیم کر لیا ہے، محض
بہتان ہے اور ہم منوچی کو قابلِ اعتماد راوی نہیں سمجھتے۔ البتہ اس بات سے انکار
نہیں ہو سکتا کہ جب قاضی عبدالوہاب ۶۷ھ میں فوت ہوئے تو انھوں نے ایک
لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپیہ نقد علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑے۔

جمع اموال میں بھی اکبری عہد کے مخدوم الملک سے عجیب نہیں رہے۔
مؤرخین ان کی زراعت و زنی بلکہ بددیانتی کی صاف شکایت کرتے ہیں۔ مگر اللہ
میں ان کے متعلق لکھا ہے۔

”قاضی حضور (کہ بڑھو تین خود را و نمودہ در تمثیت: مور جزوی و کلی لولے انا و
لاغیری سے افراشت) امرے عمدہ از حساب بر میداشتند و از حد چوں کباب می خورد
و بایں ہم میگویند کہ قاضی اداحد و جریطوئے داشت۔ وزیر ہائے کثیر انداختہ بود۔“
اسی سلسلے میں ایک لطیفہ لکھا ہے۔ مہابت خاں لہر اسپ اورنگ زیب کا ایک
امیر تھا۔ اسے حکم ہوا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ دکن جائے اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہوا۔
ابھی دار الخلافہ کے گرد و نواح میں ہی تھا کہ اُسے پتا چلا کہ قاضی (عبدالوہاب) تین چار
لاکھ روپے کی چیزیں کشمیر اور آگرے سے خرید کر تاجروں کے مال کے ساتھ احمد آباد بھیج
رہے ہیں۔ اُس کی اور قاضی کی نہ بنتی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سب کچھ بلا مگوایا
اور اپنی سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ کے پاس شکایت ہوئی تو مہابت خاں نے کہہ دیا
کہ مجھے فوج کے اخراجات کے لیے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ سودا گروں سے بطور
قرض کے لیا ہے۔ منافع کے ساتھ واپس کر دوں گا۔ اب قاضی اس امر کا اظہار نہ کر سکتا تھا
کہ اتنا مال متاع سب میرا ہے۔ چنانچہ اسے لو کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔

قاضی عبدالوہاب کے صاحبزادے قاضی شیخ الاسلام کی نسبت لکھا ہے،
”او بخلاف پدر دیانت واقعی داشت و ورع و صلاح او منسوب بر پدر یا نبود۔“ قاضی
شیخ الاسلام کا نام اس اندھیری رات میں چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ واقعی پرہیزگار
اور دیانتدار تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کے ورثے سے ایک پانی نہ لی اور جب دگر نریب
نے بجا پور پر حملہ کرنے کے متعلق ان سے استصواب کیا تو انھوں نے صاف صاف
کہہ دیا کہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس طرح جنگ شروع کرنی ناجائز ہے، لیکن ان کا دل
قضا میں نہ لگتا تھا۔ چند سال خدمت کرنے کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور
باوجودیکہ بادشاہ بڑا زور دیتا تھا کہ وہ یہ کام سنبھالے رکھیں، لیکن انھوں نے طریقے طے کیے

ٹال دیا۔ چلے ج کو چلے گئے۔ پھر زیارت مقابر بزرگاں و ملاقات عیال و اطفال کیلئے رخصت لی اور اپنے آپ کو اس سلسلے میں الجھنے نہ دیا۔ اپنی قضاۃ کے زمانے میں بھی ان کا اصول تھا کہ گواہ بالعموم جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے بیان پر فیصلہ نہیں دینا چاہیے۔ منظر بفساد زمانہ (کہ مزاجا بکذب و زور آشنا شدہ) انفصال قضا یا برتنبہ و شواہد نمے نمود۔ ان کے باقی سارے خاندان میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان کا اپنا بیٹا شیخ سراج الدین برار کا دیوان تھا۔ سرکاری روپیہ غبن کر کے خرچہ درویشی میں لیا تاکہ کوئی باز پرس نہ ہو ان کے بھتیجے یعنی قاضی عبدالوہاب کے پوتے محمد محالی خان کی نسبت لکھا ہے: ”خوگر شراب و شیفتہ رگ بود۔“

ماثر الامرا میں اس زمانے کے قاضیوں کی بڑی شکایت کی گئی ہے :-

”ایں امر جلیل القدر را دین بدینا فو شان سخت آساں گرفتہ اند۔ زردہ بر رشوت خراج سے کنند کہ تا باطل حقوق مردم صد چندان ستانند۔ نکاحات و مہر انہ را جلیل تر از شیر مادر میدانند۔ از قضات ارثی نقضات چہ توان گفت کہ مس علم ایشان نصیب اعداست و کفۃ و لیسپاندیہ وز مینداری کتاب و شرع انہاست ہر گاہ در شان قضات با علم و عمل حدیثے وارد شدہ (کہ از سہ قاضی یکے بہشتی است)۔ (و خواجہ محمد یار سا قدس سرہ در فصل الخطاب گوید کہ آن قاضی بہشتی ہم مگر قاضی بہشت باشد) اندازہ گمراہی و غفلت ایں قوم کہ کمتر از جہال اند کہ تو اند گرفت۔“

جب شرع کی تدوین و ترویج اور اہل شرع کی تنظیم قاضی عبدالوہاب اور ان جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں رہی ہو تو ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ اسلامی حکومت کی سات آٹھ صدیوں میں ایک بھی صاحب اجتہاد فقہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوا۔ جو بزرگ شیخ عبدالحق کی طرح قابل سمجھ دار اور اسلامی مذہب و شریعت کی گہرائیاں سمجھنے والے تھے یا مجدد الف ثانی کی طرح اسلام کا درد اور اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرات رکھتے تھے وہ قاضی یا مفتی بننے سے کوسوں بھاگتے تھے۔ شریعت کی عام ترویج جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ زیادہ سے زیادہ اسی کے اہل تھے کہ فقہ کی کتابیں دیکھ کر

حرام حلال کے مسئلے بتادیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ملکی ضروریات کا خیال کر کے اور قوم کی بہبودی کو مد نظر رکھتے ہوئے شرع اور فقہ کی تدوین ان اصولوں پر کرے جن سے اسلامی حکومت دیر پا اور محکم ہو۔ جن لوگوں میں شریعت رائج ہے ان کے آرام و صلاح کا انتظام ہو۔ قوم کی اصلاح اور ترقی اس طرح ہو کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے آگے بڑھی رہے۔

سندھ میں عربوں کی آمد پر محمد بن قاسم اور دمشق کے مفتیوں نے فقہی معاملات میں اجتہاد سے کام لیا اور بت پرست ہنود کو وہ حقوق دیے گئے جو اہل کتاب کے لیے مخصوص تھے، لیکن اس کے پانچ سو سال بعد جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو باب اجتہاد بند ہو چکا تھا۔ اب علماء و فقہاء کی نظر کتابوں سے آگے نہ جاتی تھی اور ان کی ترجمانی میں بھی مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے پڑتے۔ آج بھی کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں جن میں تمباکو پیسنے پر تو دوسرے لگائے جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص شرعی حیلوں سے شارع کا تمام مقصد ضائع کر دے تو اس سے کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ ایک شخص کا پاچا مہ شخصوں سے نیچے آجائے تو وہ مستوجب سزا ہے لیکن اگر وہی شخص تلواروں سے یکے بعد دیگرے اس طرح شادی کرے کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتیں اس کے نکاح میں نہ ہوں تو خواہ وہ نفس پرستی اور ہوس رانی میں اپنی زندگی گزار دے۔ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنا دے، وہ قابل الزام نہیں۔ بعض ارباب شریعت کی اسی ظاہر پرستی پر اہل طریقت کو اعتراض رہا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اور طریقت کا اختلاف بڑھا۔ اگر دونوں فریق افراط و تفریط کو ترک کر دیں۔ میانہ روی کا راستا اختیار کریں جو قرآن کریم کا صحیح طریقہ ہے اور جس پر رسول اکرم عامل تھے تو یہ اختلاف مٹ جائے اور اس کے مٹ جانے سے اسلام کی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مشکل دور ہو۔

اسلامی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم

اونگ مذہب ایک متدین بادشاہ تھا۔ اس نے شرع کے احکام پر اپنا نظام حکومت ترتیب دیا اور ان کی پوری پوری

پیروی کی، لیکن وہ کوئی تنگ نظر اور سادہ دل بادشاہ نہ تھا۔ اس کو اپنے زمانے کے علم اور مدد سے نفاذ سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک استاد کے سامنے اس زمانے کے طرز تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے طریقہ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

برتیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک استاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری اُمرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اُسے تھلیے میں بلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا:-

”مولانا! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے قتل و جرم کے اُمرا میں داخل کر دوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا۔ اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے، جہاں سب بڑا بادشاہ چلے پڑگال کا حاکم تھا۔ پھر بالینڈ کا بادشاہ ہوا۔ اور اب شاہ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہماری معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہان ہندوستان اُن سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ انھی میں ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں ہوتے ہیں جو شاہانِ عظیم فاتحانِ جہاں اور بادشاہانِ عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران کا شہر تاتار۔ سیکو۔ سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں۔ سبحان! خدا! آپ کے علم جزا فیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ کس کس ڈھب سے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی پوشاک پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض نہ تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و منزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دنیا کی تاریخ

سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباؤ اجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لیے کون سے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف دھوکے بڑی ہمارت چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا نقیب کو ہوتی ہے۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ غفلتوں کے سیکھنے کی خشک بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور استعنائہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دلپسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم و فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اُمور استعمال کر سکتا تھا۔ جن سے روشن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلب گار بناتا ہے یا مجھ کو باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر اسی طرح کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔

یہ اندراج ہم نے برنیر کے سفر نامے سے لیا ہے جو عہدِ عالمگیری میں دیر تک اس ملک میں مقیم رہا اور بعض اُمرا سے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اب بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ یہ تقریر برنیر کے نہانخانہ دماغ کی تخلیق ہے۔ عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں۔

ممکن ہے کہ یہ شبہ جائز ہو لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات اس میں درج ہیں وہ فی نفسہ اس قدر وزنی ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ جو کوتاہیاں ایک طرف ہیں اجنبی کو تقوُّس سے ہی قیام کے بعد نظر آگئیں ان سے ہمارے ارباب حل و عقد اتنی حسدیں غافل رہے؟

عالمگیر اور غیر مسلم | اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے منصفانہ سلوک نہ کیا اور مخلصیہ رواداری کی دیرینہ روایات کو دسم بہ دم کر دیا۔ مولانا شبلی نے ایک زوردار اور رسالے میں اور مسٹر فاروقی نے ایک مبسوط انگریزی کتاب میں اس اعتراض کی تردید کی ہے۔ لیکن پروفیسر جادو ناتھ سکار نے سالوں کی محنت اور تحقیق و تفتیش کے بعد اورنگ زیب کے خلاف جو مواد جمع کیا ہے اور جس چالاک سے اسے عالمگیر کے خلاف استعمال کیا ہے۔ اس کا تدارک ان کتابوں میں نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جو اس زمانے کے ایک ایک واقعہ سے پوری طرح واقف ہو کوئی معاصرانہ تصنیف اس کے مطالعہ سے باہر نہ رہی ہو اور پھر وہ پروفیسر سکار جتنی قابلیت اور ان سے زیادہ انصاف پسندی کے ساتھ ان کے زہر کے لیے تریاق تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ہماری مختصر کتاب میں اس مسئلے پر طویل بحث کی گنجائش نہیں، لیکن ہم اس سلسلے میں دو ایک باتوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں پہلی تو طلب بات یہ ہے کہ جو مسلم مورخین اورنگ زیب کے احکام سے اسلام کے متعلق نتائج اخذ کرتے ہیں یا جو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اورنگ زیب فرشتہ ثابت نہ ہوا تو اسلام مطعون ہوگا۔ وہ تناسب امور کا خیال نہیں رکھتے۔ اسلام کی بنیاد احکام عالمگیری پر ہے بلکہ قیادت عالمگیری پر نہیں۔ "کتاب الہدے" پر ہے اور اسی کے مطابق یہ مذہب پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر عالمگیر یا کوئی دوسرا مسلمان اس کے سمجھنے میں غلطی کرے تو اس سے سارا مذہب مطعون نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے حسن و قبح کا اندازہ تو قرآن کریم ہی سے ہو سکتا ہے جو مذہبی رواداری کے معیار میں بہت واضح ہے۔ لا اکرہ فی الدین۔

اس کے علاوہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیلانی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے طرز عمل سے

ہندو برگشتہ ہو گئے تھے اور اس سے مخلصیہ حکومت کو زوال ہوا۔ اس کے متعلق ذکر کرنا چاہیے کی رائے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب بنی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگ زیب انہیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مخلصیہ سلطنت کے لیے ایک باوقار عظیم ثابت ہوئی، لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی نہ مذہبی۔ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی۔ راجپوت بندیلے اور شیواجی کے اپنے فتنہ دار اور گروہ کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔

سری۔ سی رائے نے بھی اپنی تقریر میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ شیواجی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیاء تھا اور وہ مغلوں کے خلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا وہ غلطی پر ہیں۔" مرہٹہ تاریخ کے ہنرمیں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیواجی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرنے والا تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔

مرہٹوں کے علاوہ اورنگ زیب کے صوبیداروں کو گوردگو بند سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کشمکش میں بعض افسوسناک واقعات ظور پذیر ہوئے، لیکن غیر مسلم مورخین یہ امر بھول جاتے ہیں کہ اپنی وفات سے پہلے گوردگو بند سنگھ جی مغل فرج میں ایک عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور جب انہیں کسی بیچان نے ذاتی عداوت کی بنا پر زخمی کیا۔ تو اورنگ زیب کے جانشین جہاں شاہ نے اپنا خاص طبیبان کے مانجے کے لیے بھیجا۔

خوشحال خاں خطک

اورنگ زیب کے مخالفین میں صرف مرہٹے اور بلکہ نہ تھے، بلکہ اسے افغان قبائل کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ افغان بغاوت کا دارہنما خوشحال خاں خطک تھا، جو پشتو شعر کا سرتاج ہے۔ وہ بیک وقت صاحب السیف و العلم تھا اور اس کے اشعار میں جوش، آزادی، افغانوں کی فوقیت اور مغلوں کی مخالفت کی آگ اس طرح بھری ہوئی ہے کہ ایک زمانہ گزرنے پر بھی ان کے افسردہ دل گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ قبیلہ خطک کا سردار تھا۔ شاہجہان نے اس کا حق سرداری قبول کر لیا اور شاہجہاں کا ذکر اس نے ہمیشہ تعریف سے کیا، لیکن اورنگ زیب نے چند ایک شکوک کی بنا پر اسے گرفتار کر لیا اور رنجنبور کے قلعے میں کئی سال قید رکھا۔ اس قید و بند نے خوشحال کو ہمیشہ کے لیے عالمگیر بلکہ تمام مغلوں کا دشمن بنا دیا اور جب اسے وفاداری کے وعدے پر آزادی ملی تو اس نے اس وعدے کا ایسا ضروری نہ سمجھا اور کچھ دیر بعد جب سرحد پر آفریدیوں نے بغاوت کی تو اس نے اپنے پڑاثر اشعار سے اس آگ کو اور بھڑکایا اور کئی سال تک بغاوت کی تائید کی۔ حتیٰ کہ خود اورنگ زیب کو اٹک کے قریب دو سال تک ڈیرے ڈالنے پڑے۔ یوسف زئی افغانوں کی مدد اور زرد و مال کی تقسیم سے (جس سے سرحد کے اکثر مسائل حل ہوتے ہیں)، اورنگ زیب نے بالآخر اس شورش کو فرو کیا اور خوشحال خاں کا اپنا بیٹا بہرام باپ کے خلاف مغلوں سے مل گیا، لیکن خوشحال خاں کی آتش انتقام فرو نہ ہوئی۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور جب ساتھیوں کی ترک رفاقت کے بس ہو گیا تو اشعار میں اپنے دل کا بخار نکالا۔

ظلم سے اکبر جہول کے چپ نہنا چاہیے

اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہیے

پاکستانی ادبیات میں خوشحال خاں کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ فقط اس کی تصنیفات پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم یہ مقام شکر ہے کہ دوست محمد خاں صاحب کمال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اپنی بڑی کتاب (خوشحال خاں خطک) لکھ کر یہ کام پورا کر دیا۔

اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ بہن سے چاہے گا کہ اس جوشیلے کثرت میں افغان کے دل میں اورنگ زیب اور مغلوں کی نسبت کیا خیالات گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب کی نسبت اس کی رائے غیر جانبدارانہ نہیں، لیکن اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے دشمن اس کی نسبت کیا کہتے تھے۔ خوشحال مغل بادشاہ کے متعلق ایک نظم میں لکھتا ہے (ترجمہ)

”میں اورنگ زیب کے عدل و انصاف کو خوب جانتا ہوں!

اور اس کے دین و مذہب اور نفس کشی اور روزہ داری سے بھی واقف ہوں!

کیا اس کے سب بھائی ایک ایک کر کے اس کی تلوار سے شکار نہیں ہوئے؟

اور اس کے باپ کو شکست کھا کر قید خانہ کی مصیبتیں نہیں بھیلنی پڑیں؟

خواہ کوئی شخص دان میں ہزار بار سجدے کرے اور زمین پر سر مارے۔

اور روزوں کی کثرت سے اس کی نات ریتھ کی ہڈی سے مل جائے۔

جب تک اس کے دل میں نیکی نہ ہو۔

اس کی سب عبادتیں اور طہارتیں مکرور یا ہیں۔

اورنگ زیب کی زبان کچھ اور کہتی ہے اور اس کا دل کچھ اور ہی سوچتا ہے۔

خدا کرے کہ اس کے دل اور گردے مجروح ہو جائیں اور وہ تیغ و تھنگ کا شکار ہو۔

لیکن خوشحال کو فقط اورنگ زیب سے عداوت نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے

نے ایک قومی رنگ اختیار کر لیا اور اس نے تلقین شروع کی کہ افغان پھر اپنی کھوئی ہوئی

عظمت حاصل کر لیں۔ اس نے کئی نظموں میں قدیم افغان بادشاہوں اور بہادروں کا

ذکر کر کے افغانوں کو ابھارا ہے۔ ایک قصیدہ میں مغل فوج کے خلاف اپنی فتوحات

لگا کر اورنگ زیب کی گھبراہٹ کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

جب صورتِ حالات یہ ہو تو دوسری باتیں ہو سکتی ہیں۔

کر یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں یا افغان تباہ ہو جائیں۔

اگر جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یہی نیرنگی روزگار کا آقا صاف ہے۔

اور یہی خدا کی مرضی ہے تو پھر یہ کچھ ہو کے رہے گا۔

زمانہ ہمیشہ ایک ہی روش پر نہیں چلتا۔

آج یہ پھول پر مہربان ہے تو کل کانٹے پر۔

سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نجات نہیں ملتی۔

جو افغان اس کے سوا کچھ اور سوچتا ہے وہ گمراہ ہے۔

افغان تیغ زنی میں مغلوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔

کاش کہ عقل اور سمجھ میں بھی وہ زیادہ محتاط و ہوشیار ہوں۔

اگر جہاد قبیلے سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔

تو بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑے۔

ایک نظم میں افغان بادشاہوں کا ذکر کر کے افغانوں کی ہمت افزائی کی ہے۔

بہلول کی شہرت اور شیر شاہ کی۔ میرے کانوں میں آتی ہے۔

جو ہندوستان کے افغان بادشاہ تھے۔ بڑے بہادر اور منتظم۔

انھوں نے چھ سات نسلوں تک اس عقل سمجھ سے حکومت کی

کہ ساری دنیا ان کی تعریف سے گونجی تھی۔

خوشحال نے ہندوستان میں ایک عرصہ گزارا تھا اور جانتا تھا کہ مغلوں کا عسکری

نظام کھوکھلا ہو چکا ہے وہ ایک غزل میں کہتا ہے (ترجمہ)

مغل جو اب میری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ پہلوں کی طرح نہیں۔

اب ان کی تیغ و کٹنگ کا زمانہ گزر گیا اور فقط قلم ان کے پاس ہے۔

وہ افغانوں کو زرد مال سے خریدتے ہیں اور مکرو فن سے انھیں پھنساتے ہیں۔

مغلوں سے افغان عداوت کے آثار صرف خوشحال کی شاعری میں ہی نہیں ملتے

اس زمانے کے دوسرے افغان شعرا کے کلام میں بھی اس کا اظہار ہے۔ حمید کا ایک

پشو شعر ہے۔ (ترجمہ)

مغل جس گھر میں پہنچے پتھروں کی طرح

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا میں بے انصافی کی وجہ سے آگ لگ گئی۔

ایک اور مشہور شاعر خواجہ محمد کا شعر ہے۔ (ترجمہ)

اورنگ زیب کی بادشاہی میں انصاف نہیں ملے گا۔

میں خواجہ محمد انکل جاؤں گا کسی اور طرف کو۔

اس کے اظہار سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان لوگوں کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی یا

یہ کہ وہ افغان عصبیت کا شکار تھے۔ انھیں تو اصل میں مغلوں اور ان کے کارندوں

کی بے انصافی سے شکایت تھی۔ خوشحال خاں نے قلعہ رن تھنود کی قید میں جہاں

کابل اور پشاور کو یاد کیا ہے وہاں لاہور کو فراموش نہیں کیا ہے

وہ ہوا جو کابل کی طرف سے اٹھ کر آتی ہے۔

مجھ پر غبر چھڑکتی ہے۔

جب کوئی کابل کا نام لیتا ہے۔

میرے سینے میں جوش اٹھتا ہے۔

اگر کوئی پشاور کا ذکر کرتا ہے۔

تو میرا دل روشن ہو جاتا ہے۔

جو کوئی لاہور کا نام لیتا ہے۔

تو اس سے بھی میرے دل کو دلاسا ہوتا ہے۔

کابل و پنجاب کے خواہ آدمی ہوں یا کتے۔

جو نہی مجھے دکھائی دیتے ہیں۔

میرا دل بے اختیار ان پر گر پڑتا ہے۔

ابھی تک اسلامی قومیت اور ملی یک جہتی کے زیر اثر افغانوں اور مغلوں کے قبائلی

اختلافات رفع نہ ہوئے تھے، لیکن اسلام سے خوشحال خاں خطک کو بھی اسی طرح محبت

تھی جس طرح اورنگ زیب کو۔ اور اس کی نظموں میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے ایک

نظم کے چند اشعار ہیں۔ (ترجمہ)

تمام تیراہ میں مؤذن کی آواز نہیں سنائی دیتی۔
 سوائے اُس بانگ کے جو مرغِ سحر کے گلے سے نکلتی ہے۔
 اور بارگِ تنیٰ وہ بھی راہِ ہدایت سے گُور جا پڑے ہیں۔
 اور آفریدی تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔
 نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی مُلا ہے۔
 نہ وہ زکوٰۃ صدقہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے دلوں میں خدا کا خوف ہے۔
 نیک وہی ہے جو نبی کے احکام اور شرع کی پیروی کرتا ہے۔
 اور بد بخت وہ ہے جو ان کی بجائے آدری میں ٹال مٹول کرے۔
 معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی مروجہ صورت سے خوشحال کو بڑی شکایت تھی۔
 اس نظم میں آگے چل کر لکھتا ہے۔ (ترجمہ)
 صوفیہ کے قائل اور محد بھی ایک سے ہیں۔
 کیونکہ دونوں شرع اور احکامِ نبوی سے پہلو بچلتے ہیں۔
 گاہے گاہے کبھی کبھار وہ کہہ لیتے ہیں۔
 (ان میں سے چند ایک) لا الہ الا ہُو۔
 لیکن وہ ہمیشہ گناہوں میں شرابور رہتے ہیں اور تائب نہیں ہوتے۔
 خدا بچائے ان لوگوں سے یہی خوشحال کی دُعا ہے!

خوشحال خان خٹک کی شاعری میں ایک آگ ہے، لیکن وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوا۔ مغلوں کی حکومت ایک قوم یا قبیلہ کی حکومت نہ تھی، بلکہ اس وسیع سائبان کے نیچے تمام مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کا موقع تھا۔ خوشحال خان خٹک کے اپنے خاندان نے ان موقعوں سے فائدے اٹھائے، بلکہ جب دکن میں مڑھوں کے ساتھ

خوشحال خان کو روئے کے ایک بڑے ولی اللہ شیخ رحمان سے تعلق خاطر تھا اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کی صحبت اور شاہ اولیس صدیقی نقاتی کے درس سے بھی اس نے فیض حاصل کیا تھا۔

مغلوں کی طویل کشمکش شروع ہوئی تو اورنگزیب کا بڑا بہادر لیرواں اور دوسرے افغان جرنیل تھے۔ مغلیہ حکومت کے زوال سے اسلامی ہندوستان کے متعلق افغانوں کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس دورِ ابتلا میں امام الہند شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کی کسی طرف نظر اٹھتی تھی تو وہ احمد شاہ ابدالی تھا اور اس مردِ مجاہد نے بھی اسلامی ہندوستان کی پاسبانی اور بالخصوص سنی علما و زعماء کی حمایت میں کبھی کوتاہی نہ کی۔
علوم و فنون | اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء میں ہوئی اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ وہ شراب اور عیش کا دلدادہ لیکن سمجھدار اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ توڑک جہانگیری سے اُس کی قوتِ مشاہدہ اور ذہانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس اکبر کی مذہبی بوجھبوسوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن باقی باتوں میں اکبر کی پیروی کی۔ اور اس کے زمانے میں فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا۔ وہ شعرا کا قدردان تھا۔ دربار کا ملک الشعراء طالبِ آملی تھا جس کے کئی اشعار پُر لطف ہیں۔ فنِ تعمیر میں بھی عہدِ جہانگیری کے کئی نمونے موجود ہیں، لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ فروغِ مصوری کو ہوا۔ جن کا جاگیر ایک اچھا نفاذ تھا۔ عہدِ جہانگیری کے بہترین مصوّر چار تھے۔ ابو الحسن جسے "نادر الزمان" کا خطاب ملا تھا اور منصور جسے "نادر العصر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بشن داس اور فرخ بیگ بھی مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ اس عہد کے علما و صلحا کا ذکر شیخ عبدالحق کے تذکرے کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

۱۶۲۶ء میں شاہجہاں تختِ نشین ہوا۔ اس کا زمانہ خاندانِ مغلیہ کا سب سے زیادہ شاندار اور پُر شکوہ عہدِ حکومت ہے۔ فارسی کا مشہور شاعر صائب اسی زمانے میں ہندوستان آیا، لیکن ملک الشعراء سے دربارِ کلیم تھا، جس کا بڑا مقابلِ قدسی سمجھا جاتا تھا۔ علما و فضلاء میں عبدالحکیم سیالکوٹی، سعد اللہ خاں وزیرِ اعظم اور ملا محمد جوہر کی مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ جن میں محمد امین قزوینی، عبدالحمید لاہوری اور راجا بہاری مل قابلِ ذکر ہیں۔ مصوّر بھی بہت تھے۔ شاہجہان کے زمانے میں ہندوستانی مصوّر ایرانی اور ولایتی مصوّر مل سے فنِ مصوری سیکھ کر اپنے

ہوئے تھے کہ وہ ایرانی مصوروں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔ اور اس عہد کے مشہور مصوروں میں زیادہ تر ہندوستانی بلکہ ہندو ہیں۔ مصوری سے زیادہ جس بات میں شاہجہان کا زمانہ ممتاز تھا وہ اسلامی فن تعمیر کا عروج ہے۔ اس زمانے میں تاج محل - لال قلعہ جامع مسجد دہلی - جہانگیر کا مقبرہ اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور جن سے بہتر فن تعمیر کے نمونے شاید ہی دنیا میں کہیں ہوں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں موسیقی اور مصوری پر زوال آگیا۔ وہ خود شعر کا صحیح نقاد تھا اور اس نے کم از کم ایک نہایت پُر اثر اور بلند شعر خود لکھا ہے۔

عجم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چمن در شیشہ ساسعت کم گیت یابی را

لیکن اس - ملک الشعراء کا عہد موقوف کر دیا۔ مرزا بیدل فطرت - ناصر علی سرہندی اور نعمت خاں عالی اس کے زمانے کے شعرا ہیں، لیکن کفایت شعراء و دیگر کتب ان کی کوئی قدر نہ کی، بلکہ دس سال کی وقائع نویسی کے بعد درباری مورخ کا عہدہ بھی موقوف کر دیا اور تاریخ نویسی کی ممانعت کر دی۔ اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی مؤرخین ہوئے۔ اورنگ زیب نے اپنی توجہ زیادہ تر حریت کی خوشحالی - ٹیکسوں اور محسوسوں کی کمی اور تعلیم کی اشاعت پر مبذول رکھی۔ اس کا زمانہ فنون لطیفہ کے لیے سازگار نہ تھا۔ البتہ شریعت اور علوم اسلامی کی اشاعت خوب ہوئی۔ اس نے اشاعتِ علم کو بڑی ترقی دی۔ مدرسوں کے لیے زمینیں وقف کیں اور اساتذہ کے مشاہرے اور طلباء کے لیے شاہی خزانے سے وظائف مقرر کیے۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں علوم اسلامی کی بڑی قدر ہوئی، لیکن قدرت کی نیزنگیاں دیکھیے کہ پچاس سال کے طویل عرصے میں نہ تو شیخ عبدالحی عموثر یا امام الہند شاہ ولی اللہ جیسا کوئی جید عالم اور نہ ہی حضرت سلطان المشائخ یا حضرت مجدد الف ثانی جیسا کوئی مزبور مستشرق نظر آتا ہے۔ البتہ مدرس اور فقیہ بکثرت تھے اور بعض خاصے تھے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر ہستی میر محمد زہر ہروی کی تھی، جو کلام و حکمت میں

اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے والد قاضی محمد اسلم ہرات کے رہنے والے تھے لیکن بودرباش کابل میں اختیار کر لی تھی۔ قاضی محمد اسلم نے لاہور میں شیخ بہلول سے تعلیم پائی اور عہدِ جہانگیری و شاہجہانی میں معزز عہدوں پر مامور رہے۔ پہلے کابل میں قاضی تھے۔ پھر قاضی عسکر ہو گئے۔ شاہجہان نے ایک مرتبہ ان کا وزن کر کے وزن کے برابر روپے انعام دیے۔ قاضی محمد اسلم کی وفات ۱۰۵۱ھ میں ہوئی اور لاہور میں دفن ہوئے (سجۃ المرجان)۔ ان کے صاحبزادے میر محمد زاہد ہندوستان میں پیدا ہوئے اور شاہجہان نے انہیں کابل میں واقعہ نویسی پر مامور کر رکھا تھا۔ عہدِ عالمگیری میں وہ پہلے محتسب لشکر اور بعد میں صدارت کابل پر مامور ہوئے۔ اس تقریب سے انہیں دلچسپی سے اپنے وطن میں بٹھ کر تالیف و تصنیف کا موقع ملا۔ انہوں نے کئی ایک درسی کتب مثلاً شرح مواقف - شرح تہذیب دوانی اور رسالہ تصور و تصدیق مصنفہ ملا قطب رازی پر حاشیے لکھے جو اب بھی رائج ہیں ان کی وفات ۱۰۹۹ھ میں ہوئی۔ جن لوگوں نے ان سے دار الخلافہ میں براہ راست استفادہ کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیم کا نام بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں اس وقت تک زیادہ فروغِ علمائے پورب کو حاصل تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلی کی جلالی ہوئی انہیں دہلی میں مقیم رکھی گئیں۔ پنجاب میں ملا عبد الحکیم کا فیض ان کے صاحبزادے ملا عبد اللہ نے جاری رکھا۔ لیکن وہ گوشہ نشینی کی طروت زیادہ مائل تھے۔ اگرچہ گجرات میں اب بھی درس و تدریس کا معیار بلند تھا اور اواخر عہدِ عالمگیری میں وہاں مولانا نور الدین احمد آبادی جیسے علما ہوئے، لیکن جو امتیازی شان اس وقت بلادِ مشرق کے علما کو حاصل تھی وہ کسی دوسرے صوبے کو قیصر نہ ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی مخصوص خوبیوں کے باوجود عہدِ عالمگیری سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک عالمِ دینی درس و تدریس میں دہلی اور باقی حصص ملک کی نسبت کمزور اور دوسرے اضلاع شرقی کی درجہ گاہیں زیادہ رونق پر تھیں۔ اس وقت بھی ان علاقوں میں ایسے علما تھے جن کے سامنے دوسروں کے چراغ ماتر پڑ گئے۔ ایک بزرگ شیخ احمد

المعروف ملا جیون ایٹھوی تھے (وفات ۱۰۷۷ھ) جو کھنوکھ کے قریب قصبہ ایٹھی کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر خود ان کا شاگرد تھا۔ ان کی تصانیف میں سے ایک تفسیر احمدی ہے۔ جس میں ان آیات کی تفسیر ہے جن سے مسائل فقہ مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کی نورالانوار اصول فقہ میں منار کی شرح ہے۔ ایک اور بزرگ حافظ امان اللہ بناری تھے (وفات ۱۰۷۲ھ) جو کھنوکھ میں عہدہ صدارت پر متعین تھے۔ انھوں نے علم فقہ اور علم کلام پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ علمائے قریبی محل کھنوکھ کے مورث اعلیٰ ملا قطب الدین سہالوی تھے اسی زمانہ میں شہادت پائی تھی (۱۰۹۲ھ) ان کے علاوہ شیخ غلام نقشبند کھنوکھی بھی جنھوں نے علم فقہ اور فقہی فتویٰ میں متعدد کتابیں لکھیں ذکر کے قابل ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۱۳ھ میں ہوئی۔ سید عبد الجلیل بلگرامی (وفات ۱۱۳۲ھ) جو حسان السند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا اور خود ایک پرگو شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ طریقت میں شیخ غلام نقشبند کے مرید تھے، لیکن ان سب سے زیادہ اس زمانے کے جس بزرگ نے علمی عظمت میں نام پایا اور مقولات کو درسیات میں بڑی ممتاز جگہ دے دی۔ قاضی محب اللہ بہاری تھے وہ کھنوکھ اور حیدر آباد دکن میں قاضی رہے۔ پھر اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کے بیٹے شہزادہ رفیع القدر کے آلیق مقرر ہوئے اور عالمگیری کی وقتا کے بعد کچھ عرصہ تمام ہندوستان کی صدارت پر مامور رہے۔ ۱۱۷۷ھ کے اواخر میں وفات پائی۔ آپ نے فقہ اور منطق کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے بعض آج بھی مستعمل ہیں۔ مسلم الثبوت فقہ اور اصول فقہ کے متعلق آپ کی ایک بلند پایہ کتاب ہے اور علامہ بحر العلوم اور دوسرے علمائے اس پر حاشیے لکھے ہیں منطق میں آپ کی مشہور کتاب سلم العلوم ہے۔ ان کے علاوہ اقادات جو ہر فرد اور دوسرے مسائل آپ کی یادگار ہیں۔

عبد عالمگیری میں شیخ عبد الحق محدث اور شاہ ولی اللہ کے پایہ کا کوئی عالم نظر نہیں آتا۔ لیکن اب بادشاہ کی علم نوازی اور قدردانی علمائے علم و فضل کو بے حد فروغ ہوا۔ اور درس علوم اسلامی نے بڑی وسعت اختیار کی۔ درس نظامیہ عالمگیری کی

وفات کے کئی سال بعد مرقن ہوا، لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدوین نظامیہ کہلاتا ہے، عالمگیری نے ہی فرنگی محل کھنوکھ کی عالیشان عمارت مدرسہ کے لیے عطا کی۔ اس طریق تعلیم میں جو کتابیں برصغیر کی رائج ہیں ان کا اکثر حصہ عہد عالمگیری میں لکھا گیا۔ اور وہ بھی بادشاہ کے منظور نظر علما (مثلاً میرزا ہد۔ ملا محب اللہ بہاری) کے قلم سے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا۔ اور دین کا جو احیا ہوا، اس کی بنیاد عہد عالمگیری میں رکھی گئی۔

فتاویٰ عالمگیری | عبد عالمگیری کی دو تین کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک ملا محسن (متوفی ۱۱۷۰ھ) کی رد شیعہ ہے جس میں انھوں نے دلائل و براہین سے شیعوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ دوسری بحم الفرقان ہے۔ جسے مولانا محمد مصطفیٰ بن محمد سعید نے اورنگ زیب کے نام معنون کیا۔ یہ فلوکل کی کتاب کی طرح کلام مجید کے الفاظ کا اندکس ہے۔ تیسری کتاب عبد عالمگیری کی سب سے اہم تصنیف فتاویٰ عالمگیری ہے جسے ہندوستان کے خفی علمائے ہند کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں۔ لیکن کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہ تھی۔ جب اورنگ زیب نے باقاعدگی سے شریعت راج کی تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کے ممتاز علما کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ فقہ کی تمام کتب سے ”منفشی بہا مسائل“ منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے جو فقہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس جماعت کے صدر شیخ نظام تھے۔ علما کے لیے وظائف مقرر ہوئے اور آٹھ سال کی محنت کے بعد کتاب تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ محاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک تھا۔ و کتاب کا ایک صفحہ فردانہ ملا نظام سے پڑھوا کر سناتا تھا اور اس پر جرح قدح کرتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کے متعلق معارف کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں ”حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء اور طلباء کو فقہ کی

تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔

مرآۃ العالم میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے نامور فاضل ملا عبداللہ رومی جلیلی کو حکم دیا کہ وہ اور ان کے شاگرد فقاہ عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کریں، لیکن اس ترجمے کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ غالباً وہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ حال میں نو کشور پریس نے ایک اردو ترجمہ فقاہی ہندیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ کوئی پانچ ہزار صفحے کی کتاب ہے۔ دس جلدوں میں۔ شروع میں دوسو سے زیادہ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں ان علماء فقہاء کے مختصر حالات ہیں جن کی تصانیف و آراء سے مدد لی گئی۔ ابتدا کی دو جلدیں زیادہ تر ارکان مذہب مثلاً نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق ہیں۔ جلد سوم ایمان، حدود، سرقہ اور اس قسم کے اہم مسائل کے متعلق ہے۔ چالیس صفحے باب ابتدا کے لیے وقف ہیں۔ چوتھی جلد میں زیادہ تر کاروباری مسائل ہیں۔ مثلاً شرکت، بیوع، وقف، پانچویں جلد بیشتر عدالتی امور کے متعلق ہے۔ بعض عنوانات ہیں۔ ادب القاضی، کتاب الشہادت، کتاب الوکالت، چھٹی ساتویں اور آٹھویں جلدوں میں قانونی مسائل ہیں۔ جن کا بڑا حصہ فوجداری امور کے متعلق ہے۔ جلد نہم کا سب سے اہم باب ذمیوں کے متعلق ہے اور جلد دہم میں شرع سے زائد صفحوں کا باب الجیل ہے۔ کتاب کا طریق کار یہ ہے کہ اہم مسائل فقہ کی مشہور اور مستند کتابوں کے اقتباسات مآخذ کے حوالوں کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ انتخاب اور ترتیب اس محنت اور احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ جو مسائل قاضی یا مفتی کو پیش آسکتے ہیں، ان کے متعلق مشہور فقہاء کی رائے بغیر کسی دشواری کے دستیاب ہو سکتی ہے۔

عالمگیر اور بزرگانِ سرہند | پروفیسر محمد فرمان اپنی کتاب حیاتِ مجدد میں

امام ابو الکلام آزاد نے تذکرہ میں ان فقہاء کی خدمت کی ہے جو فقہی کتب میں باب الجیل کو شامل کرتے ہیں لیکن جن قانونی نظام میں سزائیں کڑی اور صین ہوں اور سزا دینے والے کو اس کا اختیار نہ ہو کہ مجرم کی ہولی حروف میں سزائیں مؤخر تخفیف کر سکے۔ وہاں بے انصافی اور جرم سے بچنے کے لیے باب الجیل ناگزیر ہے۔

لکھتے ہیں:-

”بہانگیر شاہ جہاں اور اورنگ زیب بھی شہنشاہ پہلے تھے۔ اور اس کے بعد

ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج کا خیال تھا۔“ (ص ۵۸)

بنیادی طور پر تو یہ خیال صحیح ہے کہ یہ تینوں بادشاہ ملکی مصلحتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اور اس میں فقط ان کی شخصی یا خاندانی خود غرضی نہ تھی۔ اگر ہم اس تباہی کا خیال کریں جو حکومت کے زوال سے اسلامی مرکزوں (مثلاً سرہند) پر آئی تو مسلمان بادشاہوں کی اپنی (یعنی مسلمانوں کی) حکمرانی پر قرار رکھنے کی کوشش مسبب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن عالمگیر کے متعلق تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس نے اپنی شہنشاہت کو ”اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج“ پر مقدم رکھا۔ یہ درست ہے کہ اکابر سلسلہ توحید سے بڑی موانست اور احترام کے باوجود اس نے مکاتیب امام ربانی کی نسبت ایسے احکام جاری کیے جو بزرگانِ سرہند کو ناگوار تھے، لیکن ان احکام کے پس پشت بھی شریعت کے بے اعتنائی نہ تھی بلکہ ان کا مقصد بھی فقاہ عالمگیری کی ترویج تھا۔ حضرت مجدد العتباتی کے صاحبزادگان گرامی، خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد مصطفیٰ کے ذکر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان بزرگوں کے مجموعہ کے مکاتیب میں متحد خطوط اورنگ زیب کے نام ہیں۔ اور عالمگیر نامہ کے وہ اندراجات بھی نقل کر چکے ہیں جن ان بزرگوں اور عالمگیر کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

مکتوبات سعیدیہ میں کل سو مکاتیب ہیں۔ ان میں سے نو عالمگیر کے نام ہیں ایک خط خاص طور پر اہم ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

”الحمد للہ کہ بطور آفتاب ہدایت، ظلمات کفر و ضلالت رو با باندہام آورد۔ و بیخ اللہ و بدعت از پا افتاد و ریایات عدل و انصاف باقی اعلیٰ رسید۔۔۔ معذرا اگر از راہ عنایت و دین پروری مابقی من الفواحش و المنکرات و منع برے از منہیات و مکررات بمقتلایان خدمات اسلام تاکید اہتمام بود و نور علی نور است و در باب تعمیر ساجد مرشد و مدارس مسئلہ و ترفیہ علماء و فضلا و مکرم زما و صلحا احکام واجب الاستقامت شرع و

یابد۔ موجب اعلائے ارکان شریعت بیضا و تمکین دولت عظمیٰ بطریق اتم باشد۔

زیادہ بلبل جلالت از حد ادب دور است۔ (۳۷)

خواجہ محمد معصومؒ کے اہم مکاتیب اس زمانے کے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو دار الخلافہ میں بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا خط شیخ سیف الدین کے نام ہے۔

آنچه در احوال پادشاه دین پناه سلمہ اللہ مرقوم نموده بودند از سر بیان ذکر در لطافت و حصول سلطانی ذکر و رابطہ و قلت خطرات و قبول کلمہ حق و دفع بعض منکرات و ظهور لوازم طلب ہمہ بوضوح پیوست۔ شکر خداوند جل شانہ بجا آورد۔ در طبقہ سلاطین اس نوع امور حکم عقل کے مغرب دارد (۳۸)

اگلا خط پادشاہ کے نام اور پادشاہ کے ایک خط کے جواب میں ہے۔ فرمان عالی شان کہ از کمال عنایت و مہربانی مرقوم قلم عنبریں رقم گشتہ بود خواجہ محمد شریف بخاری در اعتراف از منہ رسانید و فقرائے بیوزار ابہ تشریفات عالیہ بنواخت۔۔۔ الحمد للہ و اللہ کہ فقیر زادہ منظور نظر قبول گشتہ و اثر صحبت بجزول انجامید و از معروف و مخفی منکر کہ شیوہ فقیر زادہ است اظہار تشکر در ضامندی نموده است۔ شکر خداوندی جل شانہ بریں عطیہ بجا آورد (۳۹)

ایک اور خط میں عالمگیر کو لکھتے ہیں:-

”کیفیت سخی باطن را در کتابت فقیر زادہ پیش نوشتہ است بنظر عالی در آمدہ باشد۔ استمداد توجہ غائبانہ ازین شکستہ فرمودہ اند۔ ہر چند از راہ دعا گوئی قدیم سابقا ہم اکثر دعا و توجہ آنحضرت مشغول بودہ درینولا کہ ایں قسم مہربانیا و خصوصیت در میان آمدہ خود جمع ہمت بطریق محمود ایں سلسلہ علیہ در ترقی باطن و از دیا و کیفیت اک و استقامت

سہ یہ سب فقر سوم میں ہیں جو ایک مرتبہ امر میں چھپا تھا۔ لیکن اب عنفا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم نے تمام اہم متعلقہ اندراجات نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تیوں دفاتر کا ایک کلاڈ آفٹنکس (لٹرو میں) مولانا سید احمد امروہی نے مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی کے نام سے شائع کیا ہے اس میں ہم خطوط کے اقتباسات کے ترجمے ہیں۔

ظاہر نیز مقید است و بیچ و بیہ و نقصیر رضا ندارد“ (۴۰)

ایک خط میں شیخ سیف الدین کو لکھتے ہیں:-

نوشتہ بودند کہ در مجالس سلطانی طرفہ اسرار لازم الاستتار جلوہ میدہند۔ و بجز دخول بآن محافل بعروج و نزول خاص ممتاز می سازند۔ بلے اہل کمال از ہر طبقہ فیوض و اسرار مناسبتہ آن بکعبہ اخذ می نمایند۔ و از ہر زمین کمال مناسبتہ آن زمین میگردند۔۔۔۔۔ در احوال بندگان حضرت بزرگاشہ بودند کہ از وسعت لطیفہ اخفی و مناسبتہ تام بآن خبر میدہند از مطالعہ آن ذوقہا کرد۔ لطیفہ اخفی اعلائے لطائف است و ولایت آن فوق سائر لطائف است و ایں لطیفہ را خصوصیت مست خاص بہ سرور کائنات و مفرج موجودات علیہ و علی آلہ الصلوٰات و التسلیمات و البرکات فقیر نیز ایشان را مناسبتہ بہ لطیفہ اخفی در سے یابد (۴۱)

شیخ سیف الدین کے نام کے ایک اور خط میں پادشاہ کا ذکر ہے:-

آنچه از احوال پادشاہ دین پناه مرقوم نموده بودند ہمہ بوضوح انجامید۔ در طبقہ سلاطین ظهور ایں نوع امور از غرائب روزگار است۔۔۔۔۔ نوشتہ بودند کہ مبادرت حقین خود را صفت علم یافتہ اند و لے فرمایند کہ بایں صفت مبارک بیشتر مناسبت یافتہ میشود از مطالعہ آن خطہا نمود۔ نزدیک بود کہ رقص کند۔ حق سبحانہ از برکات ایں صفت بزرگ بہرہ تام عطا فرماید (۴۲)

ان اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر نے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت نہ کی تھی (ورنہ اس اہم امر کی صراحت ہوتی) لیکن اس نے ان کے صاحبزادے شیخ سیف الدین سے بعض اشغال نقشبندیہ سیکھے۔ اور خود حضرت خواجہ محمدؒ کے ”توجہ غائبانہ“ کی آرزو کی۔

مکتوب معصومیہ (دفتر سوم) میں دو اور دلچسپ خطوط ہیں۔ ایک کامگار خاں کے نام جو وزیر سابق جعفر خاں کا بیٹا اور خود ایک منصبدار تھا۔ دوسرا بخاں خاں کے نام جسے لہ بخاں خاں سے خواجہ نقشبند ثانی کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکتوب سے ظاہر ہے۔

مرآۃ العالم اس کی ترمیم شدہ صورت مرآۃ جہاں نما اور ریاض الاولیاء کا مصنف کہا جاتا ہے۔ وہ عالمگیر کا ایک محمد اور عزیز عہدیدار تھا۔ علما و مشائخ کا قدر دان تھا۔ اور ان کے بادشاہ سے روابط کا ایک ذریعہ تھا۔

مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالوں سے بزرگانِ سرہند اور عالمگیر کے قریبی روابط کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں عالمگیر نے مکتوباتِ امام ربانی پڑھائے جانے کی ممانعت کا حکم جاری کیا تھا۔ معارج الولاہت میں ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ کا ایک خط درج ہے جو عالمگیر کے ایما پر قاضی شیخ الاسلام (جو اپنے والد کی جگہ قاضی القضاۃ ہوئے) کی طرف سے قاضی اورنگ آباد کے نام لکھا گیا۔ (....) حسب الحکم بادشاہ اسلام بھر قاضی شیخ الاسلام بجانب قاضی اورنگ آباد رسید یہ حکم حسب ذیل تھا:-

از قرار تاریخ بیت و مہتمم شہر شوال سنہ یک ہزار و نو و ہجری، آنکہ شریعت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ، فقہ است اعتبار قاضی ہدایت اللہ بجا فیت باشندہ درینو بعض مقدس معلی رسید کہ بعض مواضع مکتوبات شیخ احمد سرہندی ظاہر و باطن

۱۔ ان تینوں کتابوں کا اصل مصنف شیخ محمد بقا سہارنپوری کو سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے حدیث کی سند شیخ نور الحق محدث دہلوی سے لی۔ باقی علوم سرہند میں جا کر شیخ عبداللہ المعروف حضرت میاں سے پڑھے۔ اور خواجہ محمد مصحوم کے مریدوں میں داخل ہوئے (ملاحظہ ہو خاتمہ مرآۃ جہاں نما) چنانچہ ان تینوں کتابوں میں بزرگانِ سرہند کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ اور ان کا نقطہ نظر بھی "سرہندی" ہے۔ مآثر عالمگیری کا مصنف ساقی مستعد خاں پہلے بختاورد خاں کا منشی اور دیوبند تھا۔ غالباً بختاورد خاں اور اس کے رفقاء سے کار کو بزرگانِ سرہند سے خاص لگاؤ تھا۔ مآثر عالمگیری میں حضراتِ سرہند کے متعلق کئی اندراجات ہیں۔ اور ہندو مسلم معاملات (مثلاً تمام ممالک محروسہ میں غیر اسلامی محابذ اور پرستش گاہوں کے "خاتمہ") کے متعلق ان کے بیانات بڑے جوشیلے ہیں۔ بلکہ عالمگیر کے معترض اکثر اس کتاب کے حوالے دیتے ہیں۔

عقائد اہل سنت و جماعت است۔ و معتقدان شیخ مذکور کہ در طرہ اورنگ آباد نجستہ بنیاد سکونت دارند۔ ترویج آل جیشہ ہند و مدیس سے نمایندہ اعتقاد حقیقت باطلہ مذکورہ دارند۔ حکم والا شرف صدور یافت۔ کہ اس خادم شریعت با شریعت پناہ بنویسد کہ آنہارا از رشد و درس آل منہ کند۔ کسے کہ معلوم شود کہ معتقد عقائد باطلہ مذکور است اور اسرا سے شرعی رسانند۔ لہذا نگارش سے باید کہ بر طبق حکم مطاع واجب اتباع یہ عمل آرند و حقیقت برنگارند۔

[معارج الولاہت مخطوطہ شلہ ۱۲۸۱ کتابت و دستگاہ پنجاب دہلی]

یہ خط ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ (مطابق ۳ نومبر ۱۶۹۷ء) کا ہے۔ اور قاضی اورنگ آباد کے نام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین چار سال بعد دار الخلافہ میں بھی مکتوباتِ امام ربانی کے خلاف ایک ہنگامہ ہوا۔ روضۃ القیومیہ میں قیوم ثالث (خواجہ محمد نقشبند) کی قیومت کے سال پانزدہم کا سارا باب اسی کے متعلق ہے۔ چونکہ روضۃ القیومیہ کے مطابق قیوم ثالث کی قیومت کا آغاز ۱۱ ربیع الاول سنہ ۹۰۲ھ کو ہوا۔ اس لیے یہ واقعات سنہ ۹۰۲ھ کے متعلق ہی ہو سکتے ہیں۔ روضۃ القیومیہ کے اندراج کا خلاصہ یہ ہے کہ جب "طریقہ احمدیہ مصومیہ" نے بڑا فروغ پایا تو دشمنوں نے حسد سے طریقہ کی مخالفت شروع کی۔ ستین خط بادشاہ کی طرف سے جلی لکھ کر سرہند بھیجے۔ جن کی بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی۔ ایک حضرت قیوم ثالث رضی اللہ عنہ کے نام۔ دوسرا شیخ سیف الدین کے نام اور تیسرا مولوی فرخ شاہ صاحب کی طرف۔ جن کا مضمون یہ تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر مخالف شرع ہیں۔ اور تمام علمائے متفق ہو کر اس بات کا فتوے دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا پڑھانا بند کر دیا جائے۔ اس بابے میں ایک مختصر پر تمام علما کے دستخط کر کے سارے مخالف اکٹھے ہو کر دار الخلافہ میں آئے۔ اور اس طریقہ کے خلفا کو پیغام بھیجا کہ تمہارے شیخ کے کلام کے بعض حصے شریعت کے موافق نہیں۔ تم اگر اس کا جواب دو جو شرع کے مطابق ہو۔ روضۃ القیومیہ

بیان کے مطابق احمدی اور محسوی تمام خلفاء اور الخلفاء میں جمع ہوئے۔ مخالفوں نے جو سوال کیے۔ ان کے ثنائی اور شریعت کے مطابق جواب دیے کہ مخالفوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔۔۔ پھر بادشاہ نے انہیں اپنے پاس بلایا۔۔۔ مناظرہ ہونے لگا۔ جس میں مخالفین نے نیچا دیکھا۔ بادشاہ نے انہیں بہت شرمندہ کیا۔

روضۃ القیومیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مخالفین کے جواب میں بہت سے رسالے لکھے گئے فقط حضرت مجدد الف ثانیؑ کی اولاد نے بہتر رسالے لکھے اور خلفاء کے مکاتیب و رسائل کو ملا کر سب کی تعداد تین سو ساٹھ تھی۔ مولوی فرخ شاہ صاحب یہ رسائل لے کر بادشاہ کے پاس آئے تو اس نے ان کی بڑی عزت کی اور یقین دلایا کہ جو خطوط مشائخ سرہند کے نام میری طرف سے لکھے گئے ان کی مجھے خبر نہیں۔

ہم روضۃ القیومیہ کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک خاص نقطہ نظر سے لکھی گئی۔ اور بغیر مزید تصدیق کے اس کے اندراجات پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ واقعات کو کونکے لگا کر بلکہ موڑ توڑ کر اور ڈرامائی انداز سے پیش کرنا مصنف کا دلپسند طریق کار ہے، لیکن مدارج الولاۃ میں بھی استفادہ کے تحت کئی صفحات پر مخالفین کے فتوے درج ہیں اس لیے بعید از قیاس نہیں کہ فریقین میں کوئی بحث و مناظرہ ہوا ہو۔

مدارج الولاۃ میں قاضی شیخ الاسلام کا جو خط درج ہے، وہ تاریخی نقطہ نظر سے معلومات افزا اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اور خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکاتیب سے بھی نفس مضمون (یعنی مکاتیب امام ربانی کے بعض اندراجات کے متعلق اور نگ زرب کے اپنے شبہات) کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ لیکن مکتوبات کے پڑھنے پڑھانے کی اس میں جو ممانعت ہے اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ عالمگیر کے متعلق یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے دیوان حافظ کے پڑھنے پڑھانے کی ممانعت

۱۔ غالباً یہ وہی رسالہ استفادہ ہے جس کا ذکر خواجہ محمد نقشبند ثانیؒ کے مکتوب ۱۱ میں ہے قاضی شیخ الاسلام کے نام کے مکتوب (۲۵) میں بھی انہی بحثوں کی طرف اشارہ ہے۔

کر دی تھی۔ اگرچہ یہ کتاب اس کو بے حد عزیز تھی۔ اور بقول ایک تذکرہ نگار کے اس کے سر ہانے رہتی تھی۔ دوسری قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ اس امر کے قومی شواہد موجود ہیں کہ معارج الولاۃ اور روضۃ القیومیہ میں بیان کردہ بحثوں کے بعد بھی عالمگیر کے دل میں بزرگان سرہند کی بڑی قدر رہی۔ اور ان کے ساتھ اس کے روابط بڑے گہرے تھے۔ خواجہ محمد مصحومؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد نقشبندؒ جنہیں قیوم ثالث کہا جاتا ہے کے مکاتیب کا ایک حصہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جو مخطوطہ ملا۔ وہ ”کسی نہایت بدخط اور غلط نویس کا تب کا لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کسی بزرگوں کو تصحیح کی زحمت دی“ ”لیکن پھر بھی غلطیاں رہ گئیں۔“ یہ غلطیاں اتنی فاش ہیں کہ بعض جگہ تو مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدھ طویل خط کے متعلق

۱۔ مثلاً اس اہم خط کو بھیجے جو مکتوبات امام ربانی کے متعلق معاصرانہ رسالہ استفادہ کے بارے میں ہم ملاحظہ کا حامل ہے۔ متعلقہ عبارت ملاحظہ ہو۔ ”تجربہ نمودہ اند۔“ [کہ جواب] از رسالہ استفادہ [نمودہ حقیقت حال] آن کہ دریں [باب] بادشاہ دین پناہ۔ شیخ [؟] بالمشافہ بعضے حقائق از رسالہ موصولہ ایشان بر این فقیر بیان نمودند۔ و چیز بابر زبان نیز فرمودہ اند کہ نقل تفصیل آن طورے وارد۔ چون دلائل وقت فقیر از حقیقت حال واقع نہ بود۔ از راہ علم و دانائی ایشان تعجب و استفادے آن (؟) نمود۔ بعد ازاں [بادشاہ بہ] شیخ عبداللہ فرمودند کہ آن رسالہ را پیش ایشان [خواجہ محمد نقشبندؒ] خواہی برد تا مطالعہ نمایند۔ و بر حقائق آن واقع شوند۔ و ہر چند گفتہ شد۔ شیخ مذکور نیاورد۔ کوچ ہم در بیان بود۔ دلائل فرصت قلیل (اطلاق بر حقائق و توجیہ آن بعید نمود) [مکتوب ۱۱] خط کے باقی حصے میں مکتوبات امام ربانی کے متعلق توجیہ و تاویل سے کام لیا ہے۔ اور اصلاح حال کے لیے [مکتوب الیہ سے] کہا ہے کہ ”متصدیان دربار محل قاضی القضاۃ و عبدالرحیم خاں و غیر ان کہ از دوستان و معتقدان این سلسلہ علیہ اند“ کو اس بارے میں لکھا جائے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں بین القوسین عبارت ہماری ہے جو قیاس پر مبنی ہے۔ لیکن ہے کہ ہمارا قیاس غلط ہو، لیکن ظاہر ہے کہ جس صورت میں یہ عبارت درج ہے اسے بغیر کسی قیاسی اضافہ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

تو خیال آتا ہے کہ شاید اصل ناقل کو مستشرق اوراق ملے۔ اور نقل کرتے وقت صفحات کی ترتیب ہی بدل گئی، لیکن اس کے باوجود مجموعہ بے حد اہم ہے۔ خواجہ محمد نقشبند قریباً عہدِ عالمگیری کے پچیس سال تک مسندِ ارشاد و ہدایت پر متمکن تھے۔ اس لیے عالمگیر اور حضراتِ مجددیہ کے تعلقات جاننے کا سب سے مستند ذریعہ یہ مجموعہ ہے۔ اس میں ایک مکتوب ہے جو یقیناً اس زمانے کا ہے، جب عالمگیر نے گوکنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یا اسے ابھی فتح کیا تھا۔ اس میں ایک اہم خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

و دیگر فقیر بقصد زیارت حرمین الشریفین از وطن برآمدہ بود۔ در اثنا سہ راہ فرطی پادشاہ دین پناہ بہ دستخط خاص مشتمل بر کمال اشتیاق و اختصاص رسید۔ بموجب مہربانیہائے آن حضرت خود را بہ خدمت ایشاں رسانید۔ غایات بے غایات فرمودند و دینی موسم رخصت نہ نمودند۔ و بادشاہ زادہ محمد کام بخش را در حضور خود طلبیدہ بہ ایں فقیر سپردند۔ کہ من ہم در صحبت بزرگان ایشاں ایں طریقہ علیا حفظ یا احترام۔ شملہ سم ازیشاں استغلا نمائید۔ و بخدمت ایشاں مشغول شوید۔ حسب الامر فقیر بادشاہ زادہ را مشغول ساخت۔ مخلوق گذشتہ۔ رفتہ دیگر بحکم بادشاہ دین پناہ بہ فقیر خانہ نیز رسیدند۔ خود (عالمگیر) ہم چند نوبت کرد آمد و رفت نمودند۔ [مکتوب ۱۲]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ محاصرہ کے وقت عالمگیر نے سرہند کے اہم ترین شیخ کے ساتھ خاص ارتباط کا اظہار کیا۔ اور اپنے چاہیتے بیٹے کام بخش کو اسی طرح توجہ

[بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۸۹]

پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔ البتہ قیاسی اضافوں کے بغیر بھی یہ امر واضح ہے کہ اس میں رسالہ استغنا کا ذکر ہے جو بادشاہ کو ملا تھا۔ [ادبِ جوہد کی عہد شد سے مکتوباتِ مہم ربانی کے متعلق معلوم ہوتا ہے:-] بادشاہ نے خواجہ نقشبند سے اس کے متعلق ذکر کیا۔ اور بعض باتیں کہیں جنسِ انجمنِ تخیل کیا۔ چیزِ ہندوؤں پر زور نہ دیا کہ تخیل تو ملے ملا، خواجہ صاحبِ سیر رسالہ نہیں دیکھا تھا اس لیے انجمنِ تخیل ان ہیانت پر فقط توجہ کا اظہار کیا۔ خواجہ نقشبند ثانی کے مکتوبات کی روشنی میں یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر وہ سارے کے سارے پوری صورت کے ساتھ شائع ہو گئے۔ تو محمد عالمگیری کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوگا۔

دلانی۔ جس طرح اُس نے خود خواجہ محمد مصحوم کی زندگی میں حاصل کی تھی۔

فتح بجا پور گوکنڈہ کے زمانے میں خواجہ محمد نقشبند سے بادشاہ کے جو خاص روابط تھے ان کا ثبوت محاصرہ کتب تواریخ سے ملتا ہے۔ مآثر عالمگیری (ترجمہ شائع کردہ ممتاز پریس) کے صفحہ ۱۹۶ پر شیخ محمد نقشبندی [نقشبند] سرہندی کی بادشاہ سے ملاقات اور گفتگو کی بیان ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۹ پر ان کے بیٹے شیخ محمد عمر سے تانا شاہ والی گوکنڈہ کی بیٹی بیاہے جانے کا ذکر ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ والی گوکنڈہ کی دوسری دو بیٹیاں وزیرِ سلطنت اسد خاں اور سابق والی بجا پور کے بیٹوں سے بیاہی گئیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ محمد نقشبند کو بادشاہ کی نظروں میں کس قدر وقعت و احترام تھا۔

مآثر عالمگیری کے اور کئی اندراجات ہیں جن کے شیوخ سرہند اور عالمگیر کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً جلوس کے سال یا زوہم کے ضمن میں ذکر ہے کہ جب شاہزادہ محمد اعظم کی شادی ہوئی۔ تو دو گواہوں میں سے ایک شیخ (سیف الدین) سرہندی تھے۔ اسی طرح بارہویں سال جلوس کے ضمن میں لکھا ہے:-

قبلہ عالم تیرہ محرم کو ایک گھڑی رات گزرنے کے بعد بارغ حیات بخش کے راستے سے شیخ سیف اللہ (سیف الدین) سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور دیر تک حقائق و معارف کی گفتگو فرما کر دولت خانہ پر آگئے۔

شیخ سیف الدین کے متعلق بیسیانات تو ابتدائی عہدِ عالمگیری کے ہیں، لیکن درکن والے تمام اندراجات ۸۹-۱۰۸۸ء کے متعلق یعنی مکتوبات کے متعلق قاضی شیخ الاسلام کے خط کے بہت بعد کے ہیں۔ اس زمانے کا ایک اور معمولی واقعہ ہے جس سے سرہندی سلسلے سے بادشاہ کے اختصاص کا اظہار ہوتا ہے۔ سن ۱۰۹۹ء کے آغاز میں جب ابھی

خواجہ نقشبند ثانی کا وقار و احترام اور طریقہ کارِ مفاہیوں کی نظر میں جس طرح کھٹکتا تھا اس کی ایک جگہ فتح خاں عالی کے وقائع میں نظر آتی ہے جس کے کئی صفحے مشیخان سرہندی وطن کی ہجو سے پُر ہیں۔

راچور فتح ہوا تھا۔ ایک آدمی آیا۔ اور کہنے لگا کہ میں بادشاہ کا مرید ہونے کی خاطر فوراً دروازہ
ملک بنگالہ سے آیا ہوں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے مسکرا کر حیب سے کچھ نقدی
نکالی۔ اور ملازمین کو دے کر کہا کہ یہ شخص ہمارے فیض سے جس چیز کا امیدوار ہے وہ
یہی ہے۔ یہ اسے دے دو۔ لیکن اس شخص نے عطیہ کو پھینک دیا اور خود فرط مالوسی
سے دریا میں جس کے قریب خیام شاہی نصب تھے۔ کود پڑا۔ پیرا کوں نے نکالا۔
تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو میاں محمد نافع سرہندی کے
پاس لیجا کر کہو کہ اسے مرید کر کے سرہندی ٹوپی اس کے سر پر رکھیں (بائبر عالمگیری ص ۲۳۲-۲۳۳)
اس زمانے میں سرہندی سلسلے سے یہ اختصاص خواجہ نقشبند ثانی کے
غیر معمولی احترام اور شہزادہ کام بخش کی مریدی سے ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ
بادشاہ کو بڑا عزیز تھا۔ اور مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع ہو چکے تھے۔ خواجہ
محمد نقشبند ثانی نے مکتوبات کی توضیح و توجیہ کے لیے جو کوششیں کیں ان میں سے ایک
یہ تھی کہ ”رفع اتہام“ کے لیے انھوں نے قاضی القضاۃ شیخ الاسلام کو جو خط لکھا،
اس کے ساتھ ایک علیحدہ کاغذ میں حضرت مجدد الف ثانی کے بعض ارشادات [مثلاً
دفتر سوم، مکتوب ۱۱۱ سے] درج کیے، جو خواجہ صاحب کے مطبوعہ مکتوبات
کے ساتھ شائع نہیں ہوئے۔ ان کے متعلق انھوں نے قاضی شیخ الاسلام کو لکھا:-
این فقیر فقرات بسیار ہمگی انوار از کلام جد بزرگوار در کاغذ علیحدہ نوشتہ بخدمت شریف
فرستادہ است۔ حسبہ اللہ ان را مطالعہ نمایند و قیاس فرمایند و بہ نظر بندگان
حضرت در آرد۔

پتا نہیں۔ کہ ان اقتباسات سے بادشاہ کی تسلی ہو گئی یا کوئی اور سبب تھا۔
اتحاد یقینی ہے کہ مکتوبات والے واقعہ کے کئی سال بعد بھی اورنگ زیب کی طرف سے
سلسلہ مجددیہ کے بزرگوں کا پہلے جیسا، بلکہ اس سے زیادہ احترام و اختصاص نظر
آتا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہیں۔ کہ مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع
ہو چکے تھے۔

عالمگیر کے دل میں بزرگان سرہند کے لیے ایک خاص جگہ تھی، لیکن یہ امر غور انداز نہ
کرنا چاہیے کہ اس کی طرف سے کئی دوسرے سلسلوں کے اولیاء کے احترام کی بھی شہادتیں
ملتی ہیں۔ بائبر عالمگیری میں لکھا ہے۔ ”قبلہ عالم کو اولیاء کبار کے ساتھ جو عقیدت
و خلوص ہے، ظاہر ہے۔ اور ان برگزیدہ نفوس کے اسلاف و اخلاف تمام افراد جہاں شاہ
کی نگاہ میں بے حد معزز و مکرم رہے ہیں۔“ (ص ۲۲۷) ان میں سے بعض مجددیہ سلسلے کے
مخاضین بھی تھے۔ مثلاً عالمگیر کے رقعات کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے
کسی میں اُس کے اپنے قلم سے بزرگان سرہند کا کوئی ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا،
لیکن رقعات عالمگیری کا جو مختصر مجموعہ عام طور پر ملتا ہے، اس میں بھی شیخ عبداللطیف
برہانپوری کی بادشاہ نے جس طرح تعریف کی ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔
اور مرآۃ جہاں نما میں بخاور خلا (یا محمد تقاسم برہانپوری) بھی شیخ کی نسبت لکھتا ہے۔
”خدیو حق جو در آواں بادشاہزادگی شہنائے جمعہ بمنزل آں عزت گزیں تشریف بڑہ مجتہد
معنوی میداشتند۔ و شیخ بزرگوار ہم برے انجام امور دینی پیش حضرت دوسر بار آمد۔“
یہ شیخ عبداللطیف سلسلہ مجددیہ کے سخت مخالف تھے۔ مثلاً معارج الولاۃ میں جو
عبد عالمگیری کی تالیف ہے، ان کی نسبت لکھا ہے۔ ”و کلمات تصوف را نگفتے۔ [و کہے
کہ گفتمے] اور ابہ الحاد و زندقہ نسبت کر دے۔ خصوصاً کہ راکہ بہ شیخ احمد کالی و شیخ
آدم بنوری نسبت دلشتے۔ اور احماد و زندقہ گفتے۔ و فرمودے کہ نماز عقب ایشاں
جائز نیست۔“

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیب کو شرع کا ترجمان بنانے میں
فقط بزرگان سرہند کو دخل نہ تھا۔ اس میں کئی دوسرے اثرات بھی شامل تھے۔ مثلاً شیخ
عبداللطیف برہانپوری ہی کی نسبت جن سے مرآۃ جہاں نما کے بیان کے مطابق عالمگیر
کے ایام شاہزادگی کے دوران جب وہ دکن کا ایک مدت تک صوبیدار تھا گہرے روابط
قائم ہوئے۔ معارج الولاۃ میں لکھا ہے۔

مرد متقی و متشرع و نادر و متقدم بود۔ ہر کہ بخدمت او میرستے۔ با حکام شرع اورا

دمیت کر دے۔ دگفتے فقیر آن است کہ متشرع است۔ و ہر کہ متشرع نیست فقیر نیست۔ و کتب فقہ را بسیار مطالعہ کر دے۔

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں اہل قلم حضرات کی کثرت ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے کو شروع سے علم کے ساتھ اختصاص رہا ہے) ان بزرگوں کی تالیفات کی اشاعت بھی دوسرے سلسلوں کی تصانیف سے زیادہ ہوئی ہے، لیکن دوسرے سلسلوں کے قلمی مخطوطے اور دیگر محاسن انرا دینی اور تاریخی ناخذ غور سے پڑھیں تو خیال ہوتا ہے کہ عالمگیر کو فقط سلسلہ مجددیہ سے تعلق خاطر نہ تھا، بلکہ وہ بڑا بلند نظر اور وسیع المطالعہ بادشاہ تھا۔ وہ نیکی، دیانتداری اور محبت دینی، خواہ وہ کسی خیال کے بزرگوں سے ظور پذیر ہو، قدر کرتا تھا۔ مثلاً ذکر جمیع اولیائے دہلی (دہلی) میں ایک مولوی محمد یعقوب صاحب کا ذکر ہے، جو عہد عالمگیری میں میر محل تھے۔ اور شاہزادگان سلطان محمد و محمد معظم کو پڑھاتے تھے۔ وہ بیس سال تک مدرسہ بادشاہی عقب مسجد جہاں نما کہے۔ بادشاہ ان کا اس حد تک محترم تھا کہ وہ ایک مرتبہ کسی وجہ سے قاضی عبدالوہاب کبیدی خاطر ہوا تو اس نے مولوی صاحب سے اس کی جگہ عہدہ قضا قبول کرنے کے لیے کہا، لیکن انھوں نے اپنی نسبت تو یہ کہا: "من یاقب قضا ندارم" اور قاضی سے بادشاہ کی کبیدی خاطر رند کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ مولوی محمد یعقوب وہی بزرگ تھے، جنھوں نے بادشاہ کے

اس سلسلے میں خواجہ محمد مصدوم کے خلیفہ خواجہ محمد باقر کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ کنز الہدایت میں لکھتے ہیں: "حضرت پیر دستگیر (خواجہ محمد مصدوم) کی قدم پائی کا فرحت حاصل کیا تو حضرت نے فقیر سے دریافت کیا کہ تم کچھ پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے ہو۔ فقیر نے عرض کیا کہ شغل باطنی کے زمانے سے تعلیم ظہری کا اتنا سلسلہ باقی نہیں رہا۔

دوسرے سفر میں بھی خلوت کے وقت حضرت نے دوبارہ دریافت کیا میں نے عرض کیا کہ مطالعہ ظہری کی مصروفیت کے وقت آنجناب سے تو جبرانی نہیں رہتی ہے۔ اور تو جو مطالعہ دہلی میں کیا کرتا ہو، یہی حضرت نے فرمایا کہ باور ہے مجھ کو کہ یہ ہو۔ ظہر ظاہر کی مصروفیت ہماری نسبت کو بڑھاتی ہے۔ اس زمانے سے فقیر کو مطالعہ ظہری کی توفیق بھی حاصل ہو گئی ہے۔" (ص ۸-۹)

اصرار، بلکہ عتاب کے باوجود داراشکوہ کے محض الحاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ "..... مدتے بلکہ عقلی عدالت و کالت شرعی ظل سبحان امتیاز داشت۔ محض کہ علم بر الحاد داراشکوہ ساختند۔ مولانا بلال محمد نکرند۔ ہر چند بادشاہ خطاب پر عتاب نمود کہ اس ہمارا فضل ہو کر دند۔ وجہ ہر نہ کہ دین شہادتیت۔ عرض نمود کہ سائیکہ کردہ اند (علم بر الحاد داراشکوہ دارندہ ملا علم بر الحاد او نیست) [ذکر جمیع اولیائے دہلی]۔

عالمگیری کی دلپسند کتب مطالعہ کی فہرست بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں مکتوبات امام ربانی یا سلسلہ نقشبندیہ کی کسی اہم کتاب کا کہیں نام نہیں ملتا۔ لیکن امام غزالی کی تصانیف کے متعلق متعدد شہادتیں ہیں۔ مائثر عالمگیری کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے: قبلہ عالم کے کمالات کسبہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے۔ جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات اور شیخ خواف الدین کی میزی کے مکتوبات الدین شیخ زین الدین و قطب علی الدین (قطب الدین؟) شیرازی کے رسائل کا خاص شوق ہے۔ اور یہ کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں۔

امام غزالی کی تصانیف سے عالمگیری کی دلچسپی کی شہادت عمل صالح سے بھی ملتی ہے اس کے مصنف میر سید محمد کی نسبت، جن کا شاہجہاں بھی بڑا قدر دان تھا، لکھتے ہیں:- والیوم در خدمت فیض مرہب حضرت خلافت مرتب محمد اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر مذکورہ اچانے علوم و کیمیا سے سعادت دریاں داد۔ [عمل صالح دفتر سوم ص ۴۹] مراۃ جہاں نما سے پتا چلتا ہے کہ عالمگیر نے دانشمند خاں سے امام غزالی کی اکثر کتابیں پڑھی تھیں:-

و خدیو زین بسج کتب رازند خانہ سلوات نشان [دانشمند خاں] انکار فرمودہ اند۔ و مصنفات حجت الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہ، خصوصاً کتاب کاوہ آیات، احیاء العلوم و المناہل تا آخر تلمذ نمودہ۔

دانشمند خاں [مولانا شمس الدین] سے یزدی [اس عہد کا مشہور فاضل اور فاضل نواز تھا۔ اس نے ایک مدت تک فرانسیسی جہاں گرد ستیاج ڈاکٹر برنیر کو اپنا جہان رکھا۔

اور اس سے متاخرین حکماء فرنگ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں "دانشمند خاں" کی (جسے وہ "ایشیا کا سب سے بڑا عالم" کہتا ہے) اور وزیر سلطنت فاضل خاں (علاء الملک قونی) کی علم و حکمت سے محبت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

اگر آثار عالمگیری کے مندرجہ بالا اندراج کی نسبت ہمارا قیاس صحیح ہے۔ کہ قطب محمد الدین شیرازی غالباً (علامہ) قطب الدین شیرازی کی تحریف ہے تو یہ خیال بجا نہیں کہ عالمگیر کو محققات سے بھی لگاؤ تھا۔ کم از کم جس استاد کی نسبت وہ کہتا تھا کہ میں نے جو کچھ سیکھا اس سے سیکھا۔ (چیزیکہ خواندہ ایم از خواندہ ایم) وہ (ملا عبد اللطیف سہارنوی) امام محققات حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ (مراۃ جہاں نما وغیرہ)

غرضیکہ عالمگیر کے بزرگان سرسند سے گہرے روابط تھے، لیکن اس کا نقطہ نظر بڑا وسیع تھا۔ اور شرع کے معاملے میں وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتا تھا۔

بنگال میں اسلام

عہد مغلیہ میں دہلی۔ لاہور۔ کشمیر۔ بلادِ پُرب۔ دکن۔ گجرات کے متعلق تو تاریخ و تذکروں کا ایک انبار ہے، لیکن جو علاقے اب پاکستان ہیں یعنی بنگال۔ مغربی پنجاب۔ ہندوستان اور بلوچستان۔ ان کے متعلق معلومات کی بڑی کمی ہے۔ بالخصوص بنگال کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ پر ناواقفیت کی ایک دبیز کڑھائی ہوئی ہے۔ تاریخ کے صفحات پر ہننا کبھی کوئی ٹھہر آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھیری رات میں کوئی جگنو چمک گیا اور اس کی روشنی میں راستے کی تلاش ہوتی ہے۔ ان حالات میں نہ صرف تواریخ کے صفحات بنگال کے متعلق تفصیلات سے بالعموم عاری ہیں۔ بلکہ مستند معلومات کی کمی کی وجہ سے بسا اوقات غلط رائیں مسلمات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

مثلاً بنگال کی اس عہد آفرین ویشنو تحریک کو لیا جائے۔ جس کی چیتنیہ نے رہنمائی کی اور جس کا صرف

چیتنیہ کی ویشنو تحریک

ہندو مذہب یا بنگالی زبان اور ادب ہی پر نہیں۔ اس علاقے میں اشاعت اسلام اور عامۃ المسلمین کی مذہبی حالت پر بڑا اثر پڑا۔ اس کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک کبیر یا بابا نانک کی تعلیمات کی طرح ہندو مذہب اور اسلام کو ملانے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس تحریک کا مقصد کبیریت یا ابتدائی سکھ مذہب کی طرح ہنود اور مسلمانوں کو ملانا نہیں تھا بلکہ ہندو مذہب کا احیا تھا اور اس مقصد میں یہ تحریک اس حد تک کامیاب ہوئی کہ نہ صرف بنگال میں اشاعت اسلام رگ گئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے ویشنو مذہب اختیار کیا اور مسلمانین اور وسطی اور شمالی بنگال کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے عقاید و اطوار میں ہندو طریقے داخل ہو گئے۔

چیتنہ وسطی بنگال کے شہر ندیا میں جو پہلے ہندو راجاؤں کا دار الحکومت تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح بنگالہ (اور لکھنؤ) کے حکم نشین شہر بن جانے کے بعد ہندوؤں کا علمی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا۔ ۱۲۸۸ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بعد میں مسلمان بیروں سے مسئلہ توحید پر بحث و مباحثہ کیا اور وہ مسلمان عقائد اور نقطہ نظر سے بے خبر نہ تھا۔ اس کے طریقے میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن میں شاید صوفیہ کے طریق کار کو دخل تھا۔ اس کے قریبی اند با اثر ساتھیوں میں کم از کم ایسے تھے جو فلسفی اور عربی کے ماہر اور بنگال کے مسلمان بادشاہ کے دربار میں دو بڑی با عزت اسامیوں پر مامور تھے۔ روپ اور ستان دو بہمن بھائی تھے۔ جن کا مورث اعلیٰ کرناٹک میں کسی ریاست کا حاکم ہو گیا۔ ۱۳۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس کی وفات ۱۳۱۶ء میں ہوئی، لیکن مرنے سے پہلے گورکھ کے کسی مسلمان حاکم سے اس کی دوستی ہو گئی جو ان دنوں جنوبی ہندوستان میں سفر کر رہا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی اور ان میں سے ایک نے گورکھ میں اپنے باپ کے مسلمان دوست کے پاس پناہ لی اور ایک معزز عہدے (وزارت) پر مامور ہو گیا۔ ۱۳۲۳ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ روپ اور ستان کا باپ پیداوا کا پوتا تھا۔ ان دو کے اصلی نام سندوش اور امر تھے۔ راسے بہادر و نسش چند سین کے بیان کے مطابق جس سے ہم نے یہ تفصیلات نقل کی ہیں، دونوں بھائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم انکاؤں کے مشہور عالم سید فخر الدین سے حاصل کی اور شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ستان شاہ بنگالہ کا دیر خاص تھا۔ اور روپ جسے شاہ کرناٹک کا خطاب ملا تھا وزیر تھا۔ دونوں نے سنسکرت میں بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی تھی اور اپنے گاؤں میں (جو گورکھ کے نواح میں تھا) کرناٹک کے کئی برہمنوں کو بلا کر آباد کیا۔ ۱۵۱۶ء میں چیتنہ سے ملے اور دیشنومت اختیار کیا۔ چیتنہ نے ہی انھیں نئے نام دیے جن سے وہ مشہور ہوئے۔ دونوں نے شاہی ملازمت کو ترک کر کے سادھوؤں کی طرح اپنے آپ کو نئے طریقے کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ چیتنہ نے انھیں بندرا بن جا کر پُرانے تیرتھوں کا کھوج نکالنے کے لیے

کہا۔ چنانچہ ستان اور روپ اپنے ایک بھتیجے اور چیتنہ کے بعض دوسرے با اثر مریدوں کے ساتھ بندرا بن میں آکر مقیم ہوئے اور وہ عمل شروع ہوا۔ جو متھرا اور بندرا بن کو شمالی ہند میں ہندو مذہب کے احیا کا بڑا مرکز بنادینے والا تھا۔

دیشنومتزکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان دو بھائیوں کی شہرت اکبر تک پہنچی اور اس نے ۱۵۷۳ء میں متھرا آکر ان سے ملاقات کی۔ اکبر کی روپ اور ستان سے ملاقات کی روایت صحیح ہو یا غلط، لیکن اتنا یقینی ہے کہ بنگالہ کا مغل صوبیدار مان سنگھ ان کا بڑا معتقد تھا اور سر جادو ناتھ سرکار کہتے ہیں کہ چیتنہ کی تحریک کو جسے پور کے راجپوت خاندان سے بڑی مدد ملی۔ بندرا بن میں اس زمانے میں جو سرنگھٹ مندر تعمیر ہوئے، ان میں سب سے پرشکوہ (گوہندجی کا مندر) مان سنگھ نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا اور مندر کے ایک سنسکرت کتبے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مندر ۱۵۹۹ء میں "ہمارا راجا پریمپتی راج کی نسل کے" راجا مان سنگھ نے اپنے گوروپ اور ستان کی زیر ہدایت تعمیر کرایا۔

متھرا کے قرب و جوار میں تعمیر منادر کا یہ وسیع سلسلہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو سلطان محمود غزنوی کی متھرا میں وسیع بڑھتی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان دار الحکومت (اگرہ) کے قریب سے مندر کثرت سے اور بڑے طعرات سے تعمیر ہو رہے تھے۔ دوسرے اکبر کے دربار میں جس واقعہ نے علما کے اختیارات کا مسئلہ سخت نازک صورت میں پیش کیا اور محض کی ترتیب اور اکبر کے امام عادل بننے کا پیش خیمہ ہوا۔ وہ متھرا بندرا بن کی اعلیٰ عمارتی سرگرمیوں کا شاخسانہ تھا۔ ہم اکبری عہد کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۵۷۹ء میں صدر الصدور کے سامنے متھرا کے ایک ایسے برہمن کا مقدمہ پیش ہوا، جس نے مسجد کے مسئلے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ اور جب اس سے باز پرس ہوئی تو بانی اسلام کے متعلق اہانت آمیز کلمات کہے۔ بالآخر شیخ عبدالنبی صدر الصدور نے اس برہمن کو قتل کر دیا تو اکبر کی راجپوت مانیوں نے جن میں مان سنگھ کی بھوپتی بھی تھی، سخت شکایت کی اور آخر کار اکبر نے محض لکھو اگر اختلافی امور میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں

لے لیے۔ اس زمانے میں سحرابندرا بن میں اس کثرت سے مندر تعمیر ہو رہے تھے کہ وثوق سے اس واقعہ کو کسی خاص مندر سے متعلق کرنا ممکن نہیں لیکن بہر کیف اسلامی ہند کی مذہبی تاریخ کا یہ بحران ویشنو مت کی اس اجماعی تحریک کا بلاواسطہ نتیجہ تھا جو تعمیر مندر اور دوسری صورتوں میں اظہارِ بارہی تھی۔

بنگال میں ویشنو تحریک کے اثرات
چیتنہ کی وفات ۱۵۳۷ء میں ہوئی۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی اور بیانات میں مخالف سلام عناصر نمایاں نہیں اگرچہ اس نے اسلام کے ترجمانوں سے بحثیں کیں اور ویشنو تہذیب کے مطابق ان میں سے بعض کو اپنے طریقے کا پیروکار بنایا یہ صحیح ہے کہ چیتنہ پر کرشن بھگتی والہانہ طور پر غالب تھا لیکن اس کا روپ اور سائن کو پُرانا تہذیبی ترقیوں کا کھوج نکالنے کے لیے سحرابھینا ہی ایک اجماعی تحریک کا آغاز تھا اور اس کے جانشینوں کے ہاتھ میں تو اس تحریک نے بالکل ایک جارحانہ صورت اختیار کر لی۔

چیتنہ کی تحریک کا جو اثر بنگالہ کے باہر ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ بنگالہ کے اندر تھا۔ اس علاقے میں اس نے اشاعتِ اسلام کا سلسلہ روک دیا۔ اسلام کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ اچھوت سمجھا جاتا تھا اور ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں معزز جگہ نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اسلام کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ویشنو تحریک نے ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں ہی باعزت جگہ بنا دی۔ اور یہ تعلیم دی کہ جو کوئی کرشن کا سچا بھگت ہوگا۔ اسی کی مکتبی ہوگی۔ خواہ وہ چندال ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس تحریک اور اس کے مختلف مظاہر نے ہندو جاتی میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس نے اسلامی مبلغین کی کامیابی ناممکن بنا دی۔ چنانچہ جس علاقے میں یہ تحریک کامیاب ہوئی وہاں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ وہی قبیلہ اور ذاتیں جن کے بھائی ہندو مشرقی بنگال میں مسلمان ہو گئے ہیں مغربی بنگال میں ہندو رہے اور اس کا بڑا سبب ویشنو اثرات تھے۔

ویشنو تحریک کا کام فقط دفاعی نہیں جارحانہ تھا۔ اس نے فقط ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے نہیں بچایا بلکہ مسلمانوں میں ویشنو مت کی اشاعت کی۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی ہوئی۔ چیتنہ نے خود بعض مسلمانوں کو ارتداد کا راستا دکھایا۔ اس کا ایک قوی سا تھی ہری واس پیلے مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان سے تھا۔ اسی طرح بجلی خاں ایک افغان سورا اس کے ہاتھ پر ویشنو ہوا۔ شیاماند نے کثرت سے مسلمانوں میں پرچار کیا اور کامیاب رہا۔ اس نے اس مقصد کے لیے اقتصادی حربے بھی استعمال کیے اور جانا رائن گڑھ سے کہا کہ مسلمان ضرور جنگ اپنا مذہب ترک نہ کریں انھیں کام نہ دیا جائے۔ پجلی ذاتوں میں یہ سلسلہ بہت وسیع تھا مسلمانوں کو پورا ویشنو بنانے کے علاوہ ویشنو طریقے کی کئی شاخیں ایسی شروع ہوئیں جن کا مقصد مسلمانوں کو ویشنو سلسلے سے منسلک کرنا تھا۔ ایک فرقہ درویشی تھا جو سائن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت وسیع سلسلہ باؤل فقیروں کا تھا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ فرقہ تھا۔ لیکن چیتنہ مت کے متعلق ڈاکٹر کیفیدی اپنی کتاب میں صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بنگالی ویشنوؤں کا ایک گروہ ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن انھوں نے بھی ان لوگوں کے رہنماؤں کے جو نام دیے ہیں وہ زیادہ تر ہندو ہیں اور سب مذہب کے ضلع سے متعلق ہیں۔ راسخ الاعتقاد مسلمان انھیں غیر مسلم سمجھتے ہیں اور اس خیال کی تائید میں فتوے بھی شائع ہوئے۔

ویشنو تحریک نے ادب کے ذریعے بھی بنگالی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ایک تو اس جاندار وسیع تحریک نے بنگالی ہندوؤں میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا کر دی اور اب زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کی شدید جذباتی کیفیت نے کثرت سے با اثر اشعار کا جامہ اختیار کیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر دھج ہوا۔ ایک تو اس نئے ادب نے بنگالی زبان اور ادب کو ایک خاص رنگ دے دیا جس نے بنگالی بولنے اور سمجھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کے اشعار اس طرح

مقبول ہو گئے کہ کسی مسلمانوں نے جو دیشنومت تھے، ان مضامین پر نظمیں لکھیں۔ بالآخر حالت یہاں تک پہنچی کہ چشتی پیروں کی مجالس سماع میں بشن پید (دیشنویت) لگائے جاتے اور ان پر اہل حال وجد کرتے۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ تصنیف مسائل المتلخ ہے، جو حضرت نور قطب عالم کے سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ قطب الدین تھانی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مرتب کی۔ اس کتاب میں حضرت نور قطب عالم سے ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ جب ان کی محفل میں بشن پید دوسری نعتوں وغیرہ کے ساتھ گائے گئے اور کسی نے کہہ کر۔ رادھا اور اس طرح ہندو ناموں پر اعتراض کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ قرآن مجید میں بھی فرعون، نمرود کے نام ہیں۔ حضرت نور قطب عالم سے اس روایت کا انتساب تو غالباً بشن پید کے جواز کے لیے ایک مستند اور مشہور بزرگ کے ارشاد دھونڈنے کا نتیجہ ہے، اتنا قرین قیاس ہے کہ جن بزرگوں نے یہ روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے ان کی مجلس میں یا کم از کم اس زمانے کی صوفیہ مجالس میں بشن پید نعتوں اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے!

بنگالی مسلمانوں کا ردِ عمل

دیشنومت اور دوسری ہندو اخیانی تحریکوں اور اس کے ساتھ ساتھ باہر سے مسلمان مبلغوں کی آمد بند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے نچلے طبقے میں جو فارسی دان حکام اور علما کے اثر سے دور تھا۔ عقائد اور اعمال کے بارے میں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ ہندو اور مسلمان عقائد خلط ملط ہو گئے۔ باطل طریقہ اور ستمیہ پیر ماننے والے بڑھ گئے۔ اور عوام الناس کے دین کو مقامی اور ہندو خیالات نے مسخ کر دیا۔ اس صورتِ حالات کی تلافی انیسویں صدی سے شروع ہوئی۔ جب حاجی شریعت اللہ مولانا شاہ ام الدین اور مولانا کرامت علی جیسے بزرگوں نے اصلاح عقائد کا بیڑا اٹھایا، لیکن عوام الناس کے عقائد اور منفی غیر مسلم اثرات کے بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدا نخواستہ اس سرزمین میں اسلام کی قدر و منزلت نہ تھی۔ یا مقامی اہل فکر نے اصلاح حالت کی کوئی کوشش نہ کی۔

مثلاً بنگال کے جن حسین شاہی مسلمان بادشاہوں نے (سنسکرت مقابلے میں) بنگالی ادب کی سرپرستی کی اور رامائن۔ مہابھارت اور دوسری کتابوں کے بنگالی ترجمے کرائے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان اور اسلام اور علوم اسلامی پر جان دینے والے تھے۔ اس خاندان کا موروثی اعلیٰ علامہ الدین حسین شاہ خود عرب تھا۔ اس نے کثرت سے مساجد اور مدرسے تعمیر کرائے۔ ان کے لیے اور بزرگوں کے مزارات کی نگہداشت کے لیے ہزاروں بیگمے زمین وقف کی۔ حضرت نور قطب عالم کے مزار کی زیارت کے لیے ہلال اپنے دار الخلافہ سے پنڈروہ جاتا تھا۔ جمعہ کی نماز باقاعدہ جامع مسجد میں جا کر پڑھتا۔ یہی سلسلہ اس کے بیٹے نصرت شاہ اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے جاری رکھا۔ افسوس کہ اس عہد کی فارسی تصانیف ایک دو کے سوا جمع نہیں ہوئیں۔ مسلمان ابھی تک غالباً بنگالی میں علمی کتابیں لکھتے ہیچکھاتے تھے، لیکن اس زمانے کی کسی عمارتیں اور متعدد کتب محفوظ ہیں۔ ان سے حسین شاہی خاندان کی دینداری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ جب دیشنومت کا ادب اور رامائن۔ مہابھارت کے بنگالی ترجمے مسلمانوں میں عام ہونے شروع ہوئے تو خود بنگالہ میں کسی اہل دل مسلمان اٹھنے جنھوں نے اسلامی موضوعات پر بنگلہ میں نظمیں لکھیں کتابیں لکھ کر بنگالی مسلمانوں کے لیے صالح دماغی اور روحانی غذا احتیاج کی۔ اس تحریک کا پیش رو سید سلطان تھا جس نے ۱۸۵۲ء (یعنی اکبر کی تخت نشینی کے زمانے میں) بوقار رسول لکھی جس کے شروع میں اس نے کہا کہ چونکہ بنگالی مسلمان عربی فارسی نہیں جانتے اور بنگالی میں اسلامی موضوعات پر کتابیں نہیں، اس لیے ناچار مسلمان بھی رامائن۔ مہابھارت پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حالات کی اصلاح کے لیے میں اپنی کتابیں لکھ رہا ہوں۔ علما اسے ناپسند کرتے ہیں اور مجھے منافق کہتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا فرض کیا ہے! سید سلطان کی وفات رسول شائع ہو گئی ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات صورتِ حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں سید سلطان فرماتے ہیں (ترجمہ) سب بنگالی عربی نہیں جانتے۔

کوئی اپنے دین کی باتیں نہیں سمجھتا۔

ہر کوئی کتھا کہانیوں سے دل بہلاتا ہے۔

میں گنہگار اور ملاندہ مخلوق ان لوگوں کے درمیان ہوں۔

مجھے معلوم نہیں کہ روزِ جزا مجھ سے باری تعالیٰ کیا پوچھے گا۔

لیکن اگر اس نے پوچھا کہ ان لوگوں کے درمیان رہ کر ان کو دین کی باتیں نہیں بتائیں۔

اور مجھے اس قصور کے لیے ملزم قرار دیا تو میں کیا جواب دوں گا؟

یہی سوچ کر میں نے نبی دمسار خاندان نبوی کی تاریخ اکھٹی ہے۔

اور اس لیے اتنے لوگ کہتے ہیں کہ میں نے دین کی کتاب کو ناپاک کر دیا۔

اگر پڑھے لکھے لوگ عربی میں کتابیں پڑھیں اور ان کا ہندوئی (بنگالی) ترجمہ نہ کریں

تو لوگوں کو یہ چیزیں کس طرح سمجھ آئیں گی؟

جس زبان (کے خطے) میں خدا نے کسی کو پیدا کیا ہے۔ وہی اس کا بڑا خزانہ ہے۔

یہ غور طلب امر ہے کہ ان سطور میں سید سلطان نے بنگالی کو ہندوئی کہا ہے

اور اگرچہ ان کی کتاب کی زبان بنگلہ ہے، لیکن اس میں سنسکرت کے الفاظ نہیں اور

ہندوستانی اور بنگالی کے اتنے مشترک الفاظ ہیں کہ جدید بنگالی نہ جاننے والے کے لیے

بھی جلدت کا بھنادشوار نہیں۔ آگے چل کر سید سلطان اپنا نقطہ نظر اور وضاحت

سے بیان کرتے ہیں :- (ترجمہ)

اگر پڑھے لکھے عام لوگوں کو تسلیم نہ دیں گے تو وہ بچارے ضرور دوزخ میں جائیں گے۔

اور اگر عام لوگوں کو اقصیت کی درجہ سے گناہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اہل علم کو اس کا ذمہ ارجھے گا۔

چونکہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ اس لیے میں اہل علم سے صاف صاف کہتا ہوں۔

(روزِ قیامت) خدا کے گا۔ تم لوگ اہل علم تھے۔ تم نے گناہ سے لوگوں کو کیوں نہ روکا؟

پس اہل علم روزِ قیامت اپنا فرض ادا نہ کرنے کے مجرم ٹھہریں گے۔

جب باری تعالیٰ لوگوں کے نیک بد کا حساب کرے گا تو وہ کہیں گے۔

ہمیں ایک اہل علم ملا تھا۔ لیکن اس نے ہمیں سکھایا نہیں۔

تو خدا ہم اہل علم کو اور بھی ملزم قرار دے گا۔

اس ڈر سے اور نبی کی عظمت کا خیال کر کے میں تمہیں بتاتا ہوں تاکہ تم گناہوں میں نہ پڑو۔

اللہ نے مجھے کتاب شریف کا علم دیا ہے تاکہ لوگوں کو بتاؤں۔

اس لیے میں نے یہ بچاؤی تصنیف کی۔

علماء مجھے منافق کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ہندوئی زبان میں لکھ کر دین کو ناپاک کر دیا۔

لیکن خدا کا ارشاد ہے۔ میں نے نبی بھیجا۔ اس ملک کی زبان میں تعلیم دینے کے لیے

جس میں وہ پیدا ہوا۔

سید سلطان اہل علم میں سے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی مقامی اثرات

کافی ہیں۔ انہوں نے رسول اکرم کے جو واقعات لکھے ہیں ان میں بعض ایسے قصے بھی

درج ہیں جو کرشن اور شنو کے متعلق ہیں، بلکہ انہوں نے تو نبی کریم کو اوتار کہا ہے۔

یا تو یہ مقامی اثرات کا نتیجہ ہو گا یا سید سلطان نے عوام کے ساتھ اس پیرائے میں کلام

کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس کے وہ حادثی ہو چکے تھے، لیکن ان کی تحریر سے یہ بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ بنگالی مسلمانوں کے خیالات اور رجحانات کی عینی سرزمین کو سمجھنے کے لیے

یہاں کے مقامی اثرات کا کھلے دل سے مطالعہ کرنا ہو گا۔

سید سلطان کی تحریروں سے خیال ہوتا ہے کہ ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) یا ایک اور

مسودے کے مطابق ۹۶۲ھ (یعنی ۱۵۵۲ء) تک کسی نے بنگالی میں خدا اور رسول کی

نسبت نہیں لکھا۔ سید سلطان کی تصانیف دو قسم کی تھیں۔ ایک تو وہ جن میں انہوں نے

قصص الانبیاء اور سیرت نبوی کی روایات بنگالی میں منتقل کیں۔ دوسرے وہ جن میں

اسلامی فلسفہ یا تصوف اور شریعت کے مسائل کو بنگالی زبان میں لکھا۔ دوسری قسم کی

اہم کتاب گیان پردیپ (یعنی نورِ عرفان) ہے۔ جس میں سلطان نے صوفیانہ خیالات

کو تندرستی یوگ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ان کے جانشینوں نے ان کوششوں کو بڑی

وسعت دی۔ اور حج۔ روزہ۔ نماز۔ زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی پر کثرت سے

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں کتابیں لکھی گئیں۔ ان تصانیف میں اصل اللہ خاں کا

شہرت نامہ خاص شہرت رکھتا ہے، لیکن مغلیہ دور کے سب سے مشہور بنگالی شاعر علاؤل نے بھی ان مضامین کی توضیح کے لیے تحفہ لکھا۔

اسلامی خیالات کو بنگالی میں منتقل کرنے والوں کا اگلا قدم عربی اور فارسی قصص اور ان زبانوں کی ادبی تصانیف کا بنگالی ترجمہ تھا۔ ان میں داستان امیر حمزہ - یوسف زلیخا - سکندر نامہ - ہفت پیکر کے ترجمے خاص شہرت رکھتے ہیں جن میں بعض علاؤل کے قلم سے ہیں۔

سید سلطان کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:-

- ۱۔ شب محراج ۲۔ رسول وجہ ۳۔ وفات رسول ۴۔ اربعین نامہ - ۵۔ معرفتی گان ۶۔ گیان پردیپ -

سید سلطان کی تالیف وفات و پیدائش اور جائے رہائش کے متعلق اختلاف ہے۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے ہم عصر تھے۔ بعض انھیں ضلع سلہٹ کا باشندہ کہتے ہیں، لیکن ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق کے مطابق وہ ضلع چٹاگانگ کے رہنے والے تھے۔ بنگال کے قدیم مسلمان ادیبوں کی تصانیف پر ابھی تک اتنی تھوڑی تحقیق و تفتیش ہوئی ہے (ان میں سے اکثر) بیشتر ابھی قلمی مسودوں کی حالت میں ہیں کہ ان کے زوانہ حیات کے متعلق شدید اختلافات ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق متعدد ایسے بنگالی ادیبوں کے نام گناتے ہیں جنہوں نے سید سلطان سے پہلے اسلامی موضوعات پر بنگالی کتابیں تصنیف کیں، لیکن دوسرے اہل الرائے ان سے متفق نہیں۔ اور وفات رسول سے جو طویل اقتباسات ہم نے دیے ہیں، ان سے بھی خیال ہوتا ہے کہ سید سلطان نے اس میدان میں پہل کی۔ سید سلطان پیری مریدی بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وفات رسول میں خلفائے راشدین اور واقعہ ذکر بلا کا ذکر کریں، لیکن وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مرید محمد خاں سے تکمیل کا کہے لیے کہا اور محمد خاں نے اس ارشاد کی تعمیل میں صحابہ اربعہ کا بیان بہ مقبول حسین اور قیامت نامہ لکھیں۔ ان میں مقتول حسین کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ محرم کے موقع پر ان کے انتخاب مجالس میں اب بھی پڑھے جاتے ہیں اور کتاب کا ادبی درجہ بھی بلند ہے۔

اصلاح رسالت کی یہ کوشش صرف اہل علم بنگالی مسلمانوں نے نہیں کی، بلکہ عوام میں بھی ہندو ادبی اثرات کے خلاف رد عمل پیدا ہوا۔ اس کا اندازہ اس عوامی ادب سے ہو سکتا ہے جو قصوں، کہانیوں اور جنگ ناموں کی صورت میں کثرت سے "مسلمانی بنگالی" میں لکھا گیا اور جس کا بسا اوقات موضوع تھا کہ مسلمان پیروں اور "غازی" کس طرح ہندو دیوتاؤں پر غالب آگئے!!

بنگالی میں مذہبی کتب لکھنے کے متعلق سید سلطان کا طرز عمل معذرت آمیز تھا۔ لیکن سچاس ساٹھ سال بعد اس بحث نے تلخ صورت اختیار کی۔ عبدالمگیر میں جو مذہبی کتابیں بنگالی میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں ایک جزیرہ سندیب (ضلع چٹاگانگ) کے ایک شاعر عبدالحکیم کی کتاب نور نامہ ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے:-

میں بنگالی میں لکھ رہا ہوں -

تاکہ ہر ایک کو اپنی محنت سے خوش کر سکوں -

میں عربی اور فارسی کو حماقت سے نہیں دیکھتا -

لیکن لوگ اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں -

ایک مضمون چاہے عربی فارسی یا ہندی میں ہو بدل نہیں جاتا -

اگر کوئی شخص خدا اور نبی کے اوصاف بیان کرے -

خدا لوگوں کی زبان سمجھ لیتا ہے -

وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتا ہے -

اور بنگالیوں کی زبان سمجھتا ہے -

مجھے ان لوگوں کی اصل کا پتا نہیں -

جو پیدا تو بنگال میں ہوئے ہیں، لیکن بنگالی زبان سے متفق نہیں -

تو کیوں یہ جگہ چھوڑ کر وہ دوسری جگہ نہیں چلے جاتے؟

عبدالحکیم نے نور نامہ کے علاوہ یوسف زلیخا - شاہ نامہ - نصیحت نامہ - لعل مئی سیف الملوک اور شہاب الدین نامہ تالیف کیں۔ آخری کتاب شاعر نے اپنے

پیر و مرشد شہاب الدین کے نام معنون کی۔

بہرام سقا بردوانی

عبدالسلامی میں عام دیہاتی مسلمانوں کی زبان بنگالی تھی۔ لیکن دفتری اور درباری زبان فارسی تھی۔ مرحوم منشی عبدالکریم کی کوششوں سے بنگالی تصانیف کے سونے

تو ایک حد تک جمع ہو گئے ہیں، لیکن فارسی تصانیف کے متعلق کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی۔ اس وقت جو اکابر بنگالہ کی سرزمین میں دفن ہیں ان میں سب سے قدیمی صاحب دیوان شاعر حاجی پیر بہرام سقا ہیں جن کا مزار بردوان کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ وہ بخارا کے پختائی ترک تھے۔ شاعر تھے۔ مسافروں، زائرین اور حاجیوں کو مفت پانی پلاتے اور آزاد مجذوبانہ زندگی بسر کرتے۔ عبدالکبری کے مودعین کہتے ہیں کہ اکبر کے خلیفہ پر جب ہمایوں نے مارچ ۱۵۵۶ء میں قندھار میں جشن کیا تو اس کے دوران میں آپ پر جذبہ طاری ہوا۔ ہمایوں کی دوسری بادشاہت کے دوران میں ہندوستان آئے۔ عبدالکبری ہیں اگر وہ تھے۔ دارالسلطنت کے ادبی و مذہبی مشاغل میں جھٹھ لیا۔ بدایونی کہتا ہے کہ آپ اپنے چند شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ مفت پانی تقسیم کیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ آبدار و دکندار شہر کرتے۔ جب اکبر کے ابتدائی ایام میں بیرم خاں کے سیاسی مخالفوں (اور پھر مخدوم الملک نے) شیعہ شتی سوال اٹھایا تو آپ پر بھی رخص کا الزام لگایا گیا۔ آپ نے اس الزام کی تردید میں ایک ترکیب بند لکھا جس میں رخص کو بُرا بھلا کہا لیکن آپ کے اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ آپ انتہائی طور پر آزاد خیال بلکہ وارستہ مزاج تھے۔ اشعار میں نور بخشی خیالات کی بھی جھلک ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں بھی کثرت سے اشعار ہیں۔ مورخین کہتے ہیں کہ آپ ان بحثوں سے برگشتہ ہو کر اکبر آباد سے چل دیے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ آپ لنکا کے سفر پر پا پیادہ چلے اور راستے میں وفات پا گئے۔ لیکن یا تو یہ اطلاع غلط تھی یا آپ کا ارادہ ساٹگاؤں بندر سے جہاز پر سوار ہونے کا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں آپ بردوان پہنچے اور مقامی روایات کے مطابق تین روز کے بعد ہی وفات پا گئے، لیکن اس دوران میں آپ نے ایک ہندو جوگی کو زیر کیا اور اس کی دی

ہوئی زمین پر آپ کا مزار ہے۔

بہرام سقا کے مزار پر سال وفات ۹۷۰ھ درج ہے۔ اس زمانے میں بنگالہ بھی افغانوں کے قبضے میں تھا۔ کوئی گیارہ بارہ سال بعد ۱۵۶۲ء میں اکبر کے جرنیلوں نے داؤد خاں حاکم بنگالہ کو شکست دی اور فتح بنگالہ کے دوران میں بردوان پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان مؤرخوں کی کتابوں میں پہلی دفعہ اس شہر کا نام اس سال آیا، لیکن اس کے بعد اس شہر کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس تاریخی دلچسپی کا عمارتی مرکز پیر بہرام سقا کا روضہ ہے جس کے احاطہ میں دو قبریں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک تو جہاں کے پہلے خاوند شیر افکن کی جو بردوان کی عملداری میں جہانگیر کے کوکہ اور بنگالہ کے گورنر قطب الدین کو کلتاش کے ساتھیوں کے ہاتھ ہلاک ہوا۔ دوسری قطب الدین کی جس کا شیر افکن نے کام تمام کیا۔ بردوان کے ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلہ پر صوفی بابزید کا مزار ہے جنھوں نے فرخ سیر کو بادشاہت کی نوید دی تھی اور جن کے مزار کے قریب فرخ سیر نے بادشاہت حاصل کرنے کے بعد مسجد تعمیر کرائی تھی۔

سقا کی اپنی ادبی اہمیت بہت ہے۔ ان کے دیوان کے متعدد نسخے بنگالہ میں ملتے ہیں۔ دو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک بانکے پور میں خدا بخش لائبریری میں ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار جو عرفی، نظیری اور ظہوری کے درباری و صحابہ رانہ، پرتکلف طرز شاعری پر فریفتہ ہیں۔ سقا سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور اس کے کلام کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں ہوا۔ درنہ ایک منفرد حساس، متجسس شخصیت کے اظہار کے علاوہ معاصرانہ طور طریقوں پر روشنی پڑتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ سقا نے بہت سے دیوان جمع کیے۔ جب جذب غالب آتا تو انھیں دھونا شروع کر دیتے لیکن پھر بھی جو کچھ بچ گیا ہے۔ ایک دیوان بزرگ سے کم نہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

آمد جبیشہ زردار س برابرے بحث
گفت از کدام کشوری و مذہب و طبیعت
گفتم کہ لامکانم و عشقت مذہبم

بنیاد کرد با من مسکین بنائے بحث
باطمطراق براجمی از برابرے بحث
دارد فراغتے دلم از ماجراے بحث

بآب دیدہ ماورق بحث شستہ ایم
بگنڈہ بر بحث عمر مدہ در جہاں بہ بلو
راہے لبوئے دفتر معنی نبروہ
نالی آیت و حدیث کہ خواندی بجائے بحث
سقاہوں زہد رسد و ہر شو کہ ہست
خود ایں مکان مسوہ نغان زبائے بحث

ایک عام رنگ کی غزل ہے ۔
بے خود و مستم از محبت وے
میدید یار بادہ نال مے ناب
دہنم را مہو و تلخ مگو
بگنڈہ از شیوہ دل آزاری
خوش بود ہاے دہوئے مستان ہم
زاہد و حافظان خوش آواز
نزد سقا سقا فقر خوش است
کے کشد جام او بہ منت کے

بہرام سقا سیلانی مزاج اور صاف گوشتھے ۔ وہ مروجہ خیال بندی اور لفظ پرستی کے قائل نہ تھے ۔ جو دل پر گزرتی سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتے کئی قطعات میں شخصی تجربات کا بیان ہے ۔

در مردم ہند طرفہ حلیت
کس را بکے سر سخن نیست
مستغرق حیرت اندکیر
چند آنکہ مجال دم زدن نیست
سر مست ز بادہ غرور اند
کس را خبرے ز خوشین نیست
گفتم کہ سقاوہ بسازم
در شہر کے مہمڈن نیست
سقا چہ کند حسن دریں کار
ایں لہ فلک ہست از حسن نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی حکام لاہور (لاہر) کی سخت گیری مشہور تھی ۔
ہر کہ در لاہر بنائے خیر ساز و جلدانی
خون وے در گردش بادا بگوئم حال شہر
نامرادے ساخت سقاخانہ و ہم مسجد
رہماں در گردش مے افگند کو تو ال شہر
طمطراق شمعہ بازار و شمع شہر
میکشد سقا خور دہ یک دم نال شہر
بہرام سقا ہندوستان زانہ تھے ، لیکن طبیعت آزاد و قلندرانہ اور نو پسند تھی ۔ ریختہ
میں بھی طرح آزمائی کی اور ان کی ابتدائی عہد اکبری کی لکھی ہوئی مغزلیں سب قدیمی ریختوں
میں شمار ہونے کے لائق ہیں ۔ لہجہ بھی دلائی ہے ۔

باز ہند و بچہ آہ دلم دھرتے ہے
کوچہ کچھ ناہی جاتوں ازیں خستہ کیا کرتے ہے
چیں برابر و زدہ بر بستہ کنارہ بہ میاں
چل چل لے دل مگر توچہ کئی اور کرتے ہے
چشم او طرفہ غزالیست کہ در باغ جناں
ہمہ ریحان و گل و سنبل تر چرتے ہے
ہات ہندی لایا دست فرو بردہ بخوں
کہ بسے کشتہ ز درستان غمش مرتے ہے
بیت سر و سہی شرم ندارد ز قدش
نوشستن را بہ چہ روا نیمہ او برتے ہے
آنکہ مردم کش او دمدم از خون جگر
قدح چشم مرا از غم خود بھرتے ہے
چپ کر لے دلشدہ سقا ز غم یار منال
گر جفا دنت بجان تو میا کرتے ہے

برردوان بڑی دیر تک مغلیہ تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز رہا ۔ عالمگیر کی وفات کے بعد یہاں موجودہ ہندو مہاراجا کی گدی قائم ہوئی ، لیکن قدیم تہذیب و تمدن سے تعلق برقرار رہا ۔ انیسویں صدی میں شمس العلماء مولانا لطف الرحمن بردوانی نے نام پایا جن کی مذہبی مسائل پر کئی تصانیف ہیں ۔ اسی زمانے کے ایک بردوانی شاعر تھے منشی محمد علی خادم ۔ حضرت شاہ بہرام سقا کی درگاہ کے خادم تھے اور بردوان کے مہاراجا جہانگیر بہادر کے فارسی شاعری میں استاد ۔ ان کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے ۔

مولانا حمید و الشمند منگلکونی
وفات ۱۰۵۳ھ
عہد مغلیہ میں بردوان اور مرشد آباد کے درمیان کا سارا علاقہ بالخصوص وہ حصہ جو شرفا کی آبادی کی بنا پر شریف آباد کہلاتا

تھا اور جیسے پرگنوں پر مشتمل ایک پوری سرکار (سرکار شریف آباد) کی وسعت رکھتا تھا۔ مسلمان علما اور مشائخ کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان میں سے بعض خاندان ایسے تھے جو گورنر کی تباہی کے بعد یہاں آئے اور علیحدہ دیہات کو آباد کر کے اسلامی عمل دخل اور علم و ہدایت کا مرکز بن گئے۔ مثلاً سالار۔ بنودیہ۔ منصور پور جہانکے اخوند کاران صدیقی جو اپنا سلسلہ نسب سلطان غیاث الدین کے قاضی القضاۃ شیخ سراج الدین اور سلسلہ طریقت حضرت نور قطب عالم سے ملاتے ہیں۔ بنگالہ کی علمی اور روحانی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ان تانبیخی دیہات میں تلاش کی ضرورت ہے، لیکن سرکار شریف آباد میں جو قصبہ اشاعت علمی کے لیے عہد مغلیہ میں سب سے مشہور تھا۔ منگل کوٹ تھا جو ضلع بردوان کے شمال میں اب ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے پرگنہ منگل کوٹ کی نوے فیصدی آبادی مسلمان تھی اور اس میں قدیمی مسجدیں اور مزار ہیں۔ ایک مزار مخدوم شاہ محمود غزنوی المعروف راہی پیر کا ہے جو مقامی روایات کے مطابق اس پرگنہ کی فتح کے باعث ہوئے۔ ایک مزار مخدوم شاہ عبداللہ گجراتی کا ہے۔ کئی پرائی مسجدوں کے آثار ہیں۔ ایک شکستہ مسجد جس کا سال تعمیر ۱۱۵۷ھ ہے، حلاء الدین حسین فرمانروائے گورنر نے تعمیر کرائی تھی۔ دوسری اس کے بیٹے اور جانشین نصرت شاہ نے ۱۱۷۳ھ میں۔ ان مسجدوں کے قبوں سے پتا چلتا ہے کہ عہد مغلیہ سے پہلے بھی یہ قصبہ رونق پر تھا۔ عہد مغلیہ میں اس کی اہمیت مولانا حمید دانشمند کی وجہ سے بڑھ گئی جو حضرت مجدد الف ثانی کے چاہیئے مرید تھے۔ اور جن کا قدردان شاہجہاں بتایا جاتا ہے۔

مولانا شیخ حمید دانشمند منگل کوٹ کے قاضیوں کے مشہور خاندان سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ قاضی ضیاء الدین (المعروف احمد سالار) بنگال میں شاہ صفی الدین کے ساتھ جن کا مزار پٹوہ (ضلع بگلی) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے اور جن کی وفات تیرھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں ہوئی تشریف لائے مولانا حمید کو تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے علوم ظاہری کا پوری طرح مطالعہ کیا۔

ان علوم کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ صوفیہ کے مخالف ہو گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی اس زمانے میں لاہور میں تھے، لیکن صوفیہ سے مخالفت کی بنا پر مولانا حمید نے ان سے فیض حاصل نہ کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ دہلی آئے اور مفتی و عسکر کے مکان پر مقیم ہوئے۔ یہاں اتفاقاً حضرت مجدد سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ بحثا بحثا بھی ہوئی، لیکن آپ حضرت مجدد سے اس طرح متاثر ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے ہو لیے۔ تعلیم باطنی کے کوئی ایک سال بعد حضرت مجدد نے انھیں خلافت عطا کی اور یہ مرشد کی کھڑاویں لے کر انھیں اپنی دستار میں لپیٹ کر وطن کو روانہ ہوئے اور باقی وقت منگل کوٹ میں ارشاد و ہدایت میں صرف کیا۔

کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ وہ منگل کوٹ آیا۔ آپ سے اخذ فیض کیا اور مسجد مدرسہ اور خانقاہ کے لیے انہی ہزار سالانہ آمدنی کی وسیع اراضی کا فرمان دیتا گیا۔ ان بیانات کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں کہ شاہجہاں جب اپنے والد کے خلاف بغاوت کر کے بنگالہ میں مقیم تھا اور بالخصوص جب ۱۶۲۲ء میں اس نے بردوان فتح کیا۔ اس وقت اسے مولانا حمید دانشمند کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہو۔ مولانا حمید کے شکستہ مزار کے قریب ایک مسجد تھی جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ شاہجہاں کی مالی مدد سے تعمیر ہوئی تھی۔ مولانا کا مقبرہ تو اب شکستہ حالت میں ہے اور شاہجہاں مسجد کے طبع سے اہل قصبہ نے ایک نئی مسجد تعمیر کی ہے، لیکن اب بھی اس شہر میں علمی اثرات موجود ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت تک یہاں ایک مدرسہ تھا جس کا کتب خانہ اب مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے کتب خانہ کا حصہ ہے!

مولانا حمید کا پورا نام مولانا حمید الدین تھا۔ ان کے نام حضرت مجدد کے کئی خطوط

یہ تفصیل مولانا بدر الدین برہنہ نے حضرت مجدد کی سوانحی حضرت تقدس میں دی ہیں اس وقت حضرت تقدس ہمارے سامنے نہیں۔ ہم نے اس کے اندراج کا خلاصہ صاحب مولوی عبدالولی صاحب کے مضمون متعلقہ منگل کوٹ، بہار۔ ارمیرہ ریسرچ سوسائٹی جون ۱۹۱۶ء سے اخذ کیا ہے۔

ہیں۔ جلد اول میں ایک اہم طویل خط (مکتوب ۲۲۰) صوفیوں کی بعض غلط فہمیوں اور عقائد روحانی کے متعلق غلط فہمیوں کے بارے میں ہے۔ جلد ثانی میں چھ صفحے کا ایک خط (۴۶) کمالاتِ نبوت اور کمالاتِ ولایت کے متعلق ہے۔ مُرشد کو اپنے دُور افتادہ مُرد کا خاص خیال تھا۔ ایک خط (۸۴) میں شکایت کی ہے کہ مولانا حمید الدین کی طرف سے بہت کم خط آتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

”اخوی ارشدی میاں شیخ حمید، عجب از وا اختیار نمودند کہ سلام و پیام را ہم آنجا گنجائش کمتر است۔ دریں ہفت و ہشت سال یک کتابت از جانب شما رسیدہ آنہم ناتمام و بے سرانجام۔ کتابت ہا کہ ازین جانب سے رسد معلوم نیست کہ بشمارے رسد یا نہ۔“

آگے چل کر لکھا ہے کہ میں شیخ عبدالحی کو جو پانچ سال میرے ساتھ رہے۔ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کے احوال سے آگہی حاصل کریں اور آئندہ کے لیے مناسب مشورے دیں۔

مولانا حمید دانشمند کے متعلق زیادہ تفصیل نہیں ملتی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی بدولت مجددیہ سلسلہ کس حد تک بنگال میں اشاعت پذیر ہوا۔ حضرت مجدد کے جانشین خواجہ محمد معصوم کے مطبوعہ مکتوبات (کانپور ایڈیشن) میں ایک خط شیخ فیض اللہ بنگالی کے نام ہے اور دو خطوط شاہ نعمت اللہ قادری کے نام ہیں۔ قلمی مکتوبات (باتھکے پور لائبریری) میں شیخ عبدالحق کے نام خطوط ہیں۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بنگال میں نقشبندیہ مجددیہ طریقے کے ماننے والے کئی ہیں۔ لیکن بظاہر اس علاقے میں اس طریقے کی زیادہ اشاعت اُنیسویں اور بیسویں صدی میں ہوئی۔

بزرگانِ ڈھاکہ | مشرقی پاکستان کے جس سب سے قدیمی مجددی بزرگ کا پتا چلا ہے وہ ڈھاکہ کے شاہ عبد الرحیم صاحب شہید تھے۔ آپ کشمیری الاصل تھے۔ پہلے مُرشد آباد آئے۔ وہاں سے ڈھاکہ تشریف لائے۔ تین واسطوں سے آپ کا سلسلہ خواجہ محمد معصوم تک اور چار واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی تک جا پہنچتا ہے۔ آپ صوفی ہدایت الشّعرف صوفی حسن کے

خلیفہ تھے۔ وہ صوفی عبد اللہ کے اور صوفی عبد اللہ حضرت خواجہ محمد معصوم کے آپ سلسلہ میں پیدا ہوئے۔ غالباً عبد عالمگیری کے اواخر میں ڈھاکہ تشریف لائے۔ چوراسی برس کی عمر میں ایک دیوانے کے ہاتھ سے چار ستمبر ۱۲۵۲ھ کو زخمی ہوئے اس کے بعد ایک مہینہ تین دن زندہ رہے اور بالآخر ۹ رمضان المبارک ۱۲۵۵ھ کو وفات پائی۔ اگلے روز دفن ہوئے کسی ہم عصر شاعر نے تاریخ لکھی:-

مزارِ شاہِ دیں عبد الرحیم بہت پُر از فیض خداوندِ کریم است
زہے روشن دل صاحبِ کلینہ اثر سے داشت از سینہ بر سینہ
زا و صافش کرامت منجلی بود چرا پنہاں کنم بیشک ولی بود
سن تدفین از روسے وفائے دہم رمضان بود آمدندائے

شاہ عبد الرحیم شہید کی عمر میں خدا تعالیٰ نے برکت دی اور آپ کی بدولت مجددیہ نقشبندیہ طریقے کی اشاعت اس علاقے میں خوب ہوئی۔ چٹاگانگ کے مشہور صاحب خانقاہ بزرگ صوفی شاہ امانت اللہ صاحب آپ ہی کے خلیفہ تھے اور ڈھاکہ میں بھی آپ کا فیض جاری ہے۔ آپ کو اپنے زمانے میں میاں صاحب کہا جاتا تھا۔ اس لیے ڈھاکہ کے جس علاقے میں آپ کا قیام تھا اور اب مزار ہے، محلہ میدان میاں صاحب کہلاتا ہے۔

ڈھاکہ کی ایک اور مشہور خانقاہ جس کا فیض ابھی جاری ہے اور جس کے بعض ارکان نے مجددیہ طریقہ اختیار کر لیا تھا، دائرہ عظیم پورہ کی درگاہ ہے۔ جس کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ اس خاندان کے سب سے قدیمی بزرگ صوفی سید محمد داکم صاحب چٹاگانگ کے رہنے والے تھے اور حضرت سید بختیار ماہی سوار کی اولاد سے تھے جو قریباً پانچ سو سال ہوئے، چٹاگانگ تشریف لائے۔ صوفی صاحب نے اپنے وطن میں شاہ امانت اللہ صاحب سے بیعت کی جو چٹاگانگ میں شاہ عبد الرحیم شہید کے مشہور صاحب خانقاہ خلیفہ تھے۔ جب وہاں کشود کار نہ ہوا۔ تو آپ پیر کی اجازت سے ڈھاکہ آئے اور حضرت شاہ عبد الرحیم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ارشاد کیا کہ تمہارا حصہ پٹنہ کے شاہ معصوم پاکباز

کے یہاں ہے۔ چنانچہ وہ بیٹہ گئے اور حضرت منعم پاکباز قدس سرہ سے حصول فیض کے بعد ڈھاکہ تشریف لائے۔ اور محلہ عظیم پورہ میں حضور ہو گئے۔ آپ کے جانشین بھی سوائے جج کے دائرہ سے کبھی باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ دائرہ میں حضور رہتے ہیں۔

حضرت صوفی محمد دائمؒ کو خدا نے بڑی مقبولیت دی اور دور دور سے لوگ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ تاریخ ڈھاکہ میں لکھا ہے کہ چانگام کمرلا اور نواکھالی کے اکثر اشخاص آپ کے مُردے تھے۔ آپ بڑے پابندِ شریعت تھے۔ سماع المزامیر کبھی نہیں کرتے تھے۔ صرف قال اللہ وقال رسول سے دائرہ گونجا کرتا تھا۔ خانقاہ میں کثرت سے طالب علم رہتے تھے جن کی تعلیم و تدریس کے لیے علما مقرر تھے اور کھانا کپڑا خانقاہ کے نگر سے ملتا تھا۔ آپ کا وصال ۱۰۹۹ھ میں ہوا۔ آپ کا فیض آپ کے جانشینوں نے جاری رکھا اور اب بھی جاری ہے۔ لیکن روحانی امور اور تزکیہ نفس سے اس زمانے میں جو دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ اس سے یہ خانقاہ بھی متاثر ہوئی ہے۔ مثلاً آپ کے ایک جانشین صوفی سید شاہ خلیل صاحب نے حکیم حبیب الرحمن سے فرمایا۔ ”میاں، چالیس برس ہو گئے۔ باپ دادا کی گدی پر بیٹھا ہوں۔ مگر اللہ کا راستا پرچھنے لوگ کم ہی آتے ہیں۔ جو آتا ہے، جھاڑ، پھونک، تعویذ، طومار کے لیے آتا ہے۔“ آپ کے پوتے صوفی شاہ وجہ اللہ صاحب نے مجددی طریقہ اختیار کر لیا تھا اور وحدت الوجود کی تردید اور وحدت الشہود کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا لیکن باقی حضرات نے اپنے بزرگوں کا طریقہ جاری رکھا۔ دائرہ کی ایک خصوصیت یہاں کا علمی ماحول ہے۔ ایک کتب خانہ بھی ہے۔ اور تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ شاہ وجہ اللہ صاحب سے شروع ہوا برابر برقرار ہے۔

مڈل کوٹ اور ڈھاکہ کے علاوہ اس مدرسہ باگھا۔ ضلع راج شاہی | زمانے میں علم و ہدایت کا ایک سرچشمہ قصبہ باگھا تھا۔ تصدیق النہاد میں خان بہادر انونڈ کا فضل ربی کہتے ہیں۔ کہ حضرت

نور قطب عالم کے خلیفہ شیخ بدرالاسلام جنھیں راجا گنیش کی تعظیم نہ کرنے پر شہید کیا گیا، باگھا کے عباسی اخوند کاروں کے مورث اعلیٰ تھے۔ یہاں بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ اور ایسٹ بنگال ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق یہ مقام پیروں کا مسکن سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی جامع مسجد نصرت شاہ نے ۱۳۵۲ھ میں تعمیر کرائی۔

مشہور ہے کہ ۱۵۱۹ھ میں یہاں بغداد سے مولانا شاہ معظم دانشمند (المعروف شاہ دو) تشریف لائے اور انھوں نے مخدوم پور کے شاہی جاگیردار الہ بخش برنوردار شگری کی صاحبزادی ارب النساء سے شادی کی اور خاندانی مدرسے کا آغاز کیا۔ ان کے بیٹے نے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا اور پوتے شاہ عبدالوہاب کو شاہجہاں کی طرف سے بیالیس گاول، جن کی آمدنی کا اندازہ اس زمانے میں آٹھ ہزار کیا جاتا تھا، انعام میں ملے۔ غالباً یہ اراضی اس زمانے میں ملی ہوگی، جب شاہجہاں بنگالہ میں مقیم تھا اور بعد میں اس کی توثیق ہو گئی ہوگی۔ ۱۶۱۲ھ میں شاہ عبدالوہاب کے بیٹے شاہ محمد رفیق نے نصف جائداد کو وقف میں منتقل کر دیا۔ اور باقی نصف اپنے بھائی نورالحارثین کی اولاد کے پاس رہنے دی۔ اس وقت سے یہ وقف برقرار اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قائم ہے۔ متولی مدرسہ، مسجد، مزار اور مسافروں کی نگہداشت کا انتظام کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب مسٹر آڈم نے بنگال بہار کے تعلیمی اداروں کا دورہ کیا اور اپنی مشہور تعلیمی رپورٹ مرتب کی تو اس وقت اس مدرسہ میں عربی فارسی کی پڑھائی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ اور مسٹر آڈم نے اپنی رپورٹ میں قصبہ باگھا کے مدرسہ کے متعلق کئی صفحات لکھے ہیں۔ وقف کی آمدنی کے متعلق اس زمانے کے کلکٹر کا اندازہ تین ہزار تھا۔

بنگال میں قادریہ سلسلے کے جس بزرگ کا نام سب شاہ نعمت اللہ قادری | پہلے لیا جاتا ہے وہ گوڑ (فیروز آباد) کے شاہ نعمت اللہ قادری تھے، جو نارفول میں پیدا ہوئے اور سیر و سفر کے دوران

راج محل آئے جو شاہ شجاع کے زمانے میں بنگالہ کا حاکم نشین شہر تھا۔ شاہ شجاع نے آپ کی بڑی قدر کی۔ آخری ایام میں آپ گوڑ کے نواحی قصبہ فیروز آباد تشریف لے گئے اور وہیں ۱۶۶۲ء میں وفات پائی۔ آپ بڑے صاحبِ سطوت بزرگ تھے کئی بزرگوں سے آپ کے مراسم تھے اور علمی حلقوں میں بھی آپ کا نام ادب سے لیا جاتا تھا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔

اسی دار الخلافہ گوڑ کا بہت تھوڑا حصہ پاکستان میں شامل ہے۔ اس میں شاہ نعمت اللہ صاحب کی درگاہ بھی ہے۔

عہد آخر کے مشائخ قادریہ | شاید موجودہ زمانے میں بنگالہ کی سب سے اہم قادری خانقاہ کلکتہ میں ہے۔ اس خاندان کا سلسلہ مغلیہ خاندان کے عہد زوال میں، بلکہ پلاسی کی لڑائی کے بعد شروع ہوا، لیکن بزرگوں کے فیض سے اس سلسلے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور چونکہ اس خاندان سے اہل علم اور اہل تصنیف بزرگوں کا تعلق رہا ہے اس لیے اس خاندان سے کے متعلق معلومات بھی کافی مل سکتی ہیں۔

۱۶۶۲ء میں حضرت غوث اعظم قدس سرہ کی اولاد میں سے ایک بزرگ سیدنا حضرت ذاکر علیؒ اپنے والد بزرگوار اور بعض دوسرے عزیزوں کے ساتھ ایک اشارہ ضعیفی کے تحت بنگالہ تشریف لائے اور منگل کوٹ ضلع بردوان میں جو ان دنوں خوب آباد اور علمی اور مذہبی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، بس گئے۔ آپ کے والد ماجد اور بعض دوسرے اقربا تو بعد میں بغداد واپس چلے گئے۔ لیکن سیدنا شیخ ذاکر علیؒ ان کے بھائی سیدنا روشن علیؒ صاحب صوبہ بہار کے ضلع پورنیہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قریب سلسلے کی اشاعت کا مرکز بنے۔ سیدنا ذاکر علیؒ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ منگل کوٹ کو ارشاد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ ایک مختصر سی خانقاہ تعمیر کی۔ آپ کی وفات اکیاسی برس کی عمر میں ۱۷۸۸ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین آپ کے بھتیجے اور داماد سیدنا شاہ طفیل علی قادری تھے۔ پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد انھوں نے دوسری شادی

مدناپور کے مشہور بزرگ اور مولانا شہباز بھگل پوری کے ممتاز خلیفہ دیوان تیدرجی الملخی (مشہور بہ چندن شہید) کے خاندان میں کی۔ شادی کے بعد آپ کا بہت سی وقت مدناپور میں گزرا۔ بلکہ ایک لحاظ سے آپ نے وہاں سکونت اختیار کر لی، لیکن وفات سے پہلے اپنے پیرومرشد کے قریب جگہ حاصل کرنے کے لیے آپ بیماری کی حالت میں منگل کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہی وصال ہو گیا۔ (۱۸۳۶ء) نعش مبارک آپ کی خواہش کے مطابق منگل کوٹ میں دفن ہے۔ آپ کے جانشین آپ کے دوسرے صاحبزادے حضرت مہر علی قادری (معروف بہ حضرت اعلیٰ حضور) تھے۔ وہ مدناپور میں ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ آپ نے مدناپور میں ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ کا آغاز کیا، لیکن اردگرد کے اضلاع (یعنی بردوان، مرشد آباد، بیرجھوم، ہنگلی۔ بانکورا اور اطراف مدناپور) میں دورہ کرتے اور لوگوں کو ہدایت فرماتے۔ آپ کی وفات ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین حضرت شاہ علی عبدالقادر شمس القادر مرشد علی القادری تھے، جو ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اور سولہ برس کی عمر میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے۔ آپ نے قریباً تینتالیس سال تک مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ بالآخر آپ نے کلکتہ میں قیام اختیار کیا، لیکن مزار مبارک مدناپور میں ہے۔ آپ آخری ایام کے مشاہیر بزرگوں میں سے تھے۔ مولانا عبدالرحمن قادری پرموہیر سینٹ زیوریہ کالج کلکتہ نے دو جلدوں میں آپ کے سوانح حیات و ارشادات مکتوبہ الموعود کے نام سے جمع کیے ہیں۔ آپ سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ شمس العلما مولانا ولایت حسین آپ کے بڑے معتقد تھے۔ آپ نے ان کے بیٹے ہدایت حسین کے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے افسر اعلیٰ ہونے کی پیشگوئی اُس وقت کی تھی، جب وہ ابھی یارہ سال کے تھے اور یہ عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ آپ کی وفات فروری ۱۹۰۱ء میں ہوئی اور جانشین حضرت سید شاہ ارشاد علی قادری المعروف سیدنا ضرور مولا ہوئے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں وفات پا گئے۔ قادریہ سلسلے کی اشاعت اور تبلیغ اسلام کے علاوہ اس خاندان سے نے اشاعتِ علم

میں بھی حصہ لیا۔ خانقاہ لین کلکتہ میں ایک وسیع کتب خانہ قادریہ لائبریری کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی۔ ہم تذکرۃ المولے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے حالات میں فارسی میں مذاکرہ قطب العالمین اور انگریزی میں جسٹس مسٹر محبوب مرشد کی گلستان قادری (انگریزی) شائع ہو چکی ہیں۔ ہم نے مندرجہ بالا حالات گلستان قادری سے ہی اخذ کیے ہیں۔ جسٹس محبوب مرشد کے والد اور سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید عبدالساک صاحب کی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتاب *Early Heroes of Islam* کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور انھوں نے حضرت غوث اعظم کی ایک انگریزی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

غیر شرعی طریقے | نقشبندیہ اور قادریہ سلسلوں اور باگھ جیسے علمی مرکزوں کی بدولت بنگال میں قرآن و سنت اور متشرع طریقت کی روشنی پھیلتی ہوئی، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ عہد مغلیہ میں یہاں غیر شرعی طریقے زوروں پر تھے اور انیسویں صدی کے آغاز تک عوام میں سب سے زیادہ زور انھی کا تھا۔ مثلاً مسائل المشائخ میں جو نویں یا دسویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔ کثرت سے شطاری درویشوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح بے شرع ملاریہ فرقہ کی نسبت حکیم حبیب الرحمان لکھتے ہیں۔ ”بنگال کے قریب ہر ضلع میں ملار گنج۔ ملار کا دائرہ۔ ملاری پور نام کی بستیاں ملتی ہیں۔ اسی ڈھاکہ میں ملار جھنڈا کی گلی اب بھی موجود ہے۔“ ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ اس فرقے کے بانی شاہ ملار (جن کی پیدائش انھوں نے ۱۲۵۹ھ اور تاریخ وفات ۱۳۳۶ھ لکھی ہے) بنگال میں آئے تھے اور یہاں ان کا بڑا اثر تھا۔ بنگال کے کسی گاؤں اور شہر (مثلاً ضلع فرید پور میں ملاری پور اور ضلع چٹاگانگ میں ملار باری اور ملار شاہ) ان کے نام پر آباد ہیں۔ یہ رائے تو قیاس پر مبنی ہے، لیکن مرآۃ ملاریہ اور فصول مسعودیہ کے مطابق شاہ ملار کے ایک مشہور خلیفہ حضرت شاہ الہ گور میں آئے اور وہیں وفات پائی۔ مجذوب تھے۔ برہنہ رہتے تھے۔ حضرت نور قطب عالم کے ہم عصر تھے

گلزار ابرار میں آپ کی نسبت لکھا ہے۔ اس سلسلے کے بعض فصیح اللسان لوگ آپ کو شیخ اعلیٰ بھی کہتے ہیں، لیکن عوام کے نزدیک آپ شیخ الہ کے نام سے ہی نامزد ہیں۔ آپ بھی انھیں مجذوبوں میں سے ہیں جو مشہور دنیا ہیں۔ آپ کی گور گور میں ہے۔ ضلع دیناج پور کا موضع بلیاد بھی (محقانہ ہمت آباد) میں عہد شاہجہانی سے آزاد قلمندروں اور غیر شرعی فقیروں کا ایک مرکز ہے، جنھوں نے ہندو لوگ اسلامی تصوف اور اخلاقی آزادی کی ایک عجیب کچھڑی بنا رکھی ہے۔ یہ لوگ سوائے ایک لنگوٹی کے کوئی کپڑا نہیں پہنتے۔ برہنہ کہلاتے ہیں۔ سر کے بال نہیں کٹواتے۔ پاؤں میں بعض سادھوؤں کی طرح بیڑیاں پہنتے ہیں۔ ان کے عقائد و اعمال کسی امور میں غیر اسلامی ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہ سلطان حسنی ماریہ برہنہ تھے، جنھوں نے ایک ہندو راجا بلیا کو بھاگا کر اس جگہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ شجاع نے جس نے ڈاکٹر بانس سے خوش ہو کر انگریز کمپنی کو وہ بے پناہ مراعات دی تھیں، جن کا نتیجہ عالمگیر اور کمپنی کی کشمکش اور ساٹھ ستر سال بعد پلاسی کی لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شاہ سلطان حسن کو بھی خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ اس زمانے کی ایک سند محترمہ ۱۲۵۹ھ راج شاہی کے سرکاری دفتر میں موجود ہے۔ جس میں شاہ شجاع نے شاہ سلطان حسن کو اختیار دیا تھا۔

دفعہ اول۔ تم جب کبھی لوگوں کی ہدایت یا سیوساحت کے لیے شہروں، دیہات، اضلاع اور جہاں کہیں اپنی خوشی کے مطابق جانا چاہو تمھیں اختیار ہے کہ جلوس کا سارا ساز و سامان مثلاً علم، جھنڈے، پھریرے، بانس، عصا، باجے، ماسی مراتب اپنے ساتھ لے جاؤ۔

دفعہ چہارم۔ جب تم ملک کے کسی حصے میں جاؤ تو مالکان دیہہ و رکا شکار تمھیں اشیائے خوردنی متیا کرنے کا بندوبست کریں گے۔

شاہ شجاع نے جو مراعات دی تھیں، اس کا سلطان حسن کے جانشینوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اٹھارھویں صدی میں جب حکومت کا نظم و نسق کمزور ہو گیا تو ملک میں نیم برہنہ قلمندروں اور ہندو بیراگیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹ پھرتے تھے جو

دیہات اور قصبات سے بظاہر خیرات کے طور پر، لیکن فی الحقیقت جبر اور دباؤ سے
نذرانے وصول کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان کی تعداد ہزار بارہ سو تک جا پہنچتی کمپنی کے
افسروں کو بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد کسی دفعہ ان کے خلاف
وجہ کشی کرنی پڑی، لیکن برسوں تک یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ مثلاً اکتوبر ۱۸۵۷ء میں پانچ سو فقیروں کا
ایک لشکر بنگال سے بہار میں داخل ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مدار یہ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اور
مالدہ کے قریب ایک درگاہ (غالباً شاہ مدار کے خلیفہ شاہ الاکا مزار ہوگا) اور ضلع بوگرہ میں
ہستان (جہاں حضرت، اہی سوار بھٹی کا مزار ہے) کی زیارت کے لیے آتے ہیں کئی مہینے
وہ شمالی بنگال کے مختلف اضلاع اور ضلع ڈھاکہ میں چکر لگاتے رہے۔ ان کا سرگروہ شاہ
مجنوں مجذوب تھا جو مداریوں کے مرکزی مقام محسن پور (یو۔ پی) کا رہنے والا تھا۔
بعض رپورٹوں میں اسے ملایا اور بعض میں (سلطان حسن کے سلسلہ کا) برہمنہ فقیر لکھا
ہے۔ برہمنہ فقیروں کے مرکز ملیا دگی میں بھی اس کا مکان تھا۔ وہ خوش خوام گھوڑے پر
سوار ہو کر اپنے ہمراہیوں کی قیادت کرتا تھا۔ انگریز افسروں نے فوج کے کسی دستے ان
فقیروں کے خلاف بھیجے۔ لیکن وہ دیہات میں بکھر جاتے تھے اور عوام ان کی سرپرستی
کرتے تھے اس لیے کوئی فیصلہ کن محرکہ نہ ہوا اور مجنوں شاہ اور ان کے ساتھی اپنی دھولیاں
کر کے واپس چلے گئے۔ سلسلہ میں وہ پھر آئے اور ناٹور کی رانی بھوائی کو ایک عرضداشت
پیش کی کہ انگریز ان کی قدیمی مسلمہ مراعات میں مخل ہو رہے ہیں، انھیں بچایا جائے۔
اس کے بعد وہ ہر دوسرے سال آتے رہے۔ کمپنی نے کسی سچاویں ان مسلح فقیروں
اور سنیاہیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کیں۔ لیکن ان کا سلسلہ برقرار رہا۔ حتیٰ کہ
۱۸۷۷ء میں مجنوں شاہ محسن پور میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد بھی مجنوں شاہ کے بھائی
موسے شاہ اور متبئی چراغ علی اور دوسرے چیلوں نے کئی سال تک یہ سلسلہ برقرار رکھا۔
کمپنی کے سپاہیوں اور فقیروں سنیاہیوں کی یہ کشمکش تھی جسے یکم چند چیر جی نے
اپنے ناول انڈیا میں منظر بنایا۔

مرقضی شاہی فقیر | اسی طرح مرقضی شاہیوں کا فرقہ تھا۔ جن کے بانی

شاہ مرقضی مجذوب یا سید مرقضی اندر تھے۔ ان سے کئی بنگالی کتب منسوب کی جاتی
ہیں۔ ایک پداوی یعنی بنگالی ویشنوی گیتوں کی کتاب ہے۔ دوسری یوگ قلندر جو اس
قسم اور اس نام کی کتابوں میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ یوگ قلندر داراشکوہ کے
جمع البحرین کی طرح اسلامی تصوف اور ہندو یوگ کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ ایسی کتابیں
اٹھارھویں صدی میں کثرت سے لکھی گئیں اور ان میں تصوف کے خیالات یوگ کی
زبان میں ادا کیے گئے، لیکن ان میں یوگ کا عنصر اس قدر زیادہ ہے کہ ڈاکٹر انعام الحق
ان کتابوں کو مسلم یوگ نہ سمجھتے ہیں۔ سید مرقضی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔
خاں صاحب عبدالولی خاں مرحوم جنھوں نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں
مسلمانان بنگالہ کی قدیمی عمارتوں اور شخصیتوں کے متعلق بیش بہا مضامین لکھے ہیں۔
اپنے ایک مضمون میں ذیل کی غزل سید مرقضی سے منسوب کرتے ہیں ۵

فارغ از سود و بیغم از ضرر
از فریب جہاں خبر دارم
تا نگوئی کہ مرد بے خبرم
نہ چوسگ بہر جیفہ در بدم
سرخ رویم جو چل دکانی
ز رازاں دوست زرد در نظرم
گزراں است مرقضی دنیا
بہتر آن است تیز تر گزرم

سید مرقضی بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید حسن تھا۔ اور
مرشد کا نام سید عبدالرزاق۔ سید حسن ترک وطن کر کے مرشد آباد چلے آئے اور سید مرقضی
اس ضلع کے تھانہ جلی پور کے ایک گاؤں بلیا گھانا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش
اور تاریخ وفات کے متعلق تذکرے خاموش ہیں، لیکن چونکہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی
قادری فیروز آبادی (متوفی ۱۲۶۲ھ) کے ہم عصر تھے۔ اس لیے ڈاکٹر انعام الحق کا
قیاس ہے کہ وہ ۱۵۹ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے اور اس کے شہر بہتر سال بعد
آپ کی وفات ہوئی ہوگی۔ شاہ نعمت اللہ صاحب آپ کی خلافت شرع باتوں کے خلاف
معارض تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ بعد میں انھوں نے یہ انداز مخالفت ترک کر دیا۔

اور اب سید مرتضیٰ کے سالانہ عرس کے بعد مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سرگروہ شاہ نعمت اللہ کے مزار پر جاتا ہے اور ان کے عرس تک وہیں قیام کرتا ہے۔

مفتی غلام سرور نے خزینۃ الاصفیاء میں آپ کے کچھ حالات و حالات الولاہیت سے نقل کیے ہیں۔ ان کے مطابق آپ راج محل میں جو شاہ جہاں کے زمانے میں جنگلے کا صدر مقام تھا رہا کرتے تھے اور یوگیوں کی طرح نشے کی حالت میں رہتے اور سماع اور موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اندر مرتضیٰ مرتضیٰ اند کہلانے کا سبب یہی خوش باشی ہو، لیکن عوام الناس میں مشہور ہے کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ایک برہمن دہن اند یا دیوی اپنا گھر بار بھجور کر آپ کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی اور اس قربانی سے خوش ہو کر آپ نے کہا تھا کہ تمہارا نام میرے نام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

سید مرتضیٰ کی زندگی لاہور کے مادھوالا حسین کی طرح تھی۔ ان سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ مزار پر اب بھی ہر سال عرس ہوتا ہے۔ آپ کے سلسلے کے فقیروں کو مرتضیٰ شاہی کہا جاتا ہے، لیکن خان صاحب عبدالولی کا جنھوں نے آپ کے حالات آپ کے خاندان کے ایک بزرگ مولوی سید ابوالفضل سے جمع کیے۔ خیال ہے کہ آپ کے (اور بعد کے) بے شرع طریقوں میں شیو شکتی کے ہندو بجاویوں کی بہت سی چیزیں جمع ہو گئیں جن میں وحدت وجود کو عیاشی اور من مانی باتیں کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

بنگال میں اسلام | غیر شرعی طریقوں کے رواج، گورکھ و جے اور یوگ قلمند جی کتابوں کی مسلمانوں کے قلم سے تحریر ستیہ پر اور مانک پر جیسے غیر اسلامی عناصر کی تنظیم و تکریم سے بھی زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ عام مسلمانوں کی زندگی اعمال و عقائد میں کثرت سے ہندوانہ چیزیں داخل ہو گئیں۔ فی الحقیقت یہ عمل بنگال کے ساتھ مخصوص نہیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی کاروائی نظر آتی ہے، لیکن ایک فرق تو قلت اور کثرت کا ہے۔ بنگال میں یہ اثرات دوسری

جگہوں سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ دوسرے باقی حصہ ملک میں تو ہندو اثرات مشیوں میں نظر کا بقیہ میں جو مسلمان آبادی کو اپنے آباؤ اجداد سے ملا۔ لیکن بنگال میں ہندو مذہب کی نئی زندگی اور ہندو مینڈروں کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ عام مسلمانوں میں وہ چیزیں آگئیں جو پہلے نہ تھیں۔ مثلاً صوفیوں کی مجالس میں لیشن پد گائے جانے لگے۔ مسلمان شاعروں نے لیشن پد لکھے۔ اسی طرح شیو مت کے ماننے والوں نے جو ترنک طریقے اختیار کیے تھے وہ مداروں اور شاید شرطاریوں نے اختیار کر لیے۔ شاید ان سے بھی اہم وہ عقیدہ ہندوانہ طرز عمل تھا جو ہندو رسم و رواج اور طور طریقوں کے متعلق عام ہو گیا اور اس وقت بھی بعض علاقوں سے بالکل زائل نہیں ہوا یا بالخصوص مشرقی پاکستان کے راج شاہی ڈوئرن جس میں زیادہ تر وہ علاقے شامل ہیں جہاں ہندو زمیندار یاں کثرت سے تھیں اور ہندوؤں کے علمی مذہبی اور تہذیبی مرکز تھے، یہ رجحان کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس ڈوئرن میں ایک ضلع ضلع ہے گشتیہ جس کا زیادہ حصہ پہلے (موجودہ مغربی بنگال کے) ضلع ندیا میں شامل تھا۔ یہاں کے ایک علی افسر نے راقم الحروف کو ۱۹۵۵ء میں بتایا کہ وہاں اب بھی قریباً پانچ فیصدی مسلمانوں کے نام ہندوانہ ہیں۔ یعنی گول چند وغیرہ۔ صرف نام سے پہلے وہ شیخ لگا لیتے ہیں۔ یعنی ہندو کا نام تو ہو گا گول چند اور مسلمان کا شیخ گول چند۔ دیہات میں مسلمان عورتوں کا لباس ہندوانہ ہے۔ راج شاہی کے گزٹیر میں نچلے طبقے کے مسلمانوں کے متعلق بعض معلومات جمع کی گئی ہیں، جو اس لیے اہم ہیں کہ ان کے ماخذ ایک مسلمان افسر، مولوی عبدالغفار (نساخ؟) ڈپٹی مجسٹریٹ راجشاہی تھے۔ ان میں نیرفخیر یا گور و صفا کے نام نہاد مسلمان پیروؤں کے طریقے تو بہت صریح ہیں اور یقیناً ہندو و ام مار کی طریقوں سے ماخوذ ہیں، لیکن عام ان پڑھ دیہاتی مسلمانوں کی نسبت بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہندو اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً اگر تیرہ بید ہو تو پد پاپوران پڑھا جاتا ہے۔ اور اگر موشی بیمار ہوں تو گنود لکھیر لارو گایا جاتا ہے تیادی کے دوران میں مشکل چاندی جے کی (پو جاسے طتی جلتی) ایک رسم ہوتی ہے جس میں فرش پر دودھ کیلے اور سینڈھور رکھا جاتا ہے۔ دیواروں پر نقشے اور تصویریں بنتی

ہیں۔ عود جلا یا جاتا ہے اور عورتیں تمام رات شام سے صبح تک گاتی ہیں۔ عام اعتقاد ہے کہ اس رسم کی بجا آوری سے دوا دہاؤ لہن کو مشکل یعنی خوش قسمتی نصیب ہوتی ہے۔ ایک اور عمل آشن کار اس وقت بجالایا جاتا ہے۔ جب کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہو یا کوئی شخص بیمار ہو (بالخصوص جوڑوں کے درمیں) یا کسی مقدمہ میں کامیابی مقصود ہو جو شخص یہ عمل کرتا ہے اسے برہماد تیا فیر کہتے ہیں۔ وہ گھنٹیاں بجاتا ہے۔ منتر پڑھتا ہے۔ دودھ اور کیلے پیش ہوتے ہیں اور برہماد تیا یعنی برہمن کی روح کی مدد لی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دیہات تعلیمی اور طبی مرکزوں سے بہت دور ہیں۔ دریاؤں، نالوں اور دلدلوں کی وجہ سے آمد و رفت بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس طرح کی جھاڑ پھونک پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ بعض جگہ (مثلاً سندھ بن) میں گھنے جنگلات ہیں۔ کئی آدمی شیر کا شکار ہوتے ہیں۔ سانپوں سے ڈسے جانے کی وارداتیں تو لاتعداد ہیں۔ ان مصائب سے عہدہ براہونے کے مہذب اور محفول ذرائع ابھی تک عام نہیں ہوئے۔ غریب ان پڑھ دیہاتی جادو ٹوٹے اور منتروں کے ذریعے ان کا علاج کراتے ہیں جو شخص یہ جادو ٹوٹے کرتے ہیں ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان آسان نہیں۔ سانپ کا منتر کرنے والے جنھیں اوجھا کہا جاتا ہے، بالعموم مسلمان ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جادو منتر اسلام نے جائز نہیں رکھا۔

بیاہ شادی کی نسبت بھی راج شاہی گزٹریز میں بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ "نکاح ایک عربی لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے بیاہ اور شادی خوشی کے اس اظہار کو کہتے ہیں جو اس موقع پر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں نکاح اور شادی کے الفاظ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں، لیکن راج شاہی میں باقی بنگال کی طرح ان دو الفاظ سے دو مختلف قسم کے بیاہ مراد لیے جاتے ہیں۔ نکاح اس بیاہ کو کہتے ہیں جو ایک بیوہ کے ساتھ ہو اور شادی فقط ایک کنواری کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس کی بیوی مرگئی ہو۔ نکاح اور بیاہ دونوں کر سکتا ہے۔ نچلے طبقوں میں نکاح ایک دم درجے کا بیاہ ہوتا ہے جو ایک لونڈی (Concubinage) سے منظور اسی مختلف ہوتا ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص اپنی نکاح شدہ بیوی سے بدسلوکی کرے یا اس کے گزارے کا انتظام نہ کرے تو نہ صرف وہ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے بلکہ بغیر کسی طرح کی طلاق سے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ دوسرا نکاح مذہبی رسوم و قواعد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پہلا خاوند ذرا بھی اس کا برا نہیں مانتا۔ "میں تمھارا بھات نہیں کساؤں گی۔" یا میں تمھیں بھات نہیں دوں گا۔" اس طرح کے جملے کہہ دینے سے علیحدگی ہو جاتی ہے۔ راج شاہی کے نچلے طبقے میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کے ہاں بغیر کسی نکاح کے بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں اونٹے کام کرتے ہیں۔ بالعموم چلموں میں بھڑکرتما کو دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کے ایک بیاہ کی چشم دید روئداد یہ تھی کہ دلھن گھر کے اندر بیٹھی تھی اور دولہا باہر تھا۔ دلھن کا بھائی جو غالباً اس کا ولی تھا، باہر آیا۔ اور دولہا سے کہا۔ "تمھارا بیاہ ہو گیا تمھارا بیاہ ہو گیا" اس کے علاوہ اور کوئی رسم نہ ہوئی۔ نہ کوئی مولوی یا قاضی بلایا گیا اور نہ ہی اسلامی طریقے کے مطابق کچھ پڑھا گیا یا دعا مانگی گئی۔ راج شاہی وسطی بنگال کے اُس حصہ میں واقع ہے جہاں ہندو اثرات زور وں پچھتے اور اصل میں بیاہ شادی کے معاملے میں غریب طبقے کی بے تکلفی ان اخراجات کے خلاف رد عمل ہے جو ان تقریبات پر ضروری سمجھے جاتے ہیں اور شاید بنگال سے باہر بھی ان پڑھ غریب عوام میں اس طرح کی بے قاعدگیاں مل جائیں۔ لیکن بنگال کی عام مسلم سوسائٹی کی بعض باتیں ایسی ہیں جو ملک کے دوسرے حصوں میں رائج نہیں۔ ناموں کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وسطی بنگال کے بعض حصوں میں کئی مسلمانوں کے ہندو نام ہیں۔ لیکن مسلمان ناموں کے ساتھ ساتھ مقامی حرفت (Nickname) رکھنے کی رسم تو بنگال کے ان لوگوں اور علاقوں میں بھی ہے جہاں مذہب اسلام سے بڑا ضعف ہے، مخفیانہ عرفت دوسری جگہ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہاں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ رسمی اور باقاعدہ طور پر بھی مسلم کے جوان ہو جانے کے بعد بھی یہ پیار کے عرف نام کا کام دیں اور تحریر میں بھی وہی استعمال ہوں۔ مثلاً حاجی شریعت اللہ سے بڑھ کر قاطع بدعت کون ہوگا۔ لیکن ان کے مشہور صاحبزادے کو عام لوگ صرف دو دو میاں کے عرفت جانتے ہیں

ان کا نام محمد محسن شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ اسی طرح مسلم لیگ کے سابق اور متحدہ محاذ کے موجودہ با اثر لیڈر مومن میاں اور ان کے بھائی لال میاں ہیں۔ جو فرید پور کے رہنے والے تھے اور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مقامی عورت علاوہ بسا اوقات اسلامی نام کو تحفیف یا تغیر و تبدل سے مقامی رنگ دیا جاتا ہے مثلاً بسا اوقات میمونہ کو مینا، چمن آرا کو چمپا، لطیفہ کو نتا، طیحہ کو مالا اور کلثوم کو کسم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ غالباً ناموں کا یہ تغیر و تبدل اور مقامی عرفوں کا استعمال لسانی مشکلات کی وجہ سے ہے۔ بنگالی لب و لہجہ عرب اور ایران تو ایک طرف رہے۔ کئی اہم امور میں شمالی ہندوستان کے لوگوں سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ نام رکھنے والے مولوی یا خوش عقیدہ بزدگ فرمولہ و بچوں کے نہایت ثقہ نام رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان ناموں کا ادا کرنا آسان نہیں ہوتا اس لیے تحریف و تحفیف سے کام لیا جاتا ہے۔ (اس طرح کا مقوڑا بہت عمل دوسری جگہ بھی ہوتا ہے مثلاً پنجابی عوام سراج الدین کو مہا جا اور غلام محمد کو گاماں کہتے ہیں۔ لیکن سوائے خاص صورتوں کے جن کی توجہ سے کی جاسکتی ہے) یہ تحف اور تحریف نام بالعموم تحریر میں استعمال نہیں ہوتے اور پنجابی اور اردو رسم الخط ہی ان کی غراست کو نمایاں کر دیتا ہے۔

بعض دوسری باتوں میں ہندو اثر صاف ظاہر ہے۔ مثلاً بزرگوں کی تعظیم و تکریم کے موقع پر ہندوؤں کی طرح ان کے پاؤں چھوئے جاتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کے آغاز کے بعد باہر سے آئے ہوئے مسلمان اس طریق تعظیم پر اپنی کراہت کا اظہار کرتے تھے۔ اس لیے اب پبلک میں اس کا مظاہرہ کم ہوتا ہے۔ لیکن گھروں پر یہ طریق تعظیم اب بھی رائج ہے اور ان خاندانوں میں بھی موجود ہے جو پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ غلص اور پرجوش مسلمان ہیں۔ لسانی اختلافات اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر غیر بنگالی خواتین کو بنگالی گھروں کے بالکل اندر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ (سوائے ان گھروں کے جہاں انگریزی رسم و رواج جاری ہے اور جو مقامی طریق کار کی نمائندگی نہیں کرتے) لیکن جن خواتین کو ایسا موقع ملتا ہے ان کا کہنا ہے کہ گھروں کی زیبائش

آرائشوں اور تصاویر میں ہندوانہ فضا کا کافی عنصر ہوتا ہے۔ بچوں کو جو کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور عوامی ادب میں اسلامی قصے بھی ہیں، لیکن ہندوانہ کہانیوں کا حصہ بھی اہم ہے۔ اب بھی رات کے وقت مسلمان بچے اپنی ماؤں اور دادیوں سے کنچن مالا۔ مالا۔ مالا۔ ملے ملے اور اس طرح کی دوسری دلکش اور ناقابل فراموش کہانیاں سنتے ہیں۔

ان جزوی امور کے علاوہ اصل اہم چیز وہ موانست و عقیدت ہے جو چند ضلع اور بعض حلقوں سے قطع نظر پڑھے لکھے بنگالی مسلمانوں کو ہندو خیالات اور زعمائے سے ہے۔ اس کا ایک سبب تو لسانی کج فہمی ہے جو خیالات پر بڑا اثر ڈالتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ذمہ دار ہندوؤں نے بھی اپنے طرز عمل سے اس رجحان کو تقویت دی ہے۔ یوں تو بنگال کی پہلی تقسیم کے بعد ہی بنگالی ہندوؤں کا ایک با اثر طبقہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو کم کرنے اور ایک متحدہ بنگالی قوم کا نقشہ پیش کرنے کے درپے رہا ہے۔ (اب اس کی پشت پر رابندر ناتھ ٹیگور اور ان کی فرما بھارتی یونیورسٹی ہے) لیکن بنگالی ادب نے جو ترقی کی ہے اور نامور بنگالی ہندوؤں (مثلاً ٹیگور۔ جے سی بوس۔ سی آر داس۔ سبھاش چندر بوس) نے دنیا کی نظروں میں جو اہمیت حاصل کی ہے اس کا اثر بنگالی مسلمانوں پر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بالعموم ہندوؤں نے عملی طور پر زیادہ قربانی اور باوی النظر میں بہتر اخلاقی عظمت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ رام کرشن مشن کی طرف سے غریبوں اور مرصیوں کی خدمت کے لیے جو کوششیں ہوتی ہیں اور پڑھے لکھے ہندو خدمت خلق کے لیے جس طرح اپنا عیش و آرام قربان کرتے ہیں۔ اس سے بنگالی مسلمانوں کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ دیہات میں بھی دکھایا جاتا ہے کہ جن یونین بورڈوں (بچاؤتوں) کے صدر ہندو تھے۔ وہاں جھگڑے کم تھے۔ کام باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ گاؤں کی سرطکیں اور کنوئیں بہتر حالت میں تھیں۔ ہندوؤں میں صبر اور احتیاط کی جو خصلتیں ہیں، انھوں نے بھی اس طرز عمل کی کامیابی آسان کر دی ہے۔ کلچرل نقطہ نظر سے بھی بنگالی مسلمانوں کو ہندوؤں کے دیکھے مٹم طریقے باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے شور و غل اور سینہ زوری سے زیادہ معائنہ ہیں

بالخصوص جب باہر والے مقامی نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کریں اور اپنی تہذیبی اور مذہبی فوقیت کے نشے میں سرشار رہیں۔

ان عام رجحانات کے علاوہ مقامی اثرات بھی ہیں۔ وسطی بنگال (یعنی مشرقی پاکستان کے موجودہ راج شاہی ڈویژن) میں اسلامی اثرات کمزور تھے۔ انیسویں صدی میں اسلامی احیائی تحریک کا اثر زیادہ تر نوکھالی۔ چٹاگانگ۔ فریدپور۔ ڈھاکہ گمرات تک رہا۔ (سلمٹ بھی حضرت شاہ جلال اور ان کے ساتھیوں کی برکت سے اور علاء الدین حسین شاہ کے اس عمل کی بدولت کہ اس نے اس سرحد پر کسی ممتاز مسلمان خاندان آباد کیے تھے۔ اسلامی تہذیب کا ایک مرکز رہا ہے) لیکن ایک تو اصلاحی اور احیائی تحریک کا بعض علاقوں میں بہت تھوڑا اثر ہوا ہے۔ دوسرے فارسی عربی کی سربازاری، جدید بنگالی ادب اور اس کے متعلقہ اثرات کے فروغ اور پڑھے لکھے طبقوں کی مذہب سے بڑھتی ہوئی عدم دلچسپی نے منفی رجحانات کو بہت تقویت دی ہے۔ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلباء نے جنوب اور جنوب مشرق میں مذہبی حالت بگڑنے نہیں دی، لیکن وہ بھی ضرورت سے زیادہ قدامت پسند ہیں اور نئی نسل کی ضروریات کا جواب دینے سے قاصر۔

ہمارے سامنے ایک ایسے بنگالی اسکالر کا ایک مقالہ ہے جو اس وقت مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم میں بڑا ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں، لکھتے ہیں۔ تمام بنگالی مسلمان نہایت حقور پی مستثنیات کے سوا فکر اور عمل میں بنگالی ہی ہیں۔ ان میں بنگال کا اصلی دل حرکت کرتا ہے اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کے ناموں، عرفوں، ان کی عوامی کہانیوں اور عوامی ادب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی افکار و خیالات اور اخلاق و رسوم کا طویل اور مسلسل نفوذ بنگالی مسلمانوں کی بنگالی ذہنیت کو کسی قابل لحاظ طور پر بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ (ترجمہ از انگریزی)

ہم فاضل مقالہ نگار کی رائے اور نقطہ نظر سے متفق نہیں۔ ہمارے خیال میں

انھوں نے اس ٹھیکہ اسلامی عنصر کا پورا اندازہ نہیں کیا، جو بنگالہ کے بیشتر مسلمانوں کی ذہنیت کا قیمتی اور عزیز جزو ہے، لیکن ان کی رائے اور اندازہ نگاہ سے ان خیالات کا اندازہ ہوگا، جو بنگالی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ با اثر طبقے میں عام ہیں اور ہماری بھی یہ رائے ہے کہ جو لوگ اپنی نگاہ ڈھاکہ اور چند دوسری جگہوں کے قدیمی سربراہان اور خاندانوں تک محدود رکھتے ہیں اور مقامی رجحانات اور پس منظر کا ٹھنڈے دل اور غور اور وسیع النظری سے مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ مشرقی پاکستان کی صورت حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ

۱۷۰۳ء | اٹھارہویں صدی عیسوی کے تیسرے سال کی ابتدا ہے۔ اسلامی
ہندوستان کا آخری جلیل القدر بادشاہ عالمگیر دکن میں مخالفوں کے برسرِ پیکار
ہے۔ اس کی عمر پچاسی سال کی ہو رہی ہے۔ بڑھاپے کے بوجھ سے کمزور ہو چکا ہے
لیکن اس کمزور اور نحیف جسم کے اندر ابھی وہی آہنی دل ہے جس کے بل بوتے پر عالمگیر
پچودہ برس کی عمر میں ایک مست ہاتھی کے سامنے یکہ و تنہا ڈٹ گیا تھا۔ اس کی دماغی
محنت اور مستعدی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فوج کی کمان بذاتِ خود کر رہا ہے مختلف
حصوں کے نقشے خود سوچتا ہے اور قلعوں پر حملے کے وقت اپنے جرنیلوں کی خود رہنمائی
کرتا ہے۔

اسے اپنے مقاصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے مرہٹوں کا شیرازہ
اگر اس کا دار و مدار کسی ایک شخص یا کسی ایک مرکز پر تھا، منتشر کر دیا ہے، لیکن اس کا
دل جانتا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے بڑے
بڑے قلعے فتح کر لیے ہیں، لیکن اب ہر مرہٹے کا گھر قلعہ ہے جس میں بادشاہ کے
خلافت سازشیں ہوتی ہیں۔ بیشک اب سب بڑے بڑے علم برداران بغاوت مٹ
گئے ہیں یا مٹا دیے گئے ہیں، لیکن اس سے دکن میں سناٹا نہیں ہوا۔ اب ہر مرہٹہ کا شکار
سپاہی ہے۔ جو کبھی شیواجی کے کسی خرد سال جانشین کی زیرِ قیادت اور کبھی کسی من چلی
رائی کی متابعت میں مصلوں کے لیے عذابِ جان بنا ہوا ہے۔

مولانا شبلی کا بیان ہے کہ اب مرہٹے محض اڑتے ہوئے درے رہ گئے تھے۔ یہ
تشبیہ گمراہ کن ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت مرہٹوں کی مرکزیت تباہ ہوئی
تھی تو سوچنا چاہیے کہ اس کے لیے حکومتِ دہلی کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ بیجا پور اور

گوکنڈہ کی وسیع خود مختار ریاستیں تو ایک ایک سال کے اندر مغلیہ مقبوضات میں داخل
ہو گئیں، لیکن مرہٹوں کو سر کرنے میں اورنگ زیب پچیس سال صرف کیے اور اس تمام
تنگ و دوکانہ نتیجہ یہ تھا کہ جونہی اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں یہ اڑتے ہوئے درے
بگولے بن گئے۔ اور خیام شاہی کو اپنی شہر نشانی کے ساتھ لے اڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کو اس کی ذاتی خوبیوں کے باوجود
حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں، لیکن سب سے اہم وجہ جس میں اسلامی
حکومت کے زوال کا راز پنہاں ہے، مغل امراء اور مغل لشکریوں کی عسکری کمزوری تھی
بادشاہ کی بیدار مغزی، ہمت، محنت اور استقلال میں کلام نہیں، لیکن اس سہ سالہ وصال
اور سپاہیوں میں آرام طلبی، غلامی، فرض ناشناسی اور خود غرضی جیسی تین خصلتیں
گھر کر چکی تھیں اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے پست درجے پر تھے۔
مرہٹوں میں ابھی ابھی پندرہویں کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب
ایک زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خانہ دانی نزاکتیں
بڑی حد تک دب گئی تھیں اور ان کا ہر فرد مغلوں کے مقابلے میں قلعے درے، سختے
جس طرح بھی ہو سکتا تھا، برسرِ کار تھا۔ دوسری طرف وہ مغل امراء اور لشکری تھے،
جنہیں عہدِ جاگیر اور عہدِ شاہجہانی کے عیش و عشرت نے بگاڑ رکھا تھا۔ ان کے لیے
اتنی مدت تک شمالی ہندوستان سے دور دکن کی لڑائیوں میں مبتلا رہنا ہی ایک ایسی
مصیبتِ عظمیٰ تھی کہ شاید وہ مرہٹوں کے ہاتھ شکست کھانے کو بھی اس پر ترجیح دیتے
ان کے دل میں اس وقت جو گند رہا تھا اس کی ترجمانی نعمت خاں حالی کرتا ہے۔

سخن را بود در تقارب قبول! فلول - فلول - فلول

الہ است اللہ و رحماں خدا مگر او کست در ہم بر فوج شاہ

رحیم است و غفار و آمرزگار ندانم چہ شد بقتلہ این سپاہ

لیکن مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا بلکہ ان میں

غدار اور نمک حرام بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے،

اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور تو اور مغل شہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ چنگی کے محاصرے کے وقت شہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجا رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتہ لگ گیا اور انھوں نے اسے گرفتار کر کے زیر حراست اورنگ نے یکے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شہزادہ محمد اعظم کو رشتہ دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مغل نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت فقط دو ماہ کی رسد تھی چھ ماہ تک فتح نہ ہوا!

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی۔ وہی حالت قلعہ داروں میں صدارتوں۔ محاسبین اور معمولی سپاہیوں اور امیروں و زیروں کی تھی۔ اور جن قلعوں کی فتح میں مہینے صرف ہوئے تھے وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دنوں میں دشمن کو بغیر کسی کشت و خون کے واپس مل جاتے۔ جب سنگتہ میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر واکن کھیڑہ کی طرف متوجہ ہوا تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ۔ پر نالہ اور پاؤ گڑھ کے قلعے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے!

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ ٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چراتے اور اگر انھیں کہیں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے راہ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس فن کشف میں بادشاہ کے بھائی "بند توری" بد مذہب ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب ایک توری امیر میر محمد امین نے شکایت کی کہ فوج کے اعلیٰ عہدے "بد مذہب اور دیوسیرت" ایرانیوں کو مل رہے ہیں۔ تو بادشاہ نے لکھا۔

مجماعت توریان کہ برادران ہمشہری بزرگان ماند... بہ مضمون ولا تلقوا ابائکم
الی التہلکۃ یعنی میندازید خود را بدستہلے خود در ہلاکت در عین گیرودار اجت

معیوب نے داند۔ اگر در آوردن کسے ایں حالت رویدہ۔ چنداں مضائقہ ندارد۔
لیکن در عین کارزار سخت مشکل است۔ اگر عیاذاً باشد از ہماہیان حضور ایں صورت واقع
شود۔ در یک لمحہ مقدمہ تمام حکایت بانجام برسد۔

اگر در ایں امر مجرب و آزمودہ انکار سے داشتہ باشد۔ مفصل معروض دارد۔ و
جماعت ایرانیان، خواہ ولایت زرا، خواہ ہندوستان زرا، کہ بجل مرکب مشہور اند بعد مدخل
ازین حرکت دوراندہ

انصاف بدہ کہ جل آں مردم زشت

بہتر ز ہزار عقل رو باہ سرشت

اورنگ زیب اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ
بار بار اپنے رفقات میں دیا ستارہ کاروان ملازموں کی کمی پر آئسو بہاتا ہے۔ ایک جگہ
لکھتا ہے: آدم ہوشیار، امانتدار، خدا ترس، آبادان کار، کمیاب
آنچہ بہتیم و کم دیدیم و بسیارست و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیارست و نیست

ایک اور جگہ لکھتا ہے: حال ایک کس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی و کاروانی آراستہ
باشد، مے خواہم یافتہ نمے شود۔ از نایابی آدم کار آہ۔ آہ۔

پوچھنے والے پوچھیں گے کہ عجب معاملہ ہے کہ اسلامی ہندوستان کا سب سے زیادہ
مذہب پرست بادشاہ برسر اقتدار ہے۔ ہر طرف اہل شرع کا بول بالا ہے۔ لیکن وہی
انسانی خوبیاں جن کے لیے مذہب مفید بتایا جاتا ہے۔ منفقہ ہو گئی ہیں اور بادشاہ خود
کہتا ہے کہ راستی، خدا ترسی، امانتداری، کمیاب بلکہ نایاب ہے! اور جو اس کی یہ ہے کہ
شرع اور فقہ کی گرم بازاری سے باطنی برائیوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ظاہر پر
ہوتی ہے۔ (محتسب راور وین خانہ چہ کار؟) ان کا کام شعائر اسلامی کی حفاظت
قمار بازی کا سد باب، شراب کی بندش۔ جزیہ کا نفاذ۔ نئے بت خانوں کی ممانعت۔
صغائر و کبائر پر سزا دہی۔ ان پر فقیہ زور دیتے ہیں، لیکن روحانی اور باطنی کوتاہیوں کا

ان سے ملنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہی فقہاء کے حیطہ اختیار سے باہر ہیں۔
 سرہند سے بیشک ایک تحریک اٹھی تھی، جس نے کئی مخلصانہ جدوجہدیں کو متاثر
 کیا لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی۔ اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور
 اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا اور پھر
 اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستا واقعات نے بند کر دیا۔
 مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قیومتیت کے سراب میں
 گم ہو گئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک
 نام نہاد قیومتیت کا دعویدار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں کہ قیوم میں ہوں اور دنیا میرے
 سر پر قائم ہے! حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب
 پاس امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے بھیجا تھا، لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے،
 اس کا بیان ایک مختصر کی زبان سے کیجئے۔

حضرت شیخ صاحب کے لیے سرہند میں دیا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے
 لٹکا ہوا نصب ہوتا۔ جس کی چوبوں پر باقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمہ کے اندر ایک
 بڑا ڈگری رکھی جاتی، جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرد اگر نقیب اور
 چوہدار ہاتھوں میں ٹنہری اور روہی حمالیے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ شاہزاد
 اور امرا حاضر خدمت ہو کر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا۔ نہ بیٹھے۔

یہ تھے حالات، جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھر اخیر عمر میں ایک فرزند پیدا ہوا
 تولد ہوا جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے
 اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سد باب کرے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مرد گرامی حالات کی پورے طور پر اصلاح کر سکا اور
 جس سیلاب کو عالمگیر جیسا دور اندیش اور مستعد منتظم نہ روک سکا، اس کا فوری سد باب
 ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا لیکن اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ

جب اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو جہاں مغلوں کا تخت و تاج اس سیلاب میں بہ گیا۔
 وہاں صبح و سجادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ قوم کا دینی انحطاط نہ
 شروع ہو گیا۔

اس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی اور دوسرے اُس نے
 اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری
 سب سے بڑی ڈھال رہا ہے۔ یہ اس خاندان کا ہی فیض تھا کہ جب ہندوستان میں اسلام
 پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے، تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے۔
 اس میں دلچسپی لیتے تھے اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور اضلاع پورب
 کی دوسری دہریہ گاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آرہا تھا، وہ اس مذہبی کشمکش میں
 مفید نہ تھا۔ اس کے لیے روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی جو فقہ اور منطق
 سے نہیں، بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی۔ اور انھیں اس خاندان نے جس
 طرح عام کیا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔

اخلاقی حیثیت سے اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی روح پھونک دی
 تھی، اس کا اندازہ مولانا سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں
 کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے روسیہ
 انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ولی اللہی تحریک کا اثر تھا کہ
 لوگ اپنے گھروں سے سیکڑوں میل دور بالا کوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ دار اپنی جان پر
 کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن کیا ان لوگوں کے اشار۔ مذہبی غیرت اور
 اخلاقی جرأت میں کوئی شک ہے؟

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہن

بازی اگر چہ پانہ سکا، سر تو کھوسکا

اس بزرگ نے نہ صرف قوم کو ایک نئی روحانی اور اخلاقی زندگی عطا کی، بلکہ جیسا کہ
 ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔ عقائد و خیالات کا ایک ایسا نظام مرتب کر دیا

جمہ اسلامی ہندوستان کے خاص حالات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں تھا اور فی الحقیقت قوم کی نئی تنظیم کے لیے روحانی اساس ثابت ہوا۔

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ ۲۱ فروری ۱۷۳۳ء کو یعنی اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی حیثیت سے اسلام کا عہد زوال ہے، لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ جس سال شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اسی کے قریب اسلام کے دوسرے جدید کاؤسرا بڑا مصلح اور مجدد درگستان نجد میں ظہور پذیر ہوئے۔

شاہ صاحب کا سلسلہ نسب والد کی طرف حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی محکمہ کے آغا نہیں ہندوستان آئے اور بمقام رہنمائی مقیم ہوئے۔ پہلے آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا، لیکن ایک بزرگ شیخ محمود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری اور دلیری کے لیے نامور رہا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین صاحب السیف والعلم تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد نے قرآن مجید انہی سے پڑھا۔ لیکن وجیہ الدین کی شہرت بطور ایک بہادر شیخ آزما کے ہے اور ان کی بہادری کے قصے شاہ عبدالرحیم اپنے گھروالوں کو سنایا کرتے تھے تاکہ انھیں بھی اخلاق فاضلہ حاصل کرنے کا شوق ہو۔ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے۔ اور جب کچھ وہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان محرم ہو تو ان چند باہمت اور وفادار سرداروں میں سے تھے، جو اس وقت بھی ثابت قدم رہے۔ جب شجاع کے مست ہاتھیوں نے او دم چار کھانٹا اور تمام لشکر تتر بتر ہو رہا تھا۔ وہ اخیر عمر میں دکن کے سفر کے لیے نکلے تھے۔ جہاں مسلمانوں کو اس وقت بڑی مشکلیں درپیش تھیں۔ لیکن برہان پور کے قریب انھیں بہت سے لیٹروں نے آن گھیرا۔ آپ ان کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور مالوہ کی خاک میں ہی دفن ہیں۔

شاہ عبدالرحیم

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم تھے۔ انھوں نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی۔ آپ ۵۳۴ھ (۱۷۴۲ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کچھ گھر پر پائی۔ کچھ اگرے میں جہاں شاہ وجیہ الدین سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ میر محمد زاہد ہروی سے محفولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں اور پھر کچھ عرصے کے لیے خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے فیض حاصل کیا جو خواجہ حسام الدین کے خلیفہ اور اس زمانے میں نقشبندیہ باقویہ طریقے کے ترجمان تھے۔

آپ کا خاندان قصبہ پہلٹ میں مقیم ہو گیا تھا، لیکن آپ نے اکبر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی میں "مندیوں" کے محلے کے نزدیک مدرسہ رحیمیہ قائم کیے وہاں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے اہل دل علما میں سے ہوتا تھا۔ آپ عام طور پر عبدالملکیری کے درباری علماء سے الگ تھلگ رہے۔ اورنگ زیب کی دعوت کے باوجود آپ اس کے دربار میں نہیں گئے اور اس زمانے کا فقہی ماحول اور علماء کا دنیا دارانہ رنگ آپ کو ناپسند تھا، لیکن آپ کے تعلقات دار الخلافہ کی اکثر علمی شخصیتوں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو۔ وفات آپ کی ۷۷ سال کی عمر میں جب شاہ ولی اللہ ابھی سترہ سال کے تھے ۱۱۳۱ھ میں ہوئی۔

شاہ عبدالرحیم کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی ہے اور فی الحقیقت علمی اور دینی خدمات میں بیٹا باپ سے باری لے گیا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم خود بڑے سمجھدار اور بلند پایہ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے۔ اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشوونما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل تھا۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی جامعیت ہے یعنی وہ اخلاقی مسائل میں ایسا سستہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی علمی وسعت اور ذہانت

لے پہلٹ ضلع منظر میں ایک قصبہ ہے۔ میرٹھ سے تھینا نہیں کوئٹہ کی جانب [معارف طریقت ص ۱۰]

افلاس العارفین میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے جو حالات ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے دیرہ و در صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اگر کسی گھر قطعاً نہ جلتے تھے، لیکن اگر امرا میں سے کوئی آپ کی زیارت کے لیے آتا تو اس کا بہت پاس کرتے اور پیار محبت سے اسے نصیحت کرتے۔ بعض مجذوبوں کی طرح بذلتی سے پیش نہ آتے۔ آپ اپنی معاشرت اور لباس اور وضع قطع میں متدل مزاج تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ”در ہر امر توسط دوست میداشتند۔ نہ چندان در تناسک و تحقق فرو رفتہ بودند کہ بر ہیبت کشد۔ نہ چندان ترک تعبد با و اب مترسل بودند کہ بہ ہماون میل کنند۔“

آپ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے آپ کی ایک رباعی نقل کی ہے جو آپ نے فی البدیہہ کہی اور اپنے فرزند ارجمند کو بطور وصیت کے لکھوائی۔ رباعی

گر تو راہ حق بخوامی پس خاطر کس را مر بخوان، الحذر

در طریقت اگر علم و حکمت است این چنین فرمود آں خیر البشر

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے خاندان کی نسبت عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف میں نقشبندی مجددی طریقے پر عامل تھے۔ حضرت حکیم الامت کے طریق کار پر ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے، لیکن اس بار سے میں شاہ عبدالرحیم کا طریقہ بھی وہی تھا جو ان کے وسیع الخیال فرزند کا۔ یعنی وہ ہر سلسلے سے فیض حاصل کرتے۔ اقوال الجلیل میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کے متحدہ بردوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں سے ایک سید عظمت اللہ اکبر آبادی تھے جو چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے ایک خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی جنہیں زیادہ تعلق خاطر قادریہ سلسلے سے تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ بزرگ مجددی سلسلے کی بڑی شاخ (یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے اپنے خاندان سے متعلق نہ تھے۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند تھے، لیکن انھوں نے بیعت حضرت مجدد کے بیٹوں اور پوتوں سے نہیں کی تھی، بلکہ نقشبندیہ سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے۔

شاہ عبدالرحیم نے حضرت خواجہ خرد سے ایک مدت تک فیض حاصل کیا۔ جو شیخ احمد مرندی اور شیخ ابو داؤد خواجہ حسام الدین کی صحبت میں رہے اور انہوں نے خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں رہے۔ جب شاہ صاحب نے حضرت خواجہ خرد سے بیعت کی درخواست کی تو انھوں نے حضرت مجدد کے فرزند ارجمند خواجہ محمد معصوم کی بیعت کا نہیں، بلکہ شیخ آدم بنوری کے کسی خلیفہ کی بیعت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ سید عبداللہ اکبر آبادی کے مرید ہوئے جو شیخ آدم بنوری کے ممتاز خلیفہ تھے۔

واقعہ یہ ہے۔ ۱۔ اور شاہ ولی اللہ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ شاہ عبدالرحیم سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ نہیں، بلکہ طریقہ نقشبندیہ باقویہ کے بزرگ تھے۔ ان کا اصل طریقہ حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا، بلکہ حضرت خواجہ باقی باللہ کا تھا۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند اور معترف تھے۔ لیکن مجددی سلسلے کی کئی باتوں کا ان کے ہاں سراغ نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ ان کے خاندان میں ہر سلسلے سے فیض حاصل کرنے کا رواج تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلے سے عقیدت کے باوجود وہ اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ کے جانشین شاہ عبدالعزیز کی نسبت شاہ غلام علی کے قلمی ملفوظات میں لکھا ہے:۔

حضرت الیشاہ (شاہ غلام علی) فرمودند کہ روزے حضرت مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب

ومن در یک مجلس بودیم۔ ناگاہ تذکرہ نقشبندیہ آمد۔ مولوی صاحب فرمودند کہ نسبت

این طریقہ نقشبندیہ بے تمک است۔

حضرت مجدد الف ثانی کے ایک پوتے شیخ عبدالاحد المعروف شاہ گل متخلص بہ وحدت ایک صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ شاہ عبدالرحیم سے ان کا گہرا بارانہ تھا۔ ان کے ایک دوسرے کے نام کئی خطوط ملتے ہیں اور چونکہ دونوں بزرگ دینی میں تھے، اس لیے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جن میں علمی اور روحانی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کی جو روایت شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے، اس سے اس لطیف لیکن

گہرے فرق کا اندازہ ہوتا ہے جو شاہ ولی اللہ خاندان کو مجددی بزرگوں سے تھا۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ پر اختلاف کے باوجود) ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے پر۔

شیخ عبدالاحد قدس سرہ نے اپنے اسلاف کی ایک متواتر نقلِ بایں مضمون پیش کی کہ نماز جماعت بالکل اس درباری جماعت کے مشابہ ہے جو ایک آلہ الحرم اور حرکت بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کرے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اسی امر کا متقاضی ہے کہ تمام لوگ ایک زبان ہو کر اپنی حاجتیں عرض کریں نہ یہ کہ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ کہے۔

شیخ عبدالرحیم صاحب فرمایا کہ آپ نے حنفی مذہب کی تائید میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے محض قیاس ہے اور قیاس بھی مع الفارق کیونکہ حقیقت میں دعا اور حضور کے ساتھ مناجات کرنا اور نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی لَا صَلَوةَ لِمَنْ مَّا يَقْرَأُ بِأَمِّ الْكُتُبِ اس دعویٰ پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے اور یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ خدا نے تعالیٰ جمع ہے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ایک میدان میں صف آرا ہوں اور ہر شخص ایک جگہ الخت اور نئے الفاظ میں مناجات کرے تو وہ ہر شخص کی علیحدہ علیحدہ مناجات سن سکتا ہے اور ایک شخص کی مناجات دوسرے کی مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

اس اختلافی مسئلے کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سی دلائل دی جا سکتی ہیں اور اس کی صحت سے یہاں بحث نہیں، لیکن شیخ عبدالاحد اور شیخ عبدالرحیم نے اس مسئلے پر جس طرح اپنے خیالات پیش کیے اس میں سمجھنے والوں کے لیے بڑا غور و فکر کا سامان ہے اور اس لطیف فرق کو نمایاں کرتا ہے جو ہمارے دو ممتاز ترین علما و اولیاء کے طریقیہ کار میں تھا۔ ایک نماز میں سب سے زیادہ اہمیت تہذیب نفس کو دیتا ہے۔ دوسرا اسے جماعت بندی اور ظاہری آداب کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک

جزوی امور میں انفرادی رنگ کی اجازت دینا فرد کی روحانی نشوونما کے لیے مفید سمجھتا ہے۔ دوسرا جماعت بندی کے اصول سے یہ آزادی نہیں دینا چاہتا۔ ایک باطن پر نظر رکھتا ہے۔ دوسرا ظاہر پر ایک جمع بین الغریبین کے اصول پر چلتا ہے۔ دوسرا ایک طریقے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک وحدت الوجودی ہے۔ دوسرا وحدت الشہودی !

شیخ عثمانی مسئلے پر بھی شاہ عبدالرحیم کا طریق کار اسی طرح اعتدال اور محاطہ فہم کا تھا جس طرح دوسرے امور میں وہ غلو اور تعصب سے پرہیز کرتے۔ اور یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب وہ ایران و روم سے آئے ہوئے ایک فاضل (عبداللہ حلبی) سے شیخ عثمانی مسائل پر مباحثہ کرنے گئے تو انھوں نے اپنا مذہب سنی نہیں بلکہ خذ ما صاودع ما ملکنا بتایا۔

روضۃ القیومیہ میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کو براہ راست حضرت مجدد الثانی کے مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کا مرید لکھا ہے۔

شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا مطلق شیخ آدم کے مقبرہ خلفا سے ہیں۔ نہایت مستقیم احوال تھے۔ صاحبِ کرامت و غوارق تھے۔ اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کیسے جانتے تھے حضرت قیوم ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے۔ ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے۔ ایک پرانی دلی میں۔ دوسرا شاہجہاں آباد کے قریب پہلت نام قصبہ میں (ذکر ازل ۱۲۰۵ھ) جب روضۃ القیومیہ کھلی گئی اس وقت شاہ ولی اللہ کا عالم شباب تھا مصطفیٰ نے شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کے ذکر سے ساتھ ان کے متعلق بھی ایک سطر لکھی ہے۔ شیخ ولی اللہ۔ آپ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم کے جامع اور شریعت اور طریقت کے سخت پابند ہیں۔ عموماً پہلت میں رہتے ہیں۔ (ذکر ازل ۱۲۵۵ھ)

شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت | شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کر دیا۔ دوسرا میں کلام مجید پڑھ لیا اور ساتویں سال سے نماز اور روزہ کی پابندی شروع کی۔

پھر فارسی کتابیں اور عربی رسائل پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی اور پھر مقولات ختم کر کے منقولات تک جا پہنچے۔ فقہ، منطق، حدیث، کلام کے علاوہ آپ نے اپنے والد سے طب، معانی اور ہندسہ و حساب کی کتابیں پڑھیں۔

آپ کے بچپن کے متعلق بہت کم واقعات ملتے ہیں، لیکن آپ کے مکتوبات کا ایک مختصر مجموعہ مطبع احمادی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے جس سے آپ کی ذہانت اور رنگ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ابھی طفل مکتب تھا کہ شیخ فیروز شاہ جو مشاہیر عصر میں سے تھے اور سلسلہ شیخ آدم بنوری سے پیوند رکھتے تھے۔ میرے والد کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپ اس دنیا میں انھی آنکھوں سے روت حق سبحانہ کے قابل تھے اور اس مسئلے پر والد ماجد سے بحث کرنے لگے۔ میں بھی باوجود طفولیت کے بیچ میں بول اٹھا کہ باہرہ اپنی ناتوانی یا کسی اور کمی کے باعث اس چیز کو بھی جو ہمارے پیچھے بلکہ ہمارے سر پر ہو نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قریب ہمارا نفس ہے۔ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ پھر اس کی ان کمزوریوں کے باوجود کس طرح اس سے قمع ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو جو ہر لطیف شے سے زیادہ لطیف ہے، معائنہ کر سکے گی!

جب میں نے مثالیں دے کر یہ بات واضح کی تو بحث ختم ہو گئی اور سب لوگ میری تعریف کرنے لگے۔

۵ سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو بیعت کیا۔ اس کے دو سال بعد والد کا انتقال ہو گیا تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسند تدریس سنبھالنی پڑی اور قریباً بارہ برس تک آپ نے اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں علوم دینی و عقلی کی تعلیم دی۔ اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بعد از وفات حضرت ایشاں دوازده سال مکالمہ بش بدین کتب دینیہ و عقلیہ نمودہ و در ہر علمے خواص واقع شد۔"

اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آپ عرب تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ اور حدیث شریف

سفر حرمین

جسے ہندوستان میں آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا۔ اس کی سند شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے لی۔ شیخ ابوطاہر آپ کے فہم کے بڑے ملاح تھے اور کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معافی کی۔

شاہ صاحب نے ابوطاہر کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ اسلامی دنیا کے بہترین اساتذہ میں سے تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں: "بالجملہ متصف بود بصفات سلف صالح ازودع واجتہاد و طاعت و اشتغال بعلم و انصاف در مذاکرہ۔ در ادنیٰ مراجعت تا تامل وافی نکردے و قمع کتب نہ نمودے، جو اب ندائے اختلافی نظروں کو تطبیق دینے کا جو اصول شاہ ولی اللہ کے والد نے اختیار کیا، ان پر شیخ بھی عامل تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں: "در اثنا سے قراۃ صحیح بخاری، تنقیح اختلاف روایات احادیث و فقہ افتاد۔ شیخ ابوطاہر گفتند اینہما از ان ست کہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در نہایت جمیعت است و از فرط جمیعت اضداد و اراجح ملتواند کرد۔" انھیں احادیث میں شاہ صاحب نے اپنے والد اور چچا کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے یہ امر قریب قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔ شاید شاہ صاحب بھی اپنے خاندانی رجحانات سے متاثر ہوئے تھے اور ان اثرات کی کسی حد تک اصلاح مدینہ منورہ میں ہوئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے کے قریب مدینہ منورہ میں بطور طالب علم وارد تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے جنھیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دونوں راہنما جانتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔ قیام مکہ معظمہ کے زمانے میں حضرت حکیم الامت نے ایک خواب دیکھا جس کے دوران میں خود رسول کریم نے آپ کو اس بشارت سے متغیر فرمایا کہ (ترجمہ) "تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ اُمت مرحومہ کے جھٹوں میں سے کسی جھٹ کی تخلیم تمہارے ذریعے کی جائے۔"

جن دنوں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، ہندوستان میں مرہٹہ گردی کی وجہ توں کی بُری حالت تھی۔ اور آپ کو ہندوستان سے اس امر کا مشورہ بھی دیا گیا کہ آپ عرب میں ہی اقامت پذیر ہو جائیں، لیکن جس ہستی سے خدا نے تعالیٰ نے اس ملک میں بے شمار خدمتیں لینی تھیں اسے بھلا اپنے آرام و سہولت کے لیے یہ مشورہ کیونکر قبول ہوتا۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دینے والوں کو لکھا کہ مجھے ہندوستان واپس آنے سے نہ روکو اور واپس آگئے۔

جب آپ نے واپسی کی تیاری کی تو آپ شیخ ابوطاہر کے پاس گئے اور ختمی سلام عرض کیا۔ اس وقت شفیق استاد اور اداوت مند شاگرد کے درمیان جو گزری اس کا ذکر شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں کیا ہے۔

میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جدائی کی گھڑی سر پر آگھڑی ہوئی اور رخصتانہ طاقات کے دوران میں مزاج پرسی کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا۔

کَسَبْتُ كُلَّ طَرِيقٍ كُنْتُ أَعْرِفُهُ
إِلَّا طَرِيقًا لِدِينِي إِلَى رَبِّكَ
(یعنی میں ہرگز اس رستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے، ان تمام رستوں کو بھول گیا، جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا، تو شیخ کی پریم آنکھوں آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسارے سُرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ فوراً گریہ سے آپ کا ہاند چوم گیا۔ زراں بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی۔

ہندوستان کو واپسی | استاد کو الوداع کہہ کر شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور ۲۳ جولائی ۱۷۳۲ء کو اپنے وطن ٹانوف دہلی میں وارد ہوئے۔ لیکن اس وقت وطن پر دہلی سے بدتر تھا۔ اسلامی حکومت پر زطل و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے اعدا اور ان سے بدتر دوست نمادِ دشمنوں کا ہجوم تھا۔ مرہٹے، سکھ، سادات بابرہ، نادر شاہ، ملک و غلظت اٹھی کے لیے ایک قہرِ عظیم بنے ہوئے تھے۔ ان حالات کے ملاحظہ سے

شاہ ولی اللہ پر جو گزرتی ہوگی اسے نگاہِ تصورِ بآسانی دیکھ سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان علما و مشائخ کے اس طبقے کا ہم خیال نہ تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ دنیوی ماحول ان کے لیے کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اس خاندان کو علم و عرفان کی قوی کشش کے باوجود واقعات سے بڑا لگاؤ رہا ہے اور وہ قوم کے دکھ درد میں برابر شریک رہے ہیں۔

اس سے پہلے جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد ابھی زوالِ حکومت کا آغاز تھا تو شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی نگاہِ انتخاب نے امر واراکین سلطنت کی بھیڑ میں سے اس مردِ صاحبِ نظر کو چُنا، جو حکومتِ اسلامی کی بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے بچا لینے کا اہل تھا اور اسے نیک کام کی تلقین کی۔ شاہ عبدالرحیم نے آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو اورنگ زیب کی وفات کے دس بارہ سال بعد جو خط لکھا، وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے:-

بہ جانب وزیر الممالک، آصف جاہ در تخلص
جہاد تحریر یافت.....

بر خاطر عاظمیٰ فقیر واضح شد کہ ملکوت مقدس
شدہ کہ کفار ذلیل و خوار شوند و لجا زان بہ چند
مُدت با خیان رسوا و خراب گردند۔ و اگر آں
شوکت و شہامت مآب بریں ملا عین کمر ہمت
بہ بندید۔ ایں ہمہ منصوب بایشان شود و تمام عالم
منخرایشان گردد و سبب رواجِ ملت و
استقامتِ دولتِ ایشان باشد۔

وزیر الممالک، آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق
دلانے کے لیے لکھا گیا.....

اس فقیر کی خاطر عاظمیٰ پر یہ منکشف ہو کہ عالم
ملکوت میں یہ امر طے شدہ ہے کہ کفار ذلیل و خوار ہوں
اور کچھ زمانے میں باغی رسوا و خراب ہوں۔ اب اگر
شوکت مآب (آصف جاہ) ان گمراہوں کی مخالفت میں
کمر ہمت بندھیں تو یہ سارے کائنات میں ان سے منسوب
ہوں گے۔ تمام عالم ان کا مستخرج ہوگا اور کلامِ رواجِ ملت
اور ان کی دولت کے استحکام کا باعث ہوگا۔

لے اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، لیکن چونکہ اورنگ زیب کی وفات کے تیرہ سال بعد شاہ عبدالرحیم انتقال کر گئے، اس لیے یہ خط اس سے پہلے کسی وقت کا ہے اور غالباً محمد شاہی دور کی ابتدا میں لکھا گیا۔

سعی قلیل خواہد بود۔ و فوائد جلیل۔ و اگر سعی نکند۔ این جملہ خود بخود بہ حوادث سماویہ ہلاک و مضحمل گردند۔ دیدی صورت این معنی بایشان منسوب نہ گردد۔

کار زلف تست مشک افشانی و ناما عشاق مصلحت راستھے براہوئے چیں بستہ اند چوں این معنی منفع (۹) و مودکہ معلوم است، لہذا بآں عزیز القدر بے اختیار نوشتہ می شود وقت را غنیمت دانند و در جہاد اعدائے اللہ تاعاد و تفاعل کار فرمائشوند۔ بعد چندین کار و امخ نخواہد شد۔ چوں اظہار اتم مطلوب نبود و دوستی و خیر خواہی و امنگی از مبالغہ احترام برفت و سخن ازین فاش تر تصور نمی شد۔

گوئے توفیق و کرامت در میاں افکندہ اند کس بمیداں در نیے آید سواراں را چہ شد! سخنے کہ باختران خود در پردہ ادا سے کردیم این جا بے پردہ نوشتہ شد تا عذر نمازد والسلام والا کرام۔

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد کی روش جاری رکھی۔ اسلامی حکومت کی بچائیں سے کشمکش کے دوران میں جو کوئی کار نمایاں کرتا شاہ صاحب اس کے لیے دعا کرتے اور تحریر و تقریر سے اس کا دل بٹھاتے۔ اس سلسلے میں ان کے دو خطوط قابل ذکر ہیں۔ ایک پابندہ خاں رودہلیہ کے نام ہے۔ درہنگام فتح نواح جبال شرقیہ ہندوستان کی کمر لاس کفار و منصوری اہل اسلام۔

عزیز القدر۔ رفعت مآب المجاہد فی سبیل اللہ۔ الرفع الکلمہ اللہ پابندہ خاں رودہلیہ تعالیٰ۔ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ سلام محبت التیام مطالعہ فرمائند۔ آنچہ شنیدہ میشود از سعی ایشان در جہاد کوہستان موجب فرح و خوشی و سبب دعا بہ منظر الخیب سے شود۔ اللہم انصو من نصو دین محمد صلی اللہ علیہ

دوسرا خط سہارنپور کے فوجدار خان زمان خاں کے نام ہے :-

اللہ تبارک و تعالیٰ مجد و قانون شجاعت و دلاوری خاں حوالی مرتبت خان زمان خاں جوہا مدت مدیدہ در درجہ مکاید طاغیان کفر از بغیہ اہل اسلام منصور و مظفر دارد۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام سنت اسلام واضح آنکہ خطوط بزرگان پہنت و بیان دلجوئی و عاطفت آں رفیع القدر شہستہ۔

ان ارباب اللہ نے حقیر کے ساتھ مل کر بڑی عاجزی سے اخلاقی مشربہ کے لیے حسن ظن اور کمال تبرکے دینی و دنیوی کی دعا کی۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس دعا کو قبول کرے اور انھیں زیادہ اعمال خیر کی توفیق دے والسلام شاہ صاحب کے یہ تین خطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعے سے

ہیں ملے تھے اور ہم نے انھیں رود کوثر کے گزشتہ ایڈیشن میں درج کر دیا۔ اس کے بعد فقیر خلیق احمد ظاہمی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکاتیب نام کی ایک مستقل کتاب میں ان سے بھی اہم

لہ یہ تینوں خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے۔ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعہ میں ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے تمام خطوط کو جمع اور شائع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

مکاتیب شائع کیے ہیں اور رائے ظاہر کی ہے کہ مرثیوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو بلانے اور نجیب الدولہ کو اس کا شریک کرنے میں شاہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا۔

شاہ ولی اللہ ان تمام کوششوں میں دلچسپی لیتے، جو حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کے لیے کی جاتیں۔ شاید کسی وقت انھیں یہ خیال بھی گذرنا ہو کہ (اپنے محاصرہ شیخ عبدالوہاب کی طرح؟) وہ مخلص اور اہل دل مجاہدین اسلام کا ایک جتھہ بنا کر زوال حکومت کے روکنے میں مدد دیں۔ لیکن اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کوشش ان کے نواسے شاہ اسماعیل کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ شاہ صاحب نے ایک عملی اور ہوشمند انسان کی طرح مادی اور عسکری کوششوں کے لیے ان لوگوں کو شوق دلایا، جن کا یہ کام تھا اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا، جس کے لیے وہ زیادہ موزوں تھے اور جو اہمیت میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔

خلافت باطنی | آج سیاسیات کی گرم بازاری سے بعض حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ دینی مذہبی اور علمی کام کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہماری ذہنی تشکیل میں بڑا ہاتھ ان بزرگوں کا رہا ہے جن کی زندگیاں بطور جہالت کے یا اسی طرح کے کسی دوسرے دنیوی صیغے میں شروع ہوئیں۔ طبیعت کے لگاؤ سے یا کسی مصلحت کی خاطر انھوں نے مذہبی معاملات میں بھی ہاتھ مارا۔ لیکن ان کی اہل دلچسپیاں

لے افسوس کہ پروفیر صاحب نے ان خطوط کے ماخذ کی تصریح نہیں کی۔ خدا نخواستہ ان پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جب ایک مشہور بزرگ کا جوش کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ایک مستقل سوانح عمری آج سے بہت پہلے چھپ چکی ہے، ایک ایسا نادر ذخیرہ جس کا کہیں ذکر نہیں شائع کیا جائے تو اصول فن کے مطابق بائے حصول کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔ پروفیر صاحب نے زبانی فرمایا کہ اس نادر ذخیرہ میں شاہ صاحب کے پانچ سو کے قریب خطوط ہیں۔ وہ انشاء اللہ باقی کو بھی شائع کریں گے۔ اور اس وقت متعلقہ امور کی وضاحت کریں گے۔

دنیوی اور مادی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں روحانی اور علمی معاملات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اس معاملے میں بھی نہایت صاحب اور جامع نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انھیں مادی اور دنیوی چیزوں کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی کاموں کی بھی دلی قدر تھی۔ اس بات کو انھوں نے فیوض الحرمین میں نہایت وسعت سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم کا کام جاری رکھنے والوں کے لیے دو راستے ہیں۔ (خلافت ظاہری اور خلافت باطنی) اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کے لیے نیک نمونہ ہے۔ مثلاً خلافت ظاہری والوں کے لیے جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکر بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات محمول مالگزاری وغیرہ کی وصولی۔ ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم و مصلحت فیصلوں۔ یتیموں کی نگرانی۔ مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں۔ سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لیے مقرر ہیں۔ مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں ان کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ وہ لوگ جو کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ وہ وہ مناظرہ و مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطباء جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و تہمت سے مسلمان اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کرتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو انسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زبردستی کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں ان کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے

موسوم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے تئیں رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ کی تکمیل کے لیے وقف رکھا۔ خلافت ظاہری کے لیے جو لوگ زیادہ موزوں ہوئے، وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور قوم کی بلوی مشکلات کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوئیں مگر ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انھوں نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ اور دوسری تالیفات کتب حدیث سے کتاب وسنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ہمارے لیے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار چھوڑا بلکہ اختلافی معاملات میں ایک ایسا راستہ اختیار کر کے جس پر صوفی اور ملا، شیعہ و سنی، حنفی اور حنبلی، مجددی اور وحدت الوجودی، معتزلہ اور اشاعہ متفق ہو سکیں۔ اسلامی ہندوستان کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا جو اس ملک میں شعائر قومی کی حیثیت حاصل کر سکتا تھا اور جس کے مروج و مقبول ہونے کا نتیجہ ہو کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہو سکی اور جدید اسلامی ہندوستان کا آغاز ہو۔

مگر معتزلہ جانے سے پہلے حکیم لاہوت کا اصل کام درس و تدریس تھا۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک فن کے لیے ایک ایک قابل شخص کی تربیت کی۔ اور پھر ان فنون کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ خود فقط حدیث پڑھاتے اور باقی وقت محاورت کوئی اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا۔ خدا سے تعالیٰ نے آپ کو صحت بھی اچھی عطا کی تھی اور آپ کے اعتدال اور باقاعدگی سے حفظ صحت میں آسانی ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: "مریض ہم کم سے شد" اور اپنے کام میں اس اہم کام سے مشغول ہوتے کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو زور ہلک نہ کر دیتے نہ کھجالتے اور نہ دھن مہلک سے ٹھوک پھیلتے "مقالات حقیقت کے مصنف لکھتے ہیں: "معمول تھا کہ آپ صبح پڑھاتے وقت رُوبہ قبلہ روزانہ مودب بیٹھتے تھے۔ اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کر کے نیا یا دھریا ہوا لباس پہنتے تھے۔ نظافت کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپ کو مدت تک خارش کی شکایت تھی لیکن آپ شب کو سونے کے وقت جسم

کھجالتے تھے۔ اور کوئی وقت کسی نے آپ کو کھجالتے نہیں دیکھا۔ آپ کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے: "مثل والد ماجد حافظہ مدیدہ ام" اور اس محنت، حسن تدبیر اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت آپ نے چند سالوں میں ہی اتنا کام کر لیا کہ دوسروں سے اس کا عشر عشر بھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ کی وفات ۱۱۶۱ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ تاریخ وفات ہے۔ اور بود امام اعظم دیں

۴۶ ۱۱ ۵۵

مولانا شبلی "تاریخ علم الکلام" میں لکھتے ہیں: "ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدس کو انہی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس باز تہیں تھا۔ شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ نچیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

نواب صدیقی حسن خاں لکھتے ہیں: "اگر وجود اور صدور اقل و در زمانہ ماضی ہی بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمر وہ سے شد۔" یعنی آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوئے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے۔ دینہ جہاں تک علمی تجربہ و داعی قابلیت۔ مجتہدانہ نظر سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے۔ دنیا کے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ بھیچے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر حدیث تصوف فقہ۔ تاریخ۔ علم الکلام غرضیکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو یاد رکھتے گئے گندن ہو جاتی۔

آپ کا سب اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں **قرآن** آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا

کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے ناواقف رہتے پڑتے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پڑگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت تپا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا۔ انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکالتے شاہ صاحب کو اس بوجھ کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۰۳۷ھ میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اس کا تپا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انھیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرات اور فرض شناسی کامیاب ہوئی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں پیٹ کر طاق پر تبر کار کھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں۔ ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین

۱۔ شیخ سعدی کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدی سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب پہلے ملک العلماء کاغزی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جوہنپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحر مواج لکھی تھی جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اسے بھی عام مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کا برخیز یہ گفتا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دور کر دیتے جو عام علم کی فضاں کا اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطور خود بلند پایہ اور قابل قدر عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امور مذہب میں مخز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بیخ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علماء و ادیبانے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے۔ ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں جسے قسلی بخش کہا جاسکے یا جس سے اصل کے زور بیان فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علماء اور اہل قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئی۔ مولانا ذریعہ کہتے ہیں: "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں،

ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کارآمد باتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: "اس بندہ مضیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس گہری نعمت پر بہت ہیں جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کتاب کے چار باب ہیں پہلے میں علوم قرآنی اور مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیات منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی پین امقر کی تھی۔ پندرہ سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلام مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ) "عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباشرت کی ہو یا احکام کی، ایک جہت کے ساتھ

رہا دیا ہے اور اس جہت کو اس آیت کے لیے سبب نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لیے آیات مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقاید باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لیے ان میں اعمال فاسدہ مظالم کا شیوع اور آیات تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر الا واللہ ولما اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی رحمت اٹھائی گئی ہے۔ اسباب نزول میں چنداں خل نہیں مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانہ جاہلیت کے عربوں سے فقط بُرائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتابوں کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہودی تحریف لفظی تو راستے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔"

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کیا ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے: "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاء باحقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمحے جو بڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین بیان کرتے ہیں وہ سب الا ماشاء اللہ علی اہل کتاب سے منقول ہیں۔ اسی کتاب میں آگے چل کر تحریر لکھتے ہیں: "اسرائیلی روایات کا

نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ مفسرین کے بعض حصے جنہیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے: ”اور محمد بن اسحق واقدی طبری نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا اور اصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھولنا ہے۔“

مفسرین کی یہی تولید زلیسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدر درس) پڑھانی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں: ”قرآن عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شان نزول یا قاعدہ نحو مشکل ہو وہاں مفسر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیر جلالین بقدر درس پڑھاویں۔ (ترجمہ)

نظام الدین اور ان کے معاصرین کے حالات سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اسلامی مدارس جن باتوں پر زور دیتے تھے وہ صرف نحو یا منطق اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اس میں کچھ تو گھنوا اور وہاں کے علماء کے مذاق کو دخل تھا اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ حکومت اسلامی کا زمانہ تھا۔ شرع حکومت کا قانون تھی جس طرح آج کل جج یا منصف یا مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں قاضی اور مفتی اور محتسب ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے فیصلوں کے لیے فقہ کی واقفیت ہرگز تھی منطق بھی فہمی فیصلوں میں مفید تھی اور صرف و نحو عربی جاننے کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ جب تک اسلامی حکومت کا اقتدار رہا۔ انہی علوم نے فروغ پایا شیخ عبدالحق نے حدیث کی اشاعت شروع کی، لیکن فقہ و منطق کے فروغ نے حدیث کو چمکنے نہ دیا۔

ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن شاہ جہاں اور عالمگیر کی علم پوری انہیں قضا اور افتا کی مسندوں پر لے گئی۔ وہ درس حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے اور ملک میں بہت سے علما ایسے نہ پیدا ہوئے جو طالبین کو درس حدیث دے سکتے۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی۔ ایک نوادرنگ ذیل کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہوگئی۔ دوسرے شیخ عبدالحق محدث کی طرح شاہ ولی اللہ بھی فنا فی العلم تھے۔ ”قاضی القضاة“ اور ”شیخ الاسلام“ بننے کی خواہش ان کے دل میں نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کشش اس علم کی توسیع کے لیے وقف رکھی۔ جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی۔ لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ علم الحدیث پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علما کی تربیت کر گئے۔ جنہوں نے درس حدیث کا سلسلہ ان کے بعد جاری رکھا اور یہ فیض ملک میں عام ہو گیا۔ حدیث میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ امام مالک کے مرتب کردہ اور سب قدیمی مجموعہ حدیث، موطاء کے وہ بڑے مدارج تھے۔ چنانچہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں: ”جب عربی زبان کی قدرت ہو جائے۔ موطاء بروایت یحییٰ بن یحییٰ صہودی پڑھاویں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑی کہ علم حدیث کی اصل ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں۔“ علم حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد سمجھنا چاہیے کہ وہ موطاء کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مولانا عبد اللہ سندھی کا یہ بیان بڑا پر معنی ہے کہ موطاء میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھنا کاجول کے طلباء کے لیے مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے موطاء کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔ عربی شرح کا نام المسویٰ اور فارسی کا المصطفیٰ ہے۔

یہ کتابیں تو علما کے لیے تھیں، لیکن شاہ صاحب نے عوام کے لیے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں۔ ایک کتاب جمل حدیث ہے۔ النوادر من الحدیث میں عجیب اور غیر معمولی حدیثیں جمع کی ہیں۔ الدر الثمیں فی مبشرات النبی کریم میں ایسی چالیس حدیثیں جمع

کی ہیں جو خواب میں انہیں بتائی گئیں۔ شرح تراجم ابواب بخاری میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخوئی کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے میں بحمد اللہ ابواب جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔ اس کے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے علمی علم حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اصول فقہ | شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یافتہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملے لیکن وہ تمام علوم اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انہوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیے، لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور عٹوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے انہوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فائدہ مالگیری سے اور فقہ اور شریعت کے اصلی سرشتیہ تک پہنچاتی ہیں اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کر لے جن کے ماتحت شریع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ انصاف فی بیان سبب الاختلاف ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم فقہ کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پرآز معلومات تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نالوتوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قوت استخراج کا اچھا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ عام طور پر مسلمان علما کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں وہ جس کتاب کا درس دیں اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے لیکن حدیث کی تاریخ سے انہیں کامل واقفیت نہ ہوگی اور عہد نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار

جمع احادیث کے طریقہ۔ احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات، ان باتوں کے متعلق انہیں مسلسل صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہاء میں جو فتوے تو دے لیں گے اور جو مسائل انہیں پیش کیے جائیں ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشورہ مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے، لیکن علم فقہ کی تدوین، عہد جدید کی ترقیاں اور تبدیلیاں مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔

ان سے انہیں پوری واقفیت نہیں۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے جن پر علماء میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا۔ ہم اس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص جسے علوم اسلامی کی تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حرز جاں بنائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق تاریخ نے جو غلو کیا ہے اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں:-

پھر ان لوگوں کے بعد بہت سے قرن بڑے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جدا کرتے نہ بدل کو استیلا سے۔ تو غیر اس وقت وہی تھا جو بہت بکے۔ منہ بچٹ ہو کر فقہاء کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدولت تیز کیا دیکھو اور ان کو باچیں چیر کر بیان کرے اور محدث وہ تھا جو صحیح اور مستقیم حدیثوں کو شمار کر لے

کی ہیں جو خواب میں انہیں بتائی گئیں۔ شرح تاجم ابواب بخاری میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخوں کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے میں بحکمہ اللہ ابواب جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔ اس کے مضامین بھی بیشک احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے بھی علم حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اصول فقہ | شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یافتہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملے۔ لیکن وہ تمام علوم اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انہوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیے، لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور محسوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے انہوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں، جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فائدے عالمگیری سے اور فقہ اور شریعت کے اصلی سرشتیہ تک پہنچاتی ہیں اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کر لے جن کے ماتحت شروع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ انصاف فی بیان سبب الاختلاف ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم فقہ کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پرآز معلومات تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولانا محمد حسن نانوتوی نے مرثب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قوت استخراج کا اچھا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ عام طور پر مسلمان علما کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں، وہ جس کتاب کا درس دیں، اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے لیکن حدیث کی تاریخ سے انہیں کامل واقفیت نہ ہوگی اور عہد نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار

جمع احادیث کے طریقہ۔ احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات، ان باتوں کے متعلق انہیں مسلسل صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہاء میں جو فتوے تو دے لیں گے اور جو مسائل انہیں پیش کیے جائیں، ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشورہ مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے، لیکن علم فقہ کی تدوین، عہد جدید کی ترقیاں اور تبدیلیاں مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔

ان سے انہیں پوری واقفیت نہیں۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے، جن پر علماء میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے، جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا۔ ہم اس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص جسے علوم اسلامی کی تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حیرتوں میں نہ جائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق متاخرین نے جو غلو کیا ہے، اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں:-

پھر ان لوگوں کے بعد بہت سے قرن بڑے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جدا کرتے نہ بدل کو استیلا سے۔ تو فقیر اس وقت رہی تھا جو بہت بکے۔
منہ بچٹ ہو کر فقہاء کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدولت نیز کہ یاد کرے اور ان کو باچیس چیر چیر کر میان کرے اور محدث وہ تھا جو صحیح اور مستقیم حدیثوں کو شمار کرے

اور اپنی کلمہ زدہ دی سے ان کو کہانیوں کی طرح بکتا چلا جائے..... اور اس کے بعد جو قرن ہوا وہ فتنے اور تقلید میں اور بھی بڑھ گیا اور لوگوں کے دلوں سے دیانتداری جاتی رہی۔ یہاں تک کہ دین کے معاملے میں غور نہ کرتے پر مطمئن ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا اور ہم انھی کے قدم کے نشانوں پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اجتہاد و تقلید | اس کتاب کے علاوہ آپ نے تقلید اور اجتہاد کے مسئلے پر ایک بڑی مفید کتاب عقد الجیدی احکام الاجتہاد و تقلید کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جن میں اجتہاد کی قسموں اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل پر بحث کی ہے کہ ایک عالمی فقہاء کے اختلاف کی صورت میں کیا کرے اور آیا ایک عالمی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے؟ انھوں نے جماعت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مجتہدین اور عالمی مجتہدین کے تین مدارج ہیں۔ (۱) مجتہدین مطلق یعنی ائمہ اربعہ۔ (ب) مجتہد فی المذہب اور (ج) مجتہد فی الفتویٰ۔ اجتہاد کی تعریف انھوں نے یہ کی ہے۔ ”خوب محنت کرنا اور دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مال چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر“

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب باب اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے۔ وہ عوام کو حق اجتہاد قطعاً نہیں دیتے۔ مجتہدوں کے بھی انھوں نے مدارج مقرر کیے۔ اجتہاد کے لیے جو مناسب شرطیں درکار ہیں۔ وہ بیان کیں، لیکن وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ انھوں نے اس خیال کی بجائے تردید کی ہے۔ وہ آغاز کتاب ہی میں فرماتے ہیں۔

”پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں جو اکثر مسائل میں اچھا نام کے

عقد الجیدی کا ترجمہ مولانا احسن ناز قوی نے کیا ہے۔ ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں۔

موافق ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمان فاسد ہے۔ اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمان اول پر تو یہ گمان بنا بر فاسد بر فاسد ہے۔“

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ارشادات نبوی کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے ”اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتوؤں کو خوب جستجو کرے گا تو اس کو ایک کلیہ قاعدہ مل جائے گا کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کی سب اقسام کو طرح طرح سے ضبط فرمایا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں میں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی۔“ چنانچہ کئی مثالیں دے کر جن میں رسول اکرم نے کڑی شرطیں نہیں لگائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ”تو ان امور کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی باتیں انھی لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتوؤں کا حال ایسا ہی ہے، جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا کہ آپ نے نہ کی باتیں چھوڑنے اور اقسام ضبط کو زیادہ بیان نہ کرنے میں ایک بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے۔“ چنانچہ شاہ صاحب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو دھیان میں رکھ کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جزئیات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصود فوت نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ ”تو جو کوئی اس مسئلے کی ماہیت جوں کی توں جان لے گا۔ اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اول یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امر حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے۔ دوم یہ کہ دین کے معاملے میں وسعت ہے، تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالفت کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں۔“

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس معاملے میں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، ہر چار مکاتیب فکر کے متبعین متقلد یعنی تقلید ائمہ کے قائل ہیں۔

اہل حدیث جماعت تقلید کی قائل نہیں۔ دوسرا مسئلہ لزوم مذہب معینہ کا ہے۔ یعنی آیا ایک مسلمان کو جو تقلید کا قائل ہے، فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے یا وہ مختلف معاملات میں مختلف مذاہب (شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی) کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پر علما میں بڑا اختلاف ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی باریکی سے کیا ہے۔ اس لیے یہ رائے بہت واضح اور یک طرفہ نہیں رہی۔ لیکن ان کی تصانیف کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ایک عامی کے لیے ”لزوم مذہب معینہ“ کے قائل ہیں، لیکن علماء و مجتہدین کے لیے وہ ایسی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں ”اور علما کو درست ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحت وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔“ اسی طرح انھوں نے کتاب کے اخیر میں لکھا ہے:-

”یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے جس کو اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے جو اس کے نفس پر سہل ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اس کی برائی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں انھی کو درست رکھتے تھے۔“

اس کے علاوہ حیاتِ ولی میں مولانا رحیم بخش لکھتے ہیں:- آپ کو مذہبی تخریق کے خانہ برانداز جھگڑوں سے چنناں بحث نہ تھی۔ نہ اُن مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی غلط مذہب کے پابند تھے کہ خواہ مخواہ اُسی کے مطابق عمل درآمد کریں۔ چنانچہ اس مسئلے کے متعلق خواجہ محمد امین کے سوال کے جواب میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ اس سے آپ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:- ”سوال سوم آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بکدام مذہب است۔“ گفتیم بقدر امکان جمع کے کم در مذاہب مشہور مثلاً حنوف و مملوۃ و حنابلہ و غسل و رجم و غیرہ واقعہ شہد کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح داند و عند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمایم۔“

شاہ ولی اللہ عامی کو مجتہدین کا مقلد رکھنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا جس ملک میں شرع رائج ہے۔ اس کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ عامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے، جو تمام مذاہب ممالک پوری طرح کرواتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔ انھوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے اور تقلید کی ایک قسم لکھی ہے، جسے قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یعنی تقلید کی وہ صورت جس میں دانستہ یا غیر دانستہ مقلد صریح احادیث پر بھی مفتیوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ”اور تقلید حرام کی یہ صورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صحیح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا۔“

تصوف تصوف کا مسئلہ بڑا طرہا ہے۔ ایک تو اسے بعض ریاکاروں نے دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، لیکن اگر انھیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ ریاکار لوگ کس مشرب میں نہیں ہوتے؟ تب بھی اسلام کی تاریخ میں ایسے مخلص، مگر وادستہ مزاج کثرت سے ملیں گے جنھیں تصوف نے مہمانیت شرع سے آزادی اور پریشان روی کا راستہ دکھایا۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جس کثرت سے شرع کی قیدیں بڑھیں اور اصولی باتوں کو چھوڑ کر فقیہوں اور محدثوں نے روزمرہ کی معمولی اور بے ضرر باتوں میں بھی لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنی کتابوں کے مطابق جکڑ دینا چاہا۔ اسی قدر اہل تصوف کی وارستگی بڑھ گئی۔

یہی وجہ تھی کہ بعض مذہبی حلقوں میں تصوف کی مروجہ صورتیں شروع سے ہی مشتبہ تھیں۔ آج کچھ دہائی اثرات، کچھ اقبال کی مخالفت اور مٹی حد تک مخرنی مادیت کی فتح سے تصوف اور بھی بدنام ہو گیا ہے اور مذہبی اعتراضات کے قطع نظر اسے بعض سہل انگار، قومی زوال کا بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف بالخصوص سہل انگار نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا، جب دنیوی نقطہ نظر سے قوم کو دیر وال تصوف نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا، جب دنیوی نقطہ نظر سے قوم کو دیر وال

تھی۔ لیکن ان زمانوں میں تصوف کی مقبولیت قومی زوال اور دنیوی پریشانی کا نتیجہ تھی۔ سبب نہ تھی اور ان دونوں کا باعث قوم اور افراد کی عسکری، اخلاقی اور علمی کمزوریاں تھیں۔

لیکن اگر تصوف میں کمی کو تاہیاں ہوں تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسے جوڑے اکھیر پھینکنا آسان نہیں۔ ہمارا ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف کی گود میں پلا ہے اور اگر ہم تصوف کا قلع قمع کریں تو بہت سی قیمتی چیزیں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی صورت یعنی احسان یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ شاید بعض نوجوان خیال کرتے ہوں کہ غلام قادر و میل کی خودی اور میر تقی میر کی خود غرضی سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں پر تصوف اور مناسب نفی خودی (اشار) کے چند پھینٹے پڑ جاتے تو غالباً ان کا عمل دوسرا ہوتا۔ تصوف کی ضرورت صرف خود پرستوں کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے نہیں۔ بلکہ جو لوگ قومی راہ میں انتہائی قربانی کرنا چاہتے ہیں انہیں بھی یہ عمل مفید پڑتا ہے کہ وہ سیدھی سادی صوفیانہ ریاضتوں اور ذکر و شغل کی مدد سے جن کا شرع سے کوئی تضاد نہیں بلکہ جو شرعی فرائض کی تکمیل کے بعد شروع ہوتے ہیں اپنی روحانی اصلاح کریں اور شخصی ہوا و ہوس، حسد، غصہ، خواہش انتقام اور ان علاقوں و نیوی کو جو ذاتی قربانیوں کی راہ میں حارج ہوتے ہیں، مٹا دیں اور اس طرح فرشتہ مثل انسان بن کر اپنے تئیں بنی نوع آدم کے لیے وقف کریں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ ان روحانی ضرورتوں کی اہمیت سمجھتے ہوئے اس کے علاوہ انھوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں تصوف سے لگاؤ ہو جانا لازمی تھا۔ ان کے والد اور چچا اہل طریقت تھے اور معاصرانہ تذکروں (مثلاً روضۃ القیومیہ) میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہوا ہے۔ علما کے ضمن میں نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی تصوف سے گہری دلچسپی ہو گئی اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں ایک وجہ امتیاز یہ تھی کہ اگرچہ یہ دونوں بزرگ عہد نبوی

کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور شاہ صاحب بھی تصوف کی اصلاح کے خواہاں ہیں، لیکن وہابی مصلحین کی طرح وہ اس کے مخالف نہیں۔

شاہ صاحب نے علم تصوف میں کمی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لمعات ہے جس کا اردو ترجمہ نقیحات کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک رسالہ وحدت الوجود و اشہود لکھا ہے جس میں شیخ اکبر کے نظریہ وحدت الوجود کی تاویل کر کے اسے شیخ مجدد کے مطابق ثابت کیا ہے۔ القول الجمیل میں بیعت کے طریقہ اور فائدے کا درجہ، چشتیہ نقشبندیہ سلسلوں کے اذکار اور صاحب بیعت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ آخر میں دو نہایت دلچسپ اور کارآمد باب عالم ربانی کے خصائص اور ادب مذکور و معرفت کے متعلق ہیں۔ القول الجمیل کا ترجمہ تفسار الحلیل کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تفسیرات الہیہ جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ فارسی میں، بیشتر تصوف کے مسائل سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ الطائف القدس، غیر کثیر وغیرہ میں علم تصوف کا بیان ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوف کے بہت سے مسائل ضمتا آگئے ہیں۔

شاہ صاحب کو تصوف سے بری دلچسپی تھی، لیکن انہیں متصوفین کی قابل اعتراض باتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی تیسری وصیت ہے: "وصیت دیگر آنست کہ دست در دست مشائخ این زماں کہ با انواع بدعت مبتلا هستند۔ ہرگز نباید داد و وصیت ایشان نباید کرد۔ و غلو عام مخور و نباید بود۔ و نہ بکرامات۔ زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمید را بحقیقت اعتبار عیست و کرامات فروشان این زمانہ ہمہ الاشارۃ اللہ طلسمات و نیز نگہات را کرامات دانستہ اند۔۔۔"

اس کے علاوہ شاہ صاحب نہ صرف مشائخ کے نقائص پر معترض تھے بلکہ انتہائی لے اس موضوع پر مولی غلام علی نے کلمات الحق لکھی۔ جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحب نے دین الباطل میں دیا۔ مولوی صاحب نے شاہ ولی اللہ سے اختلاف کیا تھا، لیکن ان کے مرشد مرزا مظہر جانجانی نے لکھا: (ترجمہ) لیکن مسئلہ تطبیق سے قرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ تو فقیہین المکشفین اگرچہ تکلف سے خالی نہیں۔ لیکن اس میں ایک عمدہ مصلحت پائی جاتی ہے۔

نفی خودی کے مخالف تھے اور اقبال کی طرح اسے ملت اسلامیہ کے لیے سخت مُضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر فریقین کے خیالات تفصیل سے لکھ کر آپ فرماتے ہیں۔
”بالجملہ افراط و تفریطات استلخ استلک و مشغول شدن ہر کس و ناکس باں دایر عضال (مرض شدید) است در ملت مصطفویہ خدا رحمت کند کہ کسی را کہ سعی اعمال آنہا کند۔“

ہم شاہ عبدالرحیم کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ وہ تصوف میں ہر سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی اسی طریق کار پر عامل تھے جس طرح آپ مذاہب اربعہ مشہورہ میں سے کسی خاص مذہب کے مقلد و پیرو نہ تھے۔ اسی طرح اہل سلوک کے طرق میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے بلکہ ہر مذہب و طریقہ میں جو بات کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دنیوی فلاح کے لیے زیادہ مفید دیکھتے، اس کو اختیار کرتے۔

شاہ ولی اللہ کو (اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی طرح) اصل تعلق خاطر سلسلہ باقویہ نقشبندیہ سے تھا۔ لیکن وہ دوسرے مشہور صوفی سلسلوں سے بھی متسلک تھے اور تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (یعنی نقشبندیہ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ قادریہ سلسلوں) کے بزرگوں کے نام لیتے۔ تاکہ سب فیض حاصل کر سکیں ان سلسلوں میں شطاری سلسلہ نہ تھا، لیکن آپ کی اپنی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے اس سلسلے کے بعض اشغال اپنے محترم استاد (شیخ ابوطاہر مدنی) اور لاہور کے ایک مشہور بزرگ حاجی محمد سعید لاہوری سے سیکھے تھے۔ شطاری طور طریقے بعض متقی بزرگوں کو پسند نہیں۔ مثلاً شیخ عبدالحق کے استاد شیخ عبد الوہاب متقی کو ان کے والد نے نصیحت کی کہ شیخ غوث گویاری شطاری کی صحبت سے دور رہنا اس سلسلے میں شرع کی پابندی پر اتنا زور نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شطاری اشغال میں ہندو لوگ کا اثر بھی

۲۷۲ حیات ولی ص ۲۷۲

۲۷۳ ایک زبردست عالم سیاح اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ امیر شاہ ابدالی آپ کا بڑا امداد تھا۔ بلکہ آپ کی درخواست پر اس نے اپنے تیسرے محلے میں لاہور کی نوٹ مار بند کر دی۔ (تذکرۃ اہل تشیع از رفیع کشمیری)

آگیا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اور ان کے اُستاد کے اس سلسلے سے انتساب نظر آتا ہے کہ اگرچہ ظاہر ہے کہ شطاری سلسلے کا خانم طور طریقہ انھوں نے نہ اختیار کیا اور شرع کی پوری پابندی کی، لیکن فیض کے معاملے میں وہ دونوں وسعت اور آزادی کی طرف مائل تھے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ابتدائی صوفیانہ تحریروں میں جو خارق عادت و اوقات آجاتے ہیں اور بعض جگہ ایسی غیر معمولی فضا ملتی ہے جو ان جیسے تیز بین اور صاف بین بزرگ کی تصانیف میں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ شطاری نسبت کا نتیجہ ہو!

شاہ صاحب کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب **حُجۃ اللہ البالغہ** ہے۔ اس کے متعلق نواب بی بی حسنا صاحب مرحوم لکھتے ہیں:-

”اس کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، تا احوال و شہادت و دل و دل و حکم اسرار بیان ہو، تا آنکہ در فن خود مبسوط علیہ واقع شدہ و مثل آن دریں دوازده صد سال جبری نہیکہ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ۔“
مولانا شبلی اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”حُجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں (شاہ صاحب) نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کیے ہیں، در حقیقت علم کلام کی رُوح و رواں ہے۔ علم کلام در حقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب و جو چیزوں مرکب ہے۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں، صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔“

۲۷۴ اس کی عالمگیر شہرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت سوڈان نے اسے گارڈن کالج خرطوم کے نصاب میں داخل کیا اور سر فخرتہ تعلیم نے اس کے پڑھانے کی سفارش کی (الذود و ذکر ص ۱۹۰)

یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ چھ سو بیس صفحات پر محیط ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک بزرگ بھائی اور گرامی دوست مولانا محمد عاشق کے ایما پر لکھی۔ کتاب کے شروع میں شاہ صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کی غرض و غایت واضح کی ہے۔ آپ نے یہ کتاب اسرارِ علم دین کے متعلق لکھی۔ مقدمے میں بتایا ہے کہ محدثین کے مختلف طبقے اور علم حدیث کے مختلف پہلو کون سے ہیں۔ بعض علما ایسے ہیں جو احادیث کی صحت، ضعف، شہرت اور غرابت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے علما کی توجہ غریب احادیث کے معانی اور مشکل احادیث کی شرح پر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ فقہاء اور محدثین کا ہوا ہے جو احادیث کے شرعی معنی بیان کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح علم حدیث کی آدھ کی قسمیں ہیں لیکن شاہ صاحب کے نزدیک علوم حدیث میں سب سے زیادہ دقیق فن جس کی بڑھ نہایت تعمیق ہے اور جس کا معیار نہایت بلند ہے۔ اور جو ان کی نظر میں تمام علوم شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے وہ اسرارِ دین کا علم ہے جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور اہم اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کیے ہیں۔ حجۃ اللہ الباقیہ علم اسرارِ دین کی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے جو عقاید یا احکام ہیں۔ ان میں کیا کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب خود اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:-

”بعض لوگ خیال کیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہو سکتی اور اعمال اور ان کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت تکلیف کرنا بصیغہ ایسا ہے جیسے کوئی آکا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا حکم دے۔ جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پاوے اور سرکشی کرے تو سزا دی جائے۔ یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اولان زمانوں کے اجماع جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے۔ اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔“

۱۔ حل میں ایک توضیحی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے پندرہ سو صفحے ہیں۔

اس کے بعد تفصیل سے ارکان اسلام مثلاً نماز، حج، زکوٰۃ اور روزہ کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلا حصہ جو اردو ترجمے میں مقدمہ کے بعد ۲۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان عام اصولوں اور کلیہ قاعدوں کے متعلق ہے۔ جن پر شریعتوں اور مذہبوں کی مصلحتوں کا مدار ہے۔

سکندر سے حصے میں پہلے حصے کے قاعدوں اور اصولوں کی کسوٹی پر مذہب اسلام کے مختلف فروعی احکام کو پرکھا ہے۔ ایک تو احادیث کے مطابق ان احکام کی توضیح کی ہے۔ دوسرے ان احکام کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ اس حصے میں طہارت، عبادت اور اور ارکان اسلامی کے علاوہ ذیل کے مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:-

(۱) البواب احسان (۲) البواب معاملات (۳) البواب تربیت منزل (۴) البواب سیاست مدن (۵) البواب معیشت (۶) چند البواب مختلف۔

شارع نے شریعت اسلام کو مرتب کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ وہ شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

”جس مصلحت پر شارع نے مستند کیا ہے اور جس خرابی سے باز رکھا ہے۔ اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے:-

(۱) ان چار اوصاف میں سے جو محاد میں مفید ہیں یا ان تمام خصلتوں میں سے جو دنیا میں سود مند ہیں کوئی نہ کوئی وصف نفس میں پیدا کرنا اور ان کو شائستہ اور مذہب بنانا ہے (۲) کلمہ الہی اور سچے مذہب کو غالب کرنا۔ شرائع کو خوب مستحکم کرنا ان کی اشاعت میں کوشش کرنا ہوتا ہے (۳) عامہ خلایق کی حالت کو منظم کرنا ان کے امور نافع اور تدابیر مفیدہ کی درستی کرنا اور ان کی رسموں کو مذہب رست میں لانا۔

حجۃ اللہ الباقیہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، لیکن مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر عقل اور سمجھ کے کس قدر قریب تھا۔ ان کی ساری کتاب کی غرض و غایت ہی اس خیال کی تائید تھی کہ جو لوگ دُرا وھ کا احکام شرعی کی تعمیل کرتے ہیں وہ دین کو صحیح طور پر نہیں

سمجھتے۔ اسلام کے تمام احکام کسی نہ کسی دنیوی یا دُعاویٰ مصلحت پر مبنی ہیں۔ چونکہ ان مصلحتوں کی توضیح ہی اسلام کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بہترین دلیل و حجت ہے۔ اس لیے اس کتاب کا نام انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ رکھا۔

شاہ صاحب کی کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ہم ضمناً ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ روز بروز خراب آ رہا ہے اور ماضی کی نسبت حال اور مستقبل دونوں زمانے بُرے ہیں۔ یہ نقطہ نظر جس نے قوم میں ایک بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر رکھی ہے فی الحقیقت مواعیدِ قرآنی اور ارشاداتِ نبوی کے صریحاً خلاف ہے اور اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ماضی کی ہر ایک بات کو خوش اعتقادی کی عینک سے اور حال کی ہر ایک چیز کو شک اور دہم اور خوف کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازمنہ ماضی کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھے اور سنتِ الہیہ پر بھی ان کی پوری نظر تھی۔ انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے اخیر میں عہدِ سعادت کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے عام نقطہ نظر کی پوری طرح تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولیٰ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:- (ترجمہ) کہ میری امت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلا مینہ اچھا ہے یا اخیر کا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:- (ترجمہ) تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں "اور یہ بھی ممکن نہیں کہ عمدہ اور بزرگ زمانے کے ہر شخص کو دوسرے مفضول زمانے پر فوقیت اور فضیلت ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو قرون بالاتفاق عمدہ اور بزرگ تھے۔ ان میں بعض لوگ فاسق اور منافق بھی تھے۔ انھی زمانوں میں حجاج، یزید بن معاویہ مختار ہیں۔"

دیگر تصانیف | شاہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن کتابوں کا

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب البحر المکلف آپ کی نہایت مختصر سوانح عمری ہے جس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جنرل بابت ۱۹۱۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات میں ایک رسالہ لکھا ہے انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ جو اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے تصوف کے متعلق ہے۔ اسی طرح ایک کتاب قصص الانبیاء جس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ آپ کے ایک سوانح نگار نے آپ کی سینتیس تصنیفات کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ بہت سی باب کیاب ہیں۔ آپ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب المقدمۃ السنیہ ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانی کے ایک کمیاب فارسی رسالے کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سوانح عمری بھی ہے اور انھوں نے شریعت اور تصوف کی تطبیق کی جدوجہد کی تھی اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری دور کے عقائد کا ذکر کر کے اس زمانے کے الحاد پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ مذہبی نقطہ نظر سے شاہ صاحب اس زمانے کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء و صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اصلاح معاشرت | اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ہم نے شاہ صاحب کی تصانیف کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن وہ

اس زمانے کے باقی علماء کی طرح فقط کتابیں پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ قوم کی معاشرتی بیماریوں پر بھی آپ کی نظر تھی اور اپنی تصنیفات میں انھوں نے ان غرابیوں کو جابجا بے نقاب کیا۔ اس موضوع پر ان کا بہترین اظہار خیال تغیبات الہیہ کے ایک باب میں ہے جو سارے کا سارا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن آپ کے مختصر وصیت نامے سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی اصلاح کا جو درخت مولانا سید احمد ربطی اور شاہ اسماعیل شہید کے ہاتھوں پھلا پھولا اس کا بیج آپ ہی نے بویا تھا۔ وصیت نامہ میں اپنے ہدایت کی ہے۔ بقدر امکان عادات و رسومِ عربِ اول کہ منشاء آنحضرت

است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندیم۔ و رسوم عجم و عادات ہنود را نزد میان خود نگزایم۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے ان احکام کا ذکر کیا ہے، جو انھوں نے عربوں کو عجمی و عشت سے بچانے کے لیے نافذ کیے تھے۔ یعنی چوں عرب بلے جہاد باطراف عجم منتشر شد۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ترسیدند کہ رسم عجم یا اختیار کنند و رسم عرب را ترک نمایند پس بدیشاں نامہ نوشتند کہ از این بندید و چادر پوشید و نعل پوشید و گزاردید و گزاردید و گزاردید و لازم گیرید لباس پدر خود اسمعیل را و خود را در دربار تہنم و ہدیت عجم و لازم گیرید نشستن در آفتاب۔ ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم محد باشند و درشت لباس باشند و سخت گزندان باشند و کمر پوشی نکنید۔

اس کے بعد ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں آگئی ہیں اور جن کی اصلاح کو شمش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے۔ سب سے پہلے نکاح بیگان کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ایکے از عادات شنیعہ ہنود آنست کہ چوں شوہر نہ بے میرد۔ نگذارند کہ آن زن شہر دیگر کند و اس عادت اصلاً در عرب نبود۔ اس کی مذمت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ خدائے تعالیٰ رحمت کناد برآں کس کہ اس عادت شنیعہ را امتلاشی (برطرف) سازد۔

(۲) دوسری بُری رسم بڑے بڑے مہربان دھنا ہے جو سنت نبوی کے خلاف اور خانہ پر بادلوں کا سبب ہے۔

(۳) تیسری عادت شنیعہ خوشی غمی کے موقع پر اسراف کی ہے جس کی وجہ سے قوم غریب ہو رہی ہے (دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و رسوم چلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و اس مہ را در عرب اول و خود نبود)۔

یہی چار بڑی خرابیاں ہیں۔ جن کی اصلاح کے لیے مولانا سید احمد بریلی اور مولانا اسمعیل شہید کو کوشش کرنی پڑی۔ اور جن کی اصلاح آج بھی مختلف صورتوں میں قوم کے لیے ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ کی سمجھ اور قابلیت قابل داد ہے کہ انھوں نے سات صفحے کے ایک مختصر سے وصیت نامے میں اپنے تجربے کا پتھر دے دیا۔ قوم

کے فائدے کی تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا اور ان ضروری معاشرتی اصلاحوں پر نظر کر کے جن کی طرف نہ فاضی کی نظر جاتی تھی نہ فقیر کی وہ بھیج بودیا جسے شاہ عبدالحزیز اور شاہ اسمعیل شہید کے زمانے میں پھولنا پھلنا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مختلف اشعار اور مکاتیب | پہلوؤں پر ہم نے تبصرہ کر دیا ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے اور فارسی غزلوں اور رباعیوں کا ایک معقول ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ امین تخلص کیا کرتے تھے۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف اور معرفت کے مضامین ادا ہوئے ہیں، لیکن اشعار میں رسمی عاشقانہ خیالات بھی ہیں۔ ہم آپ کے کلام میں سے دو فارسی رباعیات اور ایک فارسی غزل کے چند اشعار کا انتخاب تبرکاً درج کرتے ہیں۔

رباعیات

علی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است واللہ کہ سیرانی از ان تشنہ بی است
جائے کہ بود جلوہ حق حاکم وقت تابع شدن حکم خرد بوالہی است

قلم بکتابت ارف موصوف جسے بتلاوت اسما محروف
شخصے کہ ازین قوم قدم بیش نہاد گشت است بای صورت فہمی مشغوف

ابیات

تا بکے محنت مجوری و دوری بکشم تازمین وطنم سوئے وطن باز روم
تا بکے ہمد می سنگ بود شیوہ من گوہرے از حکم سوئے عدل باز روم
تا بکے بستہ زنجیر تعلق باشم آہوئے از ختم سوئے ختم باز روم
بوئے جلال میرسد از بادین در و جلال شاہ ملک منم سوئے من باز روم

شاہ صاحب نے مستقل تصانیف کے علاوہ عربی اور فارسی خطوط کا ایک معقول ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ بعض خطوط ذاتی اور نجی ہیں۔

لیکن کئی خطوں میں مختلف علمی مسائل کی توضیح ہے۔ ان خطوں میں بھی شاہ صاحب کی علمی وسعت مجتہدانہ نظر اور انصاف پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ ایک عربی خط کا ترجمہ ہم نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں جسے انھوں نے بعض دوستوں کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں:-

”مزا فے کارنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشم نہایت کدڑ ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہر آفاق دس دہائی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں ہے۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ، جو حقیقت میں انہماک کے منزلہ میں ہیں۔ ایک۔ بے حیا مونی سے جو رفع تکلیف کے لیے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

دوسرا۔ جھگڑا و محقولی جو شکوک و ادہام کے فتنے پھیلاتا ہے۔ اور خدا کا مقدار و مطیع نہیں ہوتا۔

تیسرا۔ شیخی خود فقیر جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی مسلم نے اپنی امت کے لیے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔

چوتھا۔ خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا سے کسی بارے میں اجازت ہی حاصل نہیں۔

پانچواں۔ سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ والسلام“

حکیم الامت کون ہے ؟

اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر توفان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے، لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علما یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے، بلکہ اپنے وسیع علم اور تیز فہمیت اور ادراک کی مدد سے مختلف فرقہ بندیوں کے نقطہ نظر کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں اور

ہندوستان میں شاعت اسلام کے حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اس کی بڑی ضرورت ہے۔ شیعہ سُنی خیالات کی تطبیق۔ ہندوستان کے مسلمان بیشتر سُنی ہیں، لیکن ان پر شیعہ اثرات بھی کثرت سے کار فرما رہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی ہی ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متقدم شیعہ علما، شعرا، فلسفی ہندوستان آتے رہے اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ سُنی مسئلے میں کوئی عالم اسی طرح غلو کرے۔ جس طرح نجد یا ماوراء النہر میں کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے فرقہ کا نقطہ نظر سمجھے بغیر ایک فرقہ کے خیالات پر شدت سے مصر ہو تو وہ قوم میں اختلافات بڑھائے گا اور ہندوستان میں اسلام کی نشوونما تاریخی اتفاقات کی وجہ سے جن اصولوں پر ہوئی ہے، ان کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملے میں ایک احسن طریق عمل اختیار کیا، جو دونوں طبقوں کے نقطہ نظر اور اس بحث پر تمام تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدقن ہوا ہے اور جس کو خواہ و غفلت فرقوں کے غالی طرفدار پسند نہ کریں، لیکن اہل انصاف اس کی ضرورت قدر کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سُنی اختلافات پیدا ہوئے، کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ ازالۃ الخفا میں انھوں نے بالتفصیل مختلف خلفاء کے خصائل اور ان کے حق خلافت پر تبصرہ کیا اور اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ رسول کریم کے قطعی اشاروں کے مطابق خلفاء کی ترتیب وہی ہونی چاہیے تھی جو فی الواقع ہوئی۔ لیکن حضرت علی کریم اللہ وجہ کے فضائل گننے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے بلکہ فیوض الحرمین میں کہتے ہیں (ترجمہ) ”میری طبیعت اور میرے فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کریم اللہ وجہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت کے شدید محبت ہے۔“ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تفصیل شیخیں (یعنی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر فاروق کی خلافت کے معاملے میں اولیت) کا عقیدہ ”ایک ایسی چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا۔ افسوس ہے کہ

مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں، لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت (یعنی تمام باتوں کو دھیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔
 ”جامعیت“ کے علاوہ شاہ صاحب کے معتدلانہ نقطہ نظر کا باعث ان کا متوازن
 دل و دماغ ہے، جس کی وجہ سے قوم کے ذہنی نظام میں انھیں مرکزی حاصل ہے۔
 اس معاملے میں جس دوسرے بزرگ کا نام لیا جاسکتا ہے، وہ سرکار سرسند حضرت مجدد
 الف ثانی قدس سرہ ہیں۔ جن کے احسانات سے اسلامی ہندوستان کبھی عہدہ برا
 نہیں ہو سکتا۔ اور جن کا مرتبہ کسی اہم امور میں شاہ صاحب کے بہت بلند تھا، لیکن
 وقت و وقت کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک نے کشتِ ملت کو دشمنوں کے تغلب سے
 بچایا۔ دینی اور ملی تحفظ کے لیے تیغ و تنگ کا کام دیا۔ دوسرے نے کشتِ ملت
 میں ہل چلایا اور تھم ریزی کی۔ دونوں کے حالات اور مزاج مختلف تھے۔ اس لیے
 ان کے طریق کار اور انداز خیال میں بھی فرق تھا۔ حضرت مجدد کی امتیازی خصوصیت
 ان کی ”رگ فاروقیم“ یعنی شدید اسلامی احساس ہے۔ وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس
 ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو
 حضرت کی رگ فاروقی حرکت میں آئی اور انھوں نے اکابر شہر کو لکھا کہ آپ لوگ کیوں
 اس خطیب کے ساتھ ”شدت و غلظت“ کے ساتھ پیش نہ آئے۔ اس طرح کے اور
 موقعے کئی تھے۔ یہ رگ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت فی الحقیقت
 اسلام خطرے میں ہو اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ
 کے زمانے میں ہندو احيائیت نے اسلام کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تو انھوں
 نے اس کا ترکیبی جواب دے کر اور احيائے اسلام کی تحریک چلا کر برصغیر میں
 اسلام کو ایک نئی زندگی تو انائی دی۔ لیکن شدت احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی
 صحیح صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے اور غیر معمولی حالات میں جو طریق کار ضروری
 ہو، عام حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے سے بسا اوقات دشواریاں پیدا ہوتی
 ہیں۔ مثلاً شیعوں کی نسبت حضرت مجددؒ کی رائے (علمائے ماوراء النہر کی طرح)

انتہا پسندانہ تھی۔ وہ انھیں کافر سمجھتے تھے اور ان کے صابزادے خواجہ محمد مصوم نے تو
 اورنگ زیب کے نام ایک خط میں شیعوں کو واجب القتل ٹھہرایا ہے!
 حضرت مجدد الف ثانی کے علم و عرفان، خلوص و جرأت اور عظیم احسانات میں شک
 نہیں۔ جن حالات سے انھیں سابقہ پڑا۔ انھیں دھیان میں رکھتے ہوئے ان کا نقطہ نظر
 آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کئی اہم باتوں میں اسے قومی پالیسی کی
 اساس نہیں بنایا جاسکتا اور اگر آج شیعوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا جائے تو پتا نہیں
 قوم کو کتنے ممتاز اہل قلم، خادمان قوم اور قائدان اعظم سے ہاتھ دھونا پڑے!!
 شاہ صاحب کی سب سے نمایاں خوبی ”عدل“ و اعتدال ہے، جو کوئی ان کے فلسفہ
 اور رجحانات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے ”متوازن دل و دماغ“ ”معتدل مزاج“ ”ہمگیر
 فطرت“ ”جامعیت“ ”توازن صادق“ ”اعتدال صحیح“ یا اس طرح کے الفاظ استعمال
 کرنے پڑتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت ہر امر میں طبعی توازن (Balance) برقرار رکھنے کی ضرورت

۱۔ رسالہ رد و فہم میں حضرت مجددؒ نے بھی یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور علمائے ماوراء النہر کے خیالی
 مگر ممکن نقطہ نظر کے خلاف علمائے مشرق نے جو کچھ لکھا تھا اس کی بالوضاحت تردید کی ہے۔
 ۲۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو اس بات کا بڑا احساس تھا کہ حالات کے مطابق طریق کار
 بدل جاتا ہے۔ اور انھوں نے بار بار اس کا اظہار اپنے مکتوبات میں کیا۔ دفتر اول کے مکتوب ۱۲ میں
 فرماتے ہیں: ”ہر چیز امور کے خاص و وقت کے آں چیز در آن موسم موزوں و زیبا ہے باشد۔ و بموجب
 دیگر قیاس و صاحب بنیش کے راہرو گئے قیاس نئے کند۔ اسی طرح دفتر دوم کے ایک مکتوب میں
 ہے ”اس وقت متقدمین اور متاخرین کا فتوے جاری نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر وقت کے احکام
 جلا ہیں“ (۱۲) اس بنیادی نکتہ کو ان کے سلسلے کے قدیمی بزرگ خوب سمجھتے تھے۔ اور یار
 محض اتفاق نہیں۔ کہ جب ہندو احيائیت اور اکبر کی ذہنی مطلق العنانی ختم ہو گئی تو ہندوؤں کے
 ساتھ مصالحت سے رہنے کا سب سے واضح طریق کار مرزا مظہر جانجاناں مجددیؒ نے بتایا۔

خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس صفت کو عدل یا عدالت کا نام دیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ ہمتات اور دوسری تصانیف میں اس پر بڑا زور دیا ہے۔ اجتماعی نظام برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے اسے ”اصل“ یا ”معیار“ مانا ہے اور اس کی بہت سی شاخیں گنائی ہیں۔ ہمتات میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”خصالت چہارم عدالت است و آن خصالت ہست کہ صدور آقامت نظام عادل و سیاست کلی از وسعہ باشد۔ دوسرے راجع بہ سیاست۔ مثل ادب و کفایت و حریت و سیاست مدنیہ و حسن معاشرت و بالمجملہ اس ہمہ یک اصل دارند۔

ایک اور جگہ اس کی توضیح کی ہے (ترجمہ)

عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گھگھو اور شکل و لباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو آداب کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہتے ہیں اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اس عدل کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۲۹)

شیعہ سنی مسئلے پر اہل سنت کے نقطہ نظر کی وضاحت اور تائید کے لیے شاہ صاحب نے بہت کچھ لکھا لیکن اس معاملے میں بھی ان کی رائے اس طرح انتہا پسندی سے دور تھی کہ جب ایک انتہا پسند سنی نے آپ سے پوچھا کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے تو آپ نے یہ نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علماء میں اختلاف ہے۔ وہ برہم ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو شیعہ ہے! یہ روایت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعہ پر سید۔ آنحضرت اختلاف خفیہ کہ دریں باب است بیان کردند چوں مکرر پر سید ہماں شنید۔ شنیدم کہ سے گفت شیعہ است۔“ یہ واقعہ تو شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز نے دوسری باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی اپنے والد کی پیروی

کی تھی۔ ان کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہوا۔ ان کا ایک پٹھان شاگرد تھا۔ حافظ اقبال نام۔ ہمیشہ حاضر درس ہوتا تھا۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر ہوا تھا اور شاہ صاحب نے ان کے ”بجان و دل فضائل و مناقب بیان“ کیے تو وہ اتنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا۔ اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس مسئلے پر شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ہندوستان میں پہلے تورانی سنی۔ پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی رولیں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسمن و تشیع کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات از الہ الخلفاء میں ایسے دل نشین طریقے سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے جو محض اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علیؑ کے وجہ کے مناقب کیوں بیان کیے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہا خفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتوے صادر کر دیتے ہیں اور اس لیے بجائے مناظرے اور مجاہدے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی۔

جس سے بہت سے فتوں کا سد باب ہو گیا۔

شریعت اور طریقت :- اسی طرح صوفی اور فقیہ یا صوفی اور ملا کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں کچھ تو مقامی اثرات سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیہ کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا۔ اور شاید اس لیے بھی کہ سو میں سے نوے ملا اسلام کے اس قدر ظاہری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں کہ اصلاح باطن کے لیے بلکہ مذہب حق سے کوئی فیض حاصل کرنے کے لیے تصوف کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں تصوف نے بڑا فروغ حاصل کیا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض صوفیہ کسی اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے یا جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ

یا اب اقبال نے بتایا ہے۔ اصولی باتوں (مثلاً مسئلہ استہلاک یا خانا) میں کبھی کبھی اتنا غلو کرتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر یا قومی اور انفرادی فلاح کے اصولوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تصوف اور فقہ کے درمیان اختلاف کا دروازہ کھلا جو اس وقت شروع ہوا۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نائب نے علی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شہر دہلی کے قاضی میں اختلاف بلکہ مخالفت کی نوبت آئی اور اس وقت سے آج تک جاری ہے۔ آج تصوف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستانی مسلمان کو یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ کسی صوفی سلسلے میں منسلک ہوئے سوا اور کسی مرشدِ کامل کے بغیر اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصہ لیا جاسکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تصوف زوروں پر تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے اور اس کے ان اجزاء کو جو شرع اور فقہ کے خلاف ہیں، علیحدہ کیا جائے تاکہ عوام و خواص کی روحانی اصلاح کے سلسلے بھی منقطع نہ ہوں اور شرع کی مخالفت بھی جاتی رہے۔ شاہ ولی اللہ اس کام کے لیے بے حد موزوں تھے۔ وہ اسلامی فقہ کی تاریخ سے پوری طرح باخبر اور فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ صوفی تھے۔ انھوں نے بیعت کر رکھی تھی اور خود اپنے صوفیانہ مشاہدات اور واقعات کا حال انھوں نے اس طرح لکھا ہے کہ محدود روحانی تجربے والوں کو ان کا یقین بھی نہیں آسکتا۔ انھوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلاف مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ ان سے پہلے ان کے والد اور ان کے چچا کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مولانا عبد اللہ سندھی ان دونوں بزرگوں کی نسبت لکھتے ہیں: ”ہر دو بھائیوں کے نظریوں کا حاصل ایک ایسی شاہراہ بنائے گی جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ اور متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔“ ان کو ششوں کو شاہ ولی اللہ نے وسعت دی اور تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں: ”ان کتابوں سے ظاہر صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے، خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ

ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیر میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔ تصوف اور شرع کے معاملے میں شاہ ولی اللہ کے طرزِ عمل کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ دیوبند میں جہاں شاہ صاحب کے اصولوں کی تھوڑی بہت پیروی ہو رہی ہے فقط علوم ظاہری کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ تلامذہ کی روحانی اصلاح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ میں سے اکثر صحیح تصوف اور تزکیہ نفس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور حال میں مدرسے کے سرپرست مولانا اشرف علی تھانوی نے تصوف کے متعلق جو تفصیلی کتاب لکھی ہے، وہ بھی فی الحقیقت شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر کا اظہار ہے۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف صوفیہ اور فقہاء کے اختلافات مٹانے کی کوشش کی، بلکہ صوفیہ کے اپنے درمیان جہاں اختلافات تھے، انھیں بھی کم کرنے میں سعی ہوئی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کا مکتوب مدنی ہے جس میں انھوں نے ابن العربی کی وحدت وجود اور امام ربانی کی ”وحدت شہود“ کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے روحانی اختلافات مٹانے کے لیے یہ بھی کیا کہ اگرچہ آپ کو زیادہ تعلق خاطر طریقہ نقشبندیہ باقوتیہ سے تھا، لیکن بیعت کے وقت آپ چاروں خانوادوں نام لیتے۔ تذکرۃ الرشید میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا ارشاد درج ہے: ”ہماری حضرات بیعت کے وقت چاروں مشائخ کا نام لیتے ہیں تاکہ سب برابر عقیدت رہے اور سب بزرگوں کے فیض سے مستفیض ہوں۔ اور چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے سے نکلا ہے۔“

اختلاف بین المذاهب: اس کے علاوہ فقہی مذاہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی طریقوں کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں تو اس مسئلے نے بہت پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی، لیکن ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں اس پر سخت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ چند سال ہوئے وہ اسپین ہوئے ہوئے اسپینی مراکش میں بھی بغرض سیر و سیاحت چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے تو امام نے

پوچھا۔ ”کیفَ مَذْهَبُکُمْ“ تمہارا مذہب کیا ہے۔ ان بچاروں نے مذہب کا مطلب ہندوستانی محاورہ کے مطابق دین لیا اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دہرایا اور بالآخر ایک اور سادھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انھوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا تو امام صاحب اتنے مایوس ہوئے کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے! شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بھی انصاف اور اعتدال اور سلیم الطبعی سے کام لیا ہے کہ وہ خواجہ محمد امین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ”سوم سوال آنکہ عمل تو درمات فقیہہ بر کدام مذہب است گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذہب مشہورہ“ یعنی مختلف مذہب کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حنفی طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا دونوں حنفی تھے، لیکن ان کے چاہیے استاد شیخ ابوالطاهر مدنی شافعی تھے۔ شاہ صاحب نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ اور وہ دونوں طریقوں کی خوبیوں اور ان کے اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان اختلافات کو نمایاں کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔ شاہ صاحب کا بس چلتا تو وہ چار مذہب فقہی یا کم از کم دو مشہور طریقوں کو ملا کر ایک کر دیتے۔ تفہیمات میں لکھتے ہیں: ”میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب اہمیت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیروی ان دو کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انھی مذہب کی زیادہ ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت جو امر حق بلا اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبوی کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو اس کو رکھا جائے اور جس کی کچھ اصل نہ ہو اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر وہ دونوں میں متفق علیہ ہوں تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں۔“

جدید علم الکلام کی ابتدا: یہی حال علم الکلام کے متعلق ہے۔ آپ عام مقلدین اور متکلمین کے مخالف تھے اور کئی جگہ ان کے خلاف زور سے اظہار رائے کیا ہے۔

مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:-

”در علوم شرعیہ پیشینیاں چیزہ آورند کہ مقصود معلوم پیشینیاں نہ بود بلکہ در سلف امت ازاں اثر سے یافتہ شہود۔ جموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیوں را با علم شریعت آمیختند و اصل اصول کتاب را از دست دادہ تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و اصراف و تخلیط چیزے دیگر شد۔ علوم اصول دین را کہ فضل علوم است۔ بہرین کہ متکلمین و دلائل چہ صانع آفریدند۔ و در وادی جدل و تمقن تا بکار رسیدند؛ حالانکہ سلف امت کبیر عظیم داشتند برین جنس کلام و آن را خارج از شریعت پنداشتند۔“

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں عباسیہ دور میں علم کلام اس لیے وجود میں آیا کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کرے اور دور جدید میں برسر تیاران کے رفقا کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور نیچر سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دنیا کے بنیادی واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور ان کی تصانیف میں ہے۔ ان کی مشہور تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں یہ کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں انھوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لیے بے حد مفید ہیں۔ اور ان کی غرض و غایت ہی انسانی اصلاح و تہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تقلید کے خلاف انھوں نے بڑی سختی سے اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (ترجمہ) ”تقلید سے میری جبلت اور مرشد انکار کرتی ہے اور بالکل اس سے بھڑکتی ہے۔“ ایک اور جگہ عام علماء و مقلدین پر بالواسطہ طنز کرتے ہیں: ”جسے کہ سرمایہ علم ایشان شرح وقایہ و ہدایہ باشد۔ کجا اور اک اس سر دقنق تو اندک کرد۔ اس کے علاوہ حجتہ اللہ البالغہ کے دیباچے میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ (ترجمہ)

”مصطفوی شریعت کے لیے وقت آگیا ہے کہ بران اور دلیل کے پیرانوں میں

مبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔

ایک نے علم الکلام کا پیغام نہیں تو کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ کے دیدہ و رسا حیرت انگیز سچے سچے کہ انھوں نے ایک نئے طریق کار کا آغاز کیا تھا خاتم الدیاء شاہ غلام علی ان کی نسبت کہتے تھے۔ "ایشان بسیار بزرگ بودند۔ و طریق نو آورده اند (مفوضات) حکیم الامت کے علمی کارنامے" ان احسانات اور انداز خیال کی خوبیوں کے علاوہ اصل چیز شاہ ولی اللہ کا علمی پایہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی علماء کے صدقہ نشین ہیں بلکہ اسلامی دنیا کی اہم ترین مسیتوں مثلاً امام غزالی یا علامہ ابن تیمیہ کے پلورہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں لیکن کاترجمہ اقران ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ کچھ نہ کرتے تب بھی انھیں ہماری علمی غنوں کی صنادید میں جگہ ملتی لیکن انھوں نے اس پر لکھا نہیں کی انھوں نے علوم اسلامی کی تاریخ مثلاً حدیث تفسیر تاریخ فقہ اسرار دین تصوف کو لیا اولیٰ میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے ان علوم کی ایک مستقل بٹیری یا ناگ چھڑی مولنا مودودی ایک مضمون میں شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھتے ہیں۔

"انھوں نے اسلام کے پورے فکری۔ اخلاقی۔ شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت

میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشروں سے

بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے آئمہ گزرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام

حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملے

ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے لیکن ان میں

کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے

مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ

اس راہ میں پیش قدمی کریں۔

مولنا موصوف شاہ صاحب کے مرتب کردہ نظام اسلامی کی تفصیلات دے کر

لکھتے ہیں:-

"پھر وہ نظام شریعت۔ عبادات۔ احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی

حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اسی

نوحیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ

میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہماری قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ:- شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے

ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت

کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے

کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مڑھٹوں اور سکھوں

کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس شہرت حالات کا افسوس

ہوتا ہوگا، لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔

شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں

دخل انداز ہو کر واقعات کی رُو کو روکیں لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ

کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے انھوں نے اپنی

زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں

کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روزِ بد

دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انھیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی

تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی

اختلافات مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں اور اپنے

ملے جن نہ رہ سکیں حالات شاہ ولی اللہ کو سابقہ ہندوستان میں حکومت اسلامی کے آغاز کے بعد بھی رونا

نہ ہوئے تھے۔ شاہ صاحب پر جو گزرتی ہوگی اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ٹھوس روحانی تربیت اور

بلندی حوصلہ اور سلیم الطبعی کا فیض ہے کہ ان حالات کی ایک جھلک ان کی تصانیف میں نہیں۔ کوئی شکایت

نہیں کوئی رونا نہیں، کہ دوسروں کی ہمتیں بھی کمزور ہوں اور واقعتاً ہے کہ جن کی صلاحیتیں تمام تر تعمیری

ہوں۔ ان کے پاس آئسوہانے کے لیے وقت کہاں؟ نتیجہ یہ کہ اپنی خاموش محنت سے قوم کے گرد و دھانی

دیا ر تعمیر کر گئے جس پر زمانے کے تعمیرکاروں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ ان کی تمام کوششیں اس پر منحصر تھیں کہ وہ اگرچہ یہ تعارض فطرت انسانی تھوڑے بہت اختلافات ہمیشہ رہیں گے، لیکن شاہ صاحب نے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سالہا سال کی محنت کے بعد ایک ایسا دستور العمل مرتب کر دیا، جس سے اختلافات کی گنجائش تھوڑی ہے اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علما، صوفیہ، فقہاء اور عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام میں ملک ملک کے لیے علیحدہ مذہبی نظام (National Church) نہیں ہوتا۔ لیکن تاریخی، نسلی، لسانی، اثرات پھر بھی کارفرما رہتے ہیں اور مختلف ممالک میں مختلف طریقے برسر کار آتے ہیں۔ ایران میں شیعیت نے عروج پایا۔ نجد میں مہابیت نے کسی ملک میں شافعی فقہ رائج ہے کسی میں حنفی اور کسی میں جہلی۔ اگر اس نقطہ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد، فقہی روایات اور مذہبی میلانات دیکھے جائیں تو یہ نظر آئے گا کہ جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے، جسے بنگال میں مولوی کرامت علی جوہری، بہار میں صادق پوری خاندان، اور شمالی ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے رائج کیا۔ اور جو آج دارالعلوم دیوبند کی بدولت عوام سے گزر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہ نے ترتیب دیا اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جاسکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ بابرکات ہے۔

لے اس بیان سے پروفیسر محمد فرمان نے خیال کیا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی حضرت مجدد پر فوقیت متصور ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تمام عالم اسلام کے مجدد اہل ثلثی کا مرتبہ ایک خطہ کی خاص ضروریات پوری کرنے والے سے بلند ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد شاہ صاحب کے طریق کا لاہر ان خاص مقام کی وضاحت ہے۔ ان کی فوقیت ثابت کرنا نہیں۔

حکیم الامت کو بھی اپنے کام کی اہمیت اور علوم و تہذیب کا احساس تھا۔ البحر اللطیف میں کہتے ہیں :-

کہ باور دار و این حروف از فقیر خاکسار میں
نظار عالم قدس است انکار و قبول اور
ندارد باطنش از غولش آئینہ صفت رنگے
طلسم حیرت آلود است تمکین و فضول اور
شعاع آفتاب از راہ این روزگار ہی بیزد
بجز این نمکتہ نتوان بہت مضمون و مہول اور

حکیم الامت کے فرزندانِ ارجمند

شاہ ولی اللہ صاحب نے کسی بلند پایہ کتاب یا دیگر چھوڑی، لیکن جس طرح وہ اولاد معنوی میں خوش قسمت تھے، اسی طرح اولادِ صلبی میں بھی خوش نصیب تھے۔ ان کے چار بیٹے علم و فضل میں ممتاز ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے والد ماجد کے کام کو جاری رکھا شاہ صاحب کی دودھ شادی ہوئی۔ پہلی مرتبہ اپنے ماموں کی صاحبزادی سے شادی کی، جن سے مولوی شیخ محمد صاحب پیدا ہوئے۔ جو لاؤلفوت ہوئے۔ زوجہ بقول کے انتقال کے بعد آپ کی شادی سوتی پت کے سیدنا اللہ صاحب کی دختر نیک اختر بی بی اودہ (کنڈا) سے ہوئی۔ ان سے پانچ بچے ہوئے ایک صاحبزادی بی بی امۃ العزیز (جن کا سلسلہ مقالاتِ طریقت کی تصنیف ۱۲۹۱ھ تک قائم تھا) اور چار فرزندانِ گرامی۔

شاہ عبدالعزیز [۱] دوسری شادی سے جو اولاد ہوئی، اس میں شاہ عبدالعزیز آپ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور ان کے ایک ممتاز شاگرد سے علم حاصل کر کے تدریس کی عمر میں والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے ساٹھ سال تک درس دیا اور علم حدیث سے جسے شاہ ولی اللہ نے از سر نو ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ اُس کا

لے یہ معلومات مقالاتِ طریقت سے اخذ کی گئی ہیں۔

فیض ملک میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے۔ ”بالجملہ سے جامع علوم بلکہ آیتے از آیات الہی بود“ اور حقیقت یہ ہے کہ آج ہم آپ کی عظمت کا اندازہ آپ کی تصانیف سے صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ آپ درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں ہر متن مشغول رہے۔ اس لیے آپ کو تصنیف و تالیف کا بہت وقت نہیں ملا۔ لیکن آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ تو آپ کے تلامذہ کی تعداد اور برگزیدگی سے ہو سکتا ہے اور کچھ معاصرانہ تذکروں اور تاریخی کتابوں سے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے زمانے میں آپ کی کس قدر عزت تھی۔ آپ کو کلکتہ میں کمپنی کے مدرسے کے لیے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے بلایا گیا۔ دہلی میں آپ کے روزگار کا کوئی مستقل سلسلہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے سادہ زندگی اور علوم اسلامی کی اشاعت زیادہ عزیز سمجھی۔ آپ کے شاگرد بے شمار تھے۔ ذیل میں چند نام درج کیے جاتے ہیں۔ جن میں ہر ایک صاحب علم و فضل تھا اور آپ سے علم حاصل کر کے خود فیض کا سر شمع بنا۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ محمد اسحق صاحب۔ مفتی صدر الدین دہلوی۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب۔ مولوی عبدالحی صاحب۔ مولانا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی۔ مولانا سید احمد بریلوی۔

آپ کی معلومات بے حدود وسیع تھیں اور اسلامی علوم تک محدود نہ تھیں۔ آپ خود فرماتے تھے کہ جو علوم میں نے مطالعہ کیے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب ایسے علوم تھے جو امت اسلامی کی تخلیق تھے اور باقی نصف دوسری امتوں کے۔

اور تو اور آپ کو فن موسیقی کے علمی پہلوؤں سے بھی واقفیت تھی اور مختلف گیتوں اور راگوں کو پہچانتے تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نہ صرف امور مذہبی اور حدیث و تفسیر اور فقہ میں آپ کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا

تھا، بلکہ ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے کی بڑی اہمیت تھی چنانچہ ناظرین آپ کی حیات کو یاد ہوگا کہ جب شاہ نصیر دہلوی نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے سب ساندہ کو چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے اس کی غزل کے متعلق تسلی کر دی تو ذوق نے کسی سے اصلاح لیے بغیر بے مدھمک اس غزل کو مشاعرے میں پڑھا۔

اس کے علاوہ سید ناصر ندیر فراق نے لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھا ہے۔ ”کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب و عظیم جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سُنے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا۔ ”استاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ مولانا عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے روز بروز یاد کرتا ہوں۔ اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں پچھپن سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر کو سُنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چُنا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے۔ جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے مجدد اور مجدد خواجہ میر درد صاحب ہیں آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے سے غنیمت سمجھو۔ کیونکہ خواجہ صاحب پکتے پان میں چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔

مستفصلوں کی نظروں میں تو مولوی صاحب فقط ایک حلیم الطبع، مرنجاں مرنج اور مسکین عالم تھے، جنہیں تعبیر خواب میں اور جن بھوتوں کے نکلنے میں خاص ملکہ تھا۔ لیکن آپ کے ملفوظات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ آپ بڑے زندہ دل

اور حاضر جواب تھے۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سنی مباحثے زوروں پر تھے اور علمائوں اور مسلمانوں کے مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ آپ کے پاس بھی لوگ اپنے اعتراض اور سوال لے کر آجاتے، جنہیں آپ بعض اوقات ٹھوس اور متین دلائل سے رد کرنے کی بجائے اس طرح چٹکیوں میں اڑا دیتے کہ معترض قائل بھی ہو جاتے اور لا جواب بھی۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں:-

لطیفہ:- ایک دفعہ ایک پادری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں آئے در سوال کیا کہ کیا آپ کے پیغمبر صیب اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، وہ کہنے لگا، تو پھر انھوں نے بوقت قتل امام حسین فریاد کی۔ یا یہ فریاد سنی نہ گئی؟ شاہ صاحب نے کہا کہ نبی صاحب نے فریاد تو کی، لیکن انھیں جواب آیا کہ تمھارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے علی کا صلیب پر چڑھنا یاد آ رہا ہے۔

لطیفہ:- ایک شخص آپ کے پاس کسی صورتور کی کھنچی ہوئی ایک تصویر لایا اور کہنے لگا کہ یہ تصویر جناب رسالت مآب کی ہے۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے کہا کہ حضرت پیغمبر صاحب باقاعدہ غسل کرتے تھے۔ اس تصویر کو بھی غسل دے کر دھو ڈالو۔

لطیفہ:- ایک دفعہ ایک ہندو گاریبان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میری ایک بات بتلاؤ کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟ آپ نے فرمایا کہ جو میں کہوں اُسے خوب سوچ لینا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہندو ہوتا، تو گویا کبھی نہ ہوتی۔

لطیفہ:- ایک شخص نے آپ سے مسئلہ پوچھا کہ مولوی صاحب، یہ طوائف یعنی کسی عورتیں مرنے ہیں تو ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو مردان کے آستان ہیں ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ

۱۔ مقالات طریقت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مزاج میں نہایت خوش طبعی اور ہر بات کا مذاق تھا۔ آپ کی بدنی حالت کی نسبت اس کتاب میں لکھا ہے: "وزن قدہ لا غر اندام۔ گندم رنگ۔ کلاں چشم۔ صاف جہنم تھے۔ لیکن بعض سخت بیماریوں سے سابقہ پڑا۔ اور جانی جاتی رہی۔

ہاں پڑھتے ہیں۔ حضرت نے کہا تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو!!

ہندو کے راہنماؤں کی نسبت، مرزا مظہر جانجاناں کے خیالات ہم آگے چل کر درج کریں گے لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب نے سری کرشن کے متعلق جو رائے ظاہر کرے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں وہ بھی مرزا صاحب کے ہم خیال تھے۔ آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضور کنہیا جی کے حق میں کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے حق میں چُپ ہی رہا جائے، لیکن بھاگوت گیتا سے جو ہندوؤں کی ایک معتبر کتاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا جی اولیا میں سے تھے۔

مذہبی معاملات میں کئی اہم امور پر آپ کے فتوے یادگار ہیں مثلاً جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کا لُج قائم کیا اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متائل تھے تو آپ نے ان سب کے شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کا لُج قائم ہونے سے بچا جس سلسلے پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتوے دیا۔ اسی طرح اور کئی محرکات الاء فتوے ہیں جن میں انگریزوں بلکہ تمام غیر مسلموں کی مناسب نوکری اور دار الحرب میں جرنی کافروں سے سود لینے کے جواز کے فتوے ہیں۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سنی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ نے ان مسائل پر عربی فارسی میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے تحفہ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے، لیکن مخالفین بھی اس کی متانت تہذیب اور شائستگی کے مداح ہیں۔ ان کے علاوہ تفسیر عزیزی میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں لکھی ہے۔ اصول حدیث میں محجالہ نافعہ اور تاریخ حدیث میں بستان المحققین اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ | تاریخی حیثیت سے آپ کی سب سے اہم کتاب تحفہ اثنا عشریہ ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا۔ جب شیعہ علماء کے حالات پڑھے اور دیکھا کہ کس کثرت سے انھوں نے اس کی تردید میں قوت بیان صرف کی ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے اکابر شیعہ علماء کے

سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کتاب کے اثر کو زائل کرنا تھا اور اس میں بہتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علماء کچھوں میں سب سے ممتاز نام مولوی دلدار علی مجتہد اقل کا ہے۔ انھوں نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبدالعزیز کی تحریروں کی تردید میں لکھے۔ صوارم الالہیات، حسام الاسلام، احیاء السنہ میں تحفہ اشاعہ عشریہ کے ان ابواب کا جواب ہے جو بالترتیب الہیات، نبوت اور معاد و حجت کے متعلق ہیں۔ رسالہ ذوالفقار تحفہ کے باب دوازدهم کے جواب میں ہے۔ خاتمہ کتاب صوارم میں اثبات امامت کا ذکر ہے اور رسالہ غیبت میں شاہ صاحب کے اقوال دربارہ غیبت کا رد ہے۔ علامہ حکیم مزاحم کل دہلوی نے تحفہ کے جواب میں نہ صرف نزہت اشاعہ عشریہ لکھی، بلکہ ان مباحث سے غمزدہ ہونے کے لیے جو تحفہ کی اشاعت سے پیدا ہوئے تھے، انھوں نے اپنی عمر صرف کر دی۔ اسی طرح ہم مفتی محمد قلی خاں کتوری کا ذکر مولوی دلدار علی کے تلامذہ کے ضمن میں کریں گے۔ وہ ایک مدت تک میرٹھ میں مفتی عدالت رہے۔ پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں جا مقیم ہوئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وظیفہ حیات تحفہ اشاعہ عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے۔ تحفہ کے باب ہشتم کا جواب انھوں نے تشدید المطالب و کشف الغفائن میں دیا۔ ”وآں کتابیست نہایت مبسوط و در دو مجلد کبیر“ سیف نامہ میں باب اول کا جواب ہے۔ تقلیب المکام میں باب دوم کا بیان رسالت میں باب ہفتم کا۔ (کوئی تیس ہزار سطروں کی کتاب ہوگی) اور مصارع الافہام میں باب یازدهم کا تین چار مشہور شیعہ علماء کی کوششوں کے متعلق یہ معلومات نجوم السماء سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور کئی کتابیں تھیں جو تحفہ کی تردید میں لکھی گئیں مثلاً مولوی دلدار علی صاحب جانشین سلطان العلماء سید محمد صاحب کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھوں نے تحفہ اشاعہ عشریہ کی تردید میں رسالے لکھے۔ ان مباحث کی گونج دور دور تک پہنچی۔ مثلاً آسودگان دہاکر میں حکیم حبیب الرحمان دہاکر کے ایک مشہور رئیس میرا خروٹ علی کی نسبت لکھتے ہیں کہ جب کتاب تحفہ اشاعہ عشریہ یہاں پہنچی تو میرا خروٹ علی نے دس ہزار روپیہ تحفہ کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا۔ میرا خروٹ علی

فارسی کے مشہور شاعر سید محمد آزاد جہانگیری اور اردو کے مشہور ادیب سید محمد کے پردادا تھے، لیکن حکیم حبیب الرحمن کے بیان کے مطابق یہ دونوں صاحبان سنی ہو گئے تھے۔

تحفہ اشاعہ عشریہ فی الحقیقت ایک محرکہ الادرکتاب تھی اور شاہ عبدالعزیز نے اس کی تالیف میں بے حد محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ اس سے پہلے مختلف شیعہ سنی مسائل پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے قرۃ العین فی تفضیل الشیخین۔ ازالۃ الخفا اور بعض رسائل میں ان مسائل سے بحث کی تھی، لیکن ایسی جامع اور مانع کتاب کوئی نہ تھی۔ فی الحقیقت تحفہ اشاعہ عشریہ شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے کتاب کا مطبوعہ نوکشوری ایڈیشن بڑی تقطیع کے تقریباً ساڑھے چھ سو صفحوں پر محیط ہے۔ لیکن چونکہ بیان میں بڑے ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس لیے مطالب و معانی اور دلائل و حوالے بے شمار آگئے ہیں۔ کتاب کے جامع و مانع ہونے کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات و بیانات کے انتخاب میں اصول حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ شیعہ مذہب اور خیالات کے بیان میں فقط مستند اور معتبر شیعہ کتب پر انحصار کیا گیا ہے اور تواریخ و تفسیر میں سے فقط انہی چیزوں کو چننا ہے۔ جن پر شیعہ سنی دونوں فریق متفق ہیں۔ کتاب کی زبان اور طرز بیان بھی متین اور ہمدانہ ہے۔

کتاب کے بارہ باب ہیں۔ پہلا باب شیعہ مذہب کی ابتدا اور اس کے مختلف فرقوں کے آغاز کے متعلق ہے۔ دوسرے طویل باب میں ان طریقوں اور حیلوں کو گنایا گیا ہے۔ جن سے دوسروں کو گمراہ کیا جاتا ہے اور اپنے خیالات کی ترویج و ترقی کا انتظام ہوتا ہے۔ باب سوم میں اسلاف شیعہ و علماء کتب ایشاں کا بیان ہے۔ ابواب پنجم، ششم اور ہفتم بالترتیب۔ الہیات۔ نبوت اور امامت کے متعلق ہیں۔ باب دہم میں خلفائے ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کے خلاف الزامات کا بیان ہے۔ باب یازدهم میں شیعہ فرقے کے خیالات اور خصوصیات کا تجزیہ ہے۔ آخری باب تو لا اور تبرا کے متعلق ہے۔

شروع میں شاہ صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں شاہ صاحب کے اپنے گھر میں ان کے قریبی عزیز اور مشہور فارسی شاعر میر قمر الدین منت نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا، لیکن چونکہ یہ صورت حالات ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اس کے تدارک کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ مناظرہ کے وقت آسانی ہو۔

نجوم السما میں حکیم مرزا محمد کامل کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ فی تحقیق خواجہ نصر اللہ کابل کی کتاب صواعق کا ترجمہ ہے۔ افسوس ہم اس کی تصدیق نہ کر سکے۔ لیکن نجوم السما کے بیان کے مطابق تحفہ اثنا عشریہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔ اس میں حکیم مرزا کے متعلق ایک رسالے کے حوالے سے لکھا ہے "چوں فاضل عزیز تحفہ خود را... ظاہر نمود و ضلالت شیوع گرفت و مردم جہال و ناحق بین بطرف آن گردیدند۔"

امیر الروایات میں جو مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے ایک خادم امیر خاں کی بیان کردہ روایات پر مبنی ہے۔ لکھا ہے کہ نجف خاں نے تحفہ کی تصنیف پر شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خاندان کی بڑی اہانت کی اور انھیں سخت ایذا میں پہنچائیں۔ یہ بیانات مشتبہ ہیں لیکن شیعہ ذرائع سے بھی پتا چلتا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ کی تدوین و اشاعت فقط علمی محنت کا کارنامہ نہ تھا، بلکہ بڑی اخلاقی جرأت کا کام تھا۔ ہم تحفہ اثنا عشریہ کے شروع میں اور سرورق پر مصنف کا نام "حافظ غلام حلیم ابن شیخ محمد قطب الدین احمد ابن شیخ ابو الفیض دہلوی" پڑھا کرتے تھے اور حیران ہوا کرتے تھے۔ لیکن نجوم السما کے مطالعہ سے یہ حیرت رفع ہو گئی۔ "فاضل عزیز تحفہ خود را کہ ترجمہ کتاب صواعق خواجہ نصر اللہ کابل است، بہمت خوف و اب نجف خاں مرحوم کہ سرآمد علمائے آن روزگار و از شیعیان ائمہ اطہار بود، آن را بطرف خود نسبت کردہ، بلکہ اسے فرضی غلام حلیم برائے آن تراشیدہ..." نجف خاں کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا جانجاناں کی شہادت میں بھی

اس کی پشت پناہی کو دخل تھا۔ غالباً وہ واقعہ فوری جوش کا نتیجہ تھا۔ نجف خاں کو اس میں دخل نہ تھا، لیکن اس کی عام شہرت کے پیش نظر اس کے زمانہ اقتدار میں تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف ایک دل لگی نہ تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ ت ۱۲۸۵ھ یعنی نومبر ۱۸۶۸ء کے بعد شائع کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے کی تلخ بحثیں اب ختم ہو گئیں، لیکن شاید مذہبی تاریخ کا طالب علم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ اٹھارہویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا۔ اسے روکنے میں تحفہ اثنا عشریہ کا بڑا دخل تھا۔

علمی وسعت اور محققانہ نظر کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کو عربی انشا پر ازی اور شاعری میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے کسی عربی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک منظوم عربی خط میں جو آپ نے اپنے عہد بزرگوار شاہ اہل اللہ صاحب کو لکھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے حالات اور مرثیہ اور سکھ حملہ اور دوسرے طریقے بڑی خوبی سے نظم کیے ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ نظم دہلی کی تعریف میں ہے۔ ایک قصیدے میں آپ نے سوڈان کے حالات و واقعات کا نقشہ کھینچا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی اولاد نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط تین بیٹیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی سے بیاہی گئیں۔ دوسری مولانا شاہ رفیع الدین کے بڑے فرزند مولوی عیسیٰ صاحب سے اور تیسری شیخ محمد افضل سے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ مولانا محمد اسحق صاحب مہاجر اور مولوی محمد یعقوب صاحب۔ شاہ صاحب کی وفات پر لوگوں نے مولانا محمد اسحق صاحب کو آپ کا جانشین منتخب کیا۔ انھوں نے چند سال کے بعد ۱۲۸۴ھ میں تمام قبائل کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز کی وفات ۱۲۸۹ھ سال کی عمر میں ۱۲ شوال ۱۲۳۸ھ ہجری ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو ہوئی۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہے، تاریخ لکھی ہے۔ دست بیدار اجل سے بے پروا ہو گئے فقرو دین فضل و ہنر نطف و کرم علم و عدل

شاہ رفیع الدین

شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے مولوی شاہ رفیع الدین تھے۔ آپ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کی انغوش عاطفت میں علوم مروجہ حاصل کیے اور حدیث شریف کی سند بھی اسی صاحب کمال کے دست شفقت سے حاصل کی اور زہد و تقویٰ میں اپنے باپ اور بھائی کے قدم قدم تھے۔ جب آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب کبرسنی کثرتِ امراض و ضعف مزاج کی وجہ سے دماغی محنت اور تعلیم و تدریس کے متحمل نہ ہو سکے تو زیادہ تر یہ کام شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے سپرد کیا گیا۔ آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے، لیکن آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبولِ انام ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ مثلاً راہِ نجات اور دمنِ الباطل۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں منہمک رہے اور تشریف کی عمریں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں انتقال کیا اور اپنے والد بزرگوار کے قریب پائیں کی طرف دفن ہوئے۔

شاہ عبدالقادر صاحب

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے تیسرے صاحبزادے مولوی شاہ عبدالقادر صاحب تھے۔ آپ ۱۲۶۱ھ میں شمع افروز بنیم جہاں ہوئے اور اپنے وجودِ باجود سے عالم کو روشن کیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد مکرم کے سایہ عاطفت میں پائی اور علم فقہ و حدیث و تفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیل علم سے فراغت پا کر اکبر آبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کر دی۔ گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ اس سبب تصنیف و تالیف کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ لیکن قرآن شریف کا جامع اور ترجمہ یا موضع قرآن (۱۲۰۵ھ) آپ سے یادگار ہے جو بے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں شائع ہیں۔ یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے۔ آپ نے ۱۲۳۳ھ میں تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدِ امجد عبدالرحیم صاحب کے پائیں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔ موضع قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس سے پہلے ہوا۔

یابعد میں۔ مقبولیت اور محاورے کی صحت کے لحاظ سے موضع قرآن دوسرے ترجمے سے بہتر ہے۔ اس کی دو برہمی خوبیاں ہیں۔ ایک تو اس میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی طرح اردو عبارت میں عربی جملوں کی ترکیب و ساخت کی نقل نہیں کی گئی۔ صحتِ مفهوم کے ساتھ ساتھ اردو محاورے کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ دوسرے ترجمے میں کم سے کم لفظوں میں صحیح مفہوم ادا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے میں عربی غوی ترکیب کی پابندی کی گئی ہے اور کئی جگہ کافوں کو عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمے میں بعض لفظوں اور ترکیبوں کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔ آج ان دونوں ترجموں سے بہتر ترجمے مرتب ہو رہے ہیں، لیکن جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ترجمے اُس زمانے میں ہوئے جب اردو نثر کی کتابیں انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور لوگ اس زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے تو ان بزرگوں کی سمجھاؤ و فرہن شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے اور مذہب کی اشاعت اور وقتی ضرورتوں کا پورا خیال رکھا۔

شاہ عبدالغنی

شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے۔ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید نے پوری کر دی، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم و فضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ اس نئے دور کا مطالعہ ہم اپنی تیسری کتاب موج کوثر میں کریں گے۔

علمائے متاخرین

زوالِ حکومت

۱۷۰۸-۱۸۵۷ء

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اور اس کے بہت جلد بعد مغلہ حکومت کا زوال نمایاں ہو گیا اورنگ زیب ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ جب اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو وہ خود بوڑھا تھا اور اُسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ اُس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ نے مغلوں کے علاقے کو لوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت تو اُس نے خود سرخ کر دی، لیکن بندہ کا قلع قمع فرخ سیر نے کیا، جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۲۷ء تک حکمران رہا۔ کئی لحاظ سے وہ سمجھ دار اور قابل حکمران تھا، لیکن اس کے زمانے میں مسلمان اُمراء کے دو فرقے ہو چکے تھے۔ ایرانی اور توراتی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان قبائلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ حکومت کو ضعف اس لیے بھی پہنچا کہ فرخ سیر کو تخت سید برادران (امیرالامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ) کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ سید عبداللہ وزیر سلطنت اور حسین علی دکن کا بااقتدار صوبیدار تھا۔ جب فرخ سیر نے سید برادران کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین علی نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا دیا۔ ان سے وعدہ کیا کہ بادشاہ سے تمہیں چوتھ اور سروسش مکھی کافران لے دوں گا۔ چنانچہ وہ ان کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چلا۔ فرخ سیر محزون کر دیا گیا اور مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سروسش مکھی کی اجازت مل گئی۔ خاندانِ مغلہ کے زوال کی سب سے پہلی منزل یہ تھی۔

اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۷۰۸ء فروری ۱۷۱۹ء سے ۱۷۱۹ء اگست ۱۷۱۹ء تک تین بادشاہ ہوئے۔ جب توراتی امرانے ان بھائیوں کے

مظالم دیکھے تو انھیں قتل کر دیا۔ کئی دور و زور بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۲۷ء تک حکمران رہا۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے امور سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن جب ”رنگیلے بادشاہ“ نے یہ گوارا نہ کیا تو نظام الملک بالیس ہو کر ۱۷۲۷ء میں دکن چلا گیا۔ وہاں حکومت آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور اسلامی حکومت کی تباہی و بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد حکومت دہلی کا وقار و اقتدار بتدریج کم ہوتا گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ پھولیں اور جاٹوں نے بغاوتیں کیں اور بڑا ظلم یہ ہوا کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ آگیا۔ اس نے دکن کھول کر دہلی کو لوٹا اور قتل عام کیا اور دہلی کا خزانہ خالی اور فرج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شاہ دہلی میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود مختار صوبیداروں اور دوسرے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بنگال میں علی ویردی خاں، دکن میں نظام الملک اور دکن میں برہان الملک سادات خاں عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔

محمد شاہ کی وفات ۱۷۴۷ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، جس کے زمانے میں ایرانی اور توراتی اختلافات پھر بڑھ گئے۔ ایرانیوں کا سرگروہ قطب الملک جانشین صفدر جنگ تھا اور توراتیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین، جس نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانڈھ کر طرح طرح کے مظالم شروع کیے۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ پانچ سال بعد اسے بھی مروادیا۔ اور ایک اور شہزادے کو تخت نشین کیا۔ ایرانی اور افغان امرانے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین اور اس کے مرہٹے ساتھیوں کی شکایت کی۔ احمد شاہ لاہور پر قابض ہو گیا تھا، لیکن مرہٹوں نے اس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے حامی ایرانیوں کے سرگروہ شجاع الدولہ ابن سعادت علی خاں اور افغانوں کے سرگروہ نجیب الدولہ تھے۔ مرہٹوں کے ساتھ سمجھوتہ جاٹ۔ ابراہیم گاروی اور دوسرے لوگ تھے۔ ۱۷۵۷ء میں پانی کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا۔ جس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی

ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا، لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کر کے وہیں چلا گیا اور شاہ عالم عثمانی حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس کے چند سال بعد آ رہ کے مقام پر مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی، لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ انگریزوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں، لیکن اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہ شجاع کو اپنے قابو میں رکھیں شروع شروع میں ان کا اقتدار بہت موثر نہ تھا۔ لیکن جب ریسلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر رہیلے نے بادشاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا اور اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر رہیلے کو شکست دی اور اسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا۔ تو وہ ۱۷۹۹ء تک بادشاہ رہا۔ لیکن اس کی حالت مژدہ بدست زندہ سے بہتر نہ تھی۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ ٹیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۱۷ء سے ۱۸۱۸ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۱۸ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ تخت دہلی پر مقیم رہے، لیکن ان کی حیثیت بھی شاہ شجاع سے زیادہ نہ تھی۔ درحقیقت دہلی کی اسلامی حکومت ۱۸۵۷ء ہی میں ختم ہو چکی تھی، جب غلام قادر رہیلے نے شاہ عالم کو اندھا کیا تھا اور وہ مرہٹوں کی مرہانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

اس فوج میں مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت وسیع ہو رہی تھی۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان راجا رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا۔ وہ خود مختار ہو گیا ۱۸۱۷ء کے قریب اس نے کشمیر اور پشاور فتح کر لیے۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء تک یہ علاقے سکھوں کے ہاتھ میں رہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہان اودھ مقابلہ زلیوہ دیر تک محفوظ رہے اور ۱۸۵۷ء تک جب یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نہ آ گیا، شجاع اللہ کی اولاد یہاں حکمران رہی۔ سندھ کے امیروں کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ جنوب میں سلطان حیدر علی نے میسور میں ایک نئی حکومت قائم کی تھی، لیکن ۱۷۹۹ء میں

ایسٹ انڈیا کمپنی۔ مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج نے میسور شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں فقط نظام دکن کا تاج و تخت سلامت رہا۔ ۱۹۴۸ء تک ریاست حیدر آباد منخلیہ حکومت اور تہذیب کی آخری یادگار بھی جاتی تھی، جس پر اب انڈین یونین نے قبضہ کر لیا ہے۔

زوال حکومت کے اسباب

زوال حکومت کے بیان کے ساتھ اس سانحہ کے اسباب کا ذکر بھی متوقع ہے، لیکن یہاں ان کی تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر زوال حکومت کا اصل باعث وہ علمی، دینی اور عسکری کوتاہیاں تھیں جنہیں ہم نے عہد اکبری کی محدود ترقیاں والے باب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ ان امور میں مغلوں کی

جو روز افزوں کمزوریاں تھیں، ان کا قدرتی نتیجہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت وہ ایک ایسی طاقت سے مغلوب ہو جائیں، جو ان باتوں میں ان پر فوقیت رکھتی تھی۔ عہد اکبری کے بعد ایک اور ملک خرابی رونما ہوئی یعنی دربار اور امر کی فضول خرچیاں، نمود و نمائش اور عیش کو سشتیاں۔ بنیادی طور پر تو اس کی وجہ فتوحات سلطنت کی وجہ سے دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ لیکن اکبر ایک شاہانہ نظام قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ طبیعت کا سادہ اور کفایت شعار تھا۔ جہانگیر کا مزاج دوسرا تھا۔ اور نور جہاں تو خیر نور علی نور۔ اس کے علاوہ فرنگستان سے آنے والے سامان زیب و نمائش نے نمود و نمائش کے نئے دروازے کھل دیے تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل امر نے نہایت اونچا معیار زندگی قائم رکھنا شروع کیا اور دولت و ثروت کی نمائش اور اخراجات کی فراوانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قدم مارنے لگے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا تھا۔ یعنی فضول خرچی، تعیش کو شہی اور اسے نباہنے کے لیے رعایا اور زیر دستوں پر سختی اور رشوت ستانی اور اخلاقی انحطاط۔ اس سلسلے میں عالمگیر نے صورت حالات سدھارنے کی کوشش کی، لیکن جو مزاج کئی پشتوں سے بگڑے ہوئے تھے وہ درست نہ ہوئے۔ بلکہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات

پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ اس کی وفات کے پانچ سال بعد تختِ دہلی پر اس کا پوتا معز الدین جہاندار اورنگ نشین ہوا۔ جس نے لال کنور کے ساتھ اس طرح رنگ لیاں منائیں اور اس کے اقارب کو اتنے بڑے عہدے دے دیے کہ بادشاہت اور امارت کا وقار ختم ہو گیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں حالات ذرا سنبھلے، لیکن یہ سنبھالا عارضی تھا۔ اس کی وفات کے ایک سال بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے جہاندار شاہ کی طرح بدعنوانیاں نہیں کیں اور اس کے عہدِ حکومت کے بعض روشن پہلو بھی ہیں (مثلاً اردو شاعری کی نشوونما، شاہ ولی اللہ کی تحریک کا آغاز وغیرہ) لیکن اب عیش کوشی اور اخلاقی انحطاط معاشرے کا جزو ہو گیا تھا۔ یہ کمزور پل برقرار رہا۔ رہی سہی کسر مرہٹوں اور نادور شاہ کے حملوں نے پوری کر دی۔ اور بادشاہت کا فقط ایک کھوکھلا ڈھانچہ باقی رہ گیا۔

شاہد اسبابِ زوال کے متعلق آخری شاہانِ دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار کا تجزیہ دلچسپی سے پڑھا جائے، جسے اردو کی ایک قدیمی کتاب میں حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے اور جو اٹھارویں صدی کے طوطی قیوں کی ایک دلائلِ تصویر پیش کرتا ہے۔

نتائجِ المعانی میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:-

ایک روز ابو نصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکرِ زوالِ سلطنت آگیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کی۔ چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔ اول حکیموں نے فرمانروایانِ بیداد و مغر کو وہ مقویات کھلائی کہ تاب تحمل نہ ہو سکی۔ مزاجِ وحشت طلب ہو گیا۔ دوسرے کلاں توں نے ان کے گھوڑے جو فرخیز ہوئی، اس کو پیش کیا۔ اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاہیں کو قہس و سرود میں داخل رکھا۔ ڈوم ڈھارٹی دارالہمام ہوئے۔ انتظامِ فرمانروائی میں خلل واقع ہوا۔ دشمنوں نے سراٹھایا۔ بدخواہوں نے پیر پھیلے۔ جا بجا خود مر ہو گئے۔ خرفا کو دربار میں داخل نہ ہوئی۔ ایک کی ہمت کسی نے نہ دکھائی۔ وقتِ بیکار لوگوں نے طرح دی غنیمت کی بھائی۔ تیسرے کثرتِ عیال نے اصرار و ارجح کی کڑھ ہوئی۔ اصرار و ارجح کی ترقی ہوئی۔ نزاع خانگی

سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشلخ و پیر زادوں نے جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکرِ سلطنت آیا۔ اپنے تئیں عرش پر پہنچایا۔ مسائلِ تصوف بیان کرنے لگے۔ کنج عزت کی خوبیاں عرض کرنے لگے۔ خونِ بدگمانِ خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی یہ شیخی بکھار چکے پھر اپنی کرامت بتانے لگے۔ ہم دعا کرتے ہیں۔ دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے۔ دشمن اور مرنے والے نہیں کرنے کا خود پابلی سم سمندان لشکر دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔ فرمانروا ان کے دم میں آگئے۔ پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا۔ چار بالشِ عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ ارکینِ گوشہ گزین ہوئے۔ غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لایا۔ دعا کی فوج آتی رہی۔ حکومت باقی رہی۔ لیکن زوالِ حکومتِ علومِ اسلامی کی اشاعت میں ضعف آیا۔ بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا۔ (ص ۱۶۴-۱۶۵)

علومِ اسلامی کا فروغ

سید سلیمان ندوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

فرنگی محل

”..... اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں محفلات کو فروغ دیا۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور میرزا بہرہ علی نے منطق اور فلسفہ کا درس عام کیا اور انھی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ۔ فرنگی محل اور خیر آباد کی درس گاہوں میں متاخرین کے محفلات اور شروح، حواشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۶ھ کے شاگرد عبد السلام لاہوری اور ان کے شاگرد عبد السلام اودھی۔ ان سے ملا قطب الدین سہالوی۔ ان ملا قطب الدین صاحبِ قمر آبادی۔ ملا امان اللہ بناری اور قاضی محمد عبد الباقی نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بناری سے

۱۔ شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ و مفتی زور۔ از شاگردانِ دوسرے ملا عبد السلام ساکن دیوبند مضاف لکھنؤ مشہور است بر تفسیر ہیناوی حاشیہ بر حبیہ دارو۔ بسال ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) وفات یافتہ۔
۲۔ عبد شاہجہان کے ایک شاگرد آؤش فاضل تھے۔ چلنے پہنچنے آسامی جگہ مدرسہ لاہور میں درس اعلیٰ رہے پھر بادشاہی لشکر میں منتقل ہوئے۔ ان کے تفسیلِ حاشیہ کے لیے ملاحظہ ہو تذکرہ مشاہیر لکھنؤ

پڑھا۔ مگر نظام الدین کے وارث ملا بھرا علوم ہوئے۔ بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا۔ میرزا ہد کا فیض شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کو اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو۔ ان سے شاہ عبدالعزیز صاحب کو پہنچا اور ان سے ملک میں عام ہوا۔

مولانا نے جو سلسلہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں کئی بحث طلب امور ہیں، لیکن ان کے باوجود مولانا سلیمان ندوی کا مرتب کردہ سلسلہ تاریخ علوم اسلامی دلچسپ اور مفید ہے اور علوم اسلامی کی تاریخ میں فرنگی محل کے بزرگوں کی اہمیت اس سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ شروع میں وہاں ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا جس کے تعلق کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے وطن کو واپس چلا گیا تو یزدین "نزدول" یعنی سرکاری ہو گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ملا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہالی میں رہتے تھے، جہاں انصاریوں اور عثمانیوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا تھا۔ ملا قطب الدین انصاری تھے۔ ۱۰۳۰ھ (۱۶۱۹ء) کی ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے اور ملا کو شہید کر کے ان کا گھر جلا دیا۔ ان کے صاحبزادے ملا محمد سعید سہالوی نے عالمگیری کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انھیں معافی میں دیا گیا۔ ملا قطب الدین نے ملا عبد السلام دیوبی کے شاگرد ملا دانیال اور شیخ محب اللہ آبادی کے شاگرد قاضی گھاسی سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں سے ایک شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ تھا جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہو گیا۔

اولاد کے معاملے میں آپ بڑے خوش قسمت تھے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر اور انھی کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کا فیض جاری رہا۔ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے: "عمر عزیز پیش پیش دریں بسر برد۔ گوئی ریاست علمی بجوار لکھنؤ برو ختم شد و سلسلہ تلمذ اکثر علمائے ہند برو منتہی می شود۔"

ملا قطب الدین کے بیٹوں میں سے سب بزرگ و ملا نظام الدین تھے۔ جن کے نام پر درس نظامی مشہور ہے۔ تعلیم آپ نے اپنے والد حافظ امان اللہ بناری اور

اس عہد کے ایک اور مشہور اور قابل ذکر استاد مولوی غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ تصانیف آپ کی کئی ہیں۔ جن میں حاشیہ شرح ہدایت الحکمت۔ شرح مسلم الثبوت۔ حاشیہ شمس بازغہ۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔ آپ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے ملفوظات بھی آپ نے مرتب کیے۔ آپ کی وفات ۱۲۸۰ھ میں یعنی نادر شاہ کے حملے سے تھوڑی دیر بعد ہوئی۔ آپ کی زیادہ شہرت بطور مدرس کے تھی۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے درس و تدریس کے مقابلے میں باقی سب علما کے درس بے رونق ہو گئے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہوگا جس کی شاگردی کا سلسلہ آپ کے شاگردوں یا فرزندوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو۔

درس نظامی

کتب اور علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔

(۱) صرف :- میزان - منشعب - صرف میر - پنج گنج - زبدہ - فصول اکبری - شافیہ -

(۲) نحو :- نحو میر - شرح مائتہ عامل - ہدایت النور - کافیہ - شرح جامی -

(۳) منطق :- صغریٰ - کبریٰ - ایسا غوجی - تہذیب - شرح تہذیب - قطبی مع میر سلم العلوم -

(۴) حکمت :- مہندی - صدر - شمس بازغہ -

(۵) ریاضی :- خلاصۃ الحساب - تحریر اقلیدس مقالہ اول - تشریح الافلاک - رسالہ قمر شجیہ - شرح چمنی باب اقل -

(۶) بلاغت :- مختصر معانی - مطول تاما اناقلت -

(۷) فقہ :- شرح وقایہ اولین - ہدایہ آخرین -

(۸) اصول فقہ :- نور الانوار - توضیح تلویح - مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

(۹) کلام :- شرح عقائد نسفی - شرح عقاید جلالی - میرزا ہد - شرح موافقت -

(۱۰) تفسیر :- جلالین - بیضاوی -

(۱۱) حدیث - مشکوٰۃ المصابیح -

مولوی ابوالحسنات ندوی اس نصاب کو درج کر کے لکھتے ہیں۔ "اس کے ملا نظام الدین تھے۔ انھوں نے اس کی بنیاد ایسے زبردست ہاتھوں سے رکھی کہ استادِ زمانہ آج تک اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ درس نظامی کی پائنداری کی وجہ اس کی خوبیوں سے زیادہ کچھ تو علما سے فرنگی محل کا اثر و اقتدار تھا۔ کچھ علما سے متاخرین کی عقیدت مندانہ روش۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کے ماتحت علما نے خود تعلیم پائی ہو۔ اس سے انھیں انس ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علما نے کوئی ایسا مجتہد ابھی تک پیدا نہیں کیا تھا جو پرانے عربی مدرسوں کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُسے تبدیل شدہ حالات کے مطابق مفید بنا دے۔

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا تو خیال ہے کہ درس نظامی ایک نئے نظامِ تعلیم ہے جس کا ہیولی ملا فتح اللہ شیرازی نے ترتیب دیا اور جس پر بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اس موضوع پر التذوہ کے ایک نمبر میں لکھتے ہیں۔

اور اس درس موجودہ کو حضرت قبلہ ملا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس کہنا سراسر گستاخی و بے ادبی ہے۔ حضرت ملا صاحب (قدس سرہ) نے نہ یہ موجودہ کتابیں پڑھائیں اور نہ اکثر کتابیں ان کے وقت میں تالیف ہوئی تھیں۔ نہ ان کتابوں کی جانچ مندرجہ تھی۔ اس درس کو خود وہ درس کہنا نازیبا نہیں۔ کچھ تو بعضے استادوں نے اپنے مذاق کے موافق کتابیں پڑھائیں اور کچھ طالب علموں کے مذاق اور کردار نے اضافہ کیا۔ حضرت ملا صاحب علیہ الرحمۃ کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہاں اگر ملا فتح اللہ شیرازی اس درس کا بانی کہا جائے تو سبجا نہیں۔۔۔۔۔ حضرت ملا صاحب (نظام الدین) قدس سرہ صوفی صافی عالی مشرب تھے۔ اگر وہ اس نظامِ درس کو درست فرماتے تو تصوف یا اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے۔ حالانکہ اس درس نظامی میں تصوف و اخلاق کی کوئی ایک کتاب نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس درس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تصوف و اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی درویش صوفی کی

صحبت اختیار کی اور اس کے معتقد ہوئے تو کچھ تصوف و اخلاق کا اثر ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس اب تو درویش و مشائخ بھی اقل و قلیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے دنوں سے غیر مقلدین اور وابستوں کی تعداد مولویوں کی جماعت میں زیادہ ہو گئی ہے۔ کاش اگر تصوف کی کوئی کتاب بھی ابتدا میں انھیں پڑھائی جاتی تو خیالات فاسدہ ان کے دلوں میں پیدا نہ ہوتے۔

درس نظامی کی نسبت مولانا نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔ "اس میں سب سے بڑا نقص ایک تو یہ ہے کہ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب و لغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے ساتھ منطق۔ الہیات کی عقلی کتابیں اس میں شامل ہیں، وہ بھی اب تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے میری رائے میں صرف و نحو کی کتابوں کو کم کر کے زبانی خطبات کے ذریعے سمجھانا چاہیے اور مخصوص طور پر ایسی کتابیں لکھنا چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر قواعد پر عبور ہو جائے اور ایسی کتابیں مصرعیں رائج ہیں۔ اسی طرح منطق و الہیات کی بھی بقدر ضرورت تعلیم دینی چاہیے۔ فقہ و اصول فقہ حدیث و اصول حدیث۔ بے شک نہایت ضروری ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں، وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان میں بھی رد و بدل ضروری ہے۔ معانی و بیان اور لغت و ادب کے لیے کتابوں کا معقول اضافہ کرنا چاہیے اور ہندسہ و ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا۔ طبیعیات۔ طبقات الارض۔ تاریخ اقتصادیات و سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے۔"

دینی نقطہ نظر سے درس نظامی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں تفسیر و حدیث پر پوری توجہ نہیں اور منطق۔ حکمت۔ صرف و نحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت درس نظامی مذہبی اور روحانی تعلیم کا نظام نہ تھا، بلکہ دنیوی نظامِ تعلیم تھا، جس میں فقہ وغیرہ پر اس لیے توجہ ہو گئی تھی کہ اس کی طلباء کو اسلامی حکومت کے دوران میں قاضی، مفتی اور محتسب بننے کے لیے ضرورت تھی۔ ورنہ زیادہ توجہ

منطق۔ گرامر اور فلسفہ پر تھی اور نظام تعلیم کا مقصد طلباء کی عام عقلی تربیت اور ذہنی ترقی تھا۔

نام نہاد معقولات پر ضرورت سے زیادہ توجہ علما سے پورب کا پرانا مرض ہے اور اس کے اثرات درس نظامی میں بھی نمایاں ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے طریق تعلیم میں معقولات کی نسبت جو طرز عمل ہے اس کا اندازہ دار العلوم دیوبند کے سابق سرپرست مولانا رشید گنگوہی کی رائے سے ہو سکتا ہے۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے: ”اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آب کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا، وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں۔“ حضرت امام ربانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے۔“

فلسفہ اور معقولات کی اسلام کے کسی دوسرے اہل نظر بند گول نے بھی تدریس کی ہے۔ شیخ عطار لکھتے ہیں:

فلے کفراں جابر حق المعرفة دوست تروارم ز فلے فلسفہ
گرازاں حکمت دیے افروختے کے چناں فاروق برہم سوختے
حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی مختلف علوم کے مدارج معین کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

”استاد علم کلام وفقہ اور لے است از استاد علم نحو و صرف۔ و استاد نحو و صرف اولے است
از استاد علوم فلسفی۔ با آنکہ علوم فلسفی داخل علوم معنویست۔ اکثر آن مسائل لاطائل
است و بے حاصل و اقل مسائل آنکہ از کتب اسلامیہ اخذ نموده اند و تصرفات
در آن کردہ از جبل مرکب خالی نیست۔“

لیکن اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلے پر سب سے تلخ تبصرہ مولانا محمد اسلم جبر جپوری کا ہے، جو مقالات اسلم میں لکھتے ہیں:-

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول وفقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیئت وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی

علوم ہیں۔ قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ بھی کتابوں میں لکھا جا چکا ہے، اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں۔۔۔۔

اب اگر پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو شرعی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں، جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کو سوں بھگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا فائل نہیں ہوں بلکہ کلی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء و عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خاص قرآن و سنت متواتر یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیوی علوم سکھانے چاہئیں۔ جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کا نئے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایک مرتبہ اندوہ میں اسی طرح زور دار الفاظ میں نصاب تعلیم کی شکایت کی تھی۔

”آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے، اس کا دورہ صرف نصاب تعلیم اور طرز تعلیم ہے۔“

ایک قوم کے بنانے اور بگاڑنے میں تعلیمی نصاب کو جو دخل ہو سکتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن ہمارے تعلیمی مصلحین بھی بعض بنیادی باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں (۱) کوئی نصاب تعلیم دوامی نہیں ہو سکتا (۲) مختلف مقاصد کے لیے مختلف نصاب ہوں گے۔ ایک انجینئر کو اور طرح کی ضرورت ہے۔ ایک مذہبی عالم کی ضرورت اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے قدیمی مدارس کی قومی نظام میں ایک باعزت جگہ ہے اور ہمارا مذہبی نظام اور قدیم تہذیب برقرار رکھنے میں انھوں نے مفید کام کیا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ قدیمی نصاب سے چٹھے رہنے کی وجہ سے وہ ہماری مذہبی ضروریات بھی کما حقہ پوری نہیں کر سکتے۔ کئی علوم (مثلاً اسلامی تاریخ) کا دروازہ انھوں نے اپنے لیے

تذکرہ رکھا ہے۔ فقہ، حدیث، عربی، ادب اور منطق کے ایسے کتابیں وہ رائج ہیں جن سے مہینوں کا کام سالوں میں ہوتا ہے۔ ان باتوں میں کچھ وسعت اور لچک آجائے تو اپنے مقاصد کو یہ مدرسے بہتر طریقے سے پورا کر سکیں۔

علمائے متاخرین

علامہ بحر العلوم: درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ملا عبدالحی بحر العلوم لکھنوی نے پائی۔ وہ ستروہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد انھیں ایک سانحہ پیش آیا، جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ چھوڑ کر پہلے شاہ جہان پور گئے اور پھر وہاں سے رام پور اور بنگال ہوتے ہوئے مدرسہ اس پنجپے کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ بحر العلوم کا خطاب دیا۔ درس کے لیے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا، جہاں وہ اپنی وفات یعنی ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) تک درس دیتے رہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ارکان اربعہ در اصول فقہ، شرح فتاویٰ مولنا روم، شرح فقہ اکبر اور رسالہ توحید وغیرہ۔ مولنا سلیمان ندوی نے ایک مضمون میں انھیں ابن خلدون اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے ساتھ اس طبقے میں گنا ہے جنھوں نے متاخرین کے دور تقلید میں بھی مجتہدانہ انداز برقرار رکھا ہے۔ مولنا کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے، لیکن بعض باتوں سے خیال ہوتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی اصل جگہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی اور شیخ نور الدین احمد آبادی کے ساتھ ہے۔ جنھوں نے علوم درسی میں کمال حاصل کیا اور ان کی خوب اشاعت کی، لیکن جنھیں ابن خلدون یا شاہ ولی اللہ کا ہم پایہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

ملا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ان کے بعد بھی یہ جگہ اسلامی علوم کا مرکز بنی رہی۔ ملا صاحب کے اپنے صاحبزادے مولوی عبدالباقی کچھ دیر مدرسہ ٹھہرا اور منشیٰ حاصل کر کے لکھنؤ آگئے۔ ان کے علاوہ یہاں سینکڑوں علماء تحصیل علم و فضل سے فارغ ہوئے۔ گزشتہ صدی میں یہاں کے سربراہ اور وہ عالم مولنا عبدالحی تھے۔ جنھوں نے

عربی میں متعدد کتابیں لکھیں اور جن کے کئی شاگرد نامور عالم ہوئے۔ حال میں مولنا عبدالباقی نے نام پیدا کیا۔ انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور مولنا محمد علی مرحوم نے ان سے طریقہ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی۔

آزاد بلگرامی: لکھنؤ کے قریب بلگرام کا مروجہ خیز خطہ ہے، جہاں سید عبدالحلیل اور

ان کے بعد ان کے صاحبزادے سید محمد قابل ذکر علما تھے، لیکن شاید ان سے بھی زیادہ عزت و احترام کے مستحق سید غلام علی آزاد بلگرامی تھے، جنھیں حسان الہند بھی کہا جاتا ہے۔

وہ بلگرام میں ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہمصر تھے۔ سید محمد بلگرامی

اور سید طفیل محمد بلگرامی سے تعلیم حاصل کی۔ پچیس سال کی عمر میں حج کو گئے اور مدینہ منورہ

میں شیخ محمد حیات سندھی سے ”صحیح بخاری“ پڑھی اور ”صحیح ستہ“ کا اجازہ حاصل کیا۔

پھر ہندوستان واپس آئے اور اورنگ آباد چلے گئے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے

صاحبزادے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ نے ان کی بڑی قدر کی اور اپنے پاس رکھا یہاں

انھوں نے اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزرا۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف

کئی ہیں۔ عربی میں ایک کتاب ”صحیح بخاری“ کے چند ابواب کی شرح میں ہے اور ایک اہم

کتاب سبحة المرحان فی آثار ہندوستان ہے۔ فارسی میں انھوں نے سرو آزاد، خزانہ علم و

روضۃ الاولیاء اور آثار الکرام لکھیں۔ ان میں سے پہلی کتابوں میں شعرا اور روضۃ الاولیاء میں

روضۃ خلدون کے دیباچے حالات ہیں۔ آثار الکرام بلگرام کے اولیاء اور فضلاء و شعرا کے متعلق

ہے اور ضمناً بلگرام سے باہر کے کئی بزرگوں کے حالات بھی آگئے ہیں۔ آپ کا طرز تحریر

سلجھا ہوا، محققانہ، تقاضی اور اغریق سے پاک ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ

یہ کتابیں نہ لکھ جاتے تو مورخین کو اسلامی ہند کی ذہنی، ادبی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے

میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں، بلکہ سبحة المرحان کے شروع میں مولنا آزاد بلگرامی نے

اس امر پر بجا فخر کیا ہے کہ ہندوستانی علما و فضلاء کے حالات کو انھوں نے پہلی مرتبہ منضبط

کیا۔ ہندوستان میں اولیاء کے تذکرے بہت تھے۔ علماء کا کوئی نہ تھا۔ سبحة المرحان اور

آثار الکرام میں اس کی کو پورا کرنے کی کوشش ہوئی۔

سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی۔ جس وقت مولانا آزاد آثار الکرام میں بزرگانِ بلگرام کا تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اس کا بن جو اہر کا ایک محل بے بہا، یمن میں جا کر چمکنا شروع ہوا تھا اور اس کی تابانی اور درخشانی نے عالم اسلام کو اس طرح مسخر کر لیا کہ شاید ہی کسی ہندی نژاد نے کیا ہوا۔

یہ فخرِ ہندوستان بزرگ، علامہ مرتضیٰ تھتے، جو یمن کے تعلیمی مرکز زبیدی میں اتنی دیر تک مقیم رہے کہ وہ بلادِ عرب میں زبیدی مشہور میں اور مصر و عرب میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ یمنی نہیں، ہندوستانی تھے۔ سید مرتضیٰ بلگرام میں پیدا ہوئے (۱۲۴۵ھ) ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد آ گئے۔ اور ملافاخر الہ آبادی سے کچھ دیر فیض حاصل کیا پھر دلی پہنچے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اس کے بعد عنقوانِ شباب میں ہی حج کے لیے مکہ معظمہ گئے اور وہاں سے زبید کا رخ کیا۔ جہاں انھوں نے مختلف بزرگوں سے تعلیم حاصل کی۔ قیامِ عرب کے دوران میں ان کی ملاقات سید عبدالرحمن بن مصطفیٰ عیدروسی سے ہوئی، جنھوں نے انھیں سلسلہ عیدوسیہ میں داخل کیا اور اب علامہ کے علمی سار کے ساتھ روحانی سوز شامل ہوا۔ مرشد کے زیرِ ہدایت انھوں نے مصر کا رخ کیا۔ اور تالیف و تصنیف کو اپنا شغل قرار دیا۔ ان کی وفات ۱۲۹۵ھ (۱۹۰۷ء) میں بحارِ صنف طاعون ہوئی۔

علامہ مرتضیٰ نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ جہاں کہ علوم و فنون میں، لیکن ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے نظیر ہے۔ ان کی ایک کتاب قاموس کی شرح تاج العروس ہے جو چودہ سال میں لکھی گئی اور بہت بڑی تقطیع کے چار پانچ ہزار صفحات کا محیط ہے، لیکن فنِ لغت سے بھی زیادہ شہرت آپ کو علمِ حدیث میں حاصل ہوئی۔ اس علم میں دوسرے سینکڑوں طالبوں کے علاوہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اول اور ترکی کے صدرِ اعظم علامہ راغب پاشا نے آپ سے سندیں اور اجازت نامے حاصل کیے۔ تصوف میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا اور نہ صرف بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے، بلکہ آپ نے امام غزالیؒ کی احیائے علوم الدین کی ایسی بلند پایہ شرح لکھی کہ مصر اور بلادِ عرب میں اصل کتاب کو

نے سرے سے مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ڈی۔ بی۔ میکڈانلڈ جس نے اسلامی دینیات کی تاریخ لکھی ہے (اور اس میں اپنی واقفیت کے مطابق ایک ہندوستانی عالم کا ذکر نہیں کیا) اہمِ حاضر کے مذہبی اور روحانی رجحانات کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے۔ ”دوسری تحریک غزالی کے اثر کا احیا ہے۔ یہ اثر کسی وقت بھی قطعی طور پر مودہ نہ ہوا تھا اور یمن میں تو شاید خاص طور پر کار فرما رہا۔ اسلامی دنیا کے اس کونے میں صوفیہ کی کئی مسلسل پلازاحت اپنا کام کرتی رہیں اور یہ اس ملک کا ایک باشندہ سید مرتضیٰ زبیدی تھا۔ جس نے احیائے علوم الدین پر ایک محرکۃ الاراد شرح لکھ کر دودِ حاضر میں اس کتاب کو نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بنا ڈالی۔ یہ

شرح بڑی تقطیع پر دس جلدوں میں چھپی ہے اور اس کے دواہیش چھپ چکے ہیں۔ چونکہ سید مرتضیٰ کے علمی کمالات پر ہندوستان سے باہر نکل کر بہلا آئی۔ اس لیے یہاں اکثر لوگ ان کے علمی پایہ سے ناواقف ہیں، لیکن اہل نظر ان کی قدر و قیمت خوب پہچانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو آثار الکرام کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ”خاکِ بلگرام میں ایک اور ایسا جید عالم ہو کر رہا ہے جسے فخرِ علمائے ہند کہنا بجا ہو گا۔ علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں علامہ سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا تذکرہ نہ ہو۔ مولانا مناظر احسن جنھوں نے علامہ کی ایک تصنیف نفحۃ قدسیہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ ”وہ مصر میں ہی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے نحوی اور آخر میں ایک مترانص، صاحبِ باطن ولی اللہ تھے۔“ تذکرہ علمائے ہند میں جہاں علامہ کی چھپا سٹھ کتابوں کے نام درج ہیں۔ مولوی رحمان علی خاں لکھتے ہیں۔ ”بالجملہ بوفور علم و نشرِ علوم بتوسط تلامذہ و تصانیف کتب کہ بہ حیثیت و سہ اکنافِ عالم را در گرفتہ۔ اگر وے لا عجز و صدی سیزدہم گویند رواست۔“

سید مرتضیٰ سے پہلے اور بعد میں کئی ہندوستانی علمائے عربی زبان میں تصنیف

وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن افسوس کہ ان کو حقیقی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ ہی ان کی تصانیف کی عرب اور مصر کے علمائے قدر دان کی اور ہندوستانی مسلمانوں کا بھی معتد بہ حصہ ان علمائے خیالات سے فیضیاب ہونے سے محروم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عام علمائے ہمارے ادبی اداروں کے بلاد اسلامی کے علمی حلقوں سے اس قدر مختصر و رابطہ ہیں اور عام طور پر ہمارے علم کو جن کی زندگیاں ہندوستان میں گزریں عربی زبان میں وہ ہمارے حاصل کرنا جو اہل زبان کا حصہ ہے۔ اس قدر مشکل ہے کہ ہیں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ سوائے چند مستثنیات کے ہمارے بہترین علمائے عربی تصانیف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیں اور عام طور پر ان کا اثر دنیا سے اسلام کی علمی زندگی پر بہت محدود رہا ہے۔ [حجۃ اللہ البالغہ اب انہر میں شامل درس ہو گئی ہے، لیکن جن مصری طلباء سے ہمیں قیام انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہوا وہ سید امیر علی کی سپرٹ آف اسلام سے تو بخوبی واقف تھے، لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا انھوں نے نام بھی نہ سنا تھا۔] لیکن سید مرتضیٰ نے ثابت کر دیا کہ ذہن ہندی تو ایسا ہے کہ جن ہندوستانیوں کو اہل زبان میں رہ کر عربی زبان حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ ان کے درمیان تصنیف و تالیف کرتے ہیں وہ اہل زبان سے بھی بازی لے جاتے ہیں اور عربی زبان میں ایسی

لے شاید ہمارے ہاں عربی کی تعلیم میں بھی کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ عام طور پر پاک و ہند میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے۔ وہ کتابی ہے اور قدیم اور ایک زندہ زبان میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم سے پروفیسر گب نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ مستشرقین کی ایک کانفرنس میں ہندوستان کے ایک صاحب اپنا مضمون عربی میں لکھ کر لائے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی زبان میں پڑھا۔ لیکن مصر شام اور دوسرے عرب ممالک کے نمائندوں نے بعد میں کہا کہ وہ اس مضمون کے سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے۔ پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ چونکہ مجھے اور میرے بعض انگریز ساتھیوں کو ہندوستانی طلبہ کے پڑھانے کا تجربہ تھا اور ان کے لب و لہجہ اور لسانی خصوصیات سے واقفیت تھی۔ اس لیے ہم تو کچھ بھی مضمون کو کسی حد تک سمجھ سکے، لیکن مسلمان عرب علماء اس سے یکسر محروم رہے۔

دسترس حاصل کر لیتے ہیں کہ بلگرامی کو خود اہل زبان جنہی سمجھتے گئے ہیں!

شیخ محمد حیات سندھی

عربی زبان میں تصنیف و تالیف میں جو شہرت علامہ زبیدی نے حاصل کی وہ غالباً کسی دوسرے ہندوستانی کو زمانہ حال میں نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ایسے ہندوستانی علمائے اتحاد و بہت سے۔ جنھوں نے مدینہ منورہ یا عرب کے دوسرے شہروں میں درس و تدریس کی محفلیں کیں اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ افسوس کہ ایسے علماء کا جہاں گناہ تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ ورنہ ان علمی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا جو ہندوستانی علمائے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈالے، لیکن اس فہرست میں بڑے بڑے برگزیدہ نام شامل ہیں خوش قسمتی سے ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ہم علمائے شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب متقی کا ذکر کر چکے ہیں اور صوفیہ میں شیخ تاج الدین سبغلی (خلیفہ خواجہ باقی باللہ) اور شیخ صبغت اللہ بروہی کے کارنامے گنا چکے ہیں جنھوں نے حجاز کو اور حجاز کے راستے باقی عالم کو نقشبندی اور شطاری سلسلوں سے روشناس کیا۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ جاری تھا جو علماء تکمیل تعلیم کے بعد حجاز متقیم ہو گئے تھے اور اپنی قابلیت اور شغف علمی کی بدولت وہاں مرجع خاص و عام بن گئے۔ ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے جن میں مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنفوان شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں متقیم ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی متقیم مدینہ اور مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے تکمیل تعلیم کی اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک جہم غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔ آپ کے شاگردوں میں میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ مولانا فاخرالہ آبادی بلکہ شیخ محمد بن عبداللہ بکری نجدی کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۳۵۷ھ میں ہوئی۔

مولوی سلام اللہ محدث شاہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیض ان کے بیٹے

شیخ نور الحق نے جاری رکھا۔ ان کے دو پوتوں شیخ سیف اللہ اور شیخ محب اللہ نے تصنیف و تالیف اور علم حدیث سے وابستگی کا سلسلہ برقرار رکھا اور بالترتیب شامل ترمذی اور صحیح مسلم کی شرحیں لکھیں۔ شیخ محب اللہ کے صاحبزادے حافظ فخر الدین نے صحیح مسلم کی فارسی شرح لکھی تھی۔ ان کے بیٹے مولوی شیخ الاسلام صدر الصدور دہلوی بھی کئی کتابوں مصنف تھے۔ جن میں صحیح بخاری کی مبسوط فارسی شرح مشہور ہے۔ مولوی سلام اللہ نے بھی حدیث کی اشاعت کے لیے بڑی کوشش کی۔ صحیح بخاری اور شامل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصول حدیث پر عربی میں ایک کتاب اور موطا کی شرح لکھی جو شاہ ولی اللہ کی شرح موطا سے زیادہ جامع سمجھی جاتی ہے۔ شیخ سلام اللہ کی وفات ۱۲۸۷ھ میں ہوئی۔

شیخ سلام اللہ کے بیٹے شیخ نور الاسلام نے حقیقت زمان و مکان پر دور رسانے لکھے تھے۔

خیر آبادی خاندان :- خیر آباد کے علمی خاندان کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ پہلے قابل ذکر بزرگ مولوی فضل امام خیر آبادی تھے جو دہلی میں صدر الصدور ہوئے۔ ان کا آمدنامہ اب بھی فارسی کے طلباء استعمال کرتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیر آبادی تھے جو غالب کے عزیز دوست اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جنگ آزادی کے بعد آپ رنگون جلاوطن ہوئے اور وہیں ۱۸۵۹ء میں فوت ہو گئے۔ آپ نے علم طبیعیات پر کئی کتابیں لکھیں اور عربی میں ایک کتاب جنگ آزادی ہند پر بھی مرتب کی تھی۔ آپ کا سلسلہ فیض مولوی عبدالحق خیر آبادی نے جاری رکھا جو رامپور میں تھے۔ وہ علامہ شبلی کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

شیعہ فرقہ کا فروغ

اٹھارھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ مغربی مستشرقین (مثلاً ہاسٹر) کا

اندازہ ہے کہ اورنگ زیب کے امرار کی اکثریت اس فرقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ اپنے عقاید پر بعضوں نے احتیاط و مصلحت کوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ جب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس احتیاط کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نئی روش میں پہلا وزیر کیس کے بیٹے اور جانشین بنے کی۔ جس نے حکم دیا کہ خطبہ جمعہ میں علی ولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اضافہ کیے جائیں۔ اگرہ۔ احمد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں اہل سنت والجماعت نے اس حکم کی مخالفت کی۔ احمد آباد میں خطیب نے اس پر عملدرآمد کیا تو ہجوم نے براہِ فرختہ ہو کر اسے تہ تیغ کر ڈالا۔ لیکن بادشاہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا تھی کہ لاہور میں صورتِ حالات بہت نازک ہو گئی۔ یہاں بادشاہ نے کئی علماء کو بحث مباحثہ کے لیے بلایا اور زور سے اپنے فیصلے کی تائید کی۔ ان علماء کے سرگروہ حاجی یار محمد تھے جو اس زمانے میں فضلاء لاہور میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو کھری کھری سنائیں۔ جب بادشاہ نے کہا کہ کیا تم میرے غضب سے نہیں ڈرتے تو انھوں نے جواب دیا کہ میری چار آرزوئیں تھیں۔ حصولِ علم۔ حفظِ قرآن۔ حج اور شہادت۔ خدا کے فضل سے پہلی تین تو پوری ہو گئیں اب رہے قسمت اگر چہ تھی بھی حاصل ہو جائے۔ یہ بحث کئی روز جاری رہی اور بالآخر بادشاہ نے تو پچانہ کے افسر کو حکم دیا کہ وہ بروز جمعہ (دوم اکتوبر ۱۷۰۱ء) بلا شاہی مسجد کے منبر سے نئے احکام کے مطابق خطبہ پڑھے، لیکن لاہور کے عوام (اور پٹھان سپاہیوں نے طے کیا کہ اس اقدام کا وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے اور قریباً ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جب جمعہ کے روز بادشاہ نے دیکھا کہ لاہور کے بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا اور سلطنت میں خطبہ کے لیے وہی طرزِ اختیار کی گئی جو عہدِ عالمگیری میں رائج تھی۔ اہل لاہور کے اس کامیاب مظاہرے کے بعد کسی مغل بادشاہ نے شیعہ عقائد کی

لے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی ظفر کی نسبت ایک زمانے میں لکھنؤ میں مشہور ہو گیا تھا کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے، لیکن جب کئی علماء و اکابر نے اس پر مواخذہ کیا تو [باقی اگلے صفحہ پر]

پشت پناہی نہیں کی۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں جونئی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بھاری اکثریت شیعہ حکام کی تھی۔ ان میں پہلی ریاست مرشد آباد کی تھی جس کی بنیاد عالمگیر کے محتہ اور محبوب دیوان بنگالہ مرشد قلی خاں نے رکھی۔ اس وسیع حکومت کے بڑے تہذیبی مرکز مرشد آباد، عظیم آباد اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تھے۔ شاہان اور وہ کے مورخ اعلیٰ (برہان الملک سعادت خان میر محمد امین نیشاپوری) کے خاندان کی پشت پناہی نظامت مرشد آباد نے کی۔ برہان الملک کے بھائی میر محمد باقر کو نظامت سے وظیفہ ملتا تھا۔ اس بھائی اور اپنے والد سے ملنے کے لیے میر محمد امین نیشاپور سے بنگالہ میں آئے اور پھر محمد شاہی دربار سے بڑا مرتبہ حاصل کر کے حکومت لکھنؤ کے بانی ہوئے۔ بالآخر لکھنؤ شیعہ حکومت اور خیالات کا بڑا مرکز ہو گیا۔ نوابان رامپور میں بھی اکثریت اہل تشیع کی تھی۔ سندھ میں ریاست خیر پور کے بانی اور رؤسا انھی خیالات کے تھے۔ ان حکومتوں کے علاوہ عام عہدوں اور جاگیروں میں بھی شیعہ حضرات کا بڑا اثر اور رُخ تھا۔ آخری مغل بادشاہوں کے کئی وزیر انھی عقائد کے تھے۔ مثلاً بہادر شاہ کا وزیر عظیم منعم خاں جس کے مشورے پر بادشاہ نے خطیبہ کے الفاظ بدلنے چاہے۔ خود اورنگ زیب کے وزیر اعظم اسد خاں اور سپہ سالار ذوالفقار خاں کے عقائد کے متعلق شبہ ہے۔ سادات بارہہ جن میں "بادشاہ گر" سید برادر علی (قطب الملک سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں) نے ایک زمانے میں بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ وزیر الممالک صفدر جنگ۔ امیر الامرا بخت خاں تو قیناً شیعہ خیالات کے تھے۔ حام عہدہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں۔ علمی اور ادبی معاملات میں حضرات شیعہ کا مرتبہ اس سے بھی بلند تھا۔ خود اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء کی تعلیم ایک ممتاز شیعہ فاضل ملا محمد سعید اشرف ماثر ندانی کے

[بقیہ صفحہ ۶۱۷]

بادشاہ نے اس افواہ کی تردید کی اور مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر عوام و خواص کو اپنے سنی ہونے کا یقین دلایا۔

سپر ذکر رکھی تھی۔ وہ مشہور شیعہ عالم مولانا محمد تقی مجلسی اصفہانی کے نواسے تھے شیعہ علماء کی مستند تاریخ نجوم السما میں ان کا اپنا علیحدہ تذکرہ ہے۔ شہزادی کی بارگاہ میں انھیں جو خصوصیت حاصل تھی اس کا کچھ اندازہ اس قصیدے سے ہو سکتا ہے جو ایران واپس جانے کے وقت پر انھوں نے شہزادی سے رخصت لینے کے لیے پیش کیا ہے

یکبار از وطن نتوان برگرفت دل در غم اگر چه فروں است اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت بہ باطن است چہ دلی چہ بیاض دلی پیش تست تن چہ بہ کابل چہ در قندھار

وطن میں قیام کے بعد وہ پھر ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت عالمگیر کی وفات ہو چکی تھی، لیکن اس کے پوتے شہزادہ عظیم الشان حاکم عظیم آباد نے ان کی بڑی قدر کی اور وہ بالآخر مونگیر میں فوت ہوئے۔ اورنگ زیب کے دربار کا سب سے کام اب شہزاد اور شاعر نعمت خاں عالی شیعہ تھا اور اس زمانے کے متعدد ممتاز شعرا کا یہی مذہب تھا۔ فارسی شعروادب میں ایک ایسے فرقے کا امتیاز جس میں کثرت سے ایرانی الاصل اہل قلم شامل ہوں عجیب نہیں۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں علم تاریخ کے میدان میں بھی یہ فرقہ پیش پیش تھا۔ علامہ شبلی نے مضامین عالمگیری میں بڑے شکایت آمیز لہجے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ عہد عالمگیری کے سب سے برگزیدہ مؤرخ شیعہ تھے اور انھوں نے اس زمانے کے واقعات جس انداز سے لکھے ہیں ان کی بنا پر عالمگیر سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ مرحوم کا یہ اظہار کئی لحاظ سے افسوسناک ہے۔ ایک تو یہ خیال کہ مستثنیات کو چھوڑ کر (عہد عالمگیری کے ذمہ دار شیعہ مؤرخین نے واقعات جانبداری سے اور اصول فن کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں، غلط ہے۔ دوسرے اہل سنت اہل علم کے لیے بھی کس قدر غصے کا مقام ہے کہ تاریخ کے فن میں عالمگیر کے طویل عہد میں ان کا ایک نامور تاریخ نگار نہ ہو۔ اردو ادب کی ابتدا اور ترقی میں بھی شیعہ اہل قلم کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری علمی اور ادبی زندگی میں شیعہ حضرات کا حصہ ان کی تناسب تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس فرقے میں کثرت سے ایسے (سادات یا ایرانی النسل) اہل

خاندانوں کی شمولیت ہے، جنہوں نے ہر میدان میں ایک بلند معیار پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شیعہ حضرات کی عقیدت و محبت کی ایک اہم بنیاد ان کا باب مدینۃ العلم ہونا ہے۔ اس لیے اس فرقے میں علم کی محبت ایک مذہبی فریضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اہل علم کا خاص احترام ہوتا ہے اور اٹھارویں صدی میں (مثلاً میر غلام علی آزاد اور دوسرے سادات بلگرام کی کوششوں میں) اس خصوصیت کے بڑے کامیاب مظاہرے نظر آتے ہیں۔

سیاسی اقتدار اور علمی اور ادبی امتیاز کے علاوہ اٹھارویں صدی میں شیعہ حضرات کا تجارتی کاروبار میں بھی بڑا عمل دخل تھا۔ بالخصوص سورت اور مگلی کی بحری تجارت میں ان کا حصہ بہت تھا۔ سورت میں دوسرے اور خوب سے تجارت میں پیش پیش تھے اور بنگالہ کے شیرازی اور اصفہانی تاجر خاندانوں کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔

حاجی محمد محسن | اٹھارویں صدی کے شیعہ اکابر میں ایک نہایت مبارک نام حاجی محمد محسن کا ہے جو ایک ایرانی تاجر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن جن کی اپنی عمر دوسرے مشاغل میں گزری اور جن کی حیرانہ کوششیں مسلمانان بنگالہ کی تاریخ کا سب سے روشن باب ہیں۔ ان کے دادا آغا فضل اللہ بہ شغل تجارت ایران سے آئے۔ پہلے مرشد آباد میں کچھ عرصہ ٹھہرے اور پھر مگلی میں اقامت اختیار کی جو کلکتے کی آبادی سے پہلے مشرقی ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا۔ یہاں ان دنوں ایک اور ایرانی اہل ثروت آغا مظہر مقیم تھے جنہیں مشرقی پاکستان کے موجودہ صلیح جسر اور بعض دوسرے علاقوں کی زمینداری اور نگ زیب کی طرف سے ملی تھی۔ آغا مظہر نے اپنے حسن انتظام سے اپنی جائیداد میں بڑا اضافہ کیا، لیکن ان کی اولاد زینہ کوئی نہ تھی۔

عمر کے آخری حصے میں ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے منوجان خانم رکھا۔ لڑکی کی عمر سات برس کی تھی جب آغا مظہر نے وفات پائی لیکن مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی تمام جائیداد بیٹی کے نام منتقل کر دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ نے آغا فضل اللہ کے بیٹے حاجی فیض اللہ سے شادی کر لی۔ ان کی واحد اولاد

(حاجی) محمد محسن ۳۰ سالہ میں پیدا ہوئے۔ محمد محسن اور منوجان خانم سوتیلے بھائی بہن تھے، لیکن بہن نے جو عمر میں آٹھ سال بڑی تھیں انھیں سکے بھائیوں سے زیادہ عزیز رکھا۔ اور تعلیم و تربیت میں بھی ان کی نگرانی کی۔ ان دونوں کے استاد مگلی کے آغا خیلاری تھے، جو نہ صرف ایک زبردست فاضل بلکہ جہانگیر سیاح تھے۔ اور انھوں نے اپنے سفر کی کہانیوں سے خرد سال محسن کے دل میں بھی سیر و سیاحت کی لگن پیدا کر دی۔ مگلی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مرشد آباد گئے اور وہاں کے مشہور مدرسے میں تکمیل تعلیم کی۔ اس کے بعد وہ مگلی واپس آگئے اور اپنی ہمیشہ کے کاموں میں اس کی مدد کی۔ اس کے بعد وہ تین بتیس کی عمر میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ واپسی پر سخت تکلیف اٹھائی۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قید کر لیا۔ ان سے گلو خلاصی ہوئی تو عراق کا رخ کیا۔ اور تحصیل علم اور عراق اور ایران کی سیر و سیاحت میں ساہماں صرف کیے اور ساٹھ سال کی عمر میں اصفہانیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ ہندوستان واپس آئے۔ دہلی لکھنؤ۔ بنارس۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد ہوتے ہوئے مگلی پہنچے۔ کبھی قیام ڈھاکہ میں رہتا۔ کبھی مرشد آباد۔ کبھی مگلی۔ بڑی سادہ زندگی تھی اور آزادانہ بسر کرتے تھے کبھی شادی نہیں کی تھی اور ایک سوتیلی بہن کے علاوہ دنیا میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ منوجان خانم کے شوہر مرزا صلاح الدین لا ولد فوت ہوئے تھے۔ انھوں نے حاجی محمد محسن کو اپنی تمام جائیداد کا مختار بنایا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انتظام کیا اور بہن نے مرتے وقت اپنی تمام جائیداد ان کے نام منتقل کر دی۔

منوجان خانم کی وفات اکیاسی سال کی عمر میں ۱۸ سالہ میں ہوئی اور ان کی وسیع جائیداد کے وارث حاجی محمد محسن ہوئے، لیکن ان کی سادہ زندگی میں ذرہ بھرق نہ آیا۔ تین سال بعد انھوں نے وہ تمام جائیداد جس کی سالانہ آمدنی اُس زمانے میں پینتالیس ہزار تھی، امور خیر کے لیے وقف کر دی۔ ذاتی مصارف کے لیے اتنی جائیداد رکھی جس کی ماہوار آمدنی سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔

حاجی محمد محسن نے ۲۰ اپریل ۱۸ سالہ کو وقف کی باقاعدہ رجسٹری کرائی اس کے

بچھ سال بعد تک وہ زندہ رہے اور یہ زمانہ انھوں نے وقت کے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھانے میں گزارا۔ ان کی وفات بیاسی برس کی عمر میں نومبر ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ قاضی القضاۃ مولوی سراج الدین علی خاں نے تاریخ لکھی۔ ع

عارف کامل زمانہ برقت

حاجی محمد حسن نے جائداد وقف کرتے وقت اس کی سالانہ آمدنی کے نو حصے رکھے تھے۔ تین حصے تو امام بارگاہی کی نگہداشت مجالس محرم اور دوسرے مراسم کے اخراجات اور فاتحہ خوانی کے لیے تھے۔ دو حصے متولیوں کے گزارہ کے لیے اور چار حصے ادارے اور وظائف کے لیے۔ لیکن واقعہ کی وفات کے بعد جانشین متولیوں نے جو بدعنوانیاں کیں اور جس طرح جعل سازی سے جائیداد اپنے نام دواچی پتہ پر لینے کی کوشش کی، اس نے بورڈ آف ریونیو کو مجبور کر دیا کہ جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اور بالآخر پریوی کونسل کے فیصلے کے بعد ۱۸۳۵ء میں گورنمنٹ نے طے کیا کہ وہ وقت کی بجا آمدی کی ذمہ داری لے۔ گورنمنٹ نے صرف ایک متولی مقرر کیا اور آمدنی کا ۱/۴ حصہ بچالیا۔ وظائف وغیرہ کے لیے جو چار حصے مقرر ہوئے تھے (اور جنہیں اہل حق کے مقرر کردہ متولیوں نے دستاویز کے مطابق صرف نہیں کیا تھا) انہیں حکومت نے عام تعلیمی اخراجات کے لیے منتقل کر لیا اور محسن فنڈ کی مدد سے ۱۸۳۵ء میں رگلی کالج قائم کیا اور سینتیس سال تک اسے محسن فنڈ کی مدد سے چلایا، لیکن مسلمان اس پر اعتراض تھے کہ ایک اسلامی وقف کو ایک ایسے کالج کے لیے کیوں استعمال کیا جائے جس سے فائدہ اٹھانے والے بیشتر غیر مسلم تھے۔ ڈاکٹر ہٹرنے "دی انڈین مسلمانز" میں با اثر طریقے سے اس استدلال کی حمایت کی۔ نوب عبد الحلیم نے بھی کوشش کی ۱۸۳۵ء میں فیصلہ ہوا کہ رگلی کالج کے اخراجات کا گورنمنٹ انتظام کرے۔ محسن فنڈ کی آمدنی ڈھاکہ چٹاگانگ۔ راجشاہی اور رگلی میں مدرسے قائم کرنے پر خرچ ہو اور کچھ حصہ مسلمان طلباء کے لیے وقف ہو۔ تاکہ جو مسلمان بنگال کے کسی انگریزی سکول یا کالج میں تعلیم پائے اس کی فیس کا دو تہائی حصہ اس فنڈ سے دیا جائے۔

حاجی محمد حسن کے مذہبی عقائد کی نسبت طبقاتِ حُسنیہ میں لکھا ہے۔ "در عقائد مذہبی طبعش بسوئے مذہب جعفری خیلے متوجہ بود۔ اکثرے سنیاں کہ ملازم اور بوند حسب ہدایت و فرمانش مذہب امامیہ اختیار کردند۔ ازاں گروہ رجب علی خاں و شاکر علی خاں متولیان سابق بوند کہ شیعہ شدند۔"

دکن کے شیعہ علما | شمالی ہندوستان میں شیعہ اقتدار کے مرکز قائم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نامور شیعہ علما ایران سے آنے شروع ہوئے یا مقامی باشندوں میں ہی فروغ پانے لگے۔ اس سے پہلے قاضی نور اللہ شہرئی اور ملا محمد زید (دی کو چھوڑ کر) شیعہ علما کے نام دکن کی شیعہ سلطنتوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً میر محمد مومن استر آبادی جو شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے اور ایک شہزادہ اقتدار کی کشمکش میں ناکام رہا تو انھیں بھی اس سے قریبی تعلقات کی بنا پر ایران پھوڑنا پڑا۔ وہ شمالی ہندوستان کے رستے دکن چلے گئے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ والی گورکنڈہ کی ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ وکیل السلطنت ہو گئے اور کوئی پچیس سال اس عہدے پر فائز رہے۔ نجوم التما کے مطابق ۱۰۲۵ھ میں وہ زندہ تھے۔ اسی طرح میر نظام الدین احمد بن محمد معصوم الحسینی شیرازی تھے۔ ان کے والد شاہ عباس ثانی صفوی کے ہاں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ جب بادشاہ کی ہمیشہ جج کھیلے گئیں تو انھیں مناسک حج کی تعلیم کے لیے ساتھ بھیجا گیا۔ کچھ اتفاقات ایسے پیش آئے کہ اس سفر میں ہی ان کی شادی اپنی شاگردہ سے ہو گئی۔ اب بادشاہ کے در سے دونوں ایران تو واپس نہ جاسکتے تھے۔ اس لیے مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں میر نظام الدین احمد پیدا ہوئے اور تعلیم پائی۔ جب ان کے کمالات کا شہرہ ہوا تو میر حجلہ نے جو ان دنوں والی حیدر آباد عبداللہ قطب شاہ کا وزیر تھا، انھیں اور نجف اشرف کے سید سلطان کو بلا بھیجا تاکہ ان عالی خاندان سیدوں سے اپنی دوستیاں بیاہ دے۔ اتفاق سے عبداللہ قطب شاہ کی دوستیاں تھیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ ان عالی النسب سیدوں سے ان کی شادی ہو۔ اس پر میر حجلہ برا فروختہ ہو کر حیدر آباد سے چلا گیا اور

اورنگ زیب سے جو ان دنوں دکن میں گورنر تھا جلالہ عبداللہ شاہ کی ایک بیٹی کی شادی میر نظام الدین سے ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنی سالی کی سید سلطان سے شادی کی مخالفت کی اور بالآخر اس لڑکی کی شادی ابوالحسن تانا شاہ سے ہوئی جو گوکنڈہ کا آخری بادشاہ تھا۔ میر نظام الدین ایک شاعر اور عالم اور شاعروں کے قدردان تھے۔ ان کی وفات ۱۶۶۸ء یا ۱۶۶۹ء میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ دکن میں آنے سے پہلے ان کی حجاز میں شادی ہو چکی تھی اور اُس سے ان کے ہاں ایک بیٹا مولانا صدر الدین علی المعروف سید علی خاں مدنی مدینے میں پیدا ہوا تھا جو علم و فضل میں اپنے باپ سے بھی بازی لے گیا۔ وہ شہنشاہ میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد والد سے ملنے حیدر آباد چلے گئے، لیکن اس کے جلد بعد عبداللہ قطب شاہ چل بسا اور اس کے ایک سال بعد ان کے والد بھی وفات پا گئے۔ اب ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین تھا۔ اس نے میر نظام الدین کے متعلقین کو درق کرنا شروع کیا۔ سید علی حیدر آباد چھوڑ کر برہان پور میں اورنگ زیب سے جا ملے، جو اب بادشاہ تھا اور معاملات دکن کو سلجھانے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ انھیں ایک اعلیٰ منصب ملا۔ اور ایک زمانے میں یہ برہان پور کے دیوان بھی مقرر ہوئے، لیکن بالآخر انھوں نے اورنگ زیب سے اجازت لی اور وطن کا رخ کیا۔ پہلے اصفہان میں سلطان حسین صفوی کے پاس پہنچے، لیکن جب اس نے کہا حقہ قدر نہ کی تو اپنے وطن شیراز کا رخ کیا۔ اور وہاں مدرسہ منصورہ میں تعلیم و تدریس میں زندگی کے باقی دن گزار دیے اور وہیں اپنے بزرگوں معتمد امیر محمد الدین محمد اور امیر غیاث الدین منصور کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مشہور شاعر خنیز جس نے ان سے اصفہان میں ملاقات کی۔ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اور نثر میں دوسری تصانیف کے علاوہ انھوں نے اپنے زمانے کے ادبوں کا ایک بیش قیمت تذکرہ سلاۃ العصر فی محاسن اعیان العصر کے نام سے عربی میں لکھا۔

مرشد آباد شمالی ہندوستان میں پہلا اہم شیعہ ثقافتی مرکز مرشد آباد

تھا۔ شروع میں اس کا نام مخصوص آباد تھا، لیکن جب مرشد علی خاں دیوان بنگالہ نے ۱۶۷۸ء میں شہزادہ عظیم الشان ناظم بنگالہ سے حقیقت کی بنا پر صوبائی دار الحکومت ڈھاکہ کو خیر باد کہا اور نئے مقام میں نکال اور دفاتر قائم کر کے اسے دیوانی کا صدر مقام بنایا تو اس کا نام بھی اپنے نام پر مرشد آباد رکھا۔ بعد میں وہ ناظم بنگالہ بھی ہو گیا اور بہار و اتر پردیش بھی اس کے تحت دے دیا گیا اور اس طرح یہ شہر بنگال، بہار، اتر پردیش کی نیم جزیرہ حکومت کا دار السلطنت ہو گیا۔ ڈھاکہ عظیم آباد اور بنگالی اس کے تابع تھے۔ افسوس کہ مرشد آباد کی ثقافتی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع کی اپنی دلچسپی بھی بہت ہے۔ اس کے علاوہ مرشد آباد شمالی ہندوستان اور مشرقی بنگال (ڈھاکہ) کے درمیان ایک ثقافتی سنگم تھا اور مشرقی پاکستان کی ثقافتی تاریخ اس کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ پھر لکھنؤ کے فروغ سے پہلے جب دہلی، نادرہ اور درانی حملوں میں برباد ہوئی تو اہل علم کے لیے بڑی جگہ بنیاد مرشد آباد تھا۔ مثلاً مشہور شاعر سوز، میر درد کے صاحبزادے آلم، فدوی دہلوی، شاہ رکن الدین عشق، اشرف علی خاں فضاں، شاہ قدرت اللہ خاں قدرت اس سلسلے میں دہلی سے مرشد آباد پہنچے۔ ان میں سے کچھ تو حالات سدھرنے پر دہلی واپس چلے گئے۔ بعض نے عظیم آباد کو ترجیح دی، لیکن شاہ قدرت اللہ کی وفات مرشد آباد میں ہوئی۔ (۱۷۹۱ء) مشہور شاعر انشا کا خاندان بھی زوال دہلی کے زمانے میں واپس گیا اور انشا خود مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ بعد ازاں دہلی واپس چلے گئے، لیکن ان کی شاعری اور شخصیت میں کئی عناصر ایسے ہیں، جن میں مرشد آباد کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

ہماری تہذیبی تاریخ میں مرشد آباد کا ایک خاص مقام ہے، لیکن شیعیت کی تاریخ میں مرشد آباد (اور اُس کے ثقافتی جانشین عظیم آباد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ بد قسمتی سے اب نظامت بنگالہ کی مذہبی تاریخ کے متعلق مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ فقط سیر المتاخرین میں غلام حسین خاں طباطبائی نے علی ویردی خاں کی وفات کے سلسلے میں چند شیعہ علماء و مشائخ کے نام گناے ہیں اور تذکرہ گلشن ہند میں اس علاقے کے

اُردو شعر کے نام ملتے ہیں۔ سیر المتاخرین میں بعض اہم نام مصنف کے اپنے خاندان کے ہیں۔ مثلاً اس کے دادا سید علیم اللہ طباطبائی جو ۱۲۸۷ھ میں عظیم آباد آئے اور ۱۳۲۷ھ میں وہاں وفات پا گئے۔ ان کے حالات اور کرامات پر غلام حسین خاں نے ایک علیحدہ مثنوی بشارت الاقمت کے نام سے لکھی ہے۔ شاہ حیدری اس کی حقیقی دادی کے چچا تھے۔ ”در تشیع نہایت مجاہد و بے باک“۔ وہ بھاگلپور میں مقیم تھے۔ جب یہاں پر ایک رئیس محمد خوش خاں سخت بیمار پڑے۔ شاہ حیدری ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم شیعہ ہونے کا وعدہ کرو۔ میں تمھاری شفا کا ذمہ لیتا ہوں۔ انھوں نے قبول کیا۔ اتفاق سے وہ اچھے ہو گئے اور تمام عمر شاہ حیدری کے حلقہ گویش رہے۔ بعض علما باہر سے آئے تھے اور بعض نے یہاں سے ایران جا کر تعلیم حاصل کی۔ مثلاً شیخ محمد حسن جو مشہور شاعر حزیں کی طرح ایران پر افغانوں کے غلبے کے بعد ہندوستان آئے۔ میر قاسم ناظم بنگالہ نے انھیں عظیم آباد میں زمین عطا کی۔ جہاں ان کا مزار ہے۔ سب بزرگ و با اثر علماء مرید محمد علی تھے۔ جن کی بیدایش دکن میں ہوئی، لیکن تعلیم ایران کے علما سے کبار سے حاصل کی۔ حج کے لیے مکہ معظمہ جا رہے تھے کہ جہاز طوفان میں تباہ ہو گیا اور یہ سندھ کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد۔ سورت۔ اورنگ آباد۔ ہنگلی۔ لکھنؤ۔ عظیم آباد ہوتے ہوئے پھر حج کو گئے اور حج اور زیارتوں کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ سراج الدولہ نے ان کی قدر نہ کی بلکہ مکان سے نکال دیا۔ لیکن علی ویردی خان ان کا کڑا انداز و محقق تھا۔ اس کے چچا حاجی احمد کا ایک بیٹا سراج الدولہ کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے برہنہ پاؤں کی خدمت میں پہنچا اور دریا کے کنارے ایک مکان ان کی اقامت کے لیے نذر کیا۔ سید محمد علی نے یہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مقفے عربی میں قدیم محققین و عرفا کے طریقے پر حضرت نجم الدین پاک کے حالات لکھے اور ملا محسن کاشانی کی علم فقہ کی دو کتابوں کی عربی اور فارسی شرح لکھی۔ علم نحو میں بھی ایک نامکمل فارسی رسالہ لکھا اور انھوں نے اصفہا کے کئی نسخے جمع کر کے تحقیق و مقابلہ کے بعد ایک

صحیح نسخہ مرتب کیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف ۱۲۸۰ھ میں عظیم آباد سے کلکتے جاتے ہوئے مرشد آباد ٹھہرا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مرشد آباد کے بیشتر اکابر سید محمد علی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے۔

جن مقامی علما نے ایران میں تعلیم حاصل کر کے امتیاز حاصل کیا۔ ان میں شیخ پورہ (بہار) کے مولوی نصیر اور ان کے صاحبزادے تھے۔ جس زمانے میں امیر الامرا شاہ علی حاکم بنگالہ تھے، اس وقت یہاں ایران سے اخوند ملا شاہ محمد شیرازی تشریف لائے، لیکن جلد واپس چلے گئے۔ مولوی نصیر تحصیل علم کے لیے ان کے ساتھ ایران روانہ ہوئے۔ اور ان کی سواری کے ساتھ پاپادہ چل کر ہر روز سبق حاصل کرتے۔ ایران میں وہ چوٹی کے علما کی خدمت میں پہنچے اور فقہ و احادیث اور علوم دینیہ بالخصوص ہدیت ہند سے اور حساب میں امتیاز حاصل کیا۔ ایران میں ان کی بڑی عزت تھی، لیکن وہ ہندوستان واپس آئے اور عظیم آباد میں مقیم ہو گئے۔ ان کے بیٹے داؤد علی خاں ان سے تعلیم حاصل کر کے ان کے بانشین ہوئے۔ کچھ دیر بعد زیارتوں کے لیے گئے اور اس میں اتنا شغف حاصل کیا کہ ان کا لقب ہی زائر حسین خاں ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد حسن ہوئے۔ مرشد آباد میں ایک قابل ذکر ہستی قاضی غلام مظفر کی تھی، جنھیں علی ویردی خان نے اپنا داروغہ عدالت مقرر کیا تھا۔ ”مرد خوش تقریر با کثرت فنون علمی ماہر و در نظم و نثر سلیقہ لائق داشت“۔

شاہان اسلام کا عام دستور رہا ہے کہ خواہ دلی لگاؤ کی خاطر خواہ عوام میں اپنی علم نوازی کا سکہ بٹھانے کے لیے علما سے خاص امتیاز کرتے۔ بلبن بایں ہمہ طنطنہ و تکبر پورے کو کبیر شاہی کے ساتھ برگزیدہ علما کے گھر جاتا۔ علما کو تمام شاہی دعوتوں میں بلانے اور ان سے علمی اختلاط کے لیے وقت نکالنے کا رواج تو عام تھا۔ مرشد آباد میں بھی اس پر عمل درآمد تھا۔ علی ویردی خان کے مصروف نظام اوقات میں علمی مجالس کے لیے بھی وقت تھا۔ جب وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتا تو علمی اور دینی مجلس برپا ہوتی۔ اقبال و ابراہیم سید الافاضل میر محمد علی فاضل اوام الشہرہ و تقی قلی خاں و حکیم ہادی خاں و

مرزا محمد حسین صفوی وفا خیلے دیگر ملتان (جس کا نام مؤلف سیر المتاخرین کو یاد نہیں رہا) دیوان خانے میں تشریف لاتے سید محمد علی کا اس محل میں جو احترام ہوتا وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیوان خانے میں ناظم کی مسند کے بالمقابل ان کے لیے مستقل مسند رکھی تھی جس پر ایک بڑا نگہ پڑا ہوتا۔ جب وہ باہر کے دروازے میں داخل ہوتے اور چوبیسے پر قدم رکھتے۔ علی ویردی خاں اپنی مسند پر کھڑا ہو جاتا اور جب چوبیسے اور صحن کا فاصلہ طے کر کے وسیع ایوان عمارت میں داخل ہوتے تو بعد وفا خیلے کے باوجود علی ویردی خاں مسند سے اتر کر ان کو باادب سلام کرتا۔ وہ جواب دیتے اور اپنی مسند معینہ پر جا بیٹھتے۔ اس وقت علی ویردی خاں اپنے پہلو سے ایک تکیہ کوچک ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ پھر علما کے لیے حقے لائے جاتے اور قہوے کا دور شروع ہوتا۔ علی ویردی خاں حقہ نہیں پیتا تھا، لیکن قہوے میں شریک ہوتا۔ ابتدائی مراسم ختم ہو جاتے تو فاضل ملتان کے سامنے تکیہ دھرا جاتا۔ جس پر امامیہ مذہب کی ایک نہایت اہم کتاب رکھی جاتی۔ وہ اس میں سے چند اجزا پڑھتے جن کی تشریح و تعلیم سید محمد علی کرتے۔ پھر علمی اور دینی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ دو گھنٹے تک یہ مجلس قائم رہتی۔ پھر سید محمد علی رخصت ہوتے اور اسی احترام و مراسم کے ساتھ جن سے ان کا خیر مقدم ہوا تھا، علی ویردی خاں انھیں خیر باد کہتا۔ آہستہ آہستہ دوسرے علما تشریف لے جاتے اور یہ مجلس ختم ہوتی۔

مرشد آباد کے تمدن میں فقط خوبیاں اور نیکیاں ہی نہ تھیں۔ جو باتیں دوزخ وال میں قائم شدہ اکثر شخصی ریاستوں میں عام تھیں، مرشد آباد ان سے مستثنیٰ نہ تھا، لیکن مرشد قلی خاں جو ۱۲۷۱ھ تک برسر اقتدار رہا اور علی ویردی خاں جو ۱۲۷۲ھ سے ۱۲۷۵ھ تک ناظم تھا، دو بڑے قابل اور منظم حاکم تھے اور انھوں نے مرشد آباد کو ایک اہم سیاسی اور ثقافتی مرکز بنادیا تھا۔

مرشد آباد کے ساتھ ساتھ عظیم آباد کا ذکر بھی واجب ہے جو ۱۲۷۳ھ میں مرشد آباد کے تابع آگیا۔ لیکن اپنے محل وقوع اور مرشد آباد

کے تیز سیاسی زوال کی وجہ سے زیادہ اہم اور پائدار ثقافتی مرکز ثابت ہوا۔ اس کی اہمیت اس وقت شروع ہوئی جب ۱۲۸۰ھ میں شہزادہ عظیم الشان حاکم بنگالہ نے ڈھاکہ کی جگہ پٹنہ کو اپنا صدر مقام چن کر کئی عمارتوں اور محلوں کا اضافہ کیا اور شہر کا نام اپنے نام پر عظیم آباد رکھا۔ بعد میں ناظم بنگالہ کا دار الحکومت مرشد آباد ہوا، لیکن یہاں کا ناظم یا نائب ناظم عظیم آباد میں رہتا تھا اور شہر کا ثقافتی تسلسل برقرار رہا۔ مرشد آباد کے اثر سے یہاں کئی اہم شیعہ خاندان آباد ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔ لیکن اس معاملے میں یہاں کیفیت مرشد آباد سے کسی قدر مختلف رہی اور یہ محض اتفاق نہیں کہ نادری حملہ کے بعد جب دہلی کے شاعر اور ادیب منتشر ہوئے تو منظر جانجناں کے اکثر نامور تلامذہ و مرید جن میں سے بعض مثلاً ہدایت قلی خاں حسرت۔ میر محمد باقر حریج محمد فقیہ دردمند اساتذہ فن میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ مرشد آباد نہیں گئے۔ عظیم آباد آئے۔

عظیم آباد کی ثقافتی تاریخ لکھنا یہاں ممکن نہیں۔ صرف چند اہم ناموں کو گنایا جاسکتا ہے۔ شاید ان میں سرفہرست سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین خاں طباطبائی کا نام ہے۔ ان کے والد علی ویردی خاں کے قرائد ارتقا تھے اور کچھ دنوں عظیم آباد میں صوبدار رہے، لیکن بیٹے کا اسل طرہ اختصار سیر المتاخرین کی تصنیف ہے۔ اس میں کئی فنی نقص ہیں مصنف کا تعصب مذہبی تو صاف ظاہر ہے۔ لیکن خلوص کے عہدہ وال کی اس سے زیادہ مکمل تاریخ کوئی نہیں۔ مصنف کی معلومات وسیع تھیں اور نگہ غائر اور نئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاموں اور اصولوں پر انھوں نے جس تیرات اور معاملہ فہمی سے تبصرہ کیا ہے، وہ اسلامی ہندوستان کے سیاسی ادب میں دسترید کے اسباب کی طرح ایک محرک کی چیز ہے۔ انھوں نے اپنے دادا شاہ علیہ اللہ ولہی کے حالات میں ایک مثنوی بشارت الامت اور مثنوی مولنا روم کی ایک شرح بھی لکھی۔

جو مرتبہ طباطبائی کا سیاسی تاریخ نگاری میں ہے، قریب قریب وہی رتبہ نواب علی ابراہیم خاں کا ادبی تاریخ میں ہے۔ ان کے ادبی اور سیاسی کارناموں کا ابھی صحیح

عظیم آباد

جائزہ نہیں لیا گیا، لیکن وہ ایک غیر معمولی شخصیت اور مستعدی کے انسان تھے۔ وہ عظیم آباد کے قریب شیخ پورہ میں پیدا ہوئے۔ مرشد آباد میں نشوونما پائی۔ وہ ایک زمانے میں عظیم آباد کے نائب ناظم ہو گئے اور میر قاسم کے وزیر باقاعدہ سیر اس زمانے میں تھے، جب وہ انگریزوں سے برسرِ پر خاش تھا۔ اس کے باوجود انگریز ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ آخر میں وہ مرشد آباد میں خانہ نشین ہو گئے تھے (تذکرہ مسرت افرا) لیکن ۱۸۸۱ء میں جب وارن ہسٹنگز کلکتہ سے مغرب کی طرف تسخیر ممالک کے لیے چلا تو راستے میں مرشد آباد سے نواب علی ابراہیم خاں کو "بصد اعزاز و اکرام" اپنے ساتھ لیا اور جب راجا چیت سنگھ والی بنارس کو برطرف کیا تو نواب ابراہیم کو عدالت دیوانی ضلع بنارس کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں وہ وہاں کے گورنر بھی رہے۔ قیام بنارس کے دوران میں انھوں نے ادبی اور سیاسی تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کی مشہور ترین تصنیف اردو شعرا کا تذکرہ گلزارِ ابراہیم ہے جس کا اردو ترجمہ گلشنِ ہند انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ مرشد آباد میں لکھا گیا۔ مرشد آباد اور عظیم آباد کی ادبی تاریخ جاننے کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ فارسی شعرا کا تذکرہ صفحہ ابراہیم انھی خوبیوں کا مخزن ہے جو اردو تذکرے کا ماہر الامتیاز ہیں۔ لیکن یہ زیورِ طبع سے محروم ہے۔ خلاصۃ الکلام مثنوی نگار فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ کئی تاریخی کتب اور "خطوط" ان سے یادگار ہیں ۱۸۹۳ء میں بمقامِ بنارس وفات پائی۔ نواب کی دیور بھی کے نام سے ایک محلہ اب تک ان کے نام سے وہاں آبلو ہے۔

اٹھارہویں صدی میں عظیم آباد کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہاں کے بعض ہندو کائستھر دوسا کا فروغ ہے جنھوں نے اردو ادب کی سرپرستی کی۔ مثلاً مہاراجا شتابے جو عظیم آباد کے نائب صوبہ اور مرشد آباد کے نائب دیوان تھے۔ ان کے دربار سے اشرف علی خاں غانا جیسے شاعر وابستہ تھے۔ بڑے انقلابوں کے بعد ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے مہاراجا کلیان رائے عاشق بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

ان سے پہلے میر جعفر کے زمانے میں مہاراجا رام نرائن موزوں عظیم آباد میں ناظم تھے۔ وہ فارسی میں حزین کے شاگرد تھے اور اردو میں بھی صاف خوشگوار شعر کہتے تھے۔ میر قاسم نے انھیں معزول کر کے ۱۸۶۳ء میں گنگا میں غرق کر دیا۔

عظیم آباد کی دوسری ادبی ہستیوں میں راسخ تھے جنھیں بہار کا میر کہا جاتا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔ ان کے ہمصر بلکہ پیشرو شاہ رکن تھے۔ انیسویں صدی کی قابل فکر ہستیوں میں شاہ الفت حسین فریاد تھے جو ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں وفات پا گئے۔ ۱۸۳۸ء میں وہ مرشد آباد چلے گئے۔ اور مرشد نرادوں کے مالق مقرر ہوئے۔ چار سال بعد وہ ناظم مرشد آباد کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتہ گئے اور ۱۸۶۴ء تک وہیں رہے۔ ان بتیس سالوں میں وہ سولہ برس تک عہدہ سفارت پر مامور رہے۔ بعد میں استعفیٰ دے دیا، لیکن کلکتہ میں علمی اور ادبی زندگی میں ان کا بڑا مقام تھا۔ انھوں نے فارسی زبان میں کئی اخبارات مثلاً آئینہ گیتی نما نکالے۔ اکابر کلکتہ ان کا بڑا ادب کرتے تھے، بلکہ اکثر مثلاً خان بہادر عبداللطیف بانی محکم طبری ایسوسی ایشن۔ عبیدی سہروردی۔ مولانا عبدالرؤف وحید آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری (حیات فریاد) آپ کے فخر استاد شاہر جناب شاد عظیم آبادی نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے ۱۹۲۶ء میں مکمل کی۔ فی الحقیقت یہ کتاب عظیم آباد۔ مرشد آباد۔ کلکتہ کی علمی اور ادبی زندگی کا مرقع ہے۔ شاد خود متعدد تاریخی اور ادبی کتب کے مصنف اور ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

انیسویں صدی میں بہار کے جن بزرگوں نے نام پایا، ان میں صفیر بلگرامی تھے، جو اگرے میں بس گئے تھے اور دوسری کتب کے علاوہ جلوہ خضر کے مولف تھے۔ ان کے علاوہ فرد۔ میر وزیر علی جبرتی۔ شاہ فرزند علی مثنوی۔ سید شاہ امین احمد فردوسی شوق۔ آغا حسین قلی عاشقی مولف تذکرہ نشتر عشق بھی قابل یاد ہیں، لیکن شاید بہار کا اس صدی کا سب سے اہم ثقافتی کارنامہ یانکے پور لائبریری کا قیام ہے۔ جس کا آغاز خان بہادر مولوی خدا بخش کے والد نے کیا تھا، لیکن جسے انھوں نے بے انتہا

ان کی خدمت میں پہنچے اور فقہ و حدیث و اصول کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مشہد گئے اور وہاں کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ ہندوستان واپس آکر اہل و عیال کو لکھنؤ لایا اور یہیں اپنے آپ کو تصنیف و تالیف اور اشاعت و تہذیب شیعیت کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں فیض آباد میں (جو لکھنؤ کے فروغ سے پہلے کچھ عرصہ تک اودھ کا دار الحکومت رہا) ملا محمد علی کشمیری کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ ملا عبد الحکیم کشمیری کے شاگرد تھے اور کشمیر سے آکر فیض آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی زیادہ توجہ علم فقہ پر تھی۔ انھوں نے فضیلت نماز جماعت پر ایک رسالہ لکھا جس میں نواب آصف الدولہ کی توجہ اس طرف دلائی کہ اس کے ملک میں مولانا سید ولداری علی حبیب الدین اور مجتہدین کر بلا و مشہد کا مانا ہوا عالم موجود ہے جو پیش نماز ہونے کے ہر طرح لائق ہے۔ اگر نواب نماز پنجگانہ اس کے پیچھے پڑھیں تو ہر جگہ نماز باجماعت کا رواج ہو جائے گا۔ نواب نے ملا محمد علی کشمیری کا یہ مشورہ قبول کیا اور مولانا ولداری علی کو نماز جماعت میں پیش امام بننے پر آمادہ کر لیا اور اودھ میں ایک نئی مذہبی زندگی کا آغاز ہوا۔

مولانا ولداری علی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً مرآۃ العقول (مطبوعہ بیجاوا اسلام) جو پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی گئی۔ پہلی جلد مباحث توحید کے متعلق دوسری مباحث عقل اور متعلقہ مسائل کے بیان میں تیسری نبوت۔ چوتھی امامت اور پانچویں معاد و جہان و روحانی کے متعلق تھی۔ نجوم السما میں لکھا ہے ”الحق کتابیت کہ گوش فلک نظیرش نشیدہ و چشم روز کا عدیش ندیدہ“ اساس الاصول بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس کتاب ہے۔ ان دو کے علاوہ آپ نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبد العزیز دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے مختلف ابواب و بیانات کی تردید میں لکھیں۔ تصوف کے مخالف تھے۔ شہاب ناقب میں آپ نے مذاہب مبتدعہ صوفیہ پر نکتہ چینی کی ہے اور ان مشہور صوفیہ کی تردید کی جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس مستقل کتاب کے علاوہ آپ نے مولوی محمد سمیع صوفی کے جواب میں ایک رسالہ لکھا۔

وسعت دے کر اسلامی دنیا کا ایک اہم کتب خانہ قائم کر دیا اور ۱۸۹۰ء میں اسے وقف کیا۔ اسی صدی میں عظیم آباد کے محلہ صادق پورہ نے شہرت پائی جو مولانا سید احمد شہید بریلوی کے سفر عظیم آباد (۱۸۶۱ء) کے بعد دینی اور علمی سرگرمیوں کا بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ ان دینی سرگرمیوں کا ذکر ہم مہج کوثر میں کریں گے۔ علمی حیثیت سے اس مرکز کے نمائندے حکیم مولانا عبد الحمید پریشان تھے جن کے والد ماجد مولانا احمد اللہ صاحب کو ۱۸۶۵ء میں جس دوام مجبور و ریاضے شوری کی سزا ملی تھی۔ حکیم صاحب کا علمی فیض ان کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین عظیم نے جاری رکھا جن کے بیٹے ڈاکٹر حکیم الدین احمد اردو تنقیدی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ کے اکابر شیعہ علما

شمالی ہندوستان میں شیعیت کا سب سے اہم مرکز لکھنؤ ہے۔ وہاں کی ادبی اور ثقافتی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شیعہ علما پر بھی مستقل کتابیں ممتاز لکھنؤی اہل قلم نے لکھی ہیں، لیکن ان کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی۔ اور شیعہ علما کے حالات سے عام طور پر بے خبری ہے۔

مجتہد العصر مولانا ولداری علی صنا | شیعہ علما میں سب سے اہم مولانا سید ولداری علی صاحب تھے۔ وہ ہندوستان کے پہلے مجتہد تسلیم کیے جاتے ہیں اور نجوم السما میں لکھا ہے کہ ان علاقوں میں جو کوئی شیعہ مذہب کا چرچا ہے۔ وہ ان کی بدولت ہے (وآنچه دریں دیار قدرے از دین و اسلام است۔ ہمہ از برکات اینجناب غفران مآب است) انھوں نے پہلی مرتبہ شمالی ہند میں شیعہ جماعت کی مذہبی تنظیم کی۔ ان کی علاوہ نماز جمعہ اور باجماعت نماز کا سلسلہ شروع کیا اور اشاعت و ترویج شیعیت پر لڑی توجہ کی۔ وہ نصیر آباد میں ۱۳۵۳ھ پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے فضلاء سے علوم عقلیہ حاصل کرنے کے بعد وہ عراق شریف لے گئے اور تکمیل تعلیم کا کوئی دقیقہ فروگذاست نہ کیا۔ کربلا سے پہلے اور نجف اشرف میں جو مشہور مساتذہ تھے

جس میں تصوف کا بطلان کیا ہے اور شیعہ علما کو اس سے پاک ثابت کیا ہے۔ ان کے علاوہ کئی رسالے فقہی مسائل کے متعلق تھے۔ مثلاً رسالہ ذہبیہ جو ظروف ذہبی کے احکام کے متعلق ہے۔ رسالہ الرضیٰ جن میں اطلاق وارضیٰ اور ان معاملات کے جو کفار ہندو وغیرہ سے پیش آتے ہیں مسائل بیان ہوئے ہیں وغیرہ۔ مولانا دلدار علی نے ۴ مئی ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔ مزار لکھنؤ میں ہے۔

سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر۔ مولانا دلدار علی صاحب کے کام کی اہمیت صرف ان کی تصانیف اور ذاتی تنظیمی کوششوں میں نہیں، بلکہ ان کے تلامذہ اور فرزندوں نے ان کا کام جاری رکھا اور اس کی بنیادیں گہری اور پختہ کر دیں۔ ان کے شاگرد تلامذہ میں سے مفتی سید محمد قلی خاں کنتوری۔ مرزا محمد خلیل زائر۔ سید احمد علی الحمد آبادی اور میر مرتضیٰ کے نام ایسے جلتے ہیں۔ مولوی یاد علی نے جو آپ کے چچے بھائی اور شاگرد تھے، کلام مجید کی فارسی تفسیر شیعہ نقطہ نظر سے لکھی، لیکن آپ کا اصل فیض آپ کے فرزندوں نے جاری رکھا۔ ان میں سب سے بڑے اور والد کے جانشین اور موصی سلطان العلماء مولانا سید محمد تھے۔ مرجع خلافت در ریاست دینی و دنیوی بود۔ شاہان اودھ کے عہد میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنی ممالک میں شیخ الاسلام کا ہوتا ہے۔ شاہان اودھ کی رسم تاج پوشی کے وقت سلطان العلماء ہی ان کے سر پر تاج رکھتے۔ مملکت کے تمام شرعی اور مذہبی امور آپ کی رائے سے طے پاتے۔ محکمہ افتا آپ کے سپرد تھا اور آپ کی سفارش پر ہی مفتی اور اس محکمہ کے دوسرے ملازم مقرر ہوتے۔ آپ کے شاگردوں میں سے ایک مدرسہ شاہی قائم کیا گیا۔ بادشاہ آپ کی رائے کا بڑا پاس کرتے اور وہ اپنا اثر و رسوخ شیعہ ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے اور شیعہ مذہب کی اشاعت و تقویت کے لیے استعمال کرتے۔ غالب کے فارسی خطوط پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسے شاہان اودھ سے عطیہ اس وقت وصول ہوا، جب اس نے سلطان العلماء کو اپنا وزیر و واسطہ بنایا۔ اور جب بہادر شاہ نے غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھو کر اپنی شیعیت کی تردید کرائی تو غالب کو مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد صاحب کے سامنے اس کے لیے

جواب دے ہونا پڑا۔ اس خاندان کے ساتھ غالب کے خاص مراسم تھے۔ جب سلطان العلماء کے بھائی سید العلماء سید حسین نے وفات پائی تو غالب نے ایک بڑا پیر در و مزیہ لکھا۔

گشت داغ غم حسین علی
تازہ در ماتم حسین علی

جس دبدبے اور اخلاقی جرأت کے انسان سلطان العلماء تھے، اس کا اندازہ اس کے ہو سکتا ہے کہ جب چند روز کی رہت روی کے بعد واجد علی شاہ عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا تو مجتہد العصر نے اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا، لیکن واجد علی شاہ نے اصرار کیا کہ یا تو خود یہ فرائض بجالائیں یا اپنے خاندان سے کسی دوسرے کو نامزد کریں اور فرقہ امامیہ کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی تو مجتہد العصر کو استعفیٰ واپس لینا پڑا۔ (۱۸۴۸ء) ہنومان گڑھی کے واقعہ پر بھی آپ نے مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولوی سعد اللہ سے زیادہ جرأت ایمانی کا ثبوت دیا اور لکھا "قصاص مسلمانان از کافران و قصاص کلام اللہ و بنا نہادین مسجد بر حکام وقت بہ تجویز حاکم شرع واجب است" (تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۲۷ و ۲۳۶) شاہان اودھ (بالخصوص امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ) کے زمانے میں سلطان العلماء کو جو اقتدار حاصل تھا۔ وہ ان کے والد بزرگوار کے جتنے میں بھی نہ آیا، لیکن ان کے جتنے میں تلخ لمحے بھی زیادہ تھے۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور جنگ آزادی کے بعد جب لکھنؤ پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہوا۔ تو آپ کو لکھنؤ سے ہجرت کر کے قریب کے ایک قصبہ میں پناہ لینا پڑی اور اپنے خاندان اور عیال و اطفال کے ساتھ تشویش اور پریشانی کا ایک پر آشوب زمانہ دیکھنا پڑا۔

آپ کی وفات ۲۴ جولائی ۱۸۶۷ء کو ہوئی اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تحفہ ثنائی عشریہ کے ایک حصہ (باب امامت) کا بھی آپ نے جواب لکھا جو نظر ثانی نہ ہو سکنے کے باعث شائع نہ ہوا۔ لیکن ایک رسالہ اس

کئی شیعہ اہل الرائے مستحق نہیں۔ مثلاً حیات فریاد میں سید علی محمد شاہ صفوی بادشاہوں کی ان سوشلسٹوں کا ذکر کرتے ہوئے جو سیاسی اور دوسری مصلحتوں کی بنا پر انھوں نے تصوف کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے لیے کیں کھتے ہیں :-

”اس شیعہ گروہ علماء ریاضت، متصرفین، بادیہ و دیانت کے مشاڈا لیتے اور ان کی بڑ

بنیاد کھود ڈالنے کے لیے ایک زمانہ میں جبکہ شاہ سلطان حسین صفوی بادشاہ ایران تھا اور

جناب علامہ علی قاضی القضاۃ تھے، بارہ سو فاضل صرف اس امر کی تحقیق میں سرگرم تھے کہ

دریافت کریں کہ کون انبیاء و ریاضیات میں مشغول ہے تاکہ اس کی تردید کریں۔ علماء

ظاہر و خریج محض کا نہایت سختی سے براؤ تھا۔ طہارت جسمانی کے آگے طہارت باطن کا

دھیان اور خیال تک نہ رہا تھا۔ ان باتوں کی طرف متوجہ تھے کہ یوں ہاتھ کو غوطہ دو اور

یوں پاؤں کا مسح کرو۔ اور اس قسم کے باتوں میں بل کی کھال کھینچی جاتی، اصل بڑھاپہ باطن

و صفائی طلب کیے خیال کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہندوستان کی شیعہ جماعت تو تابع اور شاگرد

علماء عراق و ایران کے ہے۔ یہی حالت ہندوستان بھر کے شیعوں کی ہو گئی کہ باطنیت کا

کہیں نام تک نہیں رہا۔ بقول جناب آقا احمد مجتہد بہانی کے شاخ کو پکڑ لید اور جو کھو

ڈالی۔ جس زمانے میں جناب غفران مآب مولانا سید ولید علی منظور تحصیل علوم دینی کے لیے عراق

تشریف لے گئے تھے تو علماء باطن میں سے ایک بھی عراق و ایران میں نہ تھا اور اگر کوئی ہوگا

تو بالکل پوشیدہ پہاڑوں میں چھپا ہوگا۔ حضرت غفران مآب جو سبق وہاں سے پڑھ آئے تھے

یہاں کے شیعوں نے طوطوں اور میناؤں کی طرح بٹھنے شروع کیے۔ پھر انیس مرحوم کے

اس مصرعہ کو جس پھول کو سونگھتا ہوئی بویتری ہے یہ خلاف خریجیت کیوں نہ سمجھا جاتا۔

راقم موجودہ شیعوں کے اعتقادات کو ہرگز برا نہیں جانتا، جو ظاہر شرع کے مطیع و

معتد ہیں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تصوف ہر مذہب کی روح و جان ہے۔ اگر اس کو نکال دیا

تو مذہب بے روح ہو کے رہ گیا۔

سید علی محمد خود شیعہ تھے۔ اس لیے ہم نے ان کی رائے کو تفصیل سے نقل کر دیا لیکن

تصوف کے متعلق یہ رائے ان تک محدود نہیں۔ ہندوستان میں تصوف کا رنگ عام طور پر

کتاب کے بعض اندراجات کی تردید میں عام طور پر ملتا ہے۔ ایک رسالہ فوائد نصیریہ کے نام سے آپ نے احکام زکوٰۃ خمس کے متعلق لکھا اور غالباً آپ کے اثر سے ہی شاہان اور دہلی میں پہلی مرتبہ امجد علی شاہ نے باقاعدہ زکوٰۃ دینی شروع کی جو تین لاکھ سالانہ کے قریب تھی اور آپ کی نگرانی میں محتاجوں اور مستحقوں کو نصیب ہوتی۔

آپ کے جانشین آپ کے صاحبزادے سید ابوالحسن ہوئے جنھیں امجد علی شاہ

نے مکیا برج کے قیام کے دوران میں ملاذ العلماء اور حکومت انگلشیہ نے شمس العلماء کا

خطاب دیا۔

سید ولید علی صاحب کے دوسرے بیٹے بھی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ سید علی

۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور عراق میں تعلیم پائی اور تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس

میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے کئی مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیا اور واقعہ فداک۔

متحدہ۔ جواز تعزیر داری کے متعلق رسائل لکھے۔ لیکن ان کا اہم ترین کام کلام مجیدی اردو زبان

میں تفسیر ہے جو دو جلدوں میں مکمل ہوئی اور امامیہ نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ تفسیر کی تکمیل

کے بعد وہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ زیارتوں کے لیے عراق کی طرف روانہ ہوئے

اور اس سفر کے دوران میں ۱۲۸۶ھ میں کربلائے معلیٰ میں وفات پا گئے۔ ایک اور

صاحبزادے سید حسن تھے۔ انھوں نے اصول دین پر دوسری کتب کے علاوہ اردو

زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھی۔ ان کی وفات ۱۲۸۶ھ میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔

پانچویں صاحبزادے سید ہمدی تھے۔ وہ تیس برس کی عمر میں اپنے والد کی زندگی ہی

میں وفات پا گئے۔ مولانا ولید علی کو اس ہونہار بیٹے کی جوانمردی کا بڑا رنج ہوا جس کا

اظہار انھوں نے ایک کتاب مسکن القلوب میں کیا ہے۔

مولانا سید ولید علی اور ان کے خاندان کی

لکھنوی شیعیت کی خصوصیات

شمالی ہندوستان میں اثناعشری خیالات

کی عظیم اشاعت میں قریب قریب وہی حیثیت ہے جو عام مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ

اور ان کے خاندان کی ہے۔ لیکن تصوف کی جس طرح مولانا نے مخالفت کی۔ اس سے

اس طرح چھایا ہوا ہے کہ شیعہ حضرات بھی اس سے پوری طرح آزاد نہیں مغربی پاکستان بالخصوص سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں کئی صوفی خانوادے ایسے ہیں جن کے بزرگ شیعہ خیالات کے ہیں۔ خود دہلی میں غالب شیعہ تھا اور مولانا دلدار علی کے خاندان سے اس کے خاص مراسم تھے، لیکن وہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور حشمتی خاندان کے ایک بزرگ کا مرید تھا۔ خاص طور پر مفتح اور ثقبہ حلقوں اور مرکزوں کے باشرعیت اور تصوف کے اس امتزاج نے فرقہ وارانہ اختلافات کم کر دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ عظیم میں بالخصوص ان علاقوں میں جو اب پاکستان میں ہیں، شیعہ سنی تعلقات خوشگوار رہے ہیں۔

دوسرے علمائے شیعہ مولانا سید دلدار علی کے خاندان کے علاوہ اس زمانے میں کئی اور نامور شیعہ علمائے تھے۔ ان میں ملا محمد علی کشمیری کا ہم ذکر کر چکے۔ ایک اور سرگرم شیعہ بزرگ مرزا محمد کمال بن عنایت احمد خاں کشمیری مقیم دہلی تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب تھے، لیکن شیعہ سنی مباحث میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے ان کی تحفہ اثنا عشریہ سے پہلے ہی بخش ہو کر تھی اور جب یہ کتاب عام ہوئی تو مرزا نے اس کے جواب میں نزہت اثنا عشریہ لکھی۔ اس کا ذکر ہم تحفہ اثنا عشریہ کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مرزا نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ مثلاً تاریخ العلماء، منتخب کنز العمال ملا علی متقی کے درجہ احادیث والہ برامت جناب امیر و دیگر ائمہ ہندی و مشائخ و معائب خلفائے ثلاثہ و دیگر اصحاب، انتخاب فرمودہ۔ ایک اور کتاب علامہ ابن حجر عسقلانی کی ایک تالیف سے اخذ کی گئی تھی اور اس میں

لے خود واجد علی شاہ کی نسبت مولوی عبدالحلیم شرکابیان پڑھنے کے قابل ہے۔ بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پورا نام مقبول تھا۔ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنی ہے۔ اگر لکھنؤ میں امٹیا برج کلکتہ کے قیام میں واجد علی شاہ کا سارا انتظامی کاروبار سنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم (منعم الدولہ) انشی السلطان وغیرہ سنی تھے شیعہ مذہبی تقریبات کا انصرام بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

صحاح ستہ کی قابل اعتراض باتیں جمع کی تھیں۔ کتاب تنبیہ اہل الکمال والانصاف علی اختلاف رجال اہل الخلافہ در ان اسما و رجال کذابین و وضاعین و مجہولین و ضعفاء و خواص و نوصیب قدریہ و مرجیہ را کہ ارباب صحاح ستہ کہ بقول اصح عبارت از صحیح بخاری و مسلم و ترمذی و مالک و نسائی و ابودر است۔ در کتاب صحاح خود آورده اند۔ اس کتاب را از تقریب ابن حجر عسقلانی استخراج فرمودہ ایک اور کتاب میں اہل سنت کے تعصبات اور قابل اعتراض خیالات کو جمع کیا تھا۔

مرزا محمد کی وفات بڑے افسوسناک حالات میں ہوئی اور اس سے اس زمانے کے مذہبی مناقشات پر روشنی پڑتی ہے۔ نجوم السما کے بیان کے مطابق اس زمانے میں بادشاہ وقت کا ایک رشتہ دار امیر نواح دہلی میں رہتا تھا۔ وہ بڑا معتصب سنی تھا اور مرزا کی تصانیف پڑھ کر خون کے گھونٹ پیا کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بیماری کا بہانہ کیا اور بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ اس کے شفا پانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مرزا محمد کو اس کے علاج کے لیے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے باصرار انھیں جانے کے لیے کہا۔ وہ نہیں جانا چاہتے تھے، لیکن بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو گئے۔ روانگی کے وقت وہ کہتے تھے کہ میرے لیے یہ سفر موت کا بلدا ہے اور سب حق بخشا کر روانہ ہوئے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھیں زہر دے دیا گیا اور دہلی میں لاکر نیچہ شریف میں جہاں شیعہ اکابر کی قبریں ہیں، دفن کیا گیا۔ یہ واقعہ سلسلہ میں رو پڑ رہا تھا۔

علامہ تفضل حسین کشمیری مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ اور کئی شیعہ علما نے اس زمانے میں شہرت پائی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں جب فرقہ وارانہ اختلافات زوروں پر تھے، سب زبردست شیعہ عالم ایک ایسا بزرگ تھا، جس نے اختلافی مسائل پر کچھ نہیں لکھا۔ یعنی علامہ تفضل حسین خاں کشمیری۔ وہ شیعہ خیالات کے تھے۔ نجوم السما میں ان کی نسبت لکھا ہے۔ ”در تشیع غالی و نور ولائے ائمہ اطہار صلوٰۃ اللہ علیہم از ہیما سے اولامح“۔ وہ کشمیری الاصل تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت

پائی۔ فلسفہ و حکمت میں تکمیل تعلیم بنارس جا کر شیخ علی حزیں سے کی اور تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وہ علوم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی اور یونانی خوب جانتے تھے۔ حکماء مغرب کی کئی کتابیں انھوں نے عربی میں ترجمہ کیں اور جبر و مقابلہ، مغربی علم ہیئت، ہندسہ اور طبیعیات کی کئی مستقل کتابیں خود لکھیں۔ نماز پھر سے پہلے فقہ امامیہ اور اس کے بعد فقہ حنفی کا درس دیا کرتے تھے۔ آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ بلا کر اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن وہ اس کام سے خوش نہ تھے اور دنیا داروں کا طریقہ اختیار کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے نیابت کے زمانے میں بھی اپنی سادگی برقرار رکھی۔ اور دروازے پر دربان تک مقرر نہ کیا جو عسدار آتا سیدھا ان تک پہنچتا اور ہر وقت حاجتمندوں کا ہجوم رہتا۔ آصف الدولہ کی مسند پر نواب سعادت علی خاں بیٹھا تو اس نے بھی آپ کی نیابت کو برقرار رکھنا چاہا۔ لیکن آپ استعفیٰ دے کر کلکتہ چلے گئے اور گوشہ عزلت میں اپنے علمی مشاغل اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے، لیکن اب دماغی محنت اور کثرتِ کار کی وجہ سے آپ کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور دماغ بھی متاثر ہو گیا جب کلکتہ میں علاج سے فائدہ نہ ہوا تو تبدیلی آب و ہوا کے لیے لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن لکھنؤ پہنچنے سے پہلے موت کا پیغام آپ پہنچا اور یکم مارچ ۱۸۸۰ء کو وفات پا گئے۔

اسماعیلی فرقے ہم نے شمالی ہند کے علمائے شیعہ کے حالات کسی تفصیل سے بیان کر دیے، لیکن یہ سب اثنا عشری تھے۔ شیعوں کا ایک دوسرا اہم فرقہ اسماعیلی ہے جو ایک زمانے میں اثنا عشری فرقے سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور شاید آج بھی پاکستان کے شیعہ حضرات میں اس فرقے کی تعداد کافی ہے۔ افسوس ہے ان کے علما و زعماء کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ تواریخ کی کتب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ عہدِ عالمگیری میں جب ترویجِ شرع کی کوششیں ہوئیں تو گجرات کے اسماعیلیوں سے مواخذہ کیا گیا۔ بعض بوہرہ سرگروہوں کو گرفتار کر لیا گیا اور اپنے سرورِ قلم جو قمیہ وہ وصول کرتے تھے، انھیں بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وزنگ نے یہ نتیجہ

یہ پالیسی برقرار نہ رکھی گئی۔ بلکہ شاہ عالم اول نے بوہرہ داعی کو جس کا صدر مقام اس وقت اجپن تھا، امتیازی خطابات دیے اور اجپن شہر کا قاضی مقرر کر دیا (ڈانلڈسن)۔ لیکن شاید اسماعیلی تاریخ میں دورِ آخر کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ خوہوں کے سرگروہ ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں آ مقیم ہوئے۔ آغا خان اول ۱۸۴۸ء میں فتح علی شاہ قاجار سے بگڑ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے اور اُس وقت سے آغا خانی خوہوں کی نئی تنظیم کا آغاز ہوا۔ بوہرہ جماعت کے داعی نے بھی ۱۸۵۵ء میں سورت کو اپنا صدر مقام بنایا، جو ان کی جماعت کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے مشائخ

عہدِ عالمگیری میں کئی اہل اللہ ہوں گے اور رقاہ عالمگیری میں دو تین ایسے بزرگوں (مثلاً شیخ عبداللطیف برہانپوری) کے نام آتے ہیں جن کا اورنگ زیب بڑا مددگار تھا، لیکن شاید سید و تفسی ملتان کے سوا (جن کی عبرت آموز داستان خانی خاں نے تفصیل سے لکھی ہے اور جنھیں عہدِ عالمگیری کا شیخِ علانی سمجھنا چاہیے) کوئی بھی ایسا نہیں جس کا ذکر تاریخی کتب میں تفصیل سے آتا ہو۔

زوالِ حکومت کے زمانے میں البتہ تصوف کو بچھ فروغ ہوا۔ اور خانقاہ نشین بزرگوں میں نہ صرف بعض سربراہانِ ہستیاں پیدا ہوئیں، بلکہ کئی نقشبندی بزرگوں (مثلاً وحدت گلشن۔ مظہر نے فارسی ادب میں نام حاصل کرنے کے علاوہ مقامی زبان کی سرپرستی کی اور اس عمل کو تقویت دی جس کی بدولت ان کے شاگردوں (مثلاً ولی احمد آبادی۔ میر درد۔ یقین۔ تاباں) نے دکنی اور بھاشا کی کاپی لپٹ کر جدید اردو کی بنیاد رکھی اور اس زبان کا آغاز کیا جو قومی خیالات اور احساسات کے اظہار کے لیے فارسی کی جگہ لینے والی تھی۔

چشتیہ سلسلے کا احیاء۔

اس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ چشتیہ سلسلے نے دو تین سو سال کے بعد باہر

رونق پائی اور اس کا باعث اس طریقے کے دو تین بزرگ تھے جو یکے بعد دیگرے اس
 زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ہیں جو شاہجہاں آباد میں
 پیدا ہوئے اور سفر حج کے دوران میں شیخ نجفی مدنی سے سمجیت ہوئے۔ انھوں نے
 واپس آکر وطن میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت شروع کی۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کا
 بیٹا بہادر شاہ شیعہ عقائد سے تائب ہونے کے بعد آپ کا مرید ہوا تھا۔ آپ کی وفات
 ۱۰۲۹ھ میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ نظام الدین دلی اورنگ آبادی تھے، جو
 شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے، لیکن جنھیں آپ نے تعلیم دے کر اورنگ آباد
 دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ یہاں شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ ہوا، بلکہ
 مشہور ہے کہ نظام الملک آصف جاہ آپ کے مرید ہو گئے تھے۔ سلسلے کی خدمت
 میں ان کے بیٹے مولانا فخر الدین فخر جہاں شاہجہاں آبادی ان سے بھی بڑھ گئے۔ وہ
 اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کی کوششوں کا میدان شمالی ہندوستان تھا۔
 یہاں دہلی میں بیٹھ کر آپ نے اطراف ملک میں خلفا بھیجے، جنھیں اپنے کام میں بڑی
 کامیابی ہوئی۔ پنجاب میں آپ نے مولانا نور محمد مہاروی کو بھیجا تھا، جنھوں نے خلیفہ
 تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خان) کے بانی خواجہ سلیمان تونسوی اور گورنر (ضلع راولپنڈی)
 جلالپور (ضلع گجرات) اور چاچراں کے بزرگوں کو مرید کیا۔ روہیل کھنڈ میں ان کے مرید اور
 مشہور صوفی شاعر مولانا نیاز احمد صاحب نیاز بریلوی نے چشتیہ نظامیہ سلسلے کو چمکایا اور شاہ
 وقت اکبر شاہ ثانی بھی آپ کا مرید تھا اور آپ کے حالات نظام الملک کے پوتے نواب
 غازی الدین خاں وزیر سلطنت نے مناقب فخریہ کے نام سے جمع کیے ہیں۔ میاں
 کالے صاحب جن کا بہادر شاہ ظفر مرید تھا اور جو مشہور شاعر غالب کے مرید تھے،
 مولانا فخر الدین کے پوتے تھے۔ مولانا کی وفات ۱۱۹۹ھ میں ہوئی۔

نقشبندیہ سلسلہ | نقشبندیہ سلسلے نے بھی اس صدی میں خوب رونق پائی اور
 اس سلسلے کے کئی بزرگوں نے اردو زبان اور شاعری کی تشکیل
 اور نشوونما میں مدد دی۔ جب بندہ بیراکی نے سرسید کو تباہ و برباد کر دیا تو جو حضرات

یہاں سے ترک مکان کر کے دہلی چلے گئے، ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالاحد سرہندی
 معروف بہ شاہ گل و وحدت حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے تھے۔ وہ دہلی میں علما
 و مشائخ کے اس حلقے میں داخل ہوئے، جس میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد
 شاہ عبدالرحیم اور چچا شیخ ابوالرضا محمد کا آنا جانا تھا۔ انھیں العارفین میں کئی جگہ ان کا
 ذکر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ نے ان کے بعض مکاتیب بھی درج کتاب کیے ہیں۔
 ان کے ایک مرید حاجی محمد افضل تھے، جن سے حکیم الامت نے حدیث پڑھی۔
 شاہ گلشن دہلوی :- ان کے دوسرے مرید شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی تھے، جن کا
 وطن برہانپور تھا، لیکن دہلی اس طرح جا کر بسے کہ دہلوی ہو گئے۔ وہ خود شاعر اور بہت سے
 شاعروں کے مرشد اور اُستاد تھے۔ کلمات الشعرا میں سرخوش نے انھیں اپنا شاگرد بتایا
 ہے۔ گو بعد میں پنجابی کی کشتش سے انھوں نے تبدیل کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ حضرت
 میں ان کی نسبت لکھا ہے۔ ”آپ شیخ عبدالاحد کے خلیفہ ہیں۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں۔
 چنانچہ اکثر شعرا آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ باطنی حالات بھی آپ کے اعلیٰ تھے۔“ آپ نے
 اپنے مرشد کے عرف شاہ گل کی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ شاہ صاحب ایک
 ترک لدنیا بزرگ تھے۔ جامع مسجد دہلی میں رہتے۔ کئی کئی دن کے بعد کھانا کھاتے اور
 اکثر ترکاریوں کے چھلکوں اور پتوں پر گزارہ کرتے۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے
 اور شاہ صاحب نے انھیں العارفین میں آپ کی زبانی بعض روایتیں نقل کی ہیں آپ
 سیر و سیاحت کے سلسلے میں ایک عرصہ احمد آباد گجرات جا کر رہے تھے۔

سرو آزاد میں آپ کے ایک سیرضیامت دیوان کا ذکر ہے اور میخانہ درد میں
 دو لاکھ اشعار کا اندازہ لگایا گیا ہے، لیکن ہمیں مختلف تذکروں سے فقط چند شعروں کیاب
 ہوئے ہیں۔ تذکرہ نشر عشق میں لکھا ہے کہ آپ نے علم موسیقی میں ایسی تحقیقات کی کہ
 لہ سرخوش لکھتا ہے: طبع درست دارد۔ مدتے پیش فقیر مشق کردہ جنون نے ہم رساندہ ازوار الخلا
 برآمد۔ الحال در گجرات بسرے برد۔ ملاحظہ ہو طغوفات شاہ غلام علی (قلی)، لہ اندیا آتش
 ابیری (مجموعہ دہلی) کی غیر مطبوعہ فہرست دیکھنے سے پتا چلا کہ وہاں دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں۔

آپ کو دوسرا امیر خسرو کہتے تھے۔ بائیس سال بلا دوکن کی سیر کی اور بیس برس دہلی میں مقیم رہے۔ تذکروں میں آپ کے جو اشعار ملے ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں۔

بدر شمس رفتہ سجدہ ہا کر دم منت پائے ماست بر سر ما
سخت جانان نیستند از چارہ سازاں کامیاب مومیائی نفع کے بخت شکست سنگ را
کلب من صورت کش صد معنی رنگیں داست گر گند گلشن تخلص ببل طبعم رواست
بہ چشم خویش نگہ سحر سامری این است
نظر بہ آئینہ کن شیشہ پری این است

گشتم شہد تیغ تغافل کشیدنت جانم ز دست برد غزالانہ دیدنت
سر دیوانگی سلامت باد راز مارا چہ پردہ پوشی کرد
حیرت بہار گلشن نظارہ خودیم آئینہ خانہ دل صد پارہ خودیم
بر دقت سے توں فہمید معنی ہائے نازاں کہ شرح حکمت العین است مژگان مرزاؤ
ز شوق ہر ز خسار یکہ چشم گرم گریہ پیرا شد
ہو گو ہر در گرہ ہر اشک من ہار و سحر گاہے

مکن باور بحر نے قطع الفت کرد شوخ من کہ چوں مقراض این ظالم زباں زیر زباں ارد
ماہ و سالم بے تو در روزیہ مستور بود بچوں نگاہ کوہ عمر من شب دید مجھ بود
آدم الشعر اے اردو ولی دکنی شاہ گلشن کا شاگرد تھا اور شاید دہلی میں نہیں بلکہ
شاہ صاحب کے طویل قیام احمد آباد کے دوران میں ان سے فیضیاب ہوا۔ ولی نے
شاہ گلشن ہی کے ایما پر اپنا دیوان فارسی دواوین کے طرز پر مرتب کیا اور اس میں وہ
مضامین باندھے جو فارسی شاعری سے مخصوص تھے۔ اس سے پہلے زیادہ تر اردو میں
بھاشا کے مضامین ہوتے تھے (ملاحظہ ہو سرو آزاد کا تہمتہ) یا ریختہ کی شتر گزگی اور غیر تصنی
خیالات۔ شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا۔ ”شما زبان دکنی را گزشتہ ریختہ را موافق
اردوئے معلیٰ شاہماں آباد موزوں بنائید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب
طبعان عالی مزاج گردد“ (تذکرہ قدس) اور ایں ہمہ مضامین فارسی کرے کار افادہ نہ

در ریختہ بکار برد۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت“ ولی نے آپ کے مشوروں پر عمل کیا اس
وقت سے اردو شاعری فارسی کے نقش قدم پر چلی اور آہستہ آہستہ یہ زبان فارسی کی
جانشین ہوئی۔

شاہ صاحب کے ایک اور شاعر مرید خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے جن کے
صاحبزادے خواجہ میر درد اردو کے بہترین صوفی شاعر ہونے کے علاوہ کئی ضخیم صوفیانہ
کتابوں کے مصنف تھے۔ میر درد ایک شعر میں اپنے معنوی بزرگوں کا ذکر کر کے
لکھتے ہیں۔

قدر ایں ناچیز را داند جناب عندلیب
گر چہ جز کا ہے نیم، اما گیارہ گلشنم

شاہ گلشن کی وفات ۱۱۲۶ھ میں ہوئی۔ مزار دہلی میں ہے۔

مرزا مظہر جانجاناں :- ایک اور نقشبندی شاعر اور اردو زبان کے عظیم مرزا
مظہر جانجاناں تھے جو ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۰ھ میں ایک شیعہ کی گولی سے
ہلاک ہوئے۔ وہ طبقہ امرا کے رکن تھے۔ ان کی پیدائش پر اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے
والد مرزا جان کے نام پر ان کا نام جان جان رکھا، لیکن جانجاناں نے زیادہ شہرت پائی۔
انھوں نے ترک دنیا کر کے تصوف اور شعروادب کے لیے زندگی وقف کر دی اور
شیخ عبدالاحد سرہندی المتخلص وحدت والمعروف شاہ گل کے کئی خلفائے فیض حاصل کیے
آزاد نے مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد کے حالات میں کسی قدر عجوج طرح سے کام لیا
ہے اور ان نقشبندی بزرگوں سے ان خیالات کا انتقام لیا ہے جو اس سلسلے کے کئی
قدیمی بزرگ حضرات شیعہ کی نسبت رکھتے تھے، لیکن محاصرانہ تذکروں سے پتا چلتا ہے
کہ غیر معمولی نازک مزاجی اور دل گداختگی کے باوجود مرزا صاحب، دقیقہ رسی، علمیت
غداقی سلیم، انصاف پسندی اور تصوف میں یگانہ روزگار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب
ان کی نسبت لکھتے ہیں :-

”آنچه قدر ایشان ما مردم میدانیم۔ شما چه دانید۔ احوال مردم ہند بیا معنی نیست کہ خود

مولد و منشا فقیر است و بلاد عرب را نیز زویدہ ایم و سیر نمودہ۔ احوال مردم و ولایت ارتقا
انجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیز سے کہ بر جلدہ شریعت و طریقت و آثار کتاب و سنت
ہمچنین استوار و مستقیم باشد و در ارشاد طالباں شان عظیم و نفس قوی دارد۔ دریں جزو دلائل
مثل ایشان در بلاد مذکور یافتہ نمیشود۔ مگر در گزشتگان بلکہ در ہر جزو زمان و جہوداں جنس
عزیزان کمتر بودہ است۔ چہ جائے ایں زمان کہ پُفتہ و قساد است ۛ

مرزا صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے آپ کے مکتوبات خاص طور
و فکر کے مستحق ہیں۔ بعض مکتوبات میں حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق اعتراضات کا
جواب دیا ہے۔ بعض میں صوفیانہ اور شرعی مسائل کی توضیح ہے۔ بعض خطوں سے اس
زمانے کی بد نظمی اور بے تربیتی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئین و
مذہب کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے۔ اور چونکہ ایک مسلمہ بزرگ کے قلم سے اس مسئلے پر
اس قدر تفصیلی اظہارِ شاف و نادر ہی کہیں ہوا ہوگا۔ اس لیے ہم اس کا پورا ترجمہ درج
ذیل کرتے ہیں:-

”آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر عرب کے مشرکوں کی عرج بے اصل دین رکھتے ہیں
یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہو گیا ہے؟ دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے
حق میں کیسا اعتقاد رکھنا چاہیے!

واضح رہے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ نوع انسانی کے پیدائش کے
شروع میں رحمتِ امیر نے ان لوگوں کی محاور و محاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب سمی بہ
ویدہ جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں۔ ایک
فرشتے برہما نام کے وسیلے سے جو ایجادِ عالم کا واسطہ ہے نازل کی۔ اس زمانے کے بعد ان

ۛ علامہ اقبال کا بھی ایک زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب مخزن میں انھوں نے ہندوؤں کے مقدس بھگناگیری
کا ترجمہ شائع کرایا (۱۹۰۲ء) تو اس میں ایک شعر تھا:-

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو

”زائیدگان نور“ کی ترکیب کے متعلق اقبال نے ایک نوٹ دیا تھا۔ زائیدگان نور یعنی دیوتے۔ زبانی لکھے ہوئے

اس کتاب سے چھ مذہب استخراج کیے اور اصول و عقائد کی بنیاد پر قائم کی۔ اس کو فن
دھرم خاستر کہتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات جس سے علم مراد ہے۔ اسی طرح مجتہدین اُنے فروع
کے چار فرقے بنائے اور ہر فرقے کے لیے الگ مسلک مقرر کیا اور فروع اعمال کی بنا اس پر
قائم کی۔ اس فن کو نام کرم خاستر رکھا۔ یعنی فن عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔

یہ لوگ نسخ احکام کے منکر ہیں لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تغیر اعمال کی
ضروری ہے اس لیے دنیا کی ساری مدت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے کا نام جنگ
رکھا ہے۔ ہر ایک جنگ کی علامتیں انھیں چار دفروں سے اخذ کی ہیں۔ جو کچھ متاخرین نے
ان میں اپنے تصرفات کیے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں۔

ان کے تمام فرقے توحید الہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فلسفے عالم
نیک و مبکی جزا و جزا حشر و نشر جسمانی اور حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علوم عقلی و نقلی۔
ریاضت و مجاہدات۔ تحقیق معارف اور کاشفات میں مدد ملے رکھتے ہیں۔ ان کی بُت پرستی
شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

ان کے علمائے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیل علم کے لیے دوسرا معاش اور
اولاد کی غرض سے تیسرا دوستی اعمال اور تہذیب نفس کے لیے چوتھا تہجد و تنہائی کی مشق کے لیے
جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجاتِ کبر لے جسے ممالکت کہتے ہیں اس پر موقوف ہے۔
ان کے دین کے قواعد و ضوابط میں نہایت اعلیٰ درجے کا نظم و نسق ہے جس سے علوم
ہوتا ہے کہ یہ دین باقاعدہ مرتب ہوا تھا لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ ہماری شرع میں یہود و نصاریٰ

بقیہ صفحہ ۶۴۶

مشکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدہ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے
تھے۔ غالباً ان کا مفہوم دہی ہوگا جن کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی فوری
تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے
نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا ۛ اقبال

کے دین کے نسخ کے سوا اور کسی دین کے نسخ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہوئے اور کئی دین منسوخ ہوتے سے نابود ہو گئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق ”وَأَن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ“ (ہر ایک گروہ کا نبی گزرا ہے) ”وَأَوَّلُ أُمَّةٍ رَّسُولٌ“ (اور ہر ایک امت کا رسول ہوتا ہے) سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے، جن کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحب کمال تھے۔ رحمتِ عامہ الہی نے مصلحتِ انسانی کو اس سرزمین میں فروگزاشت نہیں کیا۔ پیغمبرِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس قوم کے لیے لازم تھی اور دوسری قوم کے نبی سے ان کو غرض نہ ہوتی، لیکن جبکہ پہلے پیغمبرِ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں تب سے کہ جب تک نیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا بشرق سے لے کر غرب تک تمام دنیا کو آنحضرت ہی کی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مقابل تمام باقی دین منسوخ ہیں۔ آغازِ بعثت سے جس کو آج تک ایک ہزار ایک سو اسی سال ہوتے ہیں جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہوا۔ وہ کافر ہے۔ نہ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

نیز حسبِ تفسیرِ آیتِ کریمہ ”مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصِصْ عَلَيْكَ“ (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا) جب ہماری شریعت بہت سے انبیاء کے حال میں ساکت ہے تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ نہ ہم کو ان کے معتقدین کے کفر و الحاد پر ایمان واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا اعتقاد لازم ہے، لیکن اگر تعصب نہ ہو۔ تو نیک گمان ضرور کرنا چاہیے۔ اہل فارس بلکہ تمام اہم ماضیہ کے حق میں جو خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے گزر چکی ہیں اور جن کی نسبت شرع میں کچھ بیان نہیں کیا گیا اور جن کے احکام و آثار راہِ اعتدال کے مناسب اور موافق، اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے۔ کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر نہ کہہ دینا چاہیے۔ ان (اہل ہند) کی نسبت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو

حکمِ الہی سے عالمِ کون و فساد میں دخل رکھتے ہیں۔ یا بعض کاطین کی روحیں جنہیں جسمِ سلاک ہو کر اس دنیا میں کچھ تصرف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جو ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح تا ابد زندہ رہیں گے یہ لوگ ان کی مورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب ایک مدت کے بعد صاحبِ مورت سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے حوائجِ معاش و محاد کو پُر کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکرِ رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اسلامی صوفیہ میں عام ہے اور جس میں رتِ شیخ تصور کیا جاتا ہے اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیہ شیخ کی ظاہری تصویر نہیں بناتے، لیکن یہ بات کفارِ عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور مورشِ بالذات مانتے تھے نہ کہ اقرب الہی کا فدیر اور انھیں کو زمین کا خدا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو آسمان کا خدا۔ مگر یہ شرک ہے۔ ان (اہل ہند) کا سجدہ سجدہ عبودیت نہیں بلکہ سجدہ تحیت ہے۔ جو کہ ان کے طریقے میں ماں۔ باپ۔ پیر اور اُستاد کے سلام کے لیے بھی عام ہے اور جسے دُندوت کہتے ہیں۔

تنازع کا اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام

مرزا جانجناں کے خلفاء میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت مشہور ہیں۔ شاہ عبدالعزیز انھیں بھی وقت کہا کرتے تھے۔ وہ کسی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے فقہ کے مسائل کی کتاب مالا بد منہ اب بھی مستعمل ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے سات جلدوں میں تفسیرِ منظرِ لکھی۔ اس زمانے میں شاہانِ اودھ کی وجہ سے شیعہ متنی مسئلہ پھریا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے شیعہ عقائد کے خلاف سلیف المسلول کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ ارشادِ الطالبعین۔ حقوق الاسلام شاہ شایق اودھو سے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات ۱۲۸۷ھ میں ہوئی۔

مرزا منظر جانجناں کے سب سے نامور فرید
شاہ عبداللہ المعروف شاہ غلام علی دہلوی

تھے، جن کا اپنے زمانے میں اتنا شہرہ تھا کہ انھیں عقیدتمند تیرہویں صدی کا مجدد کہتے تھے۔ اور اگر اس روحانی انقلاب کا اندازہ کریں جو ان کے ایک مرید کی بدولت بلاد روم و عراق و کردستان میں ہوا تو یہ اظہار عقیدت عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں بھی ان کا بڑا اثر واقعہ تھا۔ اور دہلی میں ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کا بڑا مقابلہ سمجھی جاتی تھی۔ ایک میں ولی اللہی طریقے کی میانہ روی اور علم و عرفان تھا اور دوسرے میں مجددی مشرب کا اچانی ذوق و شوق اور متشرع تصوف تھا۔ شاہ غلام علی کے ملفوظات اور حالات ان کے مریدوں مثلاً شاہ عبدالغنی صاحب نے مرتب کیے ہیں مکاتیب مدراس سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن شاید شاہ صاحب کے علوم مرتبہ کا سب سے بہتر آئینہ سرسید احمد خاں کا وہ مختصر مضمون ہے جو انھوں نے شاہ صاحب کے متعلق آثار الصنادید میں لکھا اور بزرگان دہلی کے تذکرہ میں فاتحہ الکتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید احمد خاں کے والد پر شاہ صاحب بڑی عنایت کرتے تھے۔ سید احمد خاں پیدا ہوئے تو خوش نصیب باپ نے انھیں ہی زحمت دی۔ مواد مسعود کے کان میں اذان شاہ صاحب نے دی اور اپنے مجددیہ سلسلہ کے سردار حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرسندی قدس کے نام پر اس کا نام احمد رکھا۔ اور جب یہ سیدزادہ گھٹنوں چلنے کے قابل ہوا تو اس سے پوتوں سے زیادہ پیار کیا۔ سید احمد بھی شاہ صاحب کو داد حضرت کہا کرتے تھے انھوں نے ان کا تذکرہ بھی ایک خاص شیفنگی اور بڑے سلیقے سے لکھا ہے۔ ان کے بیان میں وہ اشکال اور الجھنیں نہیں جو آثار الصنادید کے باقی بیانات اور اندراجات میں ہیں اور چونکہ شاہ صاحب کی شخصیت، طریق کار اور اہمیت کا بہترین اندازہ اسی مضمون سے ہو سکتا ہے، ہم اس کا بیشتر حصہ درج ذیل کرتے ہیں۔ سرسید کہتے ہیں:-

بلکہ دوسرا ایڈیشن حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

جناب حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ غلام علی قدس سرہ

وطن اصلی و مالک ہے جو امرتسر (پنجاب) کے قریب واقع ہے۔ اور آپ سادات علوی سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد بھی بڑے عابد اور عابد تھے اور جنگلوں میں جا کر ذکرِ حق کیا کرتے تھے اور عینوں بناس پتی پر قناعت فرماتے تھے۔ آپ کے عجم بزرگوار نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبد اللہ آپ کا نام رکھا۔ ۱۱۵۶ھ میں آپ نے اس عالم میں قدم فیض توام رکھا، اور اپنے جمال جہاں آرا سے عالم کو متور کیا۔

آپ نے سولہ برس کی عمر تک تو اسی نواحی میں بسر کی ۱۱۷۲ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس ارادہ سے دہلی بلوایا کہ اپنے پر شاہ ناصر الدین قادری سے جن کا مزار نئی عید گاہ کے چھپے ہے، بیعت کرادی جائے۔ آپ کے پہنچنے سے پہلے شاہ ناصر الدین صاحب نے انتقال کیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو پردہ غیب سے اور ہی کچھ ظاہر کرنا تھا یہ بات غیباً وحین التواریس رہی۔ تب آپ کے والد ماجد نے اجازت و اختیار دیا کہ جس سے چاہو بیعت کرو ۱۱۷۸ھ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جناب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور یہ شعر پڑھا:-

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم

سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

بعد بیعت کے ساہ سال آپ نے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں اوقاتِ سحر کی اور وہ زہد و مجاہدہ اور ریاضت کی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ دن دن عروج کمال اور مشاہدہ جمال شاہد بے زوال اور کاشفہ اور ترقیات فائقہ ہوتی۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے اور تلقین و ارشاد سلسلہ اپنے پیرومرشد کے روبرو جاری فرمایا۔ اگرچہ آپ نے بیعت سلسلہ قادریہ میں کی تھی،

۱۱۸۰ھ خیمہ مقامات مظہری میں قصبہ دیار ضلع پنجاب لکھا ہے۔ لیکن اصل مقام بنالہ تھا جو مشرقی پنجاب کی پڑانی مردم خیز بستی تھی۔ میان سر فضل حسین کا خاندان بھی اسی قصبہ سے تھا۔

لیکن ذکر و اذکار و شغل و اشتغال طریقہ علیہ نقش بند یہ مجذوبہ میں جاری کیا اور ہر
کی اجازت حاصل کی اور اپنے پیرو مشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے بعد
حقیقت میں میرے اعتقاد بموجب اپنے پیرو بھی فوقیت لے گئے۔ سبحان اللہ کیا آدمی
تھی کہ مطلق دنیا کا لگاؤ نہ تھا۔ اللہ اللہ! کیا اطاعت سنت تھی کہ سر مو بھی فرق نہ تھا۔ لکن
تو اس درجہ پر تھا کہ کبھی کسی طرح کا خیال دل میں نہ آتا۔ اُمرا اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے
کہ ہم خانقاہ کے فقرا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کریں۔ ہرگز آپ منظور نہ فرماتے! ایک دفعہ
نواب امیر الدولہ امیر محمد خاں والی ٹونک نے بہت التجا سے درخواست تقرر وظیفہ کی
اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا ہے

ما آبرو سے فقر و قناعت نے برہم
با میر خاں گویے کہ روزی مقرر است

آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں
نے اگر بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام
اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کو بیعت کی اور خدمت
خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب
اور افغانستان کا کچھ ذکر نہیں کہ مڈی دل کی طرح اڑتے تھے۔ سچ ہے۔

چو کعبہ قبلہ حاجت شد اندو یا رہ بعید
روند خلق بمیدارش از بسی فرسنگ

حضرت کی خانقاہ میں پانسو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا سب کا
ذمہ تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حویہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب کے کام چلاتا تھا۔
اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا جو اس نے
دہی دیا۔ جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آتی اس کو بیچ کر فقرا پر صرف کرتے اور عیال
گزی گاڑھا مونا تمام فقیروں کو تیر ہوتا ویسا ہی آپ بھی پہنتے اور جو کھا نا سب کو
میتا ہوتا وہی آپ کھاتے۔ بھلا غور کرو کہ بشر کی طاقت ہے کہ ایسی بات کرے کہ

کہ اگر کوئی عرض کرتا کہ حضرت آپ اپنے لیے تو یہ کپڑا لے لیجیے اور یہ آرام کی چیز بنا لیجیے
تو آپ یہ قطعہ پڑھا کرتے۔

خاک نشینی است سلیمانیم ننگ بود افسر سلطانیم
ہست بے سال کہ می پوش کہنہ نہ شد جامہ عریانیم

اور اگر کبھی کچھ اسباب اور سامان دنیا کا ذکر آتا تو فرماتے

سرخ قانع نیست بیدل و نہ اسباب جہاں
ہر چہ باداریم زان ہم اکثرے در کار نیست

آپ کی اوقات شریف نہایت منضبط تھی۔ کلام اللہ آپ کو حفظ تھا اور تحقیق قرأت
بھی بہت خوب تھی۔ نماز صبح اول وقت ادا فرما کر دس سید پارہ کلام اللہ کے ادا فرماتے
اور بعد اس کے حلقہ مریدین جمع ہوتا اور نماز اشراق سلسلہ توجہ اور استغراق جاری
رہتا۔ بعد ادا کرنے نماز اشراق کے تدریس حدیث اور تفسیر کی شروع ہوتی۔ جو لوگ
اس جلسہ کے بیٹھنے والے ہیں ان سے پوچھا چاہیے کہ اس میں کیا کیفیت ہوتی تھی
اور پڑھنے پڑھانے اور سننے والوں کا کیا حال ہوتا تھا۔ جہاں نام رسول خدا آتا آپ
بے تاب ہو جاتے اور اس بیتابی میں حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سبحان اللہ
کیا شیخ تھے۔ باقی باللہ اور عاشق رسول اللہ! علم حدیث اور تفسیر نہایت مستحضر تھا۔
اگر باعتبار علوم عقلی سرآمد فلسفیان متقدمین اور متاخرین لکھا جاوے تو بھی بجا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا مجمع علوم پیدا کیا تھا کہ ہر ایک علم ظاہری اور باطنی میں درجہ
کمال بہ انتہائے کمال حاصل تھا۔ بعد اس درس تدریس کے آپ کچھ تھوڑا سا کھانا
کہ عبادت مجبوروں کو کافی ہو، تناول فرما کر بہ اتباع سنت نبوی قیلولہ استراحت میں آرام
کرتے۔ تھوڑی دیر بعد اقل وقت نماز ظہر ادا فرما کر پھر درس و تدریس حدیث و تفسیر
فقہ اور کتب تصوف میں مشغول ہوتے اور نماز عصر تا نماز مغرب حلقہ مریدین جمع
ہوتا اور ہر ایک آپ کی توجہ سے علوم مدارج حاصل کرتا۔ ہمیشہ تمام رات آپ شب بیدار
فرماتے تھے۔ شاید کہ گھڑی دو گھڑی بمقتضا سے بشریت غفلت آجاتی ہو سودہ بھی

جانماز پر۔ برسوں آپ نے چار پائی پر استراحت نہیں فرمائی۔ اگر غم کا بہت غلبہ ہو جائے تو نبی اللہ ﷺ کہتے پڑھتے تھے۔ آپ کی خانقاہ میں عجب عالم ہوتا تھا۔ بوریا کا فرش رہتا تھا اور اسی کے سرے پر ایک مصلیٰ بھی بوریا کا اور کبھی اور کسی چیز کا پڑا رہتا تھا اور وہیں ایک تکبیر چڑھے کار کھارتا تھا۔ آپ دن رات اسی مصلے پر بیٹھے رہتے اور عبادت معبود کیا کرتے اور سب طالبین گردِ آپ کے حلقہ باندھے بیٹھے رہتے اور ہر ایک کو جِدِ اُجداد فیض حاصل ہوتا۔ اگر کبھی کچھ فرش کا ذکر آتا تو آپ ارشاد فرماتے کہ

لنگے زیر و لنگے بالا نے غم دزد و نے غم کالا
گزر کے بوریا و پوستکے دسکے پُر زرد و دسکے
ایں قدر بس بود جمالی را عاشق زند لا ابالی را

حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود رفتگی کے سرِ مولا احکامِ شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ جو کام تھا وہ باتباع سنت تھا۔ لقمہ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مالِ مشتبہ ہرگز نہ لیتے۔ جو شخص خلافِ شرع اور سنت ہوتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے اور فرماتے تھے

یا مرو با یارِ آرزق پیرین یا بہ کش برخانماں انگشت نیل
یا مکن با پیلباناں دوستی یا بنا کن خانہ در خوردِ پیل

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی احمد شام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرہٹوں کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی بموجب اس سلسلہ

مہرہ کے

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرنا یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بار بار ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غمِ زن و فرزند سے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوتی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی تھیں خصوصاً صخر سن میں جو چاہا سو کیا جو چاہتا سو کرتا اور حرکاتِ بے جا مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا۔ آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔ آپ کے کمالات اور خرقِ عادات اس سے زائد کیا بیان میں آویں۔ اس واسطے اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں دیکھتا اور میرے نزدیک ایسے شخص کی کرامت کا بیان کرنا اس کے رتبہ سے کم ہے۔ کیونکہ فقیری کا رتبہ اس سے آگے ہے۔ غرض کہ ساٹھ سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم متور رہا۔ اور جو کہ ہر ایک کو اس دارالافتا سے دارالبقا کو چلنا ہے اپنے بھی ہفتہ کے دن صفر کی بائیسویں شنبہ ۱۲۸۷ھ میں اس جہان سے انتقال کیا اور آپ کی خانقاہ میں آپ کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ”نور اللہ مضجعہ“ آپ کے انتقال کی تاریخ ہے۔“

سر سید کے مندرجہ بالا بیان سے شاہ صاحب کی شخصی خوبیوں اور ان کی مقامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی خانقاہ میں روم شام اور دوسرے بلاد اسلامی کے باشندے دیکھے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ شاہ صاحب کو اپنے ملک میں بھی بڑا عروج حاصل تھا اور ہمسایہ ملکوں میں بھی آپ کے ماننے والے تھے، لیکن تاریخ دان کی نظروں میں شاید آپ کا سب سے بڑا فیض بلادِ روم میں مجددیہ سلسلے کی وسیع اشاعت تھا۔ جس کے ذریعہ آپ کے مرید اور خلیفہ شیخ خالد کردی تھے، جنھوں نے دہلی میں آکر آپ سے فیض حاصل کیا۔ اور پھر مجددیہ طریقے کو دولت عثمانیہ میں عام کیا۔ [۱۰۱ صفحہ پر ملاحظہ ہو]

نقشبندیہ طریقہ کی تنظیم خواجگان بخارا و مرقند (ترکستان) نے کی اور فی الحقیقت یہ ایک ترکی الاصل طریقہ ہے۔ لیکن شیخ خالد سے پہلے جو طریقہ سلطنت عثمانیہ میں چھایا ہوا تھا بیتائشی تھا جو ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی طرح؛ زیادہ تر ایک مقامی طریقہ تھا۔ نقشبندیہ سلسلے کی وسیع اشاعت پہلی مرتبہ شیخ خالد نے کی اور ان کی وجہ سے یہ سلسلہ وہاں جس شکل میں رائج ہوا وہ مجددی طریقہ تھا۔ قدیمی سلسلہ نہ تھا۔ اور اس کی اشاعت وہاں بھی احیائے علوم اور غلبہ شرع کا باعث ہوئی۔

شیخ خالد بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت دولت عثمانیہ میں نقشبندیہ طریقہ دوسرے سب طریقوں پر غالب آگیا۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا نے صوفیہ سلسلوں کا خاتمہ کیا تو اس وقت فقط استنبول میں اس سلسلے کے ۲۷ تکیے تھے۔ علاقہ کردستان میں اب بھی ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کے مناقب میں علامہ شامی نے ”سل الحسام الہندی لنصرة مولانا خالد نقشبندی“ کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو مصر میں چھپ چکا ہے۔ آپ عربی فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی دیوان ۸۴۲ھ میں استنبول میں شائع ہوا تھا۔ اب حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے اور جدید ترکی کی ان محدود کتابوں میں سے ہے، جنہیں اصل (یعنی عربی) رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔

کئی قصیدے شاہ غلام علیؒ کی تعریف میں ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ۵

خبر از من و سید آں شاہِ خوباں را بہ نہانی
کہ عالم زندہ شد بار و گر از ابر نیسانی

آگے چل کر کہتے ہیں ۵

[فٹ نوٹ ۱: متعلقہ صفحہ ۶۵۵]

شیخ خالد کروی کو ہندوستان آنے اور شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شورہ ہمارے ایک جہاں گرد و دوش مزارعیم اللہ بیگ نے دیا تھا، جن سے شیخ کی اشاعے سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ ہم نے کتب خانہ سراجیہ کنڈیاں شریف کی نذر کیا ہے۔

امام اولیا، سیاح پیدائے خدا مینی
مہین را ہمایاں شمع جمع اولیائے دیں
ذم کبریا، سیاح دریائے خدا دانی
دلیل پیشوایاں، قبلہ اعیان روحانی
چراغ آفرینش، مہر سرج دانش و بدیش
کلید گنج حکمت، محرم اسرار سبحانی
امین قدس عبد اللہ شمس کز انقائے
دہد سنگ سیاہ خاصیت لعل بدشتانی
شاہ غلام علیؒ کے مطبوعہ مکاتیب میں چند خطوط شیخ خالد کے نام ہیں۔ ایک کے ساتھ علما و مشائخ حجاز و روم کے نام ایک پیغام منسلک ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ کی شروع شروع میں مخالفت ہوئی، لیکن شاہ صاحب نے اس پیغام سے دولت عثمانی کے بزرگوں کی تشفی کی۔

شیخ خالدؒ نے جب حکومت عثمانیہ میں واپس جا کر شاہ غلام علیؒ کے مناقب بیان کیے اور طریقہ مجددیہ کی اشاعت کی تو وہاں سے دوسرے کئی بزرگ حصول فیض کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ مثلاً شاہ صاحب کے ایک خط پر حضرت سید احمد بخادوی اور حضرت سید اسماعیل مدنی کا ذکر ہے جو بڑے پایہ کے بزرگ تھے (دور وصف ایں سیدیں بہ اور اک فن مقدور بیان نیست) اور مدینہ منورہ میں مولانا خالدؒ سے نسبت حاصل کرنے کے بعد بہ غرض استفادہ دہلی آئے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد جان کا ذکر بھی یہاں بجا نہیں۔ وہ پیدا تو ہندوستان میں ہوئے۔ لیکن شاہ غلام علیؒ صاحب کے اجازت و خلافت حاصل کرنے کے بعد عازم مکر مہملہ ہوئے۔ شروع میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بعد ازاں آپ کو بڑا فروغ ہوا۔ حتیٰ کہ والدہ سلطان بھی آپ کے معتقدین میں سے ہو گئیں۔ استنبول و دیگر اضلاع روم میں آپ کے خلفا منتشر ہو گئے۔ ایک خانقاہ تیار کی۔ جس سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ آپ کی وفات ۱۲۹۵ھ میں مکہ معظمہ میں ہوئی۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ اسلامی ہندوستان کے انتہائی زوال کا تھا، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے جو شخصیں جلالی تھیں، وہ اب ہندوستان کی سرحدوں سے گزر کر بیرون ہندوستان کو متوجہ کر رہی تھیں۔ بقول خالدؒ ۵

برہنہ ظلمت کفر است گفتند بہ دل گفتم
بہ ظلمت نہ اگر بر جگرے آب حیوانی

سلسلہ مجددیہ کا دورِ جدید

مجددی حضرات شاہ غلام علی قدس سرہ کو تیرہویں صدی کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کی عظیم دینی خدمات اور وسیع اثر کا ہم نے کسی قدر تفصیلی بیان کر دیا ہے۔ لیکن خاص مجدوبہ سلسلہ کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا۔ اس کا پورا اندازہ اس بیان سے نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کو حضرت مجدد کی زندگی ہی میں بڑا فروغ حاصل ہو چکا تھا اور ملک کے دور دراز حصوں میں ممتاز بزرگ اس سے وابستہ تھے۔ خواجہ محمد مصحوم نے اس سلسلے کو بڑی وسعت دی۔ ان کے صاحبزادے خواجہ نقشبند کا زمانہ بھی عہدِ عالمگیری کی فقہی روایات کے باوجود سلسلہ کے لیے بڑا سازگار تھا۔ اس وقت طریقہ مجددی کا بڑا مرکز سرہند تھا۔ گواہانِ ملک میں بھی اس سلسلے کی کئی اہم خالقاہیں تھیں۔ خواجہ نقشبند ثانی کی وفات کے چند سال بعد سلسلے میں انتشار شروع ہوا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عالمگیری کی وفات کے تین سال کے اندر مشرقی پنجاب میں ایک ایسا بنگا بپا ہوا جس نے اس علاقے کا امن تہ و بالا کر دیا۔ مسیحاؑ میں بندہ بیراگی نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ تباہی مچانی کہ الامان! چار روز تک لوٹ مار اور سفاکانہ قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ بندہ کا قلع و قمع پانچ سال بعد نواب عبدالصمد خاں نے کیا (جن کی قبیلہ بیگم پورہ لاہور میں ”زندہ دلاں“ لاہور کی غفلت و بے حسی کا عبرتناک نقشہ پیش کرتی ہے) نواب عبدالصمد خاں اور ان کے بیٹے زکریا خاں کے عہدِ حکومت میں پھر سرہند آباد ہوا، لیکن اس کے بعد یہ شہر اکھا سنگھ بانی ریاست پٹیالہ کے قبضے میں آ گیا۔ جس نے اس شہر کو پھر لوٹ کر آباد دیا۔ اس مسلسل بد امنی اور قتل و غارت سے شہر آبادی میں اور حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کے اکثر افراد منتشر ہو گئے اور ان میں سے بعض آگے اور بعض دوسری جگہ آباد ہوئے۔ خود خواجہ محمد زبیرؒ جنھیں قیوم چارم کہا جاتا تھا

عالمگیری کی وفات کے دوسرے یا تیسرے سال یعنی بندہ کے حملے سے پہلے ”مع توابع و لواحق“ سرہند سے دہلی چلے گئے تھے۔ اور اپنی وفات تک، جو حملہ رنادرہی کے چند ماہ بعد ہوئی، وہیں مقیم رہے۔ شیخ عبدالاحد گل ان کے ساتھ یا اس سے بھی پہلے دہلی پہنچ گئے۔ سرہند میں سلسلہ کا جو نظام تھا، وہ بہت حد تک درہم برہم ہو گیا۔ اس کے علاوہ عہدِ عالمگیری کے اواخر سے ہی اکابر سرہند پر مشیخت غالب آ گئی تھی۔ درویشی تھوڑی تھی بعض بزرگوں کے حالات پڑھیں تو رُسیا نہ ٹھاٹھ کے مظاہرے کثرت سے ملتے ہیں۔ آپس میں اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے۔

دہلی میں بعض بزرگانِ سرہند (مثلاً شیخ عبدالاحد گل) نے دار الخلافہ کی علمی ادبی اور روحانی زندگی کی رونق بڑھائی۔ اور مرزا مظہر جانجاناں جیسے بزرگ سلسلہ مجددیہ میں داخل ہوئے۔ لیکن سلسلے کو نئی زندگی شاہ غلام علیؒ سے ملی۔ اس وقت انگریزوں کا اقتدار بڑھ رہا تھا جو انھیں ناگوار تھا، لیکن بہر کیف اس سے سکھوں اور مرہٹوں کی ترکیزیاں تو ختم ہوئیں۔ ملک میں امن و امان تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج میں بڑی درویشی شرع کا بڑا خیال تھا۔ روحانی مرتبہ بہت بلند تھا۔ عنایت الہی سے ان کا فیض روم و کردستان تک پہنچا، لیکن ہند اور پاکستان میں بھی ان کا کام اتنا ہی اہم تھا۔ ان کی بدولت سلسلے میں بار و گرد و روشنی کو فروغ ہوا۔ بلکہ سلسلے نے ایک نئی صورت اختیار کی جس میں اصل کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔

۱۔ سرہند سے سکھوں کو خاص طور پر نفرت تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ گورو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کو یہاں کے حاکم نے (ہندو دیوان کی انجمن پر زبردستی چڑھا دیا تھا۔ تواریخِ خالصہ میں لکھا ہے کہ جب گورو گوبند سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو یہ خبر پہنچی تب سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور روئے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت بیان کیا گیا ہے کہ گورو گوبند سنگھ صاحب اس عالم رنج و محن میں اپنے کار سے ایک چھوٹی سی گہاڑی جوڑے اکھیڑ دی۔ جس پر رائے کھڑے ہو چھاپا کہ آپ ہمارے کیا کر رہے ہیں۔ گورو صاحب فرمایا: ظالم ترکوں کی بیوقوفی کر رہا ہوں۔ ہمارے سکھ ایسے طاقتور ہیں۔ جو اس سرہند کی اینٹوں اکھاڑ کر تلج میں ڈال دیں گے۔ سرہند کی بابت بھی تاریخی حقائق سے ظاہر ہے کہ جب سکھوں نے زور پکڑا تو اس کی ایک اینٹ جدا کر دی گئی۔ مفتی غلام سرورؒ تاریخِ مخزنِ پنجاب میں لکھتے ہیں: سکھوں کو اس شہر کے ساتھ یہاں تک دشمنی ہے کہ جب کوئی سکھ اب بھی سرہند کے پاس سے گزرتا ہے۔ دو اینٹیں وہاں کے کھنڈرات سے اٹھا کر دریا میں ڈال دیتا ہے۔“ نواب شیر محمد خاں رئیس مالیر کوئلہ نے بچوں کی سزا دہی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ مالیر کوئلہ کی ریاست اٹھارویں صدی کے پُر آشوب زمانے میں بھی محفوظ رہی۔

لیکن جو تبدیل شدہ حالات کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے فیض کے جو چہنٹے لگائے ان سے نکلی ہوئی نہروں نے مغربی پاکستان کے ان علاقوں کو سیراب کیا جن کی شادابی سلسلہ کے انقلاب سرمد دہلی کے بھارت میں اجانے کے بعد بھی قائم رہی!

شاہ احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ | مغربی پاکستان میں شاہ غلام علی قدس سرہ کا فیض ایک ایسے بزرگ سے پہنچا جو خود خاندانِ مجددیہ کے چشم و چراغ تھے۔ شیخ ابن شیخ تھے، لیکن جنھوں نے پندرہ سال شاہ غلام علی سے فیض حاصل کیا اور جو شاہ صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں شاہ صاحب نے انھیں اپنا مقبلی قرار دیا تھا۔

یہ بزرگ حضرت شاہ احمد سعید تھے جو پیدا تو رام پور میں ہوئے، لیکن جرجا جید خاں مدینہ منورہ کی مبارک سرزمین میں مدفون ہے۔ آپ کے والد ماجد شاہ ابوسعید بھی شاہ صاحب خلیفہ اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ بھائی شاہ عبدالغنی مجددی تھے جنھوں نے مکملہ مقاماتِ ظہری میں شاہ غلام علی صاحب اور ان کے خلفاء کے حالات لکھے ہیں اور جن سے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے بزرگوں نے حدیث پڑھی تھی۔ شاہ احمد سعید ۱۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان کی وفات تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ تصوف کی اکثر کتابیں مثلاً رسالہ قیشری عوارق الحارۃ احیاء العلوم۔ مکتوبات امام ربانی۔ مثنوی مولانا روم شاہ صاحب سے پڑھیں۔ اس وقت دہلی علما و صلحا سے بھری پڑی تھی۔ حدیث کی سند آپ نے شاہ عبدالعزیز سے لی۔ اور محققات کی کتابیں مولوی فضل امام اور مولوی رشید الدین سے پڑھیں۔

لے ڈاکٹر صاحب تحفہ زواریہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "تأملت پانزدہ سال از حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ فیض یاب شد۔ وہم متبیت ایشاں گشتند" شاہ غلام علی قدس سرہ اور خاندانِ سعیدیہ کے فیض یافتگان کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے (مطبوعہ کتابوں کے علاوہ) اور اس کے لیے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے۔

اغذ طریقہ شاد صاحب سے کیا۔ اور پھر اس فیض کو عالم میں عام کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ یا آپ کے ساتھیوں نے سلسلہ کے ہنگامے میں حقہ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کے دہلی سے مختلف سمتوں میں (بظاہر کسی قدر پریشانی کے عالم میں اجانے کا ذکر ملتا ہے۔ اور دہلی سے آپ کا سلامتی سے نکل جانا) جو ایک مسلمان فوجی عہدہ دار کی سعی سے ہوا، آپ کے تصرفات میں شمار ہوتا ہے۔ بالآخر آپ مدینہ منورہ پہنچے۔ لیکن بزرگوں کا کوئی قدم فیض سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ لاہور آئے اور وہاں سے ۲۸ نومبر ۱۸۵۷ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب موسے زئی پہنچے۔ جہاں آپ کے محب اور جہاں شاعر خلیفہ حاجی دوست محمد قندھاری مقیم تھے۔ اور جس جگہ آپ کی چند روزہ اقامت کی وجہ سے خانقاہ احمدیہ سعیدیہ قائم ہوئی، جس کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلہ مجددیہ کے دوسرے کسی چشمہ ہائے فیض جاری ہوئے۔

شاہ احمد سعید قدس سرہ نے جو خطوط حاجی دوست محمد قندھاری کے نام لکھے، انھیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے (مع چند دیگر خطوط کے) تحفہ زواریہ کے نام سے شائع کروایا ہے۔ کوئی ڈیرہ سو صفحے کا مختصر رسالہ ہے۔ اور مکاتیب بھی طویل نہیں۔ لیکن بعض بڑے دلچسپ ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی آپ کو خانقاہ (شاہ غلام علی) کا خیال جس طرح بے قرار رکھتا تھا اس کا اظہار کسی خطوں میں ہے۔ شیخ رجب علیہ السلام کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

مکرر آنکہ اگر چیزے از حال خانقاہ بدیافت رسیدہ باشد۔ انہیں نیز مطلع سازند کہ کدام درویش در انجا مقیم گردید۔ نیچے صورت آبادیش رسیدہ یا نہ ایک اور خط میں ہے:-

لازم کہ پیوستہ بہ نگارش حالات خویش مشتمل بر خیریت خود و احوال دہلی و احوال خانقاہ شریف نوشتہ باشد کہ ازاں اطمینان خاطر خواہد شد۔ فکر آبادی خانقاہ شریف از ہمہ چیز مد نظر باشد کہ سعادت دارین دلائل متصور است۔

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غدر کے بعد دہلی کی ساری دولت لٹ لٹا
 احاطہ پنجاب میں پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد۔ حالی۔ ندیر احمد کے
 دہلی کی بریادی کے بعد پنجاب میں آجائے سے یہاں اردو کو فروغ ہوا۔ اور وہ عمل
 شروع ہوا جس کی بدولت لاہور اسلامی ہندوستان کا ایک اہم تہذیبی مرکز ہو گیا
 لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اردو ادب ہی تک محدود نہ تھا۔ روحانی امور میں
 بھی کچھ اسی طرح کا عمل کار فرما ہوا۔ بالخصوص مجددی سلسلے کو مخری پنجاب میں
 ایک بالکل نئی زندگی ملی۔ دہلی کی بریادی کے بعد شاہ احمد سعیدؒ نے جس جگہ سے اپنا
 امیدیں وابستہ کیں، وہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب موئے نئی کا مقام تھا۔
 اور جس خلص اور عقیدت مند بزرگ کو انھوں نے اپنا جانشین کیا، وہ اس علاقے
 کے حاجی دوست محمدؒ قندھاری تھے۔ بلکہ انھوں نے تو دہلی کی خانقاہ محل سرے
 اور تسبیح خانے کو بھی ان کے سپرد کیا۔ اور یہ سند لکھ دی :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقیر احمد سعید مجددی عنہ واضح می نماید کہ فقیر بارادہ اللہ سبحانہ از دہلی شریف
 متوجہ حرمین شریفین گردیدم و خانقاہ و مکانات محسراتے خود تسبیح خانہ را حوالہ
 خلیفہ خود مقبول بارگاہ حاجی دوست محمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نمودہ ام و حاجی
 صاحب را اختیار دادم کہ سند باشد خواہ خود در آنجا باشد یا خلیفہ خود را
 دارند۔ لہذا اس چند کلمہ نوشتہ دادم کہ سند باشد و بوقت حاجت بکا آید و ملی باشد
 علی خیر خلقہ و محمد و اکہ واصحابہ اجمعین۔ محرمہ تباریخ شانزدہم جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ
 یہ سند ۲۸ جنوری ۱۸۷۸ء کی تحریر ہے۔ غالباً موئے نئی میں لکھی گئی یہ وہ
 زمانہ تھا۔ جب دہلی ابھی مسلمانوں کے لیے قیامت زار بنی ہوئی تھی۔ سند میں
 دہلی شریف کا اندراج اس بیابان نورد کی حسرتوں اور محبتوں کا مرقع ہے۔

اس زمانے کی تصانیف بلکہ خطوط سے بھی اس امر پر روشنی نہیں پڑتی، لیکن
 قیاس ہے کہ موئے نئی دہلی کے بعض دوسرے ارباب سلسلہ کے لیے بھی اس

زمانے میں جائے پناہ بن گئی تھی۔ حاجی دوست محمد صاحب کے ممتاز خلیفہ خواجہ محمد عثمانؒ
 کے موقوفات میر اکبر علی دہلوی نے جمع کیے تھے۔ ان کی نسبت فوائد عثمانیہ کے دیباچے
 میں جناب "طالوت" ملانی لکھتے ہیں :-

میر اکبر علی صاحب کے والد حاجی حافظ میر احمد علی صاحب دہلوی تھے۔ ان کے
 آبا و اجداد محمد شاہ کے زمانے میں خراسان سے آکر دہلی میں آباد ہوئے۔ اور سرحدی
 خواصان کے عہد پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان میں سے اکثر
 انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے والد حاجی (دوست محمد)
 صاحب سے بیعت ہو کر اہل و عیال سمیت موئے نئی شریف میں آکر مقیم ہو گئے۔
 شاہ احمد سعیدؒ موئے نئی سے (دیریا کے رستے) ٹھٹھہ نگر (کذا) پہنچے۔ وہاں
 سے گھوڑا باری کچھ روز قیام کے بعد بمبئی کو روانہ ہو گئے۔ جہاں آپ کی تلمیذ درود
 ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء ہے۔ وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر حجاز کا قصد کیا۔ چار ماہ
 کے قریب مکہ معظمہ میں قیام رہا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کی کشش غالب آئی۔
 اکتوبر نومبر میں وہاں پہنچے۔ اور مستقل قیام اختیار کیا۔ اگلے سال جولائی میں آپ کی
 کتابیں بھی (ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے) بمبئی سے پہنچ گئیں۔ حجاز میں آپ نے
 سلسلے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کمی لوگ بیعت
 ہوئے، لیکن اب آپ کی صحت بگڑنی شروع ہوئی اور ۱۹ ستمبر ۱۸۶۰ء کو آپ کا
 وصال ہو گیا۔ جنت بقیع میں مدفون ہوئے۔ حجاز میں آپ کا کام آپ کے صاحبزادوں
 نے جاری رکھا۔ ان میں شاہ محمد مظهر اس لیے بھی یاد کے لائق ہیں کہ انھوں
 نے مسجد نبوی کے قریب باب جمعہ کی طرف ایک نہایت خوشنما و منزلہ خانقاہ

۱۵ اب کسی قدر کٹھن ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی بڑا روح افزا مقام ہے۔ افسوس کہ مدینہ منورہ کا آخری
 سفر (نومبر ۱۹۳۳ء) میں پتا چلا کہ شاید ملک کی وسعت اور دوسرے منصوبوں کی وجہ سے یہ تبرک مقام
 باقی نہ رہے، لیکن کتب خانے کی حفاظت کا پورا انتظام ہو گا۔

رابطہ منظر یہ تعمیر کرائی۔ اس میں ایک بیش قیمت کتاب خانہ ہے جس میں علوم اسلامی اور بالخصوص سلسلے کی نادر کتب موجود ہیں۔

مغربی پاکستان میں مجددی سلسلہ | حاجی دوست محمد صاحب قندھاری کی اہمیت شاہ احمد سعید صاحب کے

مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے۔ وہ ایک زمانے میں تین اہم خاندانوں (قندھاری، موسیٰ زئی، دہلی) کے سربراہ تھے۔ افغانستان اور مغربی پاکستان میں آپ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں آپ کی بدولت ہی مغربی پنجاب میں سلسلہ مجددیہ کو استحکام نصیب ہوا۔ وفات ۱۶ فروری ۱۸۶۶ء کو ہوئی۔ ان کے خلیفہ اعظم خواجہ محمد عثمان تھے۔ جن کے ملفوظات، مکتوبات اور معمولات فوائد عثمانیہ میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے جانشین ان کے صاحبزادے مولوی سراج الدین تھے۔ خواجہ محمد عثمان کی وفات ۲۷ جنوری ۱۸۹۶ء کو اور مولوی سراج الدین کی ۱۹۱۵ء کو واقع ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ اور جناب حاجی دوست محمد صاحب قندھاری موسیٰ زئی میں آرام فرما ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلہ مجددیہ نے بڑی وسعت پائی۔ اور کئی خاندانیں قائم ہوئیں۔ ان میں خاندانہ سراجیہ مجددیہ کنڈل شریف (ضلع میانوالی) جس کے موجودہ سربراہ 'جامع علم و عرفان' مولانا ابوالخلیل خان محمد صاحب مدظلہ ہیں، اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ وہاں کتب صوفیہ بالخصوص نوادر سلسلہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔

حاجی صاحب کی طرح خواجہ محمد عثمان صاحب بھی خاندانہ دہلی کے سربراہ تھے، لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شاہ احمد سعید کے پوتے شاہ ابوالخیر محمد الدین صاحب جو ہنگامہ ۱۸۵۶ء سے دیرھ سال پہلے خاندانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ حجاز سے آکر وہاں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے پرانی روایات پھر تازہ کر دیں۔ موجودہ سربراہ اور بزرگوں کی یادگار جناب ابوالحسن زید فاروقی صاحب مدظلہ ہیں۔

زبان اردو کی ارتقا

مرزا مظہر جانجاناں جن کے جانشین شاہ غلام علی تھے۔ ادبی تاریخ میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کا محقق فارسی دیوان شائع ہوا ہے، لیکن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں دیوان مظہر کا جو قلمی نسخہ ہے اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مطبوعہ دیوان میں بہت سی اچھی غزلیں شامل نہیں ہوئیں۔ مظہر جانجاناں فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ انھوں نے کئی ریختہ گو شعرا کی تربیت کی۔ بلکہ مشہور شاعر مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو خالص سب سے پہلے ڈھالا۔ اس سے پہلے دکن کی تقلید میں شمالی ہندوستان میں بھی دکنی محاورے میں شعر گوئی شروع ہوئی اور ایہام گولی کا دور دورہ تھا۔ مرزا مظہر جانجاناں نے روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزائی آمیزش سے شعر لکھے۔ اور اس رجحان کا آغاز ہوا جسے تاریخ نے بعد میں بڑی ترقی دی مصحفی کا مظہر کے متعلق اندراج حسب ذیل ہے:-

”وہ ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و منو کا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دور ایہام دیاں بود
اول کے کہ شعر ریختہ بہ تہج فارسی گفتہ دوست..... فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ
باعتماد فقیر مرزا است۔ بعد از تعجبش بہ دیگران رسیدہ۔“

مظہر جانجاناں کے علاوہ جس دوسرے نقشبندی بزرگ نے نئی زبان کو سنوارا۔ شاہ سعد اللہ گلشن تھے۔ ان کے بھی کئی ریختہ گو شاگرد تھے۔ لیکن ہماری ادبی زندگی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید اردو شاعری کے آدم 'شعراؤلی' کی رہنمائی کی۔ سراج الدین خان آندو جس کے دامن تربیت تلے میر اور سودا جیسے استاد پہلے ان کے ہم عصر تھے۔ یہ سب بزرگ فارسی کے فاضل تھے اور اسی زبان پر فدا تھے۔ لیکن انھیں نظر آ رہا تھا کہ اسلامی حکومت کے زوال کے ساتھ ایک ایسی زبان کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جسے عوام کی گفتگو سے زیادہ تعلق ہو اور جو قومی روایات، خیالات کی ترجمانی میں فارسی کی قائم مقامی کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کے قواعد منضبط

اہم تاریخیں

مذہبی۔ علمی اور ادبی

- ۱۵۰۲۔ ہمدی جو سپوری کی وفات
۱۵۲۵۔ میاں بابزید رپر وٹھال کی ولادت
۱۵۷۹۔ بادشاہ کو حق اجتہاد دیے جانے کا فیصلہ
۱۵۹۷۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندی کی لاہور پہلی میں
۱۶۰۳۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندی کی وفات
۱۶۱۶۔ نواب مر قضا خاں شیخ فرید کی وفات
۱۶۱۹۔ دربارہماگیر میں حضرت مجدد الف ثانی کی طلبی
۱۶۲۲۔ حضرت مجدد الف ثانی کی وفات
۱۶۳۸۔ ۳۹۔ اخوند درویش پشاور کی وفات
۱۶۴۲۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات۔
۱۷۰۳۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ولادت
۱۷۱۱۔ لاہور میں خطبہ جمعہ کا ہنگامہ
۱۷۳۸۔ ۳۹۔ قرون مجید کا فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ
۱۷۴۸۔ ملا نظام الدین بانی درسی کی وفات
۱۷۵۳۔ مجتہد اقل مولانا ولد علی کی ولادت
۱۷۶۲۔ شاہ ولی اللہ کی وفات
۱۷۹۱۔ قرآن مجید کا باقاعدہ اردو ترجمہ
شاہ عبدالقادر ابن شاہ ولی اللہ۔

سیاسی

- ۱۲۹۸۔ کالی کٹ میں واسکو ڈے گاما کی آمد
۱۵۲۶۔ دہلی پر بابر کا قبضہ
۱۵۵۶۔ اکبر کی تخت نشینی
۱۵۵۶۔ ۱۶۰۰۔ ۱۶۰۷۔ گجرات۔ بنگال۔
کشمیر۔ سندھ۔ احمد نگر کی فتح
۱۶۰۵۔ اکبر کی وفات
۱۶۵۸۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی
۱۶۸۳۔ اورنگ زیب کی دکن کو روانگی
۱۶۸۷۔ بیجاپور کو لکنہ کی فتح
۱۷۰۷۔ اورنگ زیب کی دکن میں وفات
۱۷۳۹۔ دہلی پر نادر شاہ کا حملہ
۱۷۵۷۔ پلاسی کی لڑائی بنگال پر پستی کا تسلط
۱۷۶۱۔ پانی پت کی تیسری لڑائی
۱۷۶۱۔ بکسر کی لڑائی
۱۷۶۱۔ چوتھی جنگ میسور سلطان ٹیپو کی
شکست و شہادت
۱۷۹۹۔ لاہور پر پنجیت سنگھ کا قبضہ
۱۸۰۳۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

کیے۔ اردو اشعار کو فارسی اشعار کے طرز پر خود لکھا اور اپنے شاگردوں سے لکھوایا اور مرزا سودا۔ میر تقی میر۔ خواجہ میر درد۔ میر حسن جیسے بندگان کی تربیت کی جنہوں نے اردو شاعری کو مشرقی ادبیات میں سر اٹھانے کے قابل بنادیا۔ علمائے اس تحریک ساتھ دیا۔ شاہ ولی اللہ نے کلام مجید کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے اردو میں ایک چھوڑ دو ترجمے کیے اور اردو زبان کی حوصلہ افزائی کی۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف فارسی میں تھیں، لیکن ان کے نواسے شاہ اسماعیل شہید کی تقویت الایمان اردو نثر کا شاہکار ہے۔ ان کی اور حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے اردو نثر کو بڑی مدد ملی۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کی وفات سے سو سوا سو سال کے اندر اردو جسے پہلے علمی حلقوں میں کوئی اہمیت نہ لگاتا تھا ایک ایسی ادبی زبان ہو گئی جو ہندوستان میں فارسی کی جانشینی کر سکتی تھی۔

منتخب فہرست کتب

عبدالرشاد بھائی

۱۔ سکینۃ الاولیاء مرتبہ دارالعلوم

۲۔ دبستان غرائب

۳۔ رباعیات سرمد

۴۔ مجمع البحرین از دارالعلوم

عبدالحمید عالمگیری

۱۔ مآثر عالمگیری

۲۔ رقتات عالمگیری

۳۔ سفرنامہ برنیر

~~۴۔ منتخب التواریخ~~

حکیم الامت شاہ ولی اللہ

۱۔ انقاس العارفين از شاہ ولی اللہ

۲۔ کلمات طیبات

۳۔ حجة اللہ الباقیہ

۴۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز

شیخ فرخ کا فروغ

۱۔ نجوم السمائی تراجم العلماء

۲۔ طبقات حسنہ

علمائے متاخرین

۱۔ سیر السالکین

۲۔ آثار اکرام (از علامہ آذکو بلگرامی)

۳۔ علمائے فرقہ علی (اردو)

۴۔ مناقب لغزیزہ

۵۔ ملفوظات و مکاتیب مرزا مظہر علی شاہ

۶۔ شاہ غلام علی مرتضوی از علامہ محمد رفیع

۷۔ جوابہ علویہ۔ مرغیہ مولانا احمد رفیع قادری

اکبر سے پہلے

۱۔ ترازک بابری

۲۔ منتخب التواریخ از بدایونی

۳۔ اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث

۴۔ تذکرہ طیبہ ہند از مولوی رحمان علی (نو کشور)

۵۔ لطائف قدوسی

عبدالاکبری

۱۔ منتخب التواریخ

۲۔ اکبرنامہ

۳۔ آئینہ اکبری

۴۔ رقتات عالمگیری

۵۔ کلمات طیبات

۶۔ رزیدۃ المقابلات

۷۔ کلمات باقی باقی کتب محمد باقی

Alcohol and the Society

(ed) By Payne

حضرت مجدد الف ثانی

۱۔ مکتوبات امام ربانی (تین جلدیں)

۲۔ زبدۃ المقالات از مولانا یاسین کشمیری

۳۔ حضرت المقدس

۴۔ مکتوبات خواجہ محمد مسکوم

۵۔ مکتوبات سعید

۶۔ حیات مجدد دوم وغیرہ مرقعات

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۱۔ اخبار الاخیار

۲۔ مجموعہ المکاتیب والرسائل

۳۔ حیات شیخ عبدالحق (خلیق احمد نظامی)